بشیر بدر۔ شاعری کے تین مجموعے
اور فن و شخصیت پہ دو کتابیں ایک ہی پی ڈی ایف فائل میں

الحمد لائبریری۔ فیس بک گروپ
کتابیں پڑھئے

آس
بشیر بدر
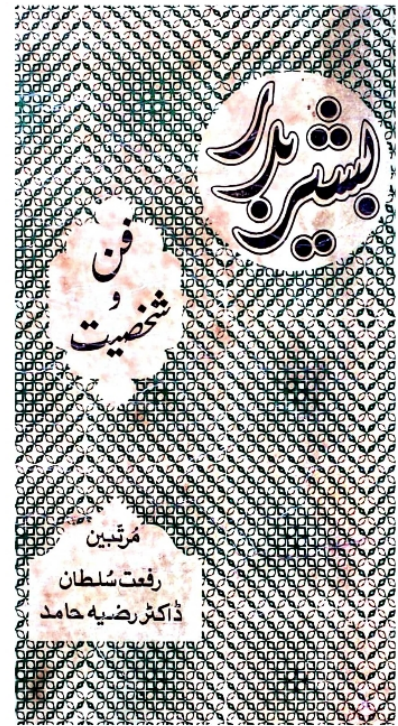
تمام کتب بغیر کسی مالی فائدے کے پی ڈی ایف میں تبدیل کی جاتی ہیں۔
کتابی مواد کی ذمہ داری مصنف پر ہے۔

03448183736
03145951212

گزشتہ دس بارہ سال سے بشیر بدر کی غزلیں نیا دور میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کی غزلیں پہلی بار نیا دور میں اشاعت کیلئے آئی تھیں تو ان کے لہجے کے چونکا دینے والے نئے پن نے جس میں احساس و فکر دونوں تازہ تازہ سے تھے مجھے متاثر کیا تھا۔ شعر پڑھتے وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑنے کا احساس ہوا تھا۔ اس غزل میں دو چیزیں تھیں اپنے زمانے کا احساس اور دوسرے اپنی روایت سے گہری وابستگی یہی خصوصیت ان کی ساری غزلوں میں رنگ بھرتی رہی ہے۔ شروع کی غزلوں میں ان کے ہاں تجربہ سمٹ کر آتا ہے بعد کی غزلوں میں یہ تجربہ پھیلتا نظر آتا ہے۔

بشیر بدر کی آواز میں ایک نیا پن ہے۔ ان کے ہاں نغمگی بھی ہے اور عہد حاضر کی آواز بھی ان کے لہجے میں دل کو موہ لینے والی ایک ایسی جاذبیت ہے کہ یہ مجموعہ جدید اردو غزل میں قابل ذکر اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

آس
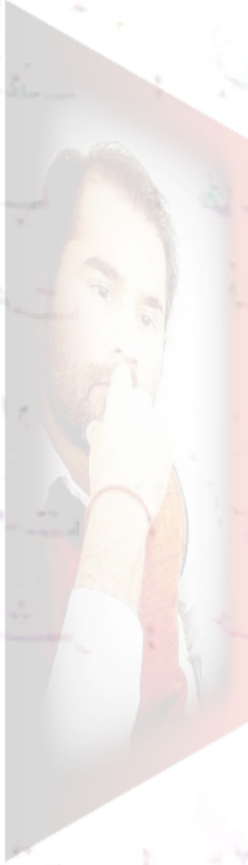
بشیر بدرؔ

حُسامی بُک ڈپو

مچھلی کمان، حیدر آباد-۲ (اے، پی)

نام کتاب : آس

مصنف : بشیر بدرؔ

مرتب : طارق سبزواری

اشاعت : فروری ۱۹۹۳ء

تعداد : ۱۰۰۰

طباعت : اسپیڈ پرنٹس سعید آباد حیدرآباد

ناشر : حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد-۲ (اے پی)

قیمت : ۴۰ روپے

اِنتساب

اپنی راحت بدر

کے نام

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے رُوبرو کرتے

بشیر بدر کی غزلوں کے مجموعے

امیج

آمد

آسمان

آس

ترتیب

ہماری شہرتوں کی موت بے نام ونشاں ہوگی
نہ کوئی تذکرہ ہوگا نہ کوئی داستاں ہوگی

اگر میں لوٹنا چاہوں تو کیا میں لوٹ سکتا ہوں
وہ دُنیا ساتھ جو میرے چلی تھی اب کہاں ہوگی

پرندے اپنی منقاروں میں سب تارے چھپالیں گے
جوانی چار دن کی چاندنی ہے پھر کہاں ہوگی

درختوں کی یہ چھالیں بھی اُتر جائیں گی پتے کیا
یہ دُنیا دھیرے دھیرے ایک دن پھر سے جواں ہوگی

ہوائیں روئیں گی سر پھوڑ لیں گی اِن پہاڑوں سے
کبھی جب بادلوں میں چاند کی ڈولی رواں ہوگی

کسے معلوم تھا ہم لوگ اِک بستر پہ سوئیں گے
حفاظت کے لئے تلوار اپنے درمیاں ہوگی

پسینہ بند کمرے کی اُمس کا جذب ہے اُس میں
ہمارے تولیے میں دھوپ کی خوشبو کہاں ہوگی

کسی گمنام پتھر پر بہت سے نام لکھ دو گے
تو قربانی ہماری اس طرح سے جاوداں ہوگی

زمینیں تو مِری اجداد نے ساری گنوا دی ہیں
مگر یہ ایک مٹھی خاک خود اپنا نشاں ہوگی

سمندر بوڑھے ہو جائیں گے اور اِک فاختہ مچھلی
ہمارے ساحلوں اور جنگلوں کی حکمراں ہوگی

○

کوئی نہ جان سکا وہ کہاں سے آیا تھا
اور اس نے دھوپ سے بادل کو کیوں ملایا تھا

یہ بات شاید لوگوں کو پسند آئی نہیں
مکان چھوٹا تھا لیکن بہت سجایا تھا

وہ اب وہاں ہے جہاں راستے نہیں جاتے
میں جس کے ساتھ یہاں پچھلے سال آیا تھا

سُنا ہے اس پہ چہکنے لگے پرندے بھی
وہ ایک پودا جو ہم نے کبھی لگایا تھا

چراغ ڈوب گئے کپکپاتے ہونٹوں پر
کسی کا ہاتھ ہمارے لبوں تک آیا تھا

بدن کو چھوڑ کے جانا ہے آسمان کی طرف
سمندروں نے ہمیں یہ سبق پڑھایا تھا

تمام عمر مرا دم اسی دھوئیں میں گھٹا
وہ اک چراغ تھا میں نے اُسے بجھایا تھا

○
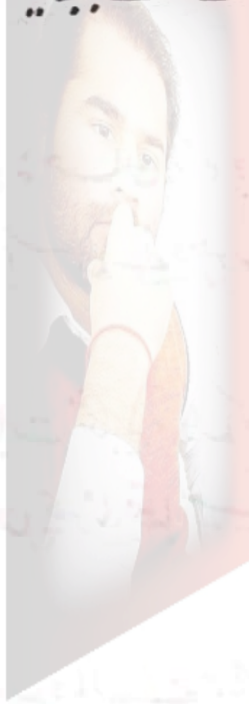
ہمارا درد ہماری دکھی نوا سے لڑے
سُلگتی آگ کبھی سرپھری ہوا سے لڑے

میں جانتا ہوں کہ انجام کار گیا ہوگا
اکیلا پتہ اگر رات بھر ہوا سے لڑے

مرے عزیز مجھے قتل کر کے پھینک آتے
بھلا ہوا کہ مرے لب مری صدا سے لڑے

سنہری مچھلیاں بادل میں کوند جاتی ہیں
بدن وہی ہے جو بندش میں بھی قبا سے لڑے

سیاہ برف میں ٹھٹھری ہے کائنات مری
کوئی ستارہ اُٹھے ٹوٹ کر خلا سے لڑے

تمام رات کی خونریز جنگ کا حاصل
بہت اندھیرا تھا اپنے ہی دست و پا سے لڑے

تمہارے شہر میں کیا ہو گیا تھا جس کے لئے
بستیو روتے رہے رات بھر خدا سے لڑے

ہما آس

○

آیا ہی نہیں ہم کو آہستہ گزر جانا
شیشے کا مقدّر ہے ٹکرا کے بکھر جانا

تاروں کی طرح شب کے سینے میں اُتر جانا
آہٹ نہ ہو قدموں کی اس طرح گزر جانا

نشے میں سنبھلنے کا فن یُوں ہی نہیں آیا
اِن زلفوں سے سیکھا ہے لہرا کے سنوّر جانا

بھر جائیں گے آنکھوں میں آنچل سے بندھے بادل
یاد آئے گا جب گل پر شبنم کا بکھر جانا

ہر موڑ پہ دو آنکھیں ہم سے یہی کہتی ہیں
جس طرح بھی ممکن ہو تم لوٹ کے گھر جانا

پتھر کو مرا سایہ آئینہ سا چمکا دے
جانا تو مرا شیشہ یوں درد سے بھر جانا

یہ چاند ستارے تم اوروں کے لئے رکھ لو
ہم کو یہیں جینا ہے ہم کو یہیں مر جانا

جب ٹوٹ گیا رشتہ سرسبز پہاڑوں سے
پھر تیز ہوا جانے ہم کو ہے کدھر جانا

○

میں نگارِ فکر و نگاہ کو کبھی بھول کر بھی صدا نہ دوں
یہ عجیب شرطِ وفا ہوئی کہ جو تم کہو میں وہی کہوں

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یُوں گذر گئے
جنہیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

مری آرزو ہے کہ ایک رات بس ایک چاندنی رات میں
میں خموش برف کی وادیوں کی اُداس بانہوں میں سو رہوں

یہ ہوا نہ جانے کہاں کہاں بھری دوپہر میں لئے پھرے
مرے برگِ دل ذرا ٹھہر جا تجھے آنسوؤں سے میں سینچ لوں

کسی مصلحت سے بہار خود مرے لب کے پاس ٹھہر گئی
مری آرزو تھی خزاں کے خشک اُداس ہونٹوں کو چوم لوں

یہ سفید پھول کی چادریں نیم شبنمی کا بُنا کفن
مجھے کچھ نہ دو یہیں رہنے دو کہ اسی گلی کی میں خاک ہوں

میں تو آنسوؤں کا سکوت ہوں لب شعر مجھ کو صدا نہ دے
نہ کبیر ہوں، نہ نظیر ہوں نہ میں میر ہوں نہ بشیر ہوں

ہم کو کافی ہیں یہی حلقۂ زنجیرِ سخن
جاؤ مل جل کے تمہیں بانٹ لو جاگیرِ سخن

وارثِ ملکِ غزل روئے تو رو لینے دو
غسل اشکوں سے ہوا کرتی ہے تطہیرِ سخن

زندگی رات ہے اور رات بھی بیمار کی رات
درد بن بن کے چمکتی رہے تنویرِ سخن

گفتگو۔ جیسے کہیں دُور غزل گائے کوئی
خامشی۔ جیسے کہ لب کھولے ہو تصویرِ سخن

ضبط کی دھار سے کٹ جاتا ہے آہن کا جگر
لوگ پھولوں پہ رواں کرتے ہیں شمشیرِ سخن

ہم بھی آئینہ صفت تھے کبھی لیکن اب تو
اپنے ماتھے پہ اُبھر آئی ہے تحریرِ سخن

ہم جو مٹ جائیں گے مٹ جائے گی تہذیبِ غزل
اپنی تقدیر میں پوشیدہ ہے تقدیرِ سخن

واہ واہ کیسی میاں آہ بھی کرنی ہو محال
واقعی سینے میں لگ جائے اگر تیرِ سخن

بدرؔ ہر فرد کو انسان نہیں کہہ سکتے
بدرؔ ہر شعر میں ہوتی نہیں تاثیرِ سخن

محفلِ مے کشاں ، کوچہ دلبراں
ہر جگہ ہو لئے اب چلیں دل کہاں

مصلحت چاہتی ہے کہ منزل ملے
اور دل ڈھونڈتا ہے کوئی کارواں

چاندنی بھی مِری طرح حیرت میں ہے
چھُپ گیا کوئی آواز دے کر کہاں

جانی پہچانی ہے ہر ادا ، ہر نظر
ہاں ، مگر یہ نہیں یاد دیکھا کہاں

رات یوں غم نے پھر دل میں آواز دی
جیسے صحرا کی مسجد میں شب کی اذاں

گرد اُڑ اُڑ کے منہ اپنا دیکھا کرے
رکھی ہے راہ میں آئینوں کی دکاں

کچھ تو میں بھی بہت دل کا کمزور ہوں
کچھ محبّت بھی ہے فطرتاً بدگماں

تذکرہ کوئی ہو ذکر تیرا رہا
اوّل و آخرش ، درمیاں درمیاں

جانے کس دیس سے دل میں آجاتے ہیں
چاندنی رات میں درد کے کارواں

درمیاں میں نہ لائیں خدا کو بھی ہم
بس وہی وہ سنے جس کی ہے داستاں

بدر صاحب ادھر کا نہ رُخ کیجیے
دِلی، لاہور ہیں شہر جادوگراں

○

خوشبو کو تتلیوں کے پروں میں چھپاؤں گا
پھر نیلے نیلے بادلوں میں لوٹ جاؤں گا

دیوانہ وار مجھ سے لپٹ جائے گی ہوا
میں سرخ سرخ پھولوں میں جب مسکراؤں گا

سونے کے پھول پتے گریں گے زمین پر
میں زرد زرد شاخوں پہ جب گنگناؤں گا

یہ لکڑیاں جو خشک ہیں بے برگ و بار ہیں
ان کو میں اپنی آگ میں جلنا سکھاؤں گا

دینار خوب برسیں گے آنگن میں ساری رات
میں خواب کے شجر کی وہ شاخیں ہلاؤں گا

دُھل جائیں گی بدن پہ جمی دُھوپ کی تہیں
اپنے لہو میں آج میں ایسا نہاؤں گا

اِک پل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے
پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا

یہ رات پھر نہ آئے گی بادل برسنے دے
میں جانتا ہوں صُبح تجھے بھول جاؤں گا

اس دن بجائے اوس کے ٹپکے گا سُرخ خون
تلوار لے کے جب میں خلاؤں میں جاؤں گا

جب رات کے سپرد مجھے کرنے آؤ گے
رومال روشنی کا ہوا میں اُڑاؤں گا

آنگن میں ننھے ننھے فرشتے لڑیں گے جب
بھوری شفیق آنکھوں میں میں مسکراؤں گا
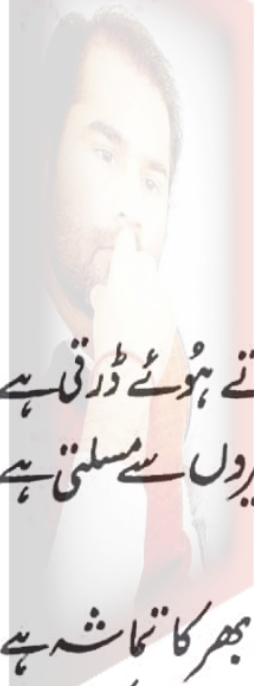
یہ چاندنی بھی جن کو چھوتے ہوئے ڈرتی ہے
دُنیا انہی پھولوں کو پیروں سے مسلتی ہے

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشہ ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

لوبان میں چنگاری جیسے کوئی رکھ جائے
یُوں یاد تری شب بھر سینے میں سلگتی ہے

آ جاتا ہے خود کھینچ کر دل سینے سے پٹڑی پر
جب رات کی سرحد سے اک ریل گزرتی ہے

آنسو کبھی پلکوں پر تا دیر نہیں رُکتے
اُڑ جاتے ہیں یہ پنچھی جب شاخ لچکتی ہے

خوش رنگ پرندوں کے لوٹ آنے کے دن آئے
بچھڑے ہوئے ملتے ہیں جب برف پگھلتی ہے
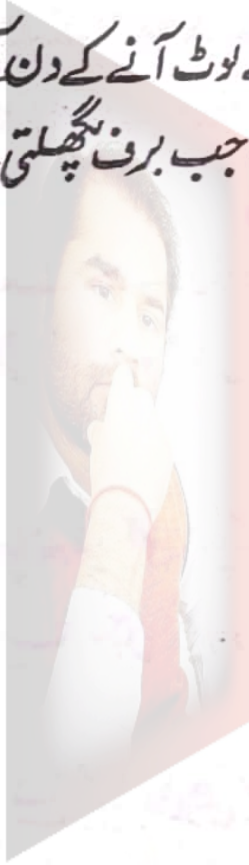
وقتِ رخصت کہیں تارے، کہیں جگنو آئے
ہار پہنانے مجھے پھول سے بازو آئے

بس گئی ہے مرے احساس میں یہ کیسی مہک
کوئی خوشبو میں لگاؤں تری خوشبو آئے

میں نے دن رات خدا سے یہ دعا مانگی تھی
کوئی آہٹ نہ ہو در پہ مرے اور تو آئے

اُس کی باتیں کہ گُل و لالہ پہ شبنم برسے
سب کو اپنانے کا اس شُوخ کو جادو آئے

ان دنوں آپ کا عالم بھی عجب عالم ہے
شُوخ کھایا ہوا جیسے کوئی آہو آئے

اُس نے چھُو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا
مُدتوں بعد، مری آنکھوں میں آنسو آئے

چاند ہاتھ میں بھر کر، جگنوؤں کے سر کاٹو اور آگ پر رکھ دو
قافلہ پرندوں کا جب زمیں پہ گر جائے چاقوؤں کے سر رکھ دو

میں بھی اِک شجر ہی ہوں جس پہ آج تک شاید پھول پھل نہیں آئے
تم مری ہتھیلی پر ایک رات چپکے سے برف کے ثمر رکھ دو

دھوپ کا ہرا بجرا، آگ کے سمندر میں چل پڑا ہمیں لینے
نرم و گرم ہونٹوں سے بند ہوتی آنکھوں کی تیلیوں کے پر رکھ دو

چاہے کوئی موسم ہو دن گئی بہاروں کے پھر سے لوٹ آئیں گے
ایک پھول کی پتی اپنے ہونٹ پر رکھ کر میرے ہونٹ پر رکھ دو

میرا تن درختوں میں اس لئے جُھلستا ہے سخت دُھوپ سہتا ہے
کیا عجب تم آ نکلو اور میرے کاندھوں پر جھک کے اپنا سر رکھ دو

روز ایسا ہوتا ہے رات کے سمندر میں شہر ڈوب جاتا ہے
اس لئے ضروری ہے اِک دیا جلا کر تم دل کے طاق پر رکھ دو

○

وہ نہیں ہے تو اُس کی آس رہے
ایک جائے تو ایک پاس رہے

جب بھی کسنے لگا، اتار دیا
اِس بدن پر کئی لباس رہے

ایک دن میں اگر لہو پی لوں
کئی دن برتنوں میں باس رہے

دونوں اِک دوسرے کا منہ دیکھیں
آئینہ، آئینے کے پاس رہے

آج ہم سب کے ساتھ خوب ہنسے
اور پھر دیر تک اُداس رہے

O

پھول سا کچھ کلام اور سہی
اک غزل اس کے نام اور سہی

اس کی زلفیں بہت گھنیری ہیں
ایک شب کا قیام اور سہی

زندگی کے اداس قصے ہیں
ایک لڑکی کا نام اور سہی

کرسیوں کو سنایئے غزلیں
قتل کی ایک شام اور سہی

کپکپاتی ہے رات سینے میں
زہر کا ایک جام اور سہی
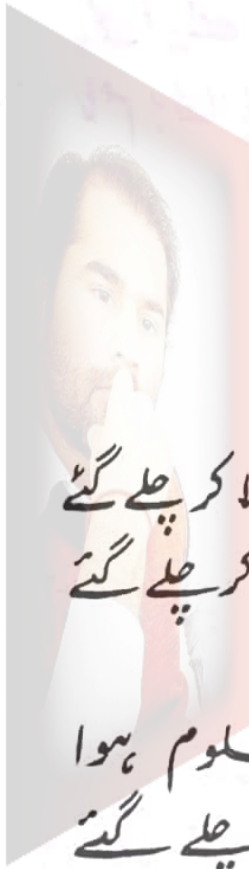
سب آنے والے بہلا کر چلے گئے
آنکھوں پر شیشے چمکا کر چلے گئے

ملبے کے نیچے آکر معلوم ہوا
سب کیسے دیوار گرا کر چلے گئے

اگر کبھی لوٹیں گے راکھ بٹوریں گے
جنگل میں جو آگ لگا کر چلے گئے

میں تھا۔ دن تھا اور اک لمبا رستہ تھا
سب خیمے جب لوگ اٹھا کر چلے گئے

چٹانوں پہ آ کر ٹھہرے دو رستے
پھر آگے اک راہ بنا کر چلے گئے

کچھ ایسے بچے بھی آئے مکتب میں
نام لکھا یا نام لکھا کر چلے گئے
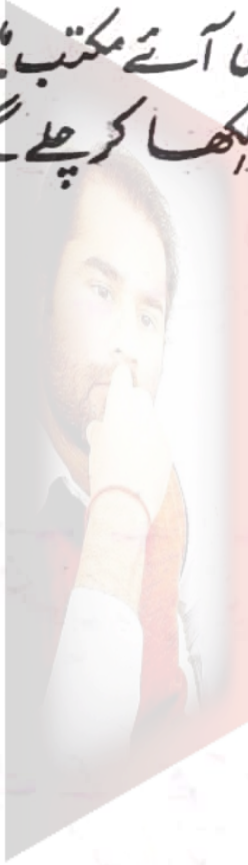
جو ادھر سے جا رہا ہے وہی مجھ پہ مہرباں ہے
کبھی آگ پاسباں ہے کبھی دھوپ سائباں ہے

بڑی آرزو تھی مجھ سے کوئی خاک رو کے کہتی
اتر آ مری زمیں پر تو ہی میرا آسماں ہے

میں اسی گماں میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں
ترا جسم بے تغیر، مرا پیار جاوداں ہے

کبھی سُرخ مومی شمعیں وہاں پھر سے جل سکیں گی
وہ لکھوری اینٹوں کا جو بڑا سا اِک مکاں ہے

سبھی برف کے مکانوں پہ کفن بچھے ہیں لیکن
یہ دھواں بتا رہا ہے ابھی آگ بھی یہاں ہے

کوئی آگ جیسے کہرے میں دبی دبی سے چمکے
تری جھلملاتی آنکھوں میں عجیب سا سماں ہے

انہیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے
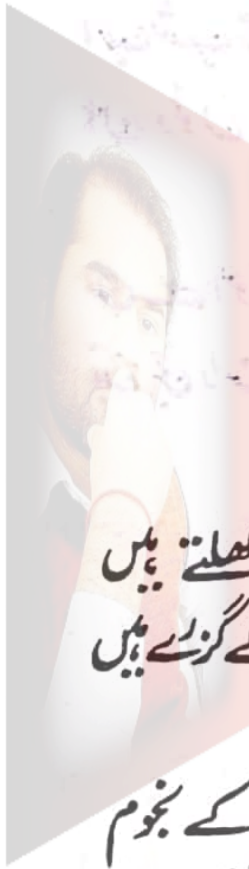
زخم یُوں مسکرا کر کھلتے ہیں
جیسے وہ دل کو چھُو کے گزرے ہیں

درد کا چاند آنسوؤں کے نجوم
دل کے آنگن میں آج اُترے ہیں

راکھ کے ڈھیر جیسے سرد مکاں
چاند اُن بدلیوں میں رہتے ہیں

آئینوں کا کوئی قصور نہیں
ان میں اپنے ہی عکس ہوتے ہیں

غور سے دیکھ خاک تنہا نہیں
ساتھ پھولوں کے رنگ اُڑتے ہیں

اب شبِ ہجر بھی نہیں آتی
ان دنوں ہم بہت اکیلے ہیں

ان سے احوالِ شب سنو صاحب
بدر جی رات رات گھومے ہیں
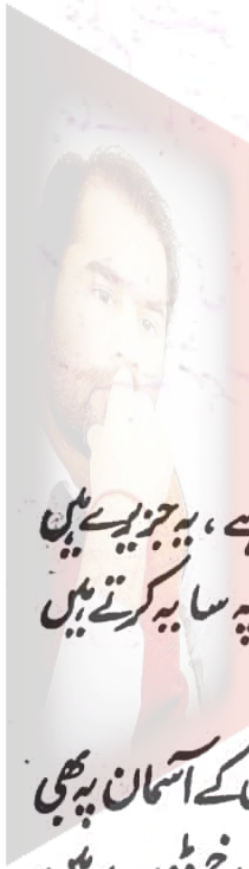
دہکتی دُھوپ سمندر ہے ، یہ جزیرے ہیں
گھنے درخت جو سڑکوں پہ سایہ کرتے ہیں

عجیب شہر ہے یہ اس کے آسمان پہ بھی
لہو میں ڈوبے ہوئے سُرخ سُرخ ڈورے ہیں

وہ کوئی اور تھا شب خون مارنے والا
ہمیں نہ مارو کہ ہم بے ضرر فرشتے ہیں

یہ پتھروں کا ہے جنگل چلو یہاں سے چلیں
ہمارے پاس تو گیلی زمیں کے پودے ہیں

پھر ان کے نیچے درندوں کے نام کس نے لکھے
ہمیں یقین ہے یہ سب ہمارے چہرے ہیں

عظیم دشمنو، چاقو چلاؤ موقع ہے
ہمارے ہاتھ ہماری کمر کے پیچھے ہیں

کہانیوں کی کئی باتیں سچ ہوئیں جیسے
سنہرے شہر سمندر میں بہتے رہتے ہیں

پلک جھپکتے ہی یہ رات وار کر دے گی
سجا کے چاند کی کشتی میں میرا سر دے گی

چڑھے گا سُوکھے بدن میں لہو کا فوّارہ
یہ سُرخ چاندنی خالی گلاس بھر دے گی

یہ نرم بلّی جو سوتی ہے میرے سینے پر
میں سو گیا تو کلیجہ ہی چاک کر دے گی

بدن کے پیڑ کو خود اس کی شاخ کاٹے گی
یہی تراش زمین کو نیا شجر دیگی

بہار اب کے لہو کے چڑھے سمندر کو
قلم کئے ہوئے بازو بریدہ سر دے گی

اُسی خیال سے پتھر ہے بیچ پانی میں
کوئی تو موج گہر کی اسے خبر دے گی

طواف دائرہ اب پہلی بار ٹوٹا ہے
یہ رہگذر ہمیں اک اور رہگذر دے گی

چڑھا کے بیٹھے پہ بکری کے بچے گھومیں گے
یہ دنیا اب ہمیں سرکس کا شیر کر دے گی

اڑتی کرنوں کی رفتار سے تیز تر، آسمانوں کے اِک گاؤں میں جائیں گے
دھوپ ماتھے پہ اپنے سجا لائیں گے سائے پلکوں کے پیچھے چھپا لائیں گے

برف پر تیرتے روشنی کے بدن، چلتی گھڑیوں کی دو سوئیوں کی طرح
دائرے میں صدا گھومنے کے لئے آہنی محوروں میں جڑے جائیں گے

جب ذرا شام کچھ بے تکلّف ہوئی، برگزیدہ فرشتوں کے پر نُچ گئے
رات کا ٹیپ سورج بجا دے اگر موم کے پاک چہرے پگھل جائیں گے

سُرمئی ہڈیوں، خاکی اشجار نے لُوٹنے والوں کا خیر مقدم کیا
ہم نے تو یہ سُنا تھا کہ اُن لوگوں پر چاند تارے بہت پھول برسائیں گے

مختلف پیچ میں اک کسی شخصیت، یاد کا پھول بن کے بکھر جائے گی
دھوپ سے تپتپاتے ہوئے ہاتھ جب، نیم کے پھول سڑکوں پہ برسائیں گے

ہم کو بھی اپنی موت کا پورا یقین ہے
پر دشمنوں کے ملک میں اک مہ جبین ہے

سر پر کھڑے ہیں، چاند ستارے بہت مگر
انسان کا جو بوجھ اٹھائے زمین ہے

یہ آخری چراغ اسی کو بجھانے دو
اس بستی میں وہ سب سے زیادہ حسین ہے

تکیے کے نیچے رکھتا ہے تصویر کی کتاب
تحریر و گفتگو میں جو اتنا متین ہے

یاروں نے جس پہ اپنی دکانیں سجائی ہیں
خوشبو بتا رہی ہے ہماری زمین ہے

○

اس نابینا پیاسے کو اس طرح پلا دینا
پانی سے بھرا شیشہ پتھر پہ گرا دینا

ان پتوں نے گرمی بھر سائے میں ہمیں رکھا
اب ٹوٹ کے گرتے ہیں بہتر ہے جلا دینا

چھوٹے قد و قامت پہ ممکن ہے ہنسے جنگل
اک پیڑ بہت لمبا ہے اس کو گرا دینا

ممکن ہے کہ اس طرح وحشت میں کمی آئے
خوابیدہ درختوں میں تم آگ لگا دینا

اب دوسروں کی خوشیاں چبھنے لگیں آنکھوں میں
یہ بلب بہت روشن ہے اس کو بجھا دینا

○

کس دیس میں یہ قافلۂ وقت رُکا ہے
عارض کے اُجالے ہیں نہ زُلفوں کی گھٹا ہے

کچھ میری نگاہوں کے تلے دھند بہت ہے
کچھ جشنِ چراغاں سے اندھیرا بھی بڑھا ہے

میں نے تیری باتوں کو کبھی جھوٹ کہا تھا
اس جرم پہ ہر جھوٹ کو سچ مان لیا ہے

اے شوخ غزالو، یہاں دو پھول تو رکھ دو
اس قبر میں خوابیدہ محبت کا خدا ہے

کچھ دیر میں سانسوں کی یہ آہٹ نہ ملے گی
دل رات کے سناٹے میں یوں ڈوب رہا ہے

صورت شمع ساری رات جلو
صبح لیکن مثال غنچہ ہنسو

چاند کا داغ دیکھنے والو
اپنے دامن کے داغ بھی دیکھو

چاہے آنکھوں کی روشنی لے لو
آنسوؤں، آج رات بھر چمکو

آؤ اِک دوُسرے کا غم بانٹیں
کچھ ہماری سُنو کچھ اپنی کہو

کون جانے کہاں بچھڑ جائیں
راہ تاریک ہے قریب رہو

یہ زمیں مدّتوں کی پیاسی ہے
آنسوؤ دل پہ ٹوٹ کر برسو

وقت سو منصفوں کا منصف ہے
وقت آئے گا انتظار کرو

چشم مانگے ہے آج دل کا لہو
بدرؔ صاحب کا کوئی شعر پڑھو

بدر، دو آنکھیں بہت ڈھونڈ رہی ہیں تم کو
چاند کی چودھویں تاریخ ہے، اوپر دیکھو

رات سوئی ہوئی رعنائیوں نے مجھ سے کہا
ہم تمہاری ہی غزل ہیں کبھی ہم کو بھی کہو

چاندنی رات میں کہہ جاتی ہے آہٹ جیسے
ہم بہت پاس ہیں آواز نہ دو، ہم کو سنو

جس سے امیدِ وفا ہو گی وہی دُکھ دے گا
بے وفا جان کے چاہو جسے اب کی چاہو

اُس کی قدرت میں نہیں رُک کے کوئی بات سنے
وقت آواز ہے آواز کو آواز نہ دو

منتظر کب سے ہیں اوراقِ کتابِ ہستی
دل کا کچھ رنگ کرو نوکِ قلم کو چُومو

ایک آواز بہت کافی ہے سوتے کے لئے
لوگ سمجھیں گے بنے لیٹے ہو اب جاگ پڑو

آج کمرے میں نہیں بیٹھنے والا موسم
برف گرنے کی خبر گرم ہے گھر سے نکلو

○

کوئی جاتا ہے یہاں سے، نہ کوئی آتا ہے
یہ دیا اپنے اندھیرے میں گھٹا جاتا ہے

سب سمجھتے ہیں وہی رات کی قسمت ہوگا
جو ستارہ کہ بلندی پہ نظر آتا ہے

میں اسی کھوج میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہوں
کس کا آنچل ہے جو کوہساروں پہ لہراتا ہے

میری آنکھوں میں ہے اک ابر کا ٹکڑا شاید
کوئی موسم ہو سرِ شام برس جاتا ہے

دے تسلی کوئی تو آنکھ چھلک اُٹھتی ہے
کوئی سمجھائے تو دل اور بھی بھر آتا ہے

○

دُھوپ کھیتوں میں اتر کر زعفرانی ہوگئی
سرمئی اشجار کی پوشاک دھانی ہوگئی

جیسے جیسے عمر بھیگی سادہ پوشاکی گئی
سُوٹ پیلا، شرٹ نیلی، ٹائی دھانی ہوگئی

اس کی اردو میں بھی اب کی مغربی لہجہ ملا
کالے بالوں کی وہ رنگت زعفرانی ہوگئی

سانپ کے بوسے میں کیسا پیار تھا کہ فاختہ
پھڑ پھڑا کر اِک صدائے آسمانی ہوگئی

نرم ٹہنی دُھند کی یلغار کو سہتی ہوئی
شاخ کی بانہوں میں آکر جاودانی ہوگئی

اپنے پہاڑ، غیروں کے گل زار ہو گئے
یہ بھی ہماری راہ کی دیوار ہو گئے

پھل پک چکا ہے شاخ پہ گرمی کی دھوپ میں
ہم اپنے دل کی آگ میں تیّار ہو گئے

ہم پہلے نرم پتّوں کی اِک شاخ تھے مگر
کاٹے گئے ہیں اتنے کہ تلوار ہو گئے

بازار میں بکی ہوئی چیزوں کی مانگ ہے
ہم اس لئے خود اپنے خریدار ہوگئے

تازہ ہو بھرا تھا سنہرے گلاب میں
انکار کرنے والے گنہگار ہو گئے

وہ سرکشوں کے پاؤں کی زنجیر تھے کبھی
اب بزدلوں کے ہاتھ میں تلوار ہو گئے

○

تم نے دیکھا کدھر گئے تارے
کس کی آواز پر گئے تارے

یہ کہیں شہرِ آرزو تو نہیں
چلتے چلتے ٹھہر گئے تارے

آج آثارِ صبح سے پہلے
وادیوں میں اُتر گئے تارے

سہمے سہمے، بجھے بجھے مغموم
سر جھکاتے گزر گئے تارے

بدرؔ کچھ واں کی بھی خبر ہے، تمہیں
آنچلوں پر بکھر گئے تارے

○

الزام، بے وفائی کے، ان کو دے رہا ہوں
شک ہو رہا ہے مجھ کو میں خود ہی بے وفا ہوں

ہر جسم گُل فروشاں اب مرکزِ نظر ہے
تم سے بچھڑ کے کتنا آوارہ ہو گیا ہوں

اس شامِ بے کسی میں دل کی خبر نہیں ہے
کب سے کہاں کہاں میں آواز دے رہا ہوں

بیتے ہوئے دنوں غم یاد آ گئے ہیں
اُن کو گلے لگا کر میں آج رو پڑا ہوں

اس لمحۂ خوشی میں افسانۂ شبِ غم
کچھ تم بھی بھول لیتے ہو کچھ میں بھی بھولتا ہوں
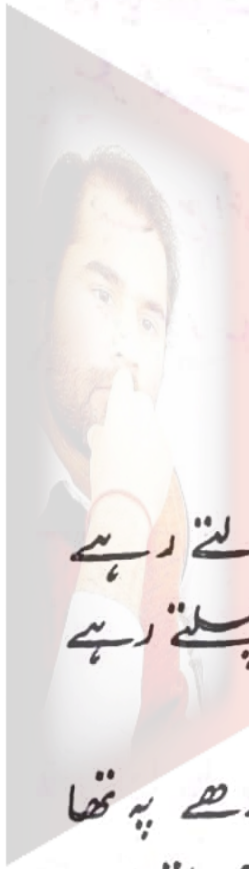
مُسافر کے رستے بدلتے رہے
مقدّر میں چلنا تھا چلتے رہے

کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا
مرے ہاتھ شعلوں پہ چلتے رہے

مرے راستے میں اُجالا رہا
دیئے اس کی آنکھوں میں جلتے رہے

آس ۵۷

محبّت، عداوت، وفا، بے رُخی
کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

سُنا ہے اُنہیں بھی ہوا لگ گئی
ہواؤں کا رُخ جو بدلتے رہے

وہ کیا تھا جسے ہم نے ٹھکرا دیا
مگر عمر بھر ہاتھ ملتے رہے

لپٹ کر چراغوں سے وہ سو گئے
جو پھولوں پہ کروٹ بدلتے رہے

○

تاروں کی چلمنوں سے کوئی جھانکتا بھی ہو
اس کائنات میں کوئی منظر نیا بھی ہو

اتنی سیاہ رات میں کس کو صدائیں دوں
ایسا چراغ دے جو کبھی بولتا بھی ہو

درویش کوئی آئے تو آرام سے رہے
گھر بھی ترے فقیر کا اتنا بڑا تو ہو

سارے پہاڑ کاٹ کے میں ملنے آؤں گا
ہاں میرے انتظار میں دریا رُکا بھی ہو

رنگوں کی کیا بہار ہے پتھر کے باغ میں
لیکن مری زمیں کا اِک حصہ ہرا بھی ہو

○

جگنو کوئی ستاروں کی محفل میں کھو گیا
اتنا نہ کر ملال جو ہونا تھا ہو گیا

پروردگار جانتا ہے تو دلوں کا حال
میں جی نہ پاؤں گا جو اُسے کچھ بھی ہو گیا

اب اُس کو دیکھ کر نہیں دھڑکے گا میرا دل
کہنا کہ مجھ کو یہ بھی سبق یاد ہو گیا

بادل اُٹھا تھا سب کو رُلانے کے واسطے
آنچل بھگو گیا کہیں دامن بھگو گیا

اِک لڑکی، ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوتی تھی
میں اُجلی دُھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا

○

سورج بھی بندھا ہوگا دیکھو مرے بازو میں
اس چاند کو بھی رکھنا سونے کے ترازو میں

اب ہم سے شرافت کی اُمید نہ کر دینا
پانی نہیں مل سکتا تپتی ہوئی بالو میں

تاریک سمندر کے سینے میں گہر ڈھونڈو
جگنو بھی چمکتے ہیں برسات کے آنسو میں

سب دیر و حرم جھوٹے دل دار و صنم جھوٹے
ہم آ ہی گئے دنیا آخر تیرے جادو میں

خوابیدہ گلابوں پر یہ اوس بچھی کیسے
احساس چمکتا ہے اسلوب کی خوشبو میں

○

گلوں کی طرح ہم نے زندگی کو اس قدر جانا
کسی کی زُلف میں اِک رات سونا اور بکھر جانا

اگر ایسے گئے تو زندگی پر حرف آئے گا
ہواؤں سے پلٹنا تِتلیوں کو چُوم کر جانا

دُھنک کے رکھ دیا تھا بادلوں کو جن پرندوں نے
انہیں کس نے سکھایا اپنے سائے سے بھی ڈر جانا

کہاں تک یہ دیا بیمار کمرے کی فضا بدلے
کبھی تم ایک مٹھی دُھوپ ان طاقوں میں بھر جانا

اسی میں عافیت ہے گھر میں اپنے چین سے بیٹھو
کسی کی سمت جانا ہو تو رستے میں اُتر جانا

کہاں آنکھوں کی یہ سوغات ہوگی
نئے لوگ ہوں گے نئی بات ہوگی

مسافر ہو تم بھی، مسافر ہیں ہم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

صداؤں کو الفاظ ملنے نہ پائیں
نہ بادل گھریں گے نہ برسات ہوگی

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا
بڑی دور تک رات ہی رات ہوگی

ازل سے ابد تک سفر ہی سفر ہے
کہیں صبح ہوگی کہیں رات ہوگی

○

سر سے چادر بدن سے قبا لے گئی
زندگی ہم فقیروں سے کیا لے گئی

میری مٹھی میں سوکھے ہوئے پھول ہیں
خوشبوؤں کو اڑا کر ہوا لے گئی

میں سمندر کے سینے میں چٹان تھا
رات اک موج آئی بہا لے گئی

ہم تو کاغذ تھے اشکوں سے بھیگے ہوئے
کیوں چراغوں کو لوُ تک ہوا لے گئی

چاند نے رات مجھ کو جگا کر کہا
ایک لڑکی تمہارا پتہ لے گئی

سینے میں آگ، آگ میں آہن بھی چاہیئے
رم جھم برستا باتوں سے ساون بھی چاہیئے

تلوار توڑنے سے تلافی کہاں ہوئی
ان بزدلوں کے ہاتھ میں کنگن بھی چاہیئے

سینے میں آفتاب سا اِک دل ضرور ہو
ہر گھر میں ایک دُھوپ کا آنگن بھی چاہیئے

بچوں کے ساتھ جھاڑیوں میں جگنو ڈھونڈھیئے
دل کے معاملات میں بچپن بھی چاہیئے

ہم آدمی ہیں یا کوئی بے حس چٹان ہیں
دل میں کسی کے نام کی دھڑکن بھی چاہیئے

راہیں روایتوں کی اگر روندنے چلوں
سر پر مجھے بزرگوں کا دامن بھی چاہیئے

کوئی ہاتھ نہیں خالی ہے
بابا، یہ نگری کیسی ہے

کوئی کسی کا درد نہ جانے
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے

اس کا بھی کچھ حق ہے آخر
اُس نے مجھ سے نفرت کی ہے

پھول دوا جیسے مہکے ہیں
کسی بیمار کی صبح ہوئی ہے

کیسے کٹے گی تنہا تنہا
اتنی ساری عمر پڑی ہے

ہم دونوں کی خوب نبھے گی
میں بھی دکھی ہوں وہ بھی دکھی ہے

اب غم سے کیا ناطہ توڑیں
ظالم بچپن کا ساتھی ہے

دل کی خاموشی پہ نہ جاؤ
راکھ کے نیچے آگ دبی ہے

گاؤں چھوڑا تو کئی آنکھوں میں کاجل پھیلا
شہر پہنچا تو کسی ماتھے پہ جھومر جھوما

زندگی تو نے مجھے مار لیا تھا لیکن
یہ تو میں تھا کہ ترے زندوں سے بہتر ہی جیا

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

وہ تو انساں بھی تری یاد کی محویت میں
درو دیوار کو سینے سے لگا کر چوما

آج کی شام دوبارہ نہ کبھی آئے گی
آج کی شام یہ مت سوچ کہ کل کیا ہوگا

دکھ بھرا پیار سمندر کی طرح لامحدود
غمزدہ حسن، رواں پانی میں گھلتا سونا

میرے ہاتھوں سے کبھی چھوٹا تھا اک آئینہ
عمر بھر جس کو مری آنکھوں نے پلکوں سے چنا

رات خاموشئ دل چھا گئی جب دُنیا پر
کوئی بولا تھا بہت پاس وہ تم تھے کہ خدا

خُوب صُورت ہے بہت پیار کی خوش فہمی بھی
بند پلکوں کو ترے ہونٹوں نے جیسے چوما
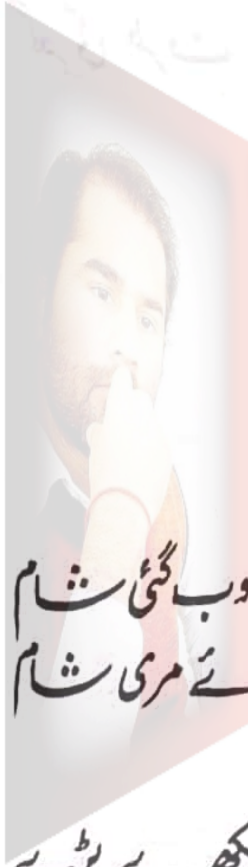
رات کے سمندر میں ڈوب گئی شام
میرے بھی سپنے میں آئے مری شام

بادل سے تھے کمرے میں بکھرے پڑے
بستر پہ لیٹی تھی تھکی ہوئی شام

بند کئے بیٹھے تھے یادوں کا گھر ہم
دروازہ کھول کر چلی گئی شام

آس ۱۷

سارے بدن کا تناؤ فضا میں
کسے کسے کپڑوں میں پھنسی پھنسی شام

تاروں کی آنکھوں میں کرنوں کے نیزے
سورج کے سینے میں چبھی ہوئی شام

تھکے تھکے پیڈل کے بیچ چلے سورج
گھر کی طرف لوٹی دفتر کی شام
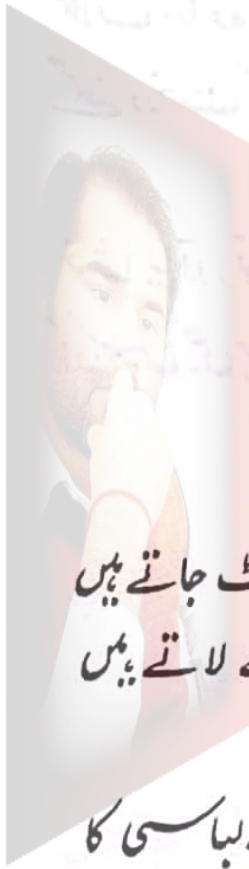
وہ پیاسے جھونکے بہت پیاسے لوٹ جاتے ہیں
جو دُور دُور سے بادل اُڑا کے لاتے ہیں

کوئی لباس نہیں دل کی بے لباسی کا
اگرچہ روز نئی چادریں چڑھاتے ہیں

ستارہ بن کے بھٹکتے ہیں ساری ساری رات
جو وعدہ کر کے وفا کرنا بھول جاتے ہیں

تیرا سکوت بھی اکثر تحیّر نغمہ
خموش رہ کے بھی یہ ہونٹ گنگناتے ہیں

ہیں دن ہوں میری جبیں پر دُکھوں کا سُورج ہے
دیئے تو رات کی پلکوں پر جھلملاتے ہیں

گلاب سا وہ بدن کیا ہوائے درد میں تو
گھنے درخت کے جنگل بھی سُوکھ جاتے ہیں
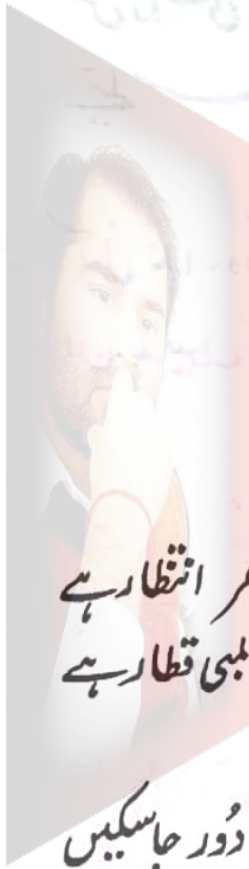
خوشا یہ قدر تو ہے اس اُداس نسل کے پاس
اُداس بھی جو نہ ہوں گے وہ لوگ آتے ہیں

ہم سے مُسافروں کا سفر انتظار ہے
سب کھڑکیوں کے سامنے لمبی قطار ہے

چمکیلی سبز آنکھیں بہت دُور جا سکیں
کن گھنٹیوں کا راستوں کو انتظار ہے

بانسوں کے جنگلوں میں وہی تیز بُو ملی
جن کا ہماری بستیوں میں کاروبار ہے

آواز پھڑ پھڑا کے وہیں دفن ہو گئی
سینے میں غالبؔ کوئی بجلی کا تار ہے

سورج بریدہ سر ہے زمین کے شہید کا
یہ دھوپ اس کے زرد بدن کی بہار ہے

کس روشنی کے شہر سے گزرے ہیں تیز رو
نیلے سمندروں پہ سنہرا غبار ہے

آئی ندا، وہ اڑتے ستارے ادھر مڑے
ان بدلیوں کے پیچھے کوہسار ہے

خفتہ شجر لرز اُٹھے جیسے کہ ڈر گئے
کچھ چاندنی کے پھول زمین پر بکھر گئے

شیشے کا تاج سر پہ رکھے آ رہی تھی رات
ٹکرائی ہم سے چاند ستارے بکھر گئے

وہ خشک ہونٹ، ریت سے نم مانگتے رہے
جس کی تلاش میں کئی دریا گزر گئے

چاہا تھا میں نے چاند کی پلکوں کو چوم لوں
ہونٹوں پہ میرے صبح کے تارے بکھر گئے

میرے لبوں پہ چاند کی قاشیں لرز گئیں
آنکھوں پہ جیسے رات کے گیسو بکھر گئے

تلوؤں میں نرم دھوپ نے جب گدگدی سی کی
پلکوں پہ سوئے چاندنی کے خواب ڈر گئے

ساحل پہ رُک گئے تھے ذرا دیر کے لئے
آنکھوں سے دل میں کتنے سمندر اُتر گئے

جن پر لکھی ہوئی تھی محبّت کی داستاں
وہ چاک چاک پُرزے ہوا میں بکھر گئے

پایا جو مسکراتے ہوئے کہہ اُٹھی بہار
جو زخم پچھلے سال لگائے تھے بھر گئے

جن پر لکھی ہوئی تھی محبّت کی داستان
وہ چاک چاک پرزے ہوا میں بکھر گئے
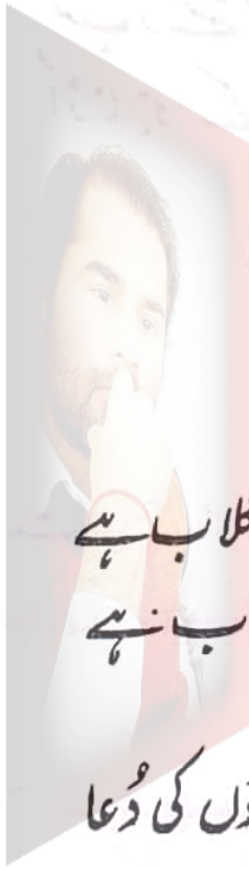
سورج مکھی کے گالوں پہ تازہ گلاب ہے
یہ میرا آفتاب، مرا ماہتاب ہے

ہر تارہ۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی دعا
یہ آسماں، حمد و ثنا کی کتاب ہے

بادل ہوا کی زد پہ برس کے بکھر گئے
اپنی جگہ چمکتا ہوا آفتاب ہے

چونکے تو یہ طلسم جہاں ٹوٹ جائے گا
عالم تمام حلقۂ زنجیرِ خواب ہے

ناحق خیال کرتے ہو دنیا کی بات کا
تم کو خراب جو کہے وہ خود خراب ہے

سب رشتے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن یہ پیار کے
اُڑنا ہوا کے دوش پہ کیسا عذاب ہے
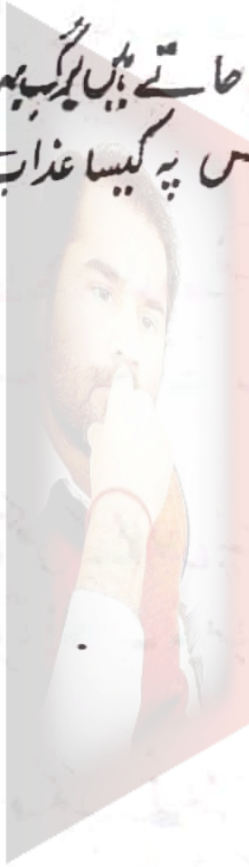
زمیں سے آنچ زمیں توڑ کر نکلتی ہے
عجیب تشنگی ان بادلوں سے برستی ہے

ہمارے عہد میں نایاب ہے، بچائے رہو
تمہاری آنکھ میں اِک چیز جو چمکتی ہے

سروں پہ دُھوپ کی گٹھری اُٹھائے پھرتے ہیں
دلوں میں جن کی بڑی سرد رات ہوتی ہے

کھڑے کھڑے میں سفر کر رہا ہوں برسوں سے
زمین پاؤں کے نیچے کہاں ٹھہرتی ہے

پگھل رہی ہیں چٹانیں نحیف بانہوں میں
بدن میں پیار کے کیسی عجیب گرمی ہے

ہوا کے آنکھ نہیں، ہاتھ اور پاؤں نہیں
اسی لیے وہ سبھی راستوں پہ چلتی ہے

○

چل مُسافر، بتیاں جلنے لگیں
آسمانی گھنٹیاں بجنے لگیں

کھِل رہا ہے شام کا کالا گلاب
زرد سوکھی پتیاں جھڑنے لگیں

رات اِک تالاب کے آئینے میں
جھلملاتی کشتیاں چلنے لگیں

بند کر لو در، دریچے، کھڑکیاں
پھر ہوا میں سیٹیاں بجنے لگیں

شاخ تھی کمزور شاید اس لئے
پتیوں پر پتیاں مرنے لگیں

دوڑتے ہیں پھول، بستوں کو دبائے
پاؤں پاؤں تتلیاں چلنے لگیں
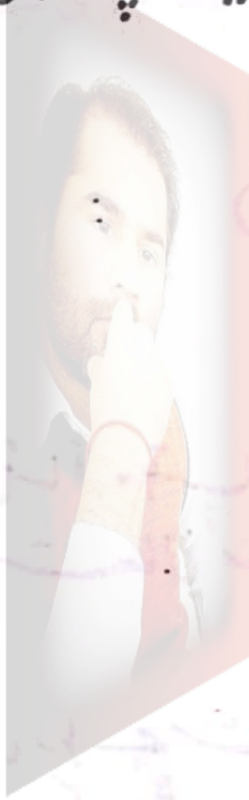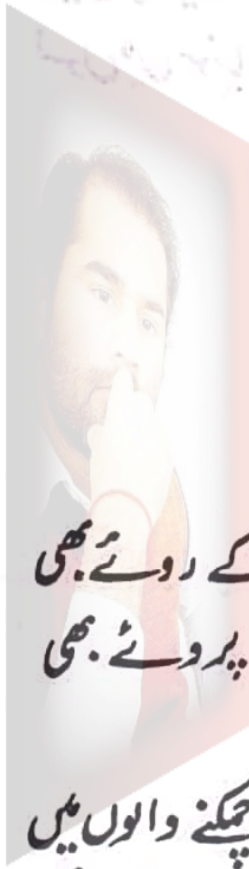
مجھے بھلائے کبھی یاد کر کے روئے بھی
وہ اپنے آپ کو بکھرائے اور پروئے بھی

شمار ہو نہ سکے ہم چمکنے والوں میں
بدن بھی ملتے رہے، روز کپڑے دھوئے بھی

بہت غبار بھرا تھا دلوں میں دونوں کے
مگر وہ ایک ہی بستر پہ رات سوئے بھی

بہت دنوں سے نہائے نہیں ہیں آنگن میں
کبھی تو راہ کی بارش ہمیں بھگوئے بھی

یہ تم سے کس نے کہا رات سے میں ڈرتا ہوں
ضرور آئے مرے بازوؤں میں سوئے بھی

یقین جانیے احساس تک نہ ہوگا ہمیں
نسوں میں سوئیاں کوئی اگر چبھوئے بھی

○

سبز پتّے دھوپ کی یہ آگ جب پی جائیں گے
اُجلے فر کے کوٹ پہنے ہلکے جاڑے آئیں گے

گیلے گیلے مندروں میں بال کھولے دیویاں
سوچتی ہیں ان کے سورج دیوتا کب آئیں گے

سُرخ، نیلے چاند تارے دوڑتے ہیں برف پر
کل ہماری طرح یہ بھی دھند میں کھو جائیں گے

دن میں دفتر کا قلم ، مل کی مشینیں سب ہیں ہم
رات آئے گی تو پلکوں پہ ستارے آئیں گے

شام تک میلہ ہے پاگل پیڑ پنچھی کس کے میت
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

دل کے ان باغی فرشتوں کو سڑک پر جانے دو
بچ گئے تو شام تک گھر لوٹ کر آ جائیں گے
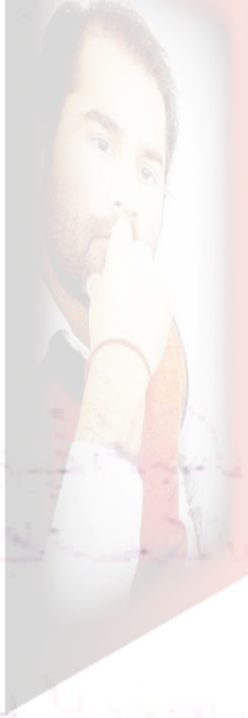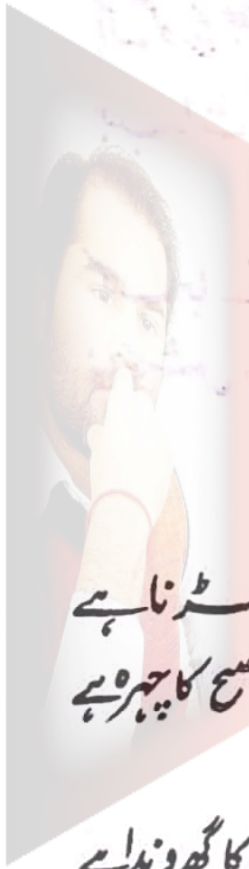
ہر روز ہمیں ملنا ہر روز بچھڑنا ہے
مَیں رات کی پرچھائیں تُو صبح کا چہرہ ہے

عالم کا یہ سب نقشہ بچوں کا گھروندا ہے
اِک ذرّے کے قبضے میں سہمی ہوئی دُنیا ہے

ہمراہ چلو میرے یا راہ سے ہٹ جاؤ
دیوار کے روکے سے دریا کہیں رُکتا ہے

ان کے ہی اشاروں پر یہ رات ملی ہم کو
جن چاند سے چہروں کا سایہ بھی سنہرا ہے

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذات خود آواز کا صحرا ہے

اِک گونج بھٹکتی ہے سنسان پہاڑوں میں
جب رات کے سینے میں دل میرا دھڑکتا ہے

کب جانے ہوا اس کو بکھرا دے فضاؤں میں
خاموش درختوں پر سہما ہوا نغمہ ہے
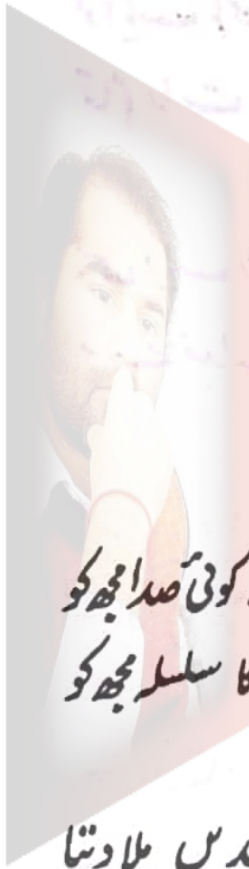
ہوا میں ڈھونڈ رہی ہے کوئی صدا مجھ کو
پکارتا ہے پہاڑوں کا سلسلہ مجھ کو

میں آسماں و زمیں کی حدیں ملا دیتا
کوئی ستارہ اگر جھک کے چومتا مجھ کو

چٹک گئے مرے تلووں سے پھول شیشے کے
زمانہ کھینچ رہا تھا برہنہ پا مجھ کو

وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لئے
بڑھا کے نیزہ زمیں سے اُٹھا لیا مجھ کو

مکان، کھیت، سبھی آگ کی لپیٹ میں تھے
سنہری گھاس میں اس نے چھُپا دیا مجھ کو

تو ایک ہاتھ میں لے آگ ایک میں پانی
تمام رات ہوا میں جلا بجھا دیا مجھ کو

بس ایک رات میں سر سبز یہ زمین ہوئی
مرے خدا نے کہاں تک بچھا دیا مجھ کو
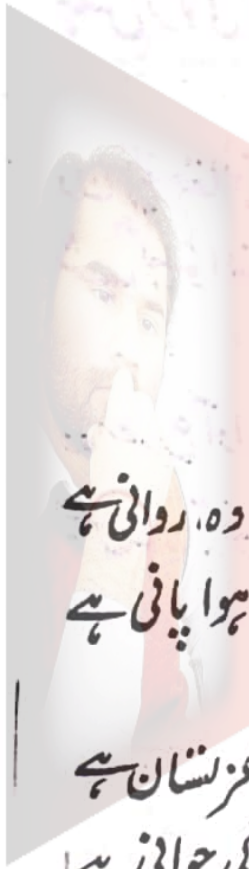
پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

اک ذہن پریشاں میں خواب غزلستان ہے
پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے

دل سے جو چھٹے بادل تو آنکھ میں ساون ہے
ٹھہرا ہوا دریا ہے بہتا ہوا پانی ہے

اے پیرِ خرد منداں دل کی بھی ضرورت ہے
یہ شہرِ غزالاں ہے یہ ملکِ جوانی ہے

غم وجہِ فگارِ دل غم قرارِ دل
آنسو کبھی شیشہ ہے آنسو کبھی پانی ہے

اس حوصلۂ دل پر ہم نے بھی کفن پہنا
ہنس کر کوئی پوچھے گا کیا جان گنوانی ہے

دن تلخ حقائق کے صحراؤں کا سورج ہے
شبِ گیسوئے افسانہ یادوں کی کہانی ہے

وہ مصرعِ آوارہ دیوانوں پہ بھاری ہے
جس میں تیرے گیسو کی بے ربط کہانی ہے

○

ہمارے واسطے یہ چار دن کی شہرت کیا
وہ مل گیا تو کسی اور کی ضرورت کیا

کبھی کبھی تو محبت کا احترام کرو
وہ بے وفا ہے تو پھر بے وفا کی چاہت کیا

گلاب کس لئے لب کو سجائے سرخی سے
ہرن کی آنکھ میں کاجل کی ہے ضرورت کیا

خدایا میری صدی میں بھی معجزہ کر دے
وہ پوچھتے ہیں کہ اس دور میں محبت کیا

میں اپنی خاک اٹھا کر کہاں کہاں گھوموں
ترے بغیر مری زندگی کی قیمت کیا

○

دماغ بھی کوئی مصروف چھاپہ خانہ ہے
وہ شور، جیسے کہ اخبار چھپتا رہتا ہے

ہزاروں تپتے زمیں پر شہید ملتے ہیں
خزاں کی دھوپ میں نیزہ کوئی چمکتا ہے

زمیں نے مانگ لیا آسماں نے چھین لیا
ہمارے پاس نہ اب جسم ہے نہ سایہ ہے

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رک جائے
سڑک پہ چلنے لگے تو ہمارے جیسا ہے

جہاں پہ ملتی نہیں دو کرنیں اس شجر کے تلے
دلائی اوڑھے ہوئے اِک فقیر بیٹھا ہے

○

اپنی جگہ جمے ہے کہنے کو کہہ رہے تھے
سب لوگ ورنہ بہتے دریا میں بہہ رہے تھے

ایسا لگا کہ ہم تم کہرے میں چل رہے ہوں
دو پھول اُونچی نیچی لہروں پہ بہہ رہے تھے

دل اُجلے پاک پھولوں سے بھر دیا تھا کس نے
اس دن ہماری آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے

اکثر شراب پی کر پڑھتی تھی وہ دعائیں
ہم ایک ایسی لڑکی کے ساتھ رہ رہے تھے

اخبار میں تو ایسی کوئی خبر نہیں تھی
جھلیے چکان جھوٹے افسانے کہہ رہے تھے

O

جب سحر چُپ ہو، ہنسا لو ہم کو
جب اندھیرا ہو جلا لو ہم کو

ہم حقیقت ہیں، نظر آتے ہیں
داستانوں میں چھُپا لو ہم کو

دن نہ پا جائے کہیں شب کا راز
صبح سے پہلے اُٹھا لو ہم کو

ہم زمانے کے ستائے ہیں بہت
اپنے سینے سے لگا لو ہم کو

وقت کے ہونٹ ہمیں چھُو لیں گے
اَن کہے بول ہیں گا لو ہم کو

شعلہ گل، گلاب شعلہ کیا
آگ اور پھول کا یہ رشتہ کیا

تم مری زندگی ہو یہ سچ ہے
زندگی کا مگر بھروسہ کیا

کتنی صدیوں کی قسمتوں کا امیں
کوئی سمجھے بساطِ لمحہ کیا

جو نہ آدابِ دشمنی جانے
دوستی کا اُسے سلیقہ کیا

جب کمر باندھ لی سفر کے لئے
دھوپ کیا مینھ کیا ہے سایہ کیا

سب ہیں کردار اِک کہانی کے
ورنہ شیطان کیا فرشتہ کیا

جان کر ہم بشیر بدر ہوئے
اس میں تقدیر کا نوشتہ کیا

جب تک نگارِ دشت کا سینہ دُکھا نہ تھا
صحرا میں کوئی لالۂ صحرا کھِلا نہ تھا

دو جھیلیں اُس کی آنکھوں میں لہرا کے سو گئیں
اس وقت میری عمر کا دریا چڑھا نہ تھا

جاگی نہ تھیں نسوں میں تمنّا کی ناگنیں
اِس گندمی شراب کو جب تک چکھا نہ تھا

اِک بے وفا کے سامنے آنسو بہاتے ہم ؟
اتنا ہماری آنکھ کا پانی مرا نہ تھا

دو کالے ہونٹ۔ جام سمجھ کے چڑھا گئے
وہ آب جس سے میں نے وضو تک کیا نہ تھا

وہ کالی آنکھیں شہر میں مشہور تھیں بہت
تب اُن پہ موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھا نہ تھا

میں صاحبِ غزل تھا حسینوں کی بزم میں
سر پہ گھنیرے بال تھے ماتھا کھُلا نہ تھا

لہو پکارتا ہے روشنی کے پیکر دے
زمینیں چیخ رہی ہیں ہمیں پیمبر دے

یہ کون سیدھا چلا جا رہا ہے بڑھتا ہوا
کوئی چٹان بنے سینہ سامنے کر دے

کہاں سے ذہن میں اِک دم مرے خیال آیا
گلاس خالی ہے اس میں کوئی لہو بھر دے

ذرا سا سر ہے مگر اس میں ایک صحرا ہے
اس طرح مری آواز کو سمندر دے

تمام تاروں کو چھُوتا ہوا گزر جاؤں
کمان بن کے مجھے تیر سا رواں کر دے

اندھیرے کمرے میں سب لوگ اب برہنہ ہیں
کسی کا ہاتھ بڑھے اور روشنی کر دے

کھُلے سے لان میں سب لوگ بیٹھیں چائے پئیں
دُعا کرو کہ خدا ہم کو آدمی کر دے

کسے خبر تھی تجھے اس طرح سجاؤں گا
زمانہ دیکھے گا اور میں نہ دیکھ پاؤں گا

حیات و موت فراق و وصال سب یکجا
میں ایک رات میں کتنے دیئے جلاؤں گا

پلا بڑھا ہوں ابھی تک انہیں اندھیروں میں
میں تیز دھوپ سے کیسے نظر ملاؤں گا

مرے مزاج کی یہ مادرانہ فطرت ہے
سویرے ساری اذیت میں بھول جاؤں گا

تم ایک پیڑ سے وابستہ ہو مگر میں تو
ہوا کے ساتھ بہت دُور دُور جاؤں گا

مرا یہ عہد ہے آج شام ہونے تک
جہاں سے رزق لکھا ہے وہیں سے لاؤں گا

اب ہے ٹوٹا سا دل خود سے بیزار سا
اس حویلی میں لگتا تھا دربار سا

اس طرح ساتھ نبھنا ہے دُشوار سا
میں بھی تلوار سا تو بھی تلوار سا

خُوب صُورت سی پاؤں میں زنجیر ہو
گھر میں بیٹھا رہوں میں گرفتار سا

گڑیا گڈے کو بیچا خریدا گیا
گھر سجایا گیا رات بازار سا

شام تک کتنے ہاتھوں سے گزروں گا میں
چائے خانوں میں اُردو کے اخبار سا

میں فرشتوں کی صحبت کے لائق نہیں
ہمسفر کوئی ہوتا گنہگار سا

بات کیا ہے کے مشہور لوگوں کے گھر
موت کا سوگ ہوتا ہے تیوہار سا

زینہ زینہ اُترتا ہوا آئینہ
اُس کا لہجہ انوکھا کھنک دار سا

وہ علی گڑھ کی شاہیں کہاں کھو گئیں
اب وہ شاعر کہاں ہے طرح دار سا

اپنا رنگِ غزل اُس کے رخسار سا
دل چمکنے لگا ہے رُخِ یار سا

آس ۱۰۸

خوشبو کی طرح آیا وہ تیز ہواؤں میں
مانگا تھا جسے ہم نے دن رات دعاؤں میں

تم چھت پہ نہیں آتے میں گھر سے نہیں نکلا
یہ چاند بہت بھٹکا ساون کی گھٹاؤں میں

اس شہر میں اک لڑکی بالکل ہے غزل جیسی
بجلی سی گھٹاؤں میں خوشبو سی ہواؤں میں

موسم کا اشارہ ہے خوش رہنے دو بچوں کو
معصوم محبت ہے پھولوں کی خطاؤں میں

ہم چاند ستاروں کی راہوں کے مسافر ہیں
ہر رات چمکتے ہیں تاریک خلاؤں میں

بھگوان ہی بھیجیں گے چاول سے بھری تھالی
مظلوم پرندوں کی معصوم سبھاؤں میں

دادا بڑے بھولے تھے سب سے یہ ہی کہتے تھے
کچھ زہر بھی ہوتا ہے انگریزی دواؤں میں
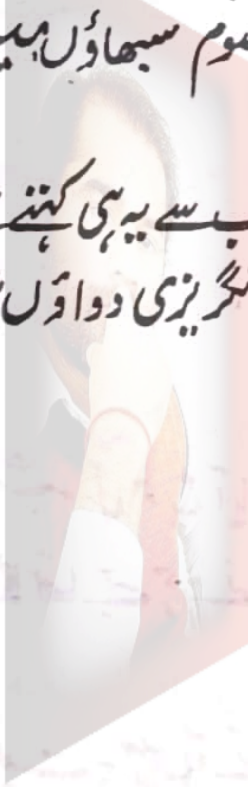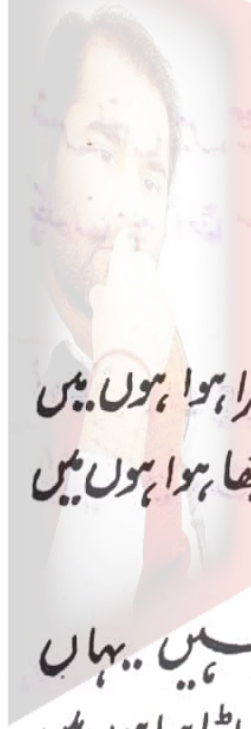
شبنم ہوں۔ سُرخ پھول پہ بکھرا ہوا ہوں میں
دل موم - اور دھوپ میں بیٹھا ہوا ہوں میں

کچھ دیر بعد راکھ ملے گی تمہیں یہاں
لَو بن کے اس چراغ سے لپٹا ہوا ہوں میں

دنیا ہے بے پناہ تو بھر پور زندگی
دو عورتوں کے بیچ میں لیٹا ہوا ہوں میں

دو سخت خشک روٹیاں کب سے لئے ہوئے
پانی کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں میں

لادی اُٹھا کے گھاٹ پہ جانے لگے ہرن
کیسے عجیب دور میں پیدا ہوا ہوں میں

بہتر ہوں لوٹ جاؤں میں اپنی زمین پر
کس آس پر خلاؤں میں لٹکا ہوا ہوں میں

نس نس میں پھیل جاؤں گا بیمار رات کی
پلکوں پہ آج شام سے سمٹا ہوا ہوں میں

اوراق میں چھپاتی تھی اکثر وہ تتلیاں
شاید کسی کتاب میں رکھا ہوا ہوں میں
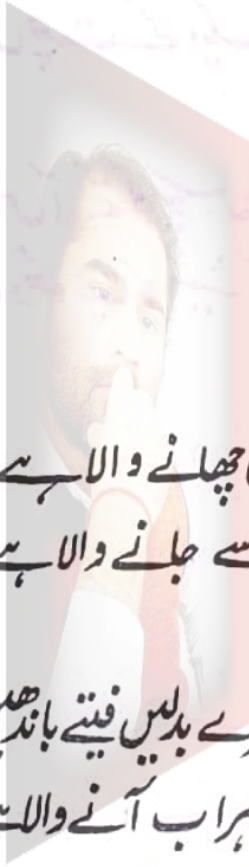
سائے اترے، پنچھی لوٹے، بادل بھی چھانے والا ہے
لیکن میں وہ ٹوٹا تارا جو گھر سے جانے والا ہے

پھر صبح ہوئی آنکھیں کھولیں، کپڑے بدلیں فیتے باندھیں
اس شہر کے بارے میں سوچیں جو شہر اب آنے والا ہے

کل شب اک ویران مسجد میں اس نے میرے آنسو پونچھے
جو ہم سب کی سوکھی شاخوں پر پھول کھلانے والا ہے

ہم ریت کے جلتے ذرّوں کو یہ دُھوپ ہی چمکائے ورنہ
دریا کترانے والا ہے، بادل ترسانے والا ہے

جگنو چمکے تو میں چونکوں، تارا نکلے تو میں سہموں
جیسے ہر کوئی میرے ہی گھر آگ لگانے والا ہے

جس چھپر کے نیچے گاؤں کے بُوڑھے حقّہ پیتے ہیں
اس چھت کے ایک پاگل لڑکا اب آگ لگانے والا ہے

جس آئینے کو برسوں میں تم رکھے پھرتے تھے ٹوٹ گیا
یہ دُھوپ کا شیشہ آنکھوں پر نیزے چمکانے والا ہے

○

قدم جمانا ہے اور سب کے ساتھ چلنا بھی
ہم اپنی راہ کے پتھر ہیں اور دریا بھی

مگر جو فاصلہ پہلے تھا اور بڑھتا گیا
میں اُس کے پاس گیا وہ اِدھر سے گذرا بھی

بہت ذہین و زمانہ شناس تھا لیکن
وہ رات بچوں کی صورت لپٹ کے رویا بھی

یہ خشک شاخ نہ سرسبز ہو سکی اُس نے
مجھے گلے سے لگایا پلک سے چوما بھی

○

چراغ جلنے سے پہلے ہمیں پہنچنا ہے
ڈھکے ہوئے ہے پہاڑوں کو آج کہرا بھی

ہزاروں میل کا منظر ہے اس نگینے میں
ذرا سا آدمی دریا ہے اور صحرا بھی

وہی شرارہ کہ جس سے جھلس گئیں پلکیں
ستارہ بن کے مری رات میں وہ چمکا بھی

اثر وہی ہوا آخر اگرچہ پہلے پہل
ہوا کا ہاتھ گلوں کے بدن پہ پھسلا بھی

انہیں تو حفظ تھے سب اپنے لوگ نام بنام
ہمیں کو یاد نہ آیا کسی کا چہرہ بھی
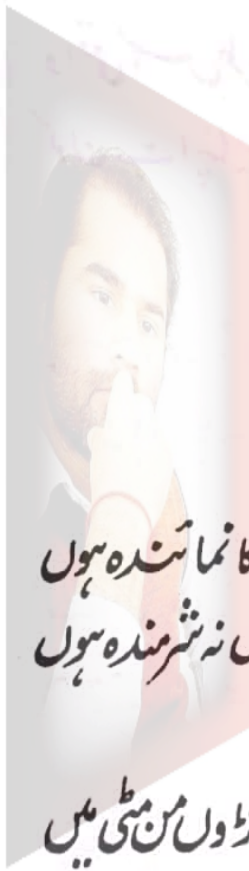
چاند کا ٹکڑا نہ سورج کا نمائندہ ہوں
میں نہ اس بات پہ نازاں ہوں نہ شرمندہ ہوں

دفن ہو جائے گا جو سیکڑوں من مٹی میں
غالباً میں بھی اسی شہر کا باشندہ ہوں

زندگی تو مجھے پہچان نہ پائی لیکن
لوگ کہتے ہیں کہ میں تیرا نمائندہ ہوں

پھول سی قبر سے اکثر یہ صدا آتی ہے
کون کہتا ہے بچالو میں ابھی زندہ ہوں

تن پہ کپڑے ہیں ندامت کی علامت اور میں
سر برہنہ یہاں آجانے پہ شرمندہ ہوں

واقعی اس طرح میں نے کبھی سوچا ہی نہیں
کون ہے اپنا یہاں کس کے لئے زندہ ہوں

○
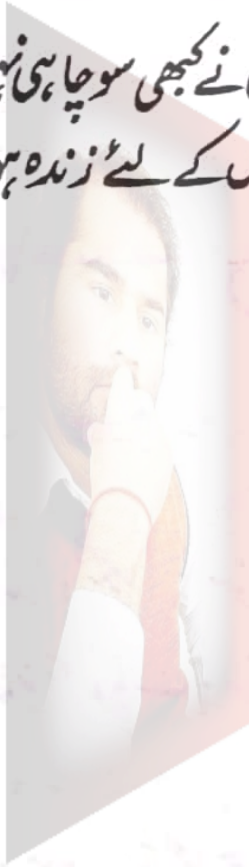
یاد اب خود کو آ رہے ہیں ہم
کچھ دنوں تک خدا رہے ہیں ہم

آرزوؤں کے سُرخ پھولوں سے
دل کی بستی سجا رہے ہیں ہم

آج تو اپنی خامشی میں بھی
تیری آواز پا رہے ہیں ہم

بات کیا ہے کہ پھر زمانے کو
یاد رہ رہ کے آ رہے ہیں ہم

ہر بے زبانِ گُل میں چہکنے لگے ہیں ہم
دولت گئی تو اور مہکنے لگے ہیں ہم

غُربت بُرا نشہ ہے اسی کا اثر نہ ہو
اب بات بات پر جو بہکنے لگے ہیں ہم

مٹی کی باس اپنے بدن کی اسیر تھی
یہ تیرا قُرب ہے کہ مہکنے لگے ہیں ہم

دُنیا سمجھ رہی تھی کہ اب راکھ ہو چکے
کیسی ہوا چلا دی۔ دہکنے لگے ہیں ہم

جن کی زبانیں کٹ گئیں پھُولوں کے نام پر
ان بُلبُلوں کی طرح چہکنے لگے ہیں ہم

ہمہ وقت رنج و ملال کیا جو گزر گیا سو گزر گیا
اسے یاد کر کے نہ دل دکھا جو گزر گیا سو گزر گیا

نہ گلہ کیا، نہ خفا ہوئے یونہی راستے میں جدا ہوئے
نہ تو بے وفا نہ میں بے وفا، جو گزر گیا سو گزر گیا

وہ غزل کی اک کتاب تھا وہ گلوں میں اک گلاب تھا
ذرا دیر کا کوئی خواب تھا جو گزر گیا سو گزر گیا

مجھے پت جھڑوں کی کہانیاں نہ سنا سنا کے اداس کر
تو خزاں کا پھول ہے مسکرا جو گزر گیا سو گزر گیا

وہ اُداس دُھوپ سمیٹ کر کہیں وادیوں میں اُتر چکا
اسے اب نہ دے مرے دل صدا جو گزر گیا سو گزر گیا

یہ سفر بھی کتنا طویل ہے یہاں وقت کتنا قلیل ہے
کہاں لوٹ کر کوئی آئے گا جو گزر گیا سو گزر گیا

وہ وفائیں تھیں کہ جفائیں تھیں نہ یہ سوچ کس کی خطائیں تھیں
وہ ترا ہے اس کو گلے لگا جو گزر گیا سو گزر گیا

کوئی فرق شاہ و گدا نہیں کہ یہاں کسی کی بقا نہیں
یہ اُجاڑ محلوں کی سُن صدا، جو گزر گیا سو گزر گیا

تجھے اعتبار و یقیں نہیں، نہیں دنیا اتنی بری نہیں
نہ ملال کر مرے ساتھ آ جو گزر گیا سو گزر گیا

○

شیشہ بھی آج سرمد و منصور ہو گیا
آئینہ تجھ کو دیکھ کے مغرور ہو گیا

کاغذ میں دب کے مر گئے کیڑے کتاب کے
دیوانہ بے پڑھے لکھے مشہور ہو گیا

محلوں میں ہم نے کتنے ستارے سجا دیئے
لیکن زمیں سے چاند بہت دُور ہو گیا

تنہائیوں نے توڑ دی ہم دونوں کی انا
آئینہ بات کرنے پہ مجبور ہو گیا

دادی سے کہنا اس کی کہانی سنائیے
وہ بادشاہ جو عشق میں مزدور ہو گیا

صبحِ وصال پوچھ رہی ہے عجب سوال
وہ پاس آگیا کہ بہت دُور ہو گیا

کچھ پھل ضرور آئینگے روٹی کے پیڑ میں
جس دن مرا مطالبہ منظور ہو گیا

آہن میں ڈھلتی جائے گی اکیسویں صدی
پھر بھی غزل سنائے گی اکیسویں صدی

بغداد، دلی، ماسکو، لندن کے درمیان
بارود بھی بچھائے گی اکیسویں صدی

جل کر جو راکھ ہو گئیں دنگوں میں اس برس
ان جھگیوں میں آئے گی اکیسویں صدی

اک یاترا ضروری ہے ننانوے کے پاس
رتھ پر سوار آئے گی اکیسویں صدی

تہذیب کے لباس اُتر جائیں گے جناب
ڈالر میں گنگنائے گی اکیسویں صدی

لے جا کے آسمان پہ تاروں کے آس پاس
امریکہ کو گرائے گی اکیسویں صدی

پھر سے خدا بنائے گا کوئی نیا جہاں
دنیا کو یوں مٹائے گی اکیسویں صدی

کمپیوٹروں سے غزلیں لکھیں گے بشیر بدر
غالب کو بھول جائے گی اکیسویں صدی

(فروری ۱۹۹۳)

بشیر بدر کی شاعری حد درجہ مانوس و محسوس جذبوں کی شاعری ہوتے ہوئے بھی، غیر مانوس اور اجنبی جذبوں کی شاعری لگتی ہے۔ کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ ان جذبوں کو عام انسانی سطح پر محسوس تو سب نے کیا ہے لیکن انہیں لفظوں کا پیکر دے کر نطق آشنا کرنے اور جزوِ شاعری بنانے کی توفیق کسی کسی کو ہوئی ہو۔

بشیر بدر کی غزل سنیے اور پڑھیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف شاعر کے دل کی آواز نہیں، ہمارے دل کی بھی آواز ہے لیکن جب حافظے اور مطالعے کی مدد سے پیچھے مڑ کر دیکھیے اور کئی صدیوں پر محیط اُردو غزل کے افق پر نگاہ دوڑائیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے قریب اور سامنے کی باتیں، اب تک ہمارے یہاں ان کہی رہ گئی تھیں۔ مانوس اجنبیت کا یہی اچانک پن اور غیر مانوس اپنائیت کا یہی چونکا دینے والا بانکپن بشیر بدر کی غزل کا خاص نشان ہے۔

بالکل اسی طرح کا نیاپن اور ذائقہ اب سے چالیس سال پہلے، اُردو غزل کو فراق گھورکھپوری کے لہجے نے دیا تھا۔ فراق کا یہ نیاپن اور ذائقہ ہندو کلچر اور مسلم ثقافت کی باہم پیوستگی پر مغربی خیالات کی صیقل سے عبارت تھا۔ بشیر بدر نے اس میں تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی معاشرتی و تہذیبی زندگی کا رس گھولا، ارضیت و مقامیت کے نئے رنگ بھر کر، اور جدیدیت کے نام پر ابھرتی ہوئی شعری روایت سے منسلک کر کے، اُردو غزل کو ایک اور تازہ لہجہ دے دیا۔ ایسا لہجہ جو اس وقت بشیر بدر کی پہچان بھی ہے اور اُردو غزل کا مان بھی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری
مدیرِ اعلیٰ و معتمد
اُردو لغت بورڈ
وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان

بیک نظر

نام : سید محمد بشیر　　تخلص : بدؔر

تعلیم : ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی (علیگ)

تعلیمی امتیازات :۔

(۱) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین کی ادارت۔ ۱۹۶۹ء میں غالب نمبر ترتیب دیا جسے یونیورسٹی نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

(۲) ایم۔ اے (پریویس) میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام مضامین کے ایم۔ اے (پریویس) کے طلبا میں اوّل رہنے پر سر ولیم مارس اسکالرشپ ملا۔

(۳) ایم۔ اے (اردو) میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن لانے پر یونیورسٹی گولڈ میڈل اور سارے مضامین کے ٹاپرس میں فرسٹ رہنے پر "رادھا کرشنن" پرائز ملا۔

انعامات : اکائی (غزلوں کا پہلا مجموعہ) پر اردو اکیڈمی یوپی کا انعام ۱۹۶۹ء

امیج (غزلوں کے دوسرے مجموعے) پر اردو اکیڈمی یوپی کا انعام ۱۹۷۳ء۔

آمد (غزلوں کا تیسرا مجموعہ) پر اردو اکیڈمی یوپی کا انعام ۱۹۸۵ء

آمد (غزلوں کا تیسرا مجموعہ) پر بہار اکیڈمی کا انعام ۱۹۸۶ء

سفر : پاکستان (دو بار)

کناڈا (ایک بار)

امریکہ (تین بار)

دبئی، شارجہ، ابوظہبی، بحرین، مسقط، دوہا (قطر)

فرائض اور امتیازات :

(۱) ممبر ساہتیہ اکاڈمی، ہند (دہلی)

(۲) رکن مجلس انتظامیہ اور مجلس عاملہ اردو اکیڈمی لکھنؤ۔

(۳) رکن مجلس انتظامیہ ترقی اردو بورڈ (مرکزی حکومت ہند) دہلی۔

(۴) صدر، بورڈ آف سٹڈیز، ریسرچ ڈگری کمیٹی، میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ۔

(۵) اکسپرٹ، انعامی کمیٹی، ہماچل پردیش اکاڈمی۔

(۶) ممبر، بورڈ آف سٹڈیز کروکشیتر یونیورسٹی۔

آسمان
الحمد لائبریری
فیس بک
گروپ
کتابیں
پڑھیے
بشیر بدر
سید حسین احسن
حسامی بک ڈپو
مچھلی کمان، حیدر آباد-۲ (اے، پی)

نام کتاب : آسمان

مصنف : بشیر بدر

مرتب : حبیب احمد و اقبال مسعود

اشاعت : فروری ۱۹۹۳ء

تعداد : [illegible]

طباعت : اسپیڈ پرنٹس سعید آباد، حیدرآباد

ناشر : حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد-۲ (اے پی)

انتساب

اپنی شریکِ زندگی
ڈاکٹر راحت بدر
کے نام

مرے ساتھ چلنے والے تجھے کیا ملا سفر میں
وہی دکھ بھری زمیں ہے وہی غم کا آسماں ہے

غزل بھی اس طرح اس کے حضور لایا ہوں
کہ جیسے بچہ کوئی آئے امتحاں کے لئے

بشیر بدر کی غزلوں کے مجموعے

امیج

آمد

آس

ترتیب

سفر میں
آسماں ہے

حمد و نعت ﷺ

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

مجھے ایسی جنّت نہیں چاہیئے
جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے

مجھے اپنی چادر میں یوں ڈھانپ لو
زمیں آسماں کچھ دکھائی نہ دے

بس اشکوں سے نامِ محمد ﷺ لکھوں
قلم چھین لے، روشنائی نہ دے

غلامی کو برکت سمجھنے لگیں
اسیروں کو ایسی رہائی نہ دے

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

○

سر سے پا تک وہ گلابوں کا شجر لگتا ہے
باوضو ہو کے بھی چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے

میں ترے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں
کتنا آساں محبت کا سفر لگتا ہے

مجھ میں رہتا ہے کوئی دشمن جانی میرا
خود سے تنہائی میں ملتے ہوئے ڈر لگتا ہے

بُت بھی رکھے ہیں، نمازیں بھی ادا ہوتی ہیں
دل مرا دل نہیں، اللہ کا گھر لگتا ہے

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

○

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

تمام رشتوں کو میں گھر پہ چھوڑ آیا تھا
پھر اس کے بعد مجھے کوئی اجنبی نہ ملا

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں میں نے
بس ایک شخص کو مانگا مجھے وہی نہ ملا

بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دُوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا اور مجھے کبھی نہ ملا

۱۰

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

اور جام ٹوٹیں گے اس شراب خانے میں
موسموں کے آنے میں موسموں کے جانے میں

ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

فاختہ کی مجبوری یہ بھی کہہ نہیں سکتی
کون سانپ رکھتا ہے اس کے آشیانے میں

دوسری کوئی لڑکی زندگی میں آئے گی
کتنی دیر لگتی ہے اُس کو بھول جانے میں

○

ہمارے ہاتھوں میں اِک شکل چاند جیسی تھی
تمہیں یہ کیسے بتائیں وہ رات کیسی تھی

مہک رہے تھے مرے ہونٹ اس کی خوشبو سے
عجیب آگ تھی بالکل گُلاب جیسی تھی

اسی میں سب تھے مری ماں، بہن بھی، بیوی بھی
سمجھ رہا تھا جسے میں وہ ایسی ویسی تھی

تمہارے گھر کے سبھی راستوں کو کاٹ گئی
ہمارے ہاتھ میں کوئی لکیر ایسی تھی

میں خزاں کی دھوپ کا آئینہ کہ میں ایک ہو کے ہزار ہوں
کہیں آنسوؤں کا ہوں قافلہ کہیں جگنوؤں کی قطار ہوں

کوئی تارہ ٹوٹ کے گر گیا کوئی چاند چھت سے اتر گیا
کسی آسمان کی چال سے جو بکھر گیا وہی ہار ہوں

وہی سوکھے سوکھے سے پیڑ ہیں وہی اجڑی اجڑی سی ٹہنیاں
کوئی پھول جس پہ کھلا نہیں میں غموں کی ایسی بہار ہوں

مجھے کیوں بلاتے ہیں پیار سے یہ چہکتے پنچھی منڈیر کے
میں خموشی کا درد ہوں میں اداس چاند کا پیار ہوں

میں وہ شعر ہوں جسے آج تک نہ کہا گیا نہ سنا گیا
جسے انگلیوں نے چھوا نہیں وہی بدنصیب ستار ہوں

ہر اِک چراغ کی لَو ایسی سوئی سوئی تھی
وہ شام جیسے کسی سے بچھڑ کے روئی تھی

نہا گیا تھا میں کل جگنوؤں کی بارش میں
وہ میرے کاندھے پہ سر رکھ کے خُوب روئی تھی

قدم قدم پہ لہُو کے نشان کیسے ہیں
یہ سر زمین تو میرے آنسوؤں نے دھوئی تھی

مکان کے ساتھ وہ پودا بھی جل گیا جس میں
مہکتے پھُول تھے پھولوں میں ایک تتلی تھی

خود اُس کے باپ نے پہچان کر نہ پہچانا
وہ لڑکی پچھلے فسادات .. میں جو کھوئی تھی

دل کی دہلیز پہ یادوں کے دیئے رکھے ہیں
آج تک ہم نے یہ دروازے کھلے رکھے ہیں

اس کہانی کے وہ کردار کہاں سے لاؤں
وہی دریا ہے وہی کچے گھڑے رکھے ہیں

ہم پہ جو گذری نہ بتایا نہ بتائیں گے کبھی
کتنے خط اب بھی ترے لکھے رکھے ہیں

آپ کے پاس خریداری کی قوت ہے اگر
آج سب لوگ دکانوں میں سجے رکھے ہیں

ٹوٹے ہوئے ستار کے سب تار کس گئے
بارش ہوئی کہ درد کے نغمے برس گئے

کیسی سیاہ رات تھی دہلیز پر کھڑی
وہ مسکرا دیئے تو اُجالے برس گئے

شادابیوں کے دَور کا انجام یہ ہوا
اب کے تو بوند بوند کو دریا ترس گئے

اب خاک اُڑ رہی ہے گلابوں کے شہر میں
وہ لُو چلی ہے اب کے کہ پتّھر جھلس گئے

گھر سے خلوص کیا گیا سب کچھ چلا گیا
باتوں میں رس نہیں رہا ہاتھوں کے مَس گئے

عالم میں انتخاب تھے کچھ لوگ شہر میں
کوئی تو کچھ بتائے کہاں جا کے بس گئے
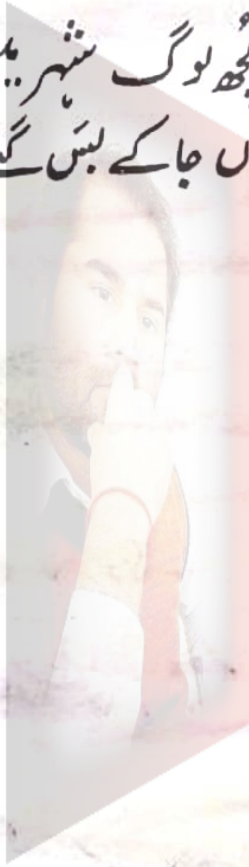
اگر یقیں نہیں آتا تو آزمائے مجھے
وہ آئینہ ہے تو پھر آئینہ دکھائے مجھے

عجب چراغ ہوں دن رات جلتا رہتا ہوں
میں تھک گیا ہوں ہوا سے کہو بُجھائے مجھے

میں جس کی آنکھ کا آنسو تھا اس نے قدر نہ کی
بکھر گیا ہوں تو اب ریت سے اُٹھائے مجھے

بہت دنوں سے میں ان پتھروں میں پتھر ہوں
کوئی تو آئے ذرا دیر کو رُلائے مجھے

میں چاہتا ہوں کہ تم ہی مجھے اجازت دو
تمہاری طرح سے کوئی گلے لگائے مجھے

○

کوئی حل نہ کوئی جواب ہے یہ سوال کیسا سوال ہے
جسے بھول جانے کا حکم ہے اسے بھول جانا محال ہے

ہوئیں زرد پھولوں کی بستیاں مگر اس میں تیری خطا کہاں
تجھے لوگ دل سے دعائیں دیں یہی تیرے فن کا کمال ہے

کبھی آسماں کی بلندیوں سے اتر کے خاک پہ آئیں گے
ابھی پنچھیوں کو خبر نہیں یہ زمین والوں کا جال ہے

ابھی سبز پیڑ کی اوٹ میں ابھی چاند ہار کے سو گیا
ترے پاک ہونٹوں کو چوم لے یہ کہاں کسی کی مجال ہے

اسی ایک بسترِ بے حسی پہ تھکے سے بدن ملے
ترے ساتھ بھی وہی بے دلی یہ وصال کیسا وصال ہے

وہ گنہگار مرے حق میں دعا کر دیتا
میرے سوکھے ہوئے جنگل کو ہرا کر دیتا

کاش وہ آتا مرے ماتھے کے بوسے لیتا
میں ہوں بیمار مرے حق میں دعا کر دیتا

یوں بھی تبدیل بہاروں میں خزاں ہو جاتی
اپنے دامن سے وہ چہرے پہ ہوا کر دیتا

یہ جو بے عیب ہیں تا عمر ترستے رہتے
مجھ کو ایسی کوئی تا عمر سزا کر دیتا

منہ چھپا لیتا، یہ سورج بھی کسی دامن میں
ایسے لہرا کے وہ زُلفوں کی گھٹا کر دیتا

یہ کوئی غم ہے کہ آسائشِ دنیا کم ہے
بے نیازی ہیں مجھے حد سے رسوا کر دیتا

ایک مدت سے یہ ہمراہ رہا کرتی ہیں
رنجشیں کوئی مرے دل سے جُدا کر دیتا

دُلہن بنی ہے رات بڑے اہتمام سے
آنسو سجا رہی ہے ستاروں کے نام سے

سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے
نیند آ گئی ہے آج ستاروں کو شام سے

اُن سے ضرور ملنا سلیقے کے لوگ ہیں
سر بھی قلم کریں گے بڑے احترام سے

کتنا بدل گیا ہوں میں دُنیا کے واسطے
آواز دے رہی ہے مجھے تیرے نام سے

وہ انتظار کی چوکھٹ پہ سو گیا ہوگا
کسی سے وقت تو پوچھیں کہ کیا بجا ہوگا

میں ہنس رہا ہوں لطیفوں کی شعری محفل میں
وہ میری آنکھوں سے اس وقت رو رہا ہوگا

یہ پتھروں کی طرح کیوں اُداس رہتا ہے
مجھے یقین ہے دل اس کا آئینہ ہوگا

میں اس خیال سے اُس کے قریب آیا تھا
کہ دوسروں کی طرح وہ بھی بے وفا ہوگا

وہ بجھے گھروں کا چراغ تھا یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو
اُسے لے گئی ہے کہاں ہوا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

کئی لوگ جان سے جائیں گے مرے قاتلوں کی تلاش میں
مرے قتل میں مرا ہاتھ تھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

وہ تمام دُنیا کے واسطے جو محبتوں کی مثال تھا
وہی اپنے گھر میں تھا بے وفا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

کہیں مسجدوں میں شہادتیں، کہیں مندروں میں عدالتیں
یہاں کون کرتا ہے فیصلہ یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مرے پاس جتنی ہے روشنی ہے یہی چراغ کی زندگی
میں کہاں جلا، میں کہاں بجھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مجھے جان کر کوئی اجنبی وہ دکھا رہے ہیں گلی گلی
اسی شہر میں مرا گھر بھی تھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

وہ سمجھ کے دھوپ کے دیوتا مجھے آج پوجنے آئے ہیں
میں چراغ ہوں تری شام کا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

○

کون آیا راستے آئینہ خانے ہو گئے
رات روشن ہو گئی دن بھی سُہانے ہو گئے

کیوں حویلی کے اُجڑنے کا مجھے افسوس ہو
سینکڑوں بے گھر پرندوں کے ٹھکانے ہو گئے

جاؤ اِن کمروں کے آئینے اٹھا کر پھینک دو
بے ادب یہ کہہ رہے ہیں ہم پُرانے ہو گئے

یہ بھی ممکن ہے کہ میں نے اس کو پہچانا نہ ہو
اب اسے دیکھے ہوئے کتنے زمانے ہو گئے

میری پلکوں پر یہ آنسو پیار کی توہین تھے
اس کی آنکھوں سے گرے موتی کے دانے ہو گئے

عظمتیں سب تری خدائی کی
حیثیت کیا مری اِکائی کی

میرے ہونٹوں کے پھول سوکھ گئے
تم نے کیا مجھ سے بے وفائی کی

سب مرے ہاتھ پاؤں لفظوں کے
اور آنکھیں بھی روشنائی کی

میں ہی ملزم ہوں، میں ہی منصف ہوں
کوئی صورت نہیں رہائی کی

اِک برس زندگی کا بیت گیا
تہہ جمی ایک اور کائی کی

اب ترستے رہو غزل کے لئے
تم نے لفظوں سے بے وفائی کی

○

خاندانی رشتوں میں اکثر رقابت ہے بہت
گھر سے نکلو تو یہ دنیا خوب صورت ہے بہت

اپنے کالج میں بہت مغرور جو مشہور ہے
دل مرا کہتا ہے اُس لڑکی میں چاہت ہے بہت

اُن کے چہرے چاند تاروں کی طرح روشن رہے
جن غریبوں کے یہاں حُسنِ قناعت ہے بہت

ہم سے ہو سکتی نہیں دُنیا کی دُنیاداریاں
عشق کی دیوار کے سائے میں راحت ہے بہت

دُھوپ کی چادر مِرے سُورج سے کہنا بھیج دے
غُربتوں کا دور ہے جاڑوں کی شدّت ہے بہت

اُن اندھیروں میں جہاں سہمی ہوتی تھی یہ زمیں
رات سے تنہا لڑا جگنو میں ہمت ہے بہت

○

تیر نظروں کے تو پلکوں کی کماں رکھے ہیں
اُن کی کیا بات ہے پھولوں کی زباں رکھے ہیں

ہم تو آنکھوں میں سنورتے ہیں وہیں سنوریں گے
ہم نہیں جانتے آئینے کہاں رکھے ہیں

اپنے قاتل بھی اسی روز سے شرمندہ ہیں
ہم بھی خاموش بہت اپنی زباں رکھے ہیں

دل کبھی ریت کا ساحل نہیں ہونے دیتے
ہم نے محفوظ وہ قدموں کے نشاں رکھے ہیں

جن پہ تحریر ہے بچپن کی محبت اپنی
اب مرے گھر کے وہ دروازے کہاں رکھے ہیں

یہ زمین سوئی ہُوئی تھی نیند میں یہاں لا کے مُجھ کو بسا گئے
وہ چمکتی دُھوپ کی شال پر مرے دل کے پھُول سجا گئے

کسی رات برف کی اوٹ سے نئی آگ لے کے وہ آئیں گے
اگر آج دُھوپ کی گود میں وہ گلاب اپنے سُلا گئے

کئی لوگ آگ کے پھُول ہیں ذرا دُور ہوں تو چمن چمن
جہاں مُسکرا کے گلے لگے دل و جاں میں آگ لگا گئے

یہ ہنسی بھی کوئی نقاب ہے جہاں چاہا ہم نے گرا لیا
کبھی اُس کا درد چھپا گئے کبھی اپنا درد چھپا گئے

وہاں سات چولہے، انگیٹھیاں، بجھے مرد عورتیں بچیاں
جہاں شام آئی تو سات گھر اسی ایک گھر میں سما گئے

مرے دائیں ہاتھ کی انگلیاں تو اندھیری رات کی شمعیں ہیں
یہ بدن تمام ہے موم کا وہ اسی لئے تو جلا گئے

کئی راج محلوں کے راجکماری لئے سانٹھ میووں کی برفیاں
کبھی آج تک جو بنی نہیں اسی مورتی پہ چڑھا گئے

ابھی رات پھولوں کی کار میں یہاں ایک آئے تھے پیر جی
ہمیں بعد مرگ ملے گا کیا وہ تمام نقشے دکھا گئے

○

کئی پیڑ دھوپ کے پیڑ تھے تری رحمتوں سے ہرے رہے
مرے نام آگ کے پھول تھے مری جھولیوں میں بھرے رہے

کہیں مال و زر کے وزیر تھے کہیں علم و فن کے امیر تھے
ولے ہم بھی ایسے فقیر تھے جو ہمیشہ ان سے پرے رہے

مرے دل میں درد کے پیڑ ہیں یہاں کوئی خوفِ خزاں نہیں
یہ درخت کتنے عجیب تھے سبھی موسموں میں ہرے رہے

وہ کلام جن سے چھتیں اُڑیں وہیں شامیانوں میں دفن ہیں
ترے شعر دل میں اُتر گئے جو کھرے تھے سکّے کھرے رہے

○

میں کب تنہا ہوا تھا، یاد ہوگا
تمہارا فیصلہ تھا، یاد ہوگا

بہت سے اُجلے اُجلے پھول لے کر
کوئی تم سے ملا تھا، یاد ہوگا

بچھی تھیں ہر طرف آنکھیں ہی آنکھیں
کوئی آنسو گرا تھا، یاد ہوگا

اُداسی اور بڑھتی جا رہی تھی
وہ چہرہ بجھ رہا تھا، یاد ہوگا

وہ خط پاگل ہوا کے آنچلوں پر
کسے تم نے لکھا تھا، یاد ہوگا

○

مری زباں پہ نئے ذائقوں کے پھل لکھ دے
مرے خدا تو مرے نام اِک غزل لکھ دے

میں چاہتا ہوں یہ دنیا وہ چاہتا ہے مجھے
یہ مسئلہ بڑا نازک ہے کوئی حل لکھ دے

یہ آج جس کا ہے اُس نام کو مبارک ہو
مری جبیں پہ مرے آنسوؤں سے کل لکھ دے

ہوا کی طرح میں بیتاب ہوں کہ شاخِ گلاب
جو ریگزار دل پہ تالاب کے کنول لکھ دے

میں ایک لمحے میں دنیا سمیٹ سکتا ہوں
تو کب ملے گا اکیلے میں ایک پل لکھ دے

دروازے کی راکھ بھی گھر ہے مٹی میں یہ گھر رکھنا
دل اک پاکیزہ چادر ہے سر پر یہ چادر رکھنا

جلی ہوئی ٹوٹی دیواریں میرے زخمی کاندھے ہیں
چاندنی رات میں چھپ کر آنا اِن پر اپنا سر رکھنا

جس کاغذ پر حال لکھوں گا وہ کاغذ جل جائے گا
تتلی پر تیزاب چھڑکنا پھولوں پر خنجر رکھنا

صندل اور سیندور سے مانگ سدا رہے تاروں کی لڑی
رہے کلائی یوں ہی کھنکتی، مالک یہ زیور رکھنا

اس دھرتی سے پیار کیا تھا، پیار کیا ہے پیار کروں گا
میں جب جاؤں مرے تن پر ماٹی کی چادر رکھنا

اپنی کھوئی ہوئی جنّتیں پا گئے زیست کے راستے بھولتے بھولتے
موت کی وادیوں میں کہیں کھو گئے تیری آواز کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے

مست و سرشار تھے کوئی ٹھوکر لگی آسماں سے زمیں پر یوں ہم آ گئے
شاخ سے پھول جیسے کوئی گر پڑے رقص آواز پر جھومتے جھومتے

کوئی پتھر نہیں ہوں کہ جس شکل میں مجھ کو چاہو بنایا بگاڑا کرو
بھول جانے کی کوشش تو کی تھی مگر یاد تم آ گئے بھولتے بھولتے

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انہیں کچھ ہنسی آ گئی، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

اب وہ گیسو نہیں ہیں جو سایہ کریں اب وہ شانے نہیں جو سہارا بنیں
موت کے بازوؤ تم ہی آگے بڑھو تھک گئے آج ہم گھومتے گھومتے

دل میں جو تیر ہیں اپنے ہی تیر ہیں، اپنی زنجیر سے پا بہ زنجیر ہیں
سنگریزوں کو ہم نے خدا کر دیا آخرش، رات دن پوجتے پوجتے

○

میں تم کو بھول بھی سکتا ہوں اس جہاں کے لئے
ذرا سا جھوٹ ضروری ہے داستاں کے لئے

مرے لبوں پہ کوئی بوند ٹپکی آنسو کی
یہ قطرہ کافی تھا جلتے ہوئے مکاں کے لئے

میں کیا دکھاؤں مرے تار تار دامن میں
نہ کچھ یہاں کے لئے ہے نہ کچھ وہاں کے لئے

غزل بھی اس طرح اس کے حضور لایا ہوں
کہ جیسے بچّہ کوئی آئے امتحاں کے لئے

○

بے خبر کرسیاں آنکھ ملتی رہیں
بستیاں بے گناہوں کی جلتی رہیں

آدمیت، محبّت، شرافت، وفا
ناگنیں آستینوں میں پلتی رہیں

دو بدن جتنے نزدیک ہوتے گئے
قربتیں فاصلوں میں بدلتی رہیں

جب مری زندگی میں اندھیرا ہوا
مرے چاروں طرف شمعیں جلتی رہیں

زہر پانی بنا مچھلیوں کے لئے
پنچھیوں کو ہوائیں مسلتی رہیں

زندگی تیری نازک بدن لڑکیاں
آگ کی شاہراہوں پہ چلتی رہیں

مُسکراتے رہے غم چھُپاتے رہے ، محفلوں محفلوں گنگناتے رہے
موت کے تیرہ و تار شمشان میں ، زندگی کے کنول جگمگاتے رہے

غزلیں کمھلا گئیں نظمیں مُرجھا گئیں ، گیت سنولا گئے ، ساز چُپ ہو گئے
پھر بھی اہلِ چمن کتنے خوش طبع تھے ، نغمۂ فصلِ گل گنگناتے رہے

تیری سانسوں کی خوشبو ، لبوں کی مہک جانے کیسے ہوائیں اُڑا لائی تھیں
رات کا ہر قدم کچھ بہکتا رہا ، وقت کے پاؤں بھی ڈگمگاتے رہے

جیسے کشمیری جھیلوں کی آغوش میں ننھے ننھے ستارے اُتر آئے ہوں
رات اُن نیلی آنکھوں میں کچھ ایسے ہی آنسوؤں کے دیئے جھلملاتے رہے

شاہدِ زندگی تو نے بھُولے سے بھی ہم غریبوں کی جانب نہ دیکھا کبھی
اور ہم تو تری عظمتوں کے لئے سر کٹاتے رہے جاں گنواتے رہے

ترے لب کی مہک میرے بازو کا بَل تیری آنکھوں کا رس میرے ہاتھوں کا حسن
سالہا سال سے جنسِ بازار ہیں صاحبِ نقد بولی لگاتے رہے

رات موسم بہت فتنہ انگیز تھا، اس پہ یادوں کی زُلفیں بھی لہرا گئیں
دیر تک دل سے تیری ہی باتیں رہیں بھُولی بسری کہانی سناتے رہے

○

سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہو جائے گا
اتنا مت چاہو اسے وہ بیوفا ہو جائے گا

ہم بھی دریا ہیں ہمیں اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف بھی چل پڑیں گے راستہ ہو جائے گا

کتنی سچائی سے مجھ سے زندگی نے کہہ دیا
تو نہیں میرا تو کوئی دوسرا ہو جائے گا

میں خدا کا نام لے کر پی رہا ہوں دوستو
زہر بھی اس میں اگر ہو گا، دوا ہو جائے گا

سب اُسی کے ہیں ہوا، خوشبو، زمین و آسماں
میں جہاں بھی جاؤں گا اس کو پتہ ہو جائے گا

غزلوں کا ہُنر اپنی آنکھوں کو سکھائیں گے
روئیں گے بہت لیکن آنسو نہیں آئیں گے

کہہ دینا سمندر سے ہم اوس کے موتی ہیں
دریا کی طرح تجھ سے ملنے نہیں آئیں گے

وہ دھوپ کے چھپّر ہوں یا چھاؤں کی دیواریں
اب جو بھی اُٹھائیں گے مل جُل کے اُٹھائیں گے

جب ساتھ نہ دے کوئی آواز ہمیں دینا
ہم پھول سہی لیکن پتھّر بھی اُٹھائیں گے

○

چاند کے چاروں طرف میلی ردائیں ساتھ ہیں
خاک اتنی سر چڑھے کس کی ہوائیں ساتھ ہیں

ایک عورت سے وفا کرنے کا یہ تحفہ ملا
جانے کتنی عورتوں کی بد دُعائیں ساتھ ہیں

انگلیاں میری ستاروں تک پہنچ سکتی نہیں
مُٹّھیوں میں جگنوؤں کی بد دُعائیں ساتھ ہیں

دن کِھلا ہے پھُول سا اور رات بھیگی آنکھ سی
کوئی موسم ہو یہاں دونوں ہوائیں ساتھ ہیں

میں ہوں اِک کاغذ کا ٹکڑا جانے کس کی کھوج میں
کیوں مرے پیچھے زمانے کی ہوائیں ساتھ ہیں

○

بس اُداس رستہ ہوں شام کا تری آہٹوں کی تلاش ہے
یہ ستارے سب ہیں بُجھے بُجھے مجھے جگنوؤں کی تلاش ہے

ذرا صبر کرنے کو آئے ہیں ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے
وہ ہیں ڈور کانٹے لئے ہوئے جنہیں مچھلیوں کی تلاش ہے

وہ جو ایک دریا تھا آگ کا سبھی راستوں سے گذر گیا
تمہیں کب سے ریت کے شہر میں نئی بارشوں کی تلاش ہے

نئے موسموں کی اُڑان کو ابھی اس کی کوئی خبر نہیں
ترے آسماں کے جال کو نئے پنچھیوں کی تلاش ہے

مرے دوستوں نے سکھا دیا مجھے اپنی جان سے کھیلنا
مری زندگی تجھے کیا خبر مجھے قاتلوں کی تلاش ہے

تری میری ایک ہیں منزلیں، وہی جستجو، وہی آرزو
تجھے دوستوں کی تلاش ہے مجھے دشمنوں کی تلاش ہے

میں غزل کہوں میں غزل پڑھوں مجھے دے تُو حُسنِ خیال دے
ترا غم ہی ہے مری تربیت، مجھے دے تو رنج و ملال دے

سبھی چار دن کی ہیں چاندنی یہ ریاستیں یہ وزارتیں
مجھے اُس فقیر کی شان دے کہ زمانہ جس کی مثال دے

مری صُبح تیرے سلام سے مری شام ہے تیرے نام سے
ترے در کو چھوڑ کے جاؤں گا یہ خیال دل سے نکال دے

مرے سامنے جو پہاڑ تھے سبھی سر جُھکا کے چلے گئے
جسے چاہے تو یہ عُروج دے جسے چاہے تو یہ زوال دے

بڑے شوق سے انہیں پتّھروں کو شکم سے باندھ کے سو رہوں
مجھے مالِ مُفت حرام ہے مجھے دے تو رزقِ حلال دے

ایسا نغمہ ہیں جس میں صدا تک نہیں، ایسی آندھی ہیں جس میں ہوا تک نہیں
زندگی کی طرح جاوداں بیکراں، اتنے مجبور جتنی فضا تک نہیں

چلئے "مضمونوں کے نوٹس اور ترجمے، اُجلے شوکیس میں سج گئے ٹھیک ہے
کیوں دوکان دار رکھے کتابِ ادب، جب اسے اب کوئی پُوچھتا تک نہیں

اِک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موج رواں
آج دو ریل کی پٹڑیوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

لکڑیوں سے تراشی ہوئی لڑکیاں ٹین کے نوجواں، مختلف رنگ میں
دوست ہیں، دوستی سے مگر بے خبر، دشمنِ جاں ہیں لیکن خفا تک نہیں

زعفراں رنگ کے گیسوؤں کی گھٹا آسماں رنگ کے کوٹ پر چھا گئی
نرم بادوں کے اُجلے فرشتوں کے پر، دودھیا خامشی اور ہوا تک نہیں

روشنی کے مقدّر میں نیندیں کہاں چاند میں، طاق پر وہ سجائیں کہیں
ہم چراغِ وفا، جلنا ہے رات بھر آسمان تا زمیں وہ جلائیں کہیں

دو بھٹکتی ہوئی رُوحیں جیسے ملیں یُوں ملیں وہ نگاہیں مگر خوف ہے
زیست ہے رات میں جنگلوں کا سفر اس جنم میں بھی ہم کھو نہ جائیں کہیں

شُہرتیں مثلِ مینارِ عظمت ہمیں آسماں کی طرف لے چلی ہیں مگر
جی میں ہے سبز پیغمبروں کی طرح سینۂ سنگ سے سر اٹھائیں کہیں

برف سی اُجلی پوشاک پہنے ہوئے، پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہیں
وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

کوئی کُتبہ نہیں ہیں سرِ راہ ہم جس پہ اقوالِ زرّیں بدلتے رہو
ہم تو آنسو ہیں پلکوں پہ رکھ لو ہمیں جب اشارہ کرو ٹوٹ جائیں کہیں
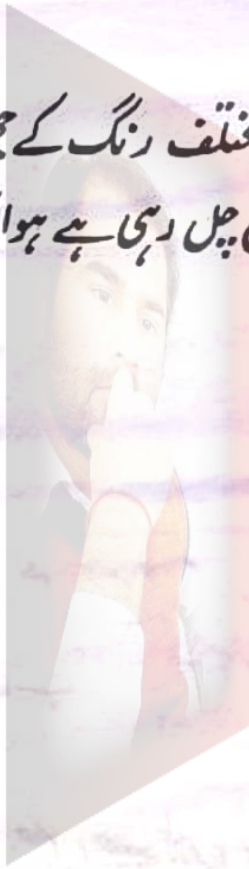
اَن کہے شعر ہیں وادئ ذہن میں مختلف رنگ کے جھلملاتے دیئے
دستِ الفاظ محفوظ کر لے انہیں چل رہی ہے ہوا بُجھ نہ جائیں کہیں

ادب کی حد میں ہُوں میں بے اَدب نہیں ہوتا
تمہارا تذکرہ اب روز و شب نہیں ہوتا

کبھی کبھی تو چھلک پڑتی ہیں یُونہی آنکھیں
اُداس ہونے کا کوئی سبب نہیں ہوتا

کئی امیروں کی محرُومیاں نہ پُوچھ کہ بس
غریب ہونے کا احساس اَب نہیں ہوتا

میں والدین کو یہ بات کیسے سمجھاؤں
محبتوں میں حسب و نسب نہیں ہوتا

وہاں کے لوگ بڑے دلفریب ہوتے ہیں
مرا بہکنا بھی کوئی عجب نہیں ہوتا

میں اس زمین کا دیدار کرنا چاہتا ہوں
جہاں کبھی بھی خدا کا غضب نہیں ہوتا
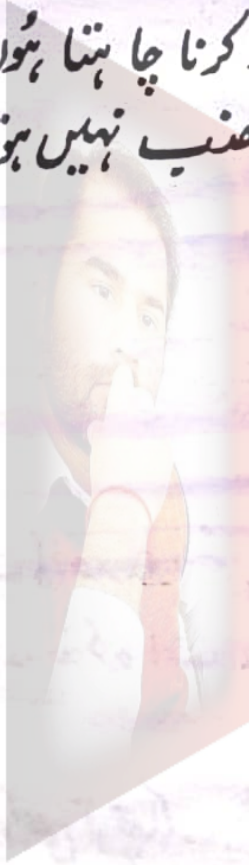
تیرا ہاتھ مرے کاندھے پر دریا بہتا جاتا ہے
کتنی خاموشی سے دکھ کا موسم گزرا جاتا ہے

نیم پہ اٹکے چاند کی پلکیں شبنم سے بھر جاتی ہیں
سونے گھر میں رات گئے جب کوئی آتا جاتا ہے

پہلے اینٹیں، پھر دروازے اب کے چھت کی باری ہے
یاد نگر میں ایک محل تھا وہ بھی گرتا جاتا ہے

راکھ ہوئیں آنکھوں کی شمعیں آنسو بھی بے نور ہوئے
دھیرے دھیرے میرا دل پتھر سا ہوتا جاتا ہے

اپنا دل ہے ایک پرندہ جس کے بازو ٹوٹے ہیں
حسرت سے بادل کو دیکھے بادل اُڑتا جاتا ہے

ساری رات برسنے والی بارش کا میں آنچل ہوں
دن میں کانٹوں پر پھیلا کر مجھ کو سُکھایا جاتا ہے

ہم نے تو بازار میں دُنیا بیچی اور خریدی ہے
ہم کو کیا معلوم کسی کو کیسے چاہا جاتا ہے

○

میری یادوں کی اِک اِک گلی سو گئی، میرے خوابوں کے سارے مکاں سو گئے
دل شبِ تار کی سلطنت ہو گیا جب سے اشکوں کے شہزادگاں سو گئے

پتھروں کی زمیں پتھروں کے شجر، پتھروں کے مکاں، پتھروں کے بشر
کب سویرا ہوا ہم کدھر کو چلے کس گلی شام آئی، کہاں سو گئے

کیا ہوا، آج کیوں خیمۂ زخم سے کج کلاہانِ غم پھر نکلنے لگے
ہم تو سمجھے تھے اب شہرِ دل مٹ چکا تھک گئے درد کے کارواں سو گئے

اس کی آمد پہ دل کی تمناؤں نے روشنی کے گھروندے بنائے بہت
ایک وہ کیا گیا سب دیئے بجھ گئے، آرزوؤں کے سارے مکاں سو گئے

○

اُڑتے بادل، بزرگوں کی شفقت بنے دُھوپ میں لڑکیاں مسکراتی رہیں
جب سے جانا کہ اب کوئی منزل نہیں، منزلیں راہ میں آتی جاتی ہیں

رات، پریاں، فرشتے، ہمارے بدن، مانگ کر برف میں جل رہے تھے مگر
کچھ شبیہیں، کتابوں کے بجھتے دیئے، کاغذی مقبروں میں جلاتی رہیں

سارے دن کی تپی ساحلی ریت پر دو تڑپتی ہوئی مچھلیاں سو گئیں
اپنے ملنے کی وہ آخری شام تھی، لہریں آتی رہیں لہریں جاتی رہیں

ننگے پاؤں فرشتوں کا اک طائفہ آسماں سے زمیں پر اُترنے لگا
سر برہنہ فلک زادیاں عرش سے آنسوؤں کے ستارے گراتی رہیں

اک دریچے میں دو آنسوؤں کا سفر، رات کے راستوں کی طرح کھو گیا
نرم مٹی پہ گرتی ہوئی پتیاں، سونے والوں کو چادر اڑھاتی رہیں

میرے سینے پر وہ سر رکھے ہوئے سوتا رہا
جانے کیا تھی بات میں جاگا کیا روتا رہا

شبنمی میں دُھوپ کی جیسے وطن کا خواب تھا
لوگ یہ سمجھے میں سبزے پر پڑا سوتا رہا

وادیوں میں گاہ اُترا اور کبھی پربت چڑھا
بوجھ سا اِک دل پہ رکھا ہے جسے ڈھوتا رہا

گاہ پانی، گاہ شبنم اور کبھی خوناب سے
ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا

اِک ہوائے بے نِکاں سے آخرش مُرجھا گیا
زندگی بھر جو محبّت کے شجر بوتا رہا

رونے والوں نے اُٹھا رکھا تھا گھر سر پر مگر
عُمر بھر کا جاگنے والا پڑا سوتا رہا

رات کی پلکوں پہ تاروں کی طرح جاگا کیا
صبح کی آنکھوں میں شبنم کی طرح روتا رہا

روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جس رات لوگ
کوئی سایہ میرے کمرے میں چُھپا روتا رہا

خون پتّوں پہ جما ہو کیسے
پھول کا رنگ ہرا ہو جیسے

بارہا یہ ہمیں محسوس ہوا
درد سینے کا خدا ہو جیسے

پھول کی آنکھ میں شبنم کیوں ہے
سب ہماری ہی خطا ہو جیسے

کرچیں چبھتی ہیں بہت سینے میں
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے

سب ہمیں دیکھنے آتے ہیں مگر
نیند آنکھوں سے خفا ہو جیسے

اب چراغوں کی ضرورت ہی نہیں
چاند اس دل میں چھپا ہو جیسے

جی میں آتا ہے کہ سجدہ کر لیں
دل کی آواز خدا ہو جیسے

روز آتی تھی ہوا اس جیسی
وہ بھی یوں آیا ہوا ہو جیسے

○

تم نے بھی کم نصیب پہ کچھ کم نگاہ کی
اس نے تو خیر زندگی اپنی تباہ کی

ہم دونوں دُنیادار نہیں ہیں اِسی لئے
صورت کوئی نظر نہیں آتی نباہ کی

پتھر سمجھ کے تم جسے ٹھکرا کے چل دیئے
اس دل پہ تھی نگاہ بہت مہرو ماہ کی

اُن کی نظر میں پیار گناہِ عظیم ہے
توفیق دے خدا انہیں ایسے گناہ کی

حالات بے وفائی پہ مجبُور کر گئے
ورنہ اسے بھی چاہ بہت تھی نباہ کی

اپنے کو رشکِ میرؔ سمجھتے ہیں بدؔر جی
گمراہ کر گئی ہے صدا واہ، واہ کی

ماٹی کی کچّی گاگر کو کیا کھونا کیا پانا بابا
ماٹی کو ماٹی میں رہنا ہے ماٹی میں مل جانا بابا

ہم کیا جانے دیواروں سے کیسے دھوپ اُترتی ہوگی
رات رہے باہر جانا ہے رات گئے گھر آنا بابا

جس لکڑی کو اندر اندر دیمک بالکل چاٹ چکی ہو
اس کو اُوپر سے چمکانا راکھ پہ دھوپ جمانا بابا

پیار کی گہری پھنکاروں سے سارا بدن آکاش ہوا ہے
دودھ پلانا تن ڈسوانا ہے دستور پرانا بابا

اِن اُونچے شہروں میں پیدل صرف دیہاتی ہی چلتے ہیں
ہم کو بازاروں سے اِک دن، کاندھے پر لے جانا بابا

بے تاب ہے رنگت کے لئے پیار کی خوشبو
کب سر کے قریب آئے گی تلوار کی خوشبو

مطلع میں دمک اُٹھتا ہے اس ماتھے کا مطلع
اشعار میں آجاتی ہے رُخسار کی خوشبو

کہتی ہے کہ آنگن کی چنبیلی تھے کبھی ہم
کوٹھے پہ تڑپتی گُلِ بازار کی خوشبو

دیوانی ہوئیں جن کے لئے چاندنی راتیں
وہ نکہتِ گیسو ہے کہ رخسار کی خوشبو

درکار ہے آرائشِ نکہت کے لئے رنگ
اِک سر کا لہو مانگے ہے دیوار کی خوشبو

اب اگلے برس یہ در و دیوار نہ ہوں گے
اس گھر سے بہت آتی ہے اشعار کی خوشبو

یاد کسی کی چاندنی بن کر کوٹھے کوٹھے چھٹکی ہے
یاد کسی کی دھوپ ہوئی ہے زینہ زینہ اُتری ہے

رات کی رانی صحنِ چمن میں گیسو کھولے سوتی ہے
رات بِرات اُدھر مت جانا اِک ناگن بھی رہتی ہے

تم کو کیا، تم غزلیں کہہ کر اپنی آگ بُجھا لو گے
اس کے جی سے پُوچھو جو پتھر کی طرح چُپ رہتی ہے

قفل جڑے ہیں اس گھر کی ہر کھڑکی میں، دروازوں میں
پھر بھی دروازوں سے اکثر اِک آہٹ جھانکا کرتی ہے

پتھّر لے کر گلیوں گلیوں لڑکے پُوچھا کرتے ہیں
ہر بستی میں مجھ سے آگے شہرت مری پہنچتی ہے

مدّت سے اِک لڑکی کے رُخسار کی دُھوپ نہیں آئی
اسی لئے میرے کمرے میں اتنی ٹھنڈک رہتی ہے

○

یہ اُداسی ، دھواں ، چاندنی چوک میں
چاندنی ہے کہاں چاندنی چوک میں

ایک ہی گشت میں آگ سی لگ گئی
سردیاں ہیں کہاں چاندنی چوک میں

ہر خریدار زہرہ جبیں ، مہ بدن
ہر دکاں کہکشاں چاندنی چوک میں

ایک لڑکی کی صُورت میں دیکھا گیا
خواب صد شاعراں چاندنی چوک میں

آج عہدِ گزشتہ کے اک مہرباں
مل گئے ناگہاں چاندنی چوک میں

میری آنکھوں میں اِک چاندنی چوک میں
گذری عمرِ رواں چاندنی چوک میں

نقرئی قہقہے، غم دبائے ہوئے
یہ بہارِ خزاں، چاندنی چوک میں

مشقِ شعر و سخن میں ملے گا کہیں
لشکرِ شاعراں چاندنی چوک میں

فکرِ اصلاحِ دنیا میں کھوئے ملے
آلِ پیغمبراں چاندنی چوک میں

بیچ بازار میں گا رہا تھا کوئی
آؤ نا میری جاں، چاندنی چوک میں

دولتِ جسم و جاں کا بھروسہ نہیں
کچھ خرید و میاں چاندنی چوک میں

نہ جانے کتنے تارے تھرتھرا کے ٹوٹ جاتے ہیں
کبھی جو سُر مگیں آنکھوں میں آنسو جھلملاتے ہیں

یہ سناٹا کہ اپنی سانس کی آہٹ نہیں ملتی
یہ اندھیارا کہ یادوں کے دیئے بھی بجھتے جاتے ہیں

پسینے کے سنہرے قطروں یا اشکوں کی لڑیوں سے
بہر صُورت یہ دنیا ہم بناتے ہم سجاتے ہیں

ہر اک خطِّ بدن اُبھرا ہے ان کا میرے شعروں میں
انہیں اب لوگ غزلوں سے مری پہچان جاتے ہیں

جُھکی پلکیں، گھنے گیسو، حسیں دامن، سُبک آنچل
جہاں کی تپتی راہوں میں یہ سائے یاد آتے ہیں

نہ جانے ان دنوں کیوں صبح کچھ کُشو لائے رہتی ہے
نہ جانے شام ہی سے کیوں ستارے ڈُوب جاتے ہیں

ہمیں کیا، ہم کو مرنا، ہم کو جینا دونوں آتا ہے
ہمیں کیا، ہم تو اپنے خون میں اکثر نہاتے ہیں

ہم بکھرتے ہیں تیرگی کی طرح
درد بڑھتا ہے روشنی کی طرح

ہم خدا بن کے آئیں گے ورنہ
ہم سے مل جاؤ آدمی کی طرح

برف سینے کی جیسے جیسے گلی
آنکھ کھلتی گئی کلی کی طرح

جب کبھی بادلوں میں گھرتا ہے
چاند لگتا ہے آدمی کی طرح

کسی روزن، کسی دریچے سے
سامنے آؤ روشنی کی طرح

سب نظر کا فریب ہے ورنہ
کوئی ہوتا نہیں کسی کی طرح

خوبصورت، اُداس، خوفزدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

چاند سورج کے آنے جانے سے کچھ کمی زیادتی نہیں ہوتی
شہر میں دن کے وہ علاقے ہیں جن میں اب رات ہی نہیں ہوتی

دل وہ پُوجا کی تھال ہے جس میں زندگی پھُول رکھنا بھُول گئی
اور آنکھیں وہ طاقِ مسجد ہیں جن میں اَب روشنی نہیں ہوتی

شام آتی تھی اپنے ساتھ لئے تیری یادوں کے جلتے بجھتے دیئے
شام کیا اب تو ساری ساری رات آگ میں روشنی نہیں ہوتی

جلنے والی ہر ایک شے کے لئے آنسوؤں کی بڑی ضرورت ہے،
ایسا [illegible] کے وہ نہیں جلتی جس میں ہلکی نمی نہیں ہوتی

تیرے اور میرے پیار میں اکثر سارے جذبات مشترک ہیں مگر
دھوپ کتنی ہی مہربان ہو جائے یہ کبھی چاندنی نہیں ہوتی

بزمِ آزمائش ہے، لوگ اپنے شعروں میں تارے توڑ لاتے ہیں
بدرؔ اچھا موقع ہے دل کی بات کہہ جاؤ وہ بھی سننے آتے ہیں

پتھروں پہ سر رکھ کر رات رات روتے ہو کیا خبر نہیں تم کو
یہ بھی سب سمجھتے ہیں ساتھ ساتھ روتے ہیں اپنا جی دکھاتے ہیں

ہم نے اپنے شعروں میں اپنا دل اتارا ہے دل میں جو بھی کوئی ہو
وہ ہمارے شعروں کو اپنا عکس کہتے ہیں دیکھ کر لجاتے ہیں

رقصِ نور و نغمہ ہو، بارشِ کرم ہوگی، آج جشنِ عشرت ہے
پتھروں کے سوداگر، پتھروں کے بھاؤ میں دل خرید لاتے ہیں

رُوپ دلہن کی گلیو، پنگھٹوں کی سانوریو، کچھ خبر بھی ہے تم کو
ہم تمہارے گاؤں میں پیاسے پیاسے آئے تھے پیاسے پیاسے جاتے ہیں

نکل آئے اِدھر جناب کہاں
رات کے وقت آفتاب کہاں

میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں
ورنہ ان پتھروں میں آب کہاں

سیب کھلے ہیں کسی کے گالوں پر
اس برس باغ میں گلاب کہاں

میرے ہونٹوں پر تیری خوشبو ہے
چھو سکے گی انہیں شراب کہاں

○

نظر سے گفتگو، خاموش لب ۔ تمہاری طرح
غزل نے سیکھے ہیں انداز سب تمہاری طرح

جو پیاس تیز ہو تو ریت بھی ہے چادرِ آب
دکھائی دور سے دیتے ہیں سب تمہاری طرح

بُلا رہا ہے زمانہ مگر ترستا ہُوں
کوئی پکارے مجھے بے سبب تمہاری طرح

ہوا کی طرح میں بے تاب ہوں کہ شاخِ گلاب
لہکتی ہے مری آہٹ پہ اب تمہاری طرح

مثالِ وقت میں تصویرِ صبح و شام ہوں اب
مرے وجود پہ چھائی ہے شب تمہاری طرح

سُناتے ہیں مجھے خوابوں کی داستاں اکثر
کہانیوں کے پُراسرار لب تمہاری طرح

○

سادہ ورق پہ اُبھرے گا شاید قلم کا چاند
شہرِ غزل کی رات ہے یادِ صنم کا چاند

دل کی رہِ حیات ہیں یہ شوخ تمکنت
لہرا رہا ہے تیز ہوا میں علم کا چاند

کیا زندگی ہماری گلی تک بھی آئی تھی
یہ گیسوؤں کے پھول یہ نقشِ قدم کا چاند

اس بار تجربوں کی روائیں نظر پہ ہیں
روشن بہت زیادہ تھا پچھلے جنم کا چاند

آنکھیں نہ کھول دینا۔ اماوس کی رات ہے
ہاتھوں میں لے کے جھوما کرو جامِ جم کا چاند

دروازے شہرِ درد کے کھلنے دو دوستو
نکلے گا مسکراتا ہوا شامِ غم کا چاند

○

دل شکستہ کوئی ہم جیسا یہاں دفن ہے کیا
دیر تک رات کو رونے کی صدا آتی ہے

جیسے چشمے پہ نہاتی ہوئی شہزادئ خواب
چاندنی رات جب اشکوں میں نہا جاتی ہے

کیا یہاں دشتِ تمنّا میں کوئی پھول کھلا
اب ادھر روز کئی بار صبا آتی ہے

کسی دستک نے بہت چپکے سے سرگوشی کی
چاند سے چاندنی نزدیک ہوئی جاتی ہے

میری آنکھوں میں اُتر آئے ہیں کالے بادل
جاؤ سو جاؤ کہ موسم بڑا جذباتی ہے

خشک پتّوں کو کوئی روند رہا ہے شاید
بال بکھرائے ہوئے بادِ صبا آتی ہے

پیار کی نئی دستک دل پہ پھر سنائی دی
چاندسی کوئی صورت خواب میں دکھائی دی

کس نے میری پلکوں پہ تتلیوں کے پر رکھے
آج اپنی آہٹ بھی دیر تک سنائی دی

ہم غریب لوگوں کے آج بھی وہی دن ہیں
پہلے کیا اسیری تھی آج کیا رہائی دی

بارشوں کے چہرے پر آنسوؤں سے لکھنا ہے
کچھ نہ کوئی پڑھ پائے ایسی روشنائی دی

آسماں زمین رکھ کر دونوں ایک مٹھی میں
اک ذرا سی لڑکی نے پیار کی خدائی دی

یہ تنک مزاجی تو خیر اس کی فطرت ہے
ورنہ اس نے چاہت بھی ہم کو انتہائی دی

یہ تناؤ قدرت نے دو دلوں میں کیوں رکھا
مجھ کو کج کلاہی دی اس کو کج ادائی دی

O

پچھلی رات کی نرم چاندنی شبنم کی خنکی سے رچا ہے
یوں کہنے کو اُس کا تبسم، برق صفت ہے شعلہ نُما ہے

وقت کو ماہ و سال کی زنجیروں میں جکڑ کر کیا پایا ہے
وقت تو ماہ و سال کی زنجیروں میں اور بھی تیز بڑھا ہے

اک معصوم سے پیار کا تحفہ، گھر کے آنگن میں پایا ہے
اُس کو غم کے پاگل پن میں کوٹھے کوٹھے بانٹ دیا ہے

نظم، غزل، افسانہ، گیت، ایک ذرا سی غم تھا جس کو ہم نے
کیسا کیسا نام دیا ہے، کیسے کیسے بانٹ لیا ہے

آہوں کے بادل کیوں دل میں بن برسے ہی لوٹ گئے
اب کے برس ساون کا مہینہ کیسا پیاسا پیاسا گیا ہے

پھول سی ہر تصویر میں ذہن کی دیواروں سے اُتار چکا ہوں
پھر کیوں دل میں کانٹا سا رہ رہ کر چبھتا رہتا ہے

ان آنکھوں کا متوالا پن ، ان ہونٹوں کی جنبش کم کم
نشہ ہے جو ڈول رہا ہے ، جادو ہے جو بول رہا ہے

مجھ کو اُن سچی باتوں سے ، اپنے جھوٹ بہت پیارے ہیں
جن سچی باتوں سے صدیوں انسانوں کا خون بہا ہے

یارو ، سونا چاندی ہو کر سونا چاندی کا تُو ، جاؤ
ہم نے آنسو کی کھیتی کی ذہن نگر آباد کیا ہے

بدرؔ تمہاری فکرِ سخن پر ، اک علامہ ہنس کر بولے
یہ لڑکا نو عمر پرندہ ، اونچا اُڑنا سیکھ رہا ہے

سردیوں کی راتوں میں اپنے اپنے گاؤں میں گرد الاؤ کے بیٹھے ہیں
ہم سے کتنے دیوانے تیرے میرے قصّوں میں اپنا غم سناتے ہیں

گاؤں کی کوئی گوری توڑ کر ہر اک ناطہ دور دیس جاتی ہے
اِن گھنے درختوں میں آج دف نہیں بجتے، کھیت سر جھکائے ہیں

رنگ و نور کی گڑیو، زندگی کی تصویرو، تم نے رنج و غم میں بھی
اپنی مسکراہٹ سے ہم سے دل شکستوں کے حوصلے بڑھائے ہیں

چاند دیس کے لوگو، دل تمہارے ہوتا ہے، پیار تم سمجھتے ہو،
ہم تو اپنے بچپن سے تم کو چھونے پانے کی حسرتیں چھپائے ہیں

زندگی تری فکریں کھلتے ہی گلابوں کا رس نچوڑ لیتی ہیں
پھول جیسی عمروں کے سوچتے ہوئے بچے بوڑھے ہوتے جاتے ہیں

اک جاتی دُنیا میں ایک آتی دُنیا میں، ایک وقفہ ہوتا ہے
اس سیاہ وقفے میں پھول روندے جاتے ہیں کانٹے پہنے جاتے ہیں

چاند سے کوئی کہہ دو، چاندنی کے شعلوں کے اب الاؤ مہکائے
آج میرے آنگن میں مہکی مہکی زلفوں کے مہکے مہکے سائے ہیں

○

شاید مرے آنسو سے اُس کا کوئی رشتہ ہے
تپتے ہوئے صحرا میں جو پھول اکیلا ہے

جھنجھلا کے کسی لمحہ وہ توڑ بھی سکتا ہے
اک بچے کی انگلی سے لپٹی رگِ دُنیا ہے

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

ہو سکتا ہے کل سورج سونا ہی مجھے پلٹے
اک سانپ مرے دل میں سمٹا ہوا بیٹھا ہے

کب جانے ہوا اس کو بکھرا دے فضاؤں میں
خاموش درختوں پر سہما ہوا نغمہ ہے

اب روئے کہاں ساون اب تڑپے کہاں بادل
آنگن نہ بغیچہ ہے اک چھوٹا سا کمرہ ہے

ٹھہری ہوئی جھیلوں میں اک برقِ رواں جیسے
ان حیرتی آنکھوں میں یوں "دوڑتی دنیا" ہے

جیسے ورقِ گل پر انگارہ کوئی رکھ دے
یوں دستِ حنائی پر آنسو ابھی ٹپکا ہے

اپنا چاند ہیں ڈھونڈ رہا ہوں تیرے چاند ستاروں میں
شاید سچا موتی بھی ہو شیشے کے ان پاروں میں

شاخ پہ جتنے پھول ہیں اکثر پیغمبر سے لگتے ہیں
لیکن میں تو اس کی مانوں جو ہنس دے انگاروں میں

نفظ سیاسی کا پردہ ہیں غور سے دیکھو پس منظر
پھول سے چہرے چھپے ہوئے ہیں کاغذ کے انباروں میں

کمرے ویران، آنگن خالی۔ پھر یہ کیسی آوازیں
شاید میرے دل کی دھڑکن چُھپی ہے ان دیواروں میں

تقریروں کا جادو اکثر جھوٹ سے ملتا جلتا ہے
اسی لئے تو بات کہی ہے ہم نے صرف اشاروں میں

تیرا جسم اشعار کے آئینہ میں ایسا لگتا ہے
چاند کو جیسے قید کیا ہو شیشے کی دیواروں میں

تہذیبوں کا سُورج جب چھُپ جاتا ہے تو چُپکے سے
الفت دیئے جلا جاتی ہے دل کے گہرے غاروں میں

چھوٹی سی ہتھیلی کو دیکھا کر اک سوداگر نے یہ کہا
صد ہا شاعر مل جائیں گے اتنے کم دیناروں میں

○

وہ پھُول تیرے ہونٹوں کے چھونے سے جو کھلا
وہ پھُول، اور جون کی آتش بھری ہوا

نیزوں نے مجھ کو جیسے زمیں سے اُٹھا لیا
میں تیرے نرم سینے سے جس دم جدا ہوا

جیسے کہ سارے شہر کی بجلی چلی گئی
آنکھیں کھُلی کھُلی تھیں مگر سوجھتا نہ تھا

تصویر میری پردۂ تخلیق بن گئی
چڑیا نے اس کی آڑ میں اِک گھر بسا لیا

باتیں کہ جیسے پانی میں جلتے ہوئے دیئے
کمرے میں نرم نرم اُجالا سا بھر گیا

سر درد، جیسے نیند کے سینے پہ سو گیا
ان پھول جیسے ہاتھوں نے ماتھا جونہی چھوا

اِک لڑکی، ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی
میں اُجلی، دھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا

سنّاٹے آئے در جوں میں جھانکا چلے گئے
گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

ٹہنی گلاب کی مرے سینے سے لگ گئی
جھٹکے کے ساتھ کار کا رکنا غضب ہوا

○

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی

اُجالوں کی پریاں نہانے لگیں
ندی گنگنائی، خیالات کی

میں چپ تھا تو چلتی ہوا رُک گئی
زباں سب سمجھتے ہیں جذبات کی

مقدّر مری چشمِ پُرآب کا
برستی ہوئی رات برسات کی

کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

○

مری نظر میں خاک، تیرے آئینے پہ گرد ہے
یہ چاند کتنا زرد ہے، یہ رات کتنی سرد ہے

کبھی کبھی تو یوں لگا کہ ہم سبھی مشین ہیں
تمام شہر میں نہ کوئی زن نہ کوئی مرد ہے

خدا کی نظموں کی کتاب ساری کائنات ہے
غزل کے شعر کی طرح ہر ایک فرد، فرد ہے

حیات آج بھی کنیز ہے حضورِ جبر میں
جو زندگی کو جیت لے وہ زندگی کا مرد ہے

اُسے تبرک حیات کہہ کے پلکوں پر رکھوں
اگر مجھے یقین ہو یہ راستے کی گرد ہے

وہ جن کے ذکر سے رگوں میں دوڑتی تھیں بجلیاں
انہیں کا ہاتھ ہم نے چھو کے دیکھا کتنا سرد ہے

○

رات سے جی ہے سوگوار بہت
یاد آؤ نہ آج یار بہت

پاؤں میں دم رہے دیار بہت
ہاتھ چلتے ہوں روزگار بہت

دل میں ہر وقت ایک ہنگامہ
شہر تنہا ہے شہر یار بہت

دیکھ لیں مہر بانیاں تیری
زندگی بن نہ غمگسار بہت

کیا کوئی یار آنے والا ہے
وقت پوچھو ہوا آج یار بہت

رات کھنی ہے بدر سو جاؤ
ہو چکا اس کا انتظار بہت

○

قدم سے آگے آگے چل رہی ہے
مسافر کو گلی پہچانتی ہے

ترے بیمار کا اب تب لگا ہے
بہ حالت گفتنی کم، دیدنی ہے

نہ جانے کس طرف سے آ رہی ہیں
ہواؤں میں بڑی افسردگی ہے

یہ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں
ستاروں کے لبوں پر کپکپی ہے

ابھی کچھ زندگی کا آسرا ہے
چراغوں میں ابھی کچھ روشنی ہے

سحر کے قافلے یہ جانتے ہیں
ابھی اک رات کی منزل پڑی ہے

جب تک نگارِ دشت کا سینہ دُکھا نہ تھا
صحرا میں کوئی لالۂ صحرا کھلا نہ تھا

دو جھیلیں اس کی آنکھوں میں لہرا کے سو گئیں
اس وقت میری عمر کا دریا چڑھا نہ تھا

جاگی نہ تھیں لبوں میں تمنّا کی ناگنیں
اس گندمی شراب کو جب تک چکھا نہ تھا

ڈھونڈا اگر دجہانِ نجر میں عمر بھر
وہ چلتی پھرتی چھاؤں ہے میں نے کہا نہ تھا

اک بے وفا کے سامنے آنسو بہاتے ہم
اتنا ہماری آنکھ کا پانی مرا نہ تھا

دو کالے ہونٹ، جام سمجھ کر چڑھا گئے
وہ آب جس سے میں نے وضو تک کیا نہ تھا

سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کو لائے تھے
اک ہم ہی ایسے تھے کہ ہمارا خدا نہ تھا

وہ کالی آنکھیں، شہر میں مشہور تھیں بہت
تب ان پہ موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھا نہ تھا

میں صاحبِ غزل تھا حسینوں کی بزم میں
سر پر گھنیرے بال تھے ماتھا کھلا نہ تھا

O

موجۂ گل کے پیچھے پڑ کر کیوں دیوانی ہوئی ہے مٹی
ٹھوکر کھا کر خود آ جائے گا جس کی جہاں لکھی ہے مٹی

گلیاں گھپ ہیں، میدان چپ ہیں اور وہ دیوانہ بھی نہیں
مٹی کا دل بیٹھ گیا ہے کس کی آج اٹھی ہے مٹی

آنکھیں آنسو، دل بھی آنسو، شاید ہم سرتاپا آنسو
تھوڑی مٹی اور ملا دے ابھی بہت گیلی ہے مٹی

مٹی کا اک اور کھلونا زیست بنانے والی ہے
خاموشی سے دیکھ تو آڈ اس آنچل میں بندھی ہے مٹی

آہن جیسی دیواریں ہوں یا انسان کا جسم خاکی
مٹی کی فطرت آزادی ہے قید نہیں رہ سکتی مٹی

پچھلے سال یہیں بہت سی ٹوٹی قبریں منہ کھولے تھیں
دھرتی کے زخموں کو کتنی جلدی بھر دیتی ہے مٹی

میں ٹھہرا مٹی کا مادھو، جا دیوانی راہ لے اپنی
تو سونے چاندی کی مورت خود کو کیوں کرتی ہے مٹی

یہ جو دل ہے نازک تر ہے پہلے اک پتھر کا بت تھی
صدیوں یہ آنکھیں روئی ہیں، صدیوں تک بھیگی ہے مٹی

ہر ذرّے میں راز نیا ہے گو مٹی کے تم ہو کھلونے
اِک اِک شعر میں بدرؔ تمہارے جیسے بول رہی ہے مٹی

میرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی
میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

ان پہاڑوں میں رہتے ہیں ہمزاد
بول کر دیکھو، بولتا ہے کوئی

آج میں جاگوں گا کہ سوتے میں
میری پلکوں کو چومتا ہے کوئی

میرا شیطان مر گیا شاید
میرے سینے پہ سو رہا ہے کوئی

رنگ یہ بھی بہت پرانا ہے
سوچتا کوئی، بولتا ہے کوئی

سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا
کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی

○

کوئی ہاتھ نہیں خالی ہے
بابا، یہ نگری کیسی ہے

کوئی کسی کا درد نہ جانے
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے

اُس کا بھی کچھ حق ہے آخر
اس نے مجھ سے نفرت کی ہے

پھول دوا جیسے مہکے ہیں
کس بیمار کی صبح ہوئی ہے

جیسے صدیاں بیت چکی ہوں
پھر بھی آدھی رات ابھی ہے

کیسے کٹے گی تنہا تنہا
اتنی ساری عمر پڑی ہے

ہم دونوں کی خوب نبھے گی
میں بھی دکھی ہوں وہ بھی دکھی ہے

اب غم سے کیا ناطہ توڑیں
ظالم بچپن کا ساتھی ہے

دل کی خاموشی پہ نہ جاؤ
راکھ کے نیچے آگ دبی ہے

○

مری غزل کی طرح اُس کی بھی حکومت ہے
تمام ملک میں وہ سب سے خوبصورت ہے

کبھی کبھی کوئی انسان ایسا لگتا ہے
پرانے شہر میں جیسے نئی عمارت ہے

جمی ہے دیر سے کمرے میں عینکوں کی نشست
فضا میں گرد ہے، ماحول میں کدورت ہے

بہت دنوں سے مرے ساتھ تھی مگر کل شام
مجھے پتہ چلا وہ کتنی خوبصورت ہے

یہ زائرانِ علی گڑھ کا خاص تحفہ ہے
مری غزل کا تبرک دلوں کی برکت ہے

ذرّوں میں کسمساتی ہوئی کائنات ہوں
جو منتظر ہے جسموں کی میں وہ حیات ہوں

دونوں کو پیاسا مار رہا ہے کوئی یزید
یہ زندگی حسین ہے اور میں فرات ہوں

"نیزہ زمیں پہ گاڑ کے گھوڑے سے کود جا"
پر میں۔ زمیں پہ آبلہ پا خالی ہات ہوں

کیسا فلک ہوں جس پہ سمندر سوار ہے
سُورج بھی میرے سر پہ ہے میں کیسی رات ہوں

اندھے کنویں میں مار کے جو پھینک آئے تھے
ان بھائیوں سے کہیو، ابھی تک حیات ہوں

آتی ہوئی ٹرین کے جو آگے رکھ گئی
اس ماں سے یہ نہ کہنا بقیہ حیات ہوں

بازار کا نقیب سمجھ کر مجھے نہ چھیڑ
خاموش رہنے دے میں ترے گھر کی بات ہوں

○

اب ہوئی داستاں رقم بابا
انگلیاں ہو گئیں قلم بابا

کاغذی جوئے شیر لائے ہیں
اپنا تیشہ بھی قلم بابا

چاند اکثر اداس رہتا ہے
اس کو آخر ہے کس کا غم بابا

آہٹیں چلمنوں سے پوچھتی ہیں
قید کب تک رہیں گے ہم بابا

عشق نے یہ بھی رتبہ ہم کو دیا
لوگ کہتے ہیں محترم بابا

اب تو تنہائیاں بھی پوچھتی ہیں
ہے ترا بھی کوئی صنم بابا

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پرودے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں کہ دلِ شاعر پہ چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

اِن لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اُس جانِ تغزل نے جب بھی کہا۔ کچھ کہیئے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

ہر جنم میں اُسی کی چاہت تھے
ہم کسی اور کی امانت تھے

اس کی آنکھوں میں جھلملاتی ہوئی
ہم غزل کی کوئی علامت تھے

تیری چادر میں تن سمیٹ لیا
ہم کہاں کے دراز قامت تھے

جیسے جنگل میں آگ لگ جائے
ہم کبھی اتنے خوبصورت تھے

پاس رہ کر بھی دُور دُور رہے
ہم نئے دور کی محبت تھے

اس خوشی میں مجھے خیال آیا
غم کے دن کتنے خوبصورت تھے

دن میں ان جگنوؤں سے کیا لینا
یہ دیئے رات کی ضرورت تھے

○

ریت بھری ہے ان آنکھوں میں آنسو سے تم دھو لینا
کوئی سوکھا پیڑ ملے تو اس سے لپٹ کے رو لینا

اس کے بعد بہت تنہا ہو جیسے جنگل کا راستہ
جو بھی تم سے پیار سے بولے ساتھ اسی کے ہو لینا

کچھ تو ریت کی پیاس بجھاؤ جنم جنم کی پیاسی ہے
ساحل پر چلنے سے پہلے اپنے پاؤں بھگو لینا

میں نے دریا سے سیکھی ہے پانی کی پردہ داری
اوپر اوپر ہنستے رہنا، گہرائی میں رو لینا

روتے کیوں ہو دل والوں کی قسمت ایسی ہوتی ہے
ساری رات یونہی جاگو گے دن نکلے تو سو لینا

٥

لہروں میں ڈوبتے رہے دریا نہیں ملا
اس سے بچھڑ کے پھر کوئی ویسا نہیں ملا

وہ بھی بہت اکیلا ہے شاید میری طرح
اس کو بھی کوئی چاہنے والا نہیں ملا

ساحل پہ کتنے لوگ مرے ساتھ ساتھ تھے
طوفاں کی زد میں آیا تو تنکا نہیں ملا

دو چار دن تو کتنے سکون سے گذر گئے
سب خیریت رہی کوئی اپنا نہیں ملا

○

پھول برسے کہیں شبنم کہیں گوہر برسے
اور اس دل کی طرف برسے تو پتھر برسے

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

کون کہتا ہے کہ رنگوں کے فرشتے اُتریں
کچھ بھی برسے مگر اس بار تو گھر گھر برسے

ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اُٹھے اپنے ہی دل پر برسے

○

سرکش پہاڑیوں میں جھرنوں کا بانکپن ہے
کتنا عظیم فانی انسان کا بدن ہے

خوابوں میں ان گلابی ہونٹوں پہ مسکراہٹ
مہتاب سو رہا ہے۔ بیدار اِک کرن ہے

شاید زمین کے سینے میں کوئی آسماں ہے
دریا کی تہہ میں لرزاں تاروں کی انجمن ہے

اوراقِ سادہ لے کر پریاں اُتر رہی ہیں
پھر سینۂ سخن میں اشعار کی چبھن ہے

اُس برگِ گل پہ لفظوں کے موتی بکھر گئے
شبنم ہوا کے رُخ پر یا بولتا چمن ہے

سینے پہ پاؤں رکھ کر دُنیا گزر رہی ہے
گو رنگ خاکِ دل ہے گلنار یہ چمن ہے

ساحل پہ شام کتنی گمبھیر ہے کہ دریا
رُک رُک کے بہہ رہا ہے آواز میں تھکن ہے

شہرِ نگار میری خاطر اُداس مت ہو
آبِ رواں بھی بے گھر، خوشبو بھی بے وطن ہے

○

بے تحاشا سی لا اُبالی ہنسی
چھن گئی ہم سے وہ جیالی ہنسی

لب کھلے جسم مسکرانے لگا
پھول کا کھلنا تھا کہ ڈالی ہنسی

مسکرائی خدا کی محویت
یا ہماری ہی بے خیالی ہنسی

کون بے درد چھین لیتا ہے
میرے پھولوں کی بھولی بھالی ہنسی

وہ نہیں تھا وہاں تو کون تھا پھر
سبز پتوں میں کیسے لالی ہنسی

دھوپ میں کھیت گنگنانے لگے
جب کوئی گاؤں کی جیالی ہنسی

ہنس پڑی شام کی اُداس فضا
اس طرح چائے کی پیالی ہنسی

میں کہیں جاؤں ہے تعاقب میں
اس کی وہ جان لینے والی ہنسی

○

رات اک خواب ہم نے دیکھا ہے
پھُول کی پنکھڑی کو چُوما ہے

دل کی بستی پرانی دلّی ہے
جو بھی گزرا ہے اس نے لوٹا ہے

خندۂ گل فریب ہے گل کا
رات بھر چُپکے چُپکے رویا ہے

ہم تو کچھ دیر ہنس بھی لیتے ہیں
دل ہمیشہ اُداس رہتا ہے

اب بجز تیری یاد کے اے دوست
اس خرابے میں کون آتا ہے

پیسہ ہاتھوں کی میل ہے بابا
زندگی چار دن کا میلہ ہے

کوئی مطلب ضرور ہو گا میاں
یوں کوئی کب کسی سے ملتا ہے

تم اگر مل بھی جاؤ تو بھی ہمیں
حشر تک انتظار کرنا ہے

آج دریا، چڑھا چڑھا سا ہے
کوئی ہم سے خفا خفا سا ہے

جسم جیسے بھرا بھرا ساغر
گفتگو میں نشہ نشہ سا ہے

ناک نقشہ بس آپ ہی جیسا،
نام بھی کچھ بھلا بھلا سا ہے

شہر یادوں کا اک بسایا تھا
اب نشاں بھی مٹا مٹا سا ہے

دل سے اک روشنی جہاں میں تھی
یہ دیا بھی . بجھا . بجھا سا ہے

باغ ہے ایک پھول لاکھوں ہیں
رنگ سب کا جُدا جُدا سا ہے

شبنمی آگ بھی جلاتی ہے
پھول کا دل جلا جلا سا ہے

کس کو فرصت کہ اک نظر دیکھے
بدر، تنہا . بجھا بجھا سا ہے

○

اگر تلاش کروں کوئی مل ہی جائے گا
مگر تمہاری طرح مجھ کو کون چاہے گا

تمہیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا

نہ جانے کب تیرے دل پر نئی سی دستک ہو
مکاں خالی ہوا ہے تو کوئی آئے گا

میں اپنی راہ میں دیوار بن کے بیٹھا ہوں
اگر وہ آیا تو کس راستے سے آئے گا

تمہارے ساتھ یہ موسم فرشتوں جیسا ہے
تمہارے بعد یہ موسم بہت ستائے گا

○

خواہشیں، جیسے افریقہ کی بیٹیاں، جنگِ آزادی میں سر سے باندھے کفن
حلقۂ نور میں آ گئے۔ بڑھتے ہوئے دھوپ کو چھیڑتے آبنوسی بدن

ان ہواؤں سے موسم بدلنے لگا دھوپ میں پیار کی نرم چمکار ہے
پھر کبوتر کے جوڑوں کے دل میں چھپی ننھے چُن چن کے لانے کی فطری چُبھن

شہر و صحرا کی تقسیم ممکن نہیں، ایک قوت ہے جس کے بہت روپ ہیں
ان پہاڑوں میں بھی پیار کا ظلم ہے، ان مشینوں میں بھی ظلم کا پیار پن

مرنے والے مصوّر کے تکیے تلے ایک کاغذ ملا جس پہ یہ درج تھا
روشنی کے لباسوں سے لپٹا ہوا آئینہ خانے میں خوشبوؤں کا بدن

اونچے گرجا گھروں میں گھرے نوجواں، راہبوں کے دلوں میں دبی خواہشیں
جیسے بیروت کی ساحلی ریت پر دھوپ کھاتی ہوئی لڑکیوں کے بدن

○

کہیں چاند راہوں میں کھو گیا کہیں چاندنی بھی بھٹک گئی
میں چراغ وہ بھی بجھا ہوا مری رات کیسے چمک گئی

مری داستاں کا عروج تھا تری نرم پلکوں کی چھاؤں میں
مرے ساتھ تھا تجھے جاگنا تری آنکھ کیسے جھپک گئی

بھلا ہم ملے بھی تو کیا ملے وہی دوریاں وہی فاصلے
نہ کبھی ہمارے قدم بڑھے نہ کبھی تمہاری جھجک گئی

ترے ہاتھ سے مرے ہونٹ تک وہی انتظار کی پیاس ہے
مرے نام کی جو شراب تھی کہیں راستے میں چھلک گئی

تجھے بھول جانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں
تری یاد شاخِ گلاب ہے جو ہوا چلی تو لچک گئی

○

مری زندگی بھی مری نہیں یہ ہزار خانوں میں بٹ گئی
مجھے ایک مٹھی زمین دے، یہ زمین کتنی سمٹ گئی

تری یاد آئے تو چُپ رہوں ذرا چُپ رہوں تو غزل کہوں
یہ عجیب آگ کی بیل تھی مرے تن بدن سے لپٹ گئی

مجھے لکھنے والا لکھے بھی کیا، مجھے پڑھنے والا پڑھے بھی کیا
جہاں میرا نام لکھا گیا وہیں روشنائی اُلٹ گئی

نہ کوئی خوشی نہ ملال ہے کہ سبھی کا ایک سا حال ہے
ترے سکھ کے دن بھی گذر گئے مری غم کی رات بھی کٹ گئی

مری بند پلکوں پر ٹوٹ کر کوئی پھول رات بکھر گیا
مجھے سسکیوں نے جگا دیا میری کچی نیند اُچٹ گئی

○

پکے گیہوں کی خوشبو چیختی ہے
بدن اپنا سنہرا ہو چکا ہے

ہماری شاخ کا نوخیز پتہ
ہوا کے ہونٹ اکثر چومتا ہے

اندھیری رات کا تنہا مسافر
میری پلکوں پہ اب سہما ہوا ہے

سمیٹو اور سینے میں چھپا لو
یہ سناٹا بہت پھیلا ہوا ہے

حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

مجھے ان نیلی آنکھوں نے بتایا
تمہارا نام پانی پہ لکھا ہے

○

اب تیرے میرے بیچ ذرا فاصلہ بھی ہو
ہم لوگ جب ملیں تو کوئی دُوسرا بھی ہو

تو جانتا نہیں مری چاہت عجیب ہے
مجھ کو منا رہا ہے کبھی خود خفا بھی ہو

تو بے وفا نہیں ہے مگر بے وفائی کر
اس کی نظر میں رہنے کا کچھ سلسلہ بھی ہو

پت جھڑ کے ٹوٹتے ہوئے پتّوں کے ساتھ ساتھ
موسم کبھی تو بدلے گا یہ آسرا بھی ہو

چُپ چاپ اس کو بیٹھ کے دیکھوں تمام رات
جاگا ہوا بھی ہو کوئی سویا ہُوا بھی ہو

اس کے لئے تو میں نے یہاں تک دُعائیں کیں
میری طرح سے کوئی اسے چاہتا بھی ہو

○

وہی تاج ہے وہی تخت ہے وہی زہر ہے وہی جام ہے
یہ وہی خدا کی زمین ہے یہ وہی بتوں کا نظام ہے

بڑے شوق سے مرے گھر جلا، کوئی آنچ تجھ پہ نہ آئے گی
یہ زباں کسی نے خرید لی، یہ قلم کسی کا غلام ہے

یہاں ایک بچے کے خون سے جو لکھا ہوا ہے اُسے پڑھیں
ترا کیرتن ابھی پاپ ہے ابھی میرا سجدہ حرام ہے

میں یہ مانتا ہوں مرے دیئے تری آندھیوں نے بجھا دیئے
مگر ایک جگنو ہواؤں میں ابھی روشنی کا اِمام ہے

مرے فکر و فن تری انجمن، نہ عروج تھا نہ زوال ہے
مرے لب پہ تیرا ہی نام تھا مرے لب پہ تیرا ہی نام ہے

○

کبھی تو شام ڈھلے اپنے گھر گئے ہوتے
کسی کی آنکھ میں رہ کر سنور گئے ہوتے

سنگار دان میں رہتے ہو آئینے کی طرح
کسی کے ہاتھ سے گر کر بکھر گئے ہوتے

غزل نے بہتے ہوئے پھول چن لئے ورنہ
غموں میں ڈوب کر ہم لوگ مر گئے ہوتے

عجیب رات تھی کل تم بھی آ کر لوٹ گئے
جب آ گئے تھے تو پل بھر ٹھہر گئے ہوتے

بہت دنوں سے ہے دل اپنا خالی خالی سا
خوشی نہیں تو اداسی سے بھر گئے ہوتے

○

کہیں پلکیں اوس سے دھو گئیں کہیں دل کو پھولوں سے بھر گئی
تری یاد سولہ سنگار ہے جسے چھو دیا وہ سنور گئی

میں سنہرے پتوں کا پیڑ ہوں، میں خزاں کا حسن و وقار ہوں
مرے بال چاندی کے ہو گئے مرے سر پہ دھوپ بکھر گئی

مرا شاعرانہ سا خواب بھی جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
انہیں ناخداؤں کے خوف سے وہ چڑھی ندی میں اتر گئی

تری آرزو تری جستجو میں بھٹک رہا تھا گلی گلی
مری داستاں تری زلف ہے جو بکھر بکھر کے سنور گئی

انہیں دو گھروں کے قریب ہی کہیں آگ لے کے ہوا بھی تھی
نہ کبھی تمہاری نظر گئی نہ کبھی ہماری نظر گئی

نہ غموں کا میرے حساب لے نہ غموں کا اپنے حساب دے
وہ عجیب رات تھی کیا کہیں جو گزر گئی سو گزر گئی

○

محفل مہکشاں کوچہ دلبراں
ہر جگہ ہو لئے اب چلیں دل کہاں

مصلحت چاہتی ہے کہ منزل ملے
اور دل ڈھونڈتا ہے کوئی کارواں

تذکرہ کوئی ہو، ذکر ترا رہا
اوّل [illegible] پرسش، درمیاں درمیاں

رات یوں دل میں پھر تم نے آواز دی
جیسے صحرا کی مسجد میں شب کی اذاں

گرد آلود چہرے پہ حیرت نہ کر
دشت در دشت گھومی ہے عمر رواں

بدرؔ صاحب اِدھر کا نہ رُخ کیجئے
دِلّی، لاہور ہیں شہرِ جادوگراں

○

پہلا سا وہ زور نہیں ہے میرے دکھ کی صداؤں میں
شاید پانی نہیں رہا ہے اب پیاسے دریاؤں میں

جس بادل کی آس میں جوڑے کھول لئے ہیں سہاگن نے
وہ پربت سے سر ٹکرا کر برس چکا صحراؤں میں

جانے کب تڑپے اور چمکے سونی رات کو پھر ڈس جائے
مجھ کو ایک روپہلی ناگن بیٹھی ملی ہے گھٹاؤں میں

پتہ تو آخر پتہ تھا گنجان گھنے درختوں نے
زمین کو تنہا چھوڑ دیا ہے اتنی تیز ہواؤں میں

دن بھر دھوپ کی طرح سے ہم چھائے رہتے ہیں دنیا پر
رات ہوئی تو سمٹ کے آجاتے ہیں دل کی گپھاؤں میں

کھڑے ہوئے جو ساحل پر تو دم میں پلکیں بھیگ گئیں
شاید آنسو چھپے ہوئے ہوں صبح کی نرم ہواؤں میں

○

رات کی راہ میں تاروں کی کماں روشن ہے
چاند میں کون ہے یہ کس کا مکاں روشن ہے

جس کو دیکھو مرے ماتھے کی طرف دیکھے ہے
درد ہوتا ہے کہاں اور کہاں روشن ہے

یاد جب گھر کی کبھی آتی ہے تو لگتا ہے
رات کی راہ میں شیشے کا مکاں روشن ہے

چاند جس آگ میں جلتا ہے اُسی شعلے سے
برف کی وادی میں کہرے کا دُھواں روشن ہے

جیسے دریاؤں میں خاموش چراغوں کا سفر
ایسا نس نس میں مرے دردِ رواں روشن ہے

صبح سے ڈھونڈھ رہے تھے کہ کہاں سے سورج
اب نظر آئے ہو تو سارا جہاں روشن ہے

اکائی
بشیر بدر

میں CERTIFICATES کس سے لکھواؤں؟ اور کیوں؟

جن سے کچھ لکھوایا جا سکتا ہے وہ میرے استاد، بزرگ یا دوست ہیں۔ وہ کوئی غیر جانبدارانہ کلمۂ خیر لکھ دیں تو بھی میرا شکی دل مطمئن نہ ہوگا۔

وہ نجی خطوط جو چھپنے چھپانے کی نیت سے نہیں لکھے گئے، اُن کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔

محمد علوی کے ایک خط (۱۴ر نومبر ۱۹۶۱ء) کا یہ فقرہ ہے۔

"جانِ غزل، میں غزل میں فراق اور ناصر کے بعد بشیر بدر ہی کو مانتا ہوں۔"

یہ خط اس وقت کا ہے جب علوی یہ پوسٹر چھپوا چکا تھا۔

سب مشاعروں سے ہٹ کر ایک مشاعرہ۔ دورِ جدید کے بہترین شاعر بشیر بدر، شہریار ایم۔ اے، پروفیسر بمل کرشن اشک شرکت کر رہے ہیں۔ مقام پربیا بھائی ہال۔ احمد آباد، شرح ٹکٹ ....

اس دل خوش کن فقرے نے ایک لمبی مسافت کے لیے تیار کرنا تھا۔

عادل منصوری کا خط (۲۳ر اکتوبر ۱۹۶۲ء) کہتا ہے۔

"جدید غزل کا سب سے پیارا نام بشیر بدر ہے" مگر اس کی وجہ میری دوست بنانے والی شخصیت بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ عادل اس سے پہلے لکھ چکا ہے۔

"احمد آباد تمھاری باتوں کا دیوانہ ہے اور تمھارے شعروں سے گونج رہا ہے۔ جیتن، جیلانی اور سرشار تمھارے شعر تمھارے لہجے میں پڑھا کرتے ہیں۔"

وزیر آغا لکھتے ہیں۔

"آپ کے ہاں وہ گہرائی اور نکھار صاف اُبھر آیا ہے جس کی مجھے آپ سے توقع تھی۔ آپ دبے پاؤں اپنے اندر اُترتے چلے گئے ہیں اور نتیجتہً اب آپ کی غزل میں وہ کسک پیدا ہو گئی ہے جس کے بغیر اعلیٰ شاعری کا تصور محال ہے۔"

اِکائی

بشیر بدر
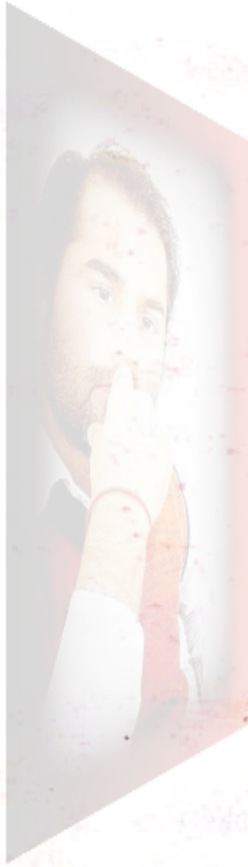
ناشر
کالج اینڈ یونیورسٹی بک اسٹال بڑا بازار۔ علی گڑھ

حقوق : بحق مصنف

تعداد : ایک ہزار

مطبع : لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ

اشاعت : نومبر ۱۹۶۹ء

قیمت : تین روپے

اہتمام : قمر جہاں ہاشمی، شہناز

پتہ :- بشیر بدر، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر آل احمد سرور
کی
جناب میں
فیس بک گروپ۔ کتابیں پڑھیے
سید حسین احسن
Imagitor

اگر کوئی رسالہ یا اخبار "اکائی" پر
تبصرہ کرنا اپنے لئے مفید سمجھتا ہے تو اسے
کم از کم اس کی دو کاپیاں خریدنا لازمی ہیں[1]

---

[1] یہ اس لئے بھی کہ تبصرہ، اشتہار یا اطلاع نامے کا کام کرتا ہے۔ اس کتاب کو اس کی ضرورت نہیں۔ ابھی اس کا ٹائٹل تک نہیں بنا ہے، صرف دو تہائی کتاب چھپ پائی ہے اور تقریباً ساڑھے پانچ سو کتابوں کی پیشگی خریداری ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کاپیاں مجھے اپنے بزرگوں اور لکھنے والوں کو دینی ہیں۔ چند ہی کتابیں بچیں گی۔ اُن کے لئے اشتہار کا یہ طریقہ میرے لئے بیہودہ

نوٹس

○ — اس مجموعے میں، ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۹ء کی غزلوں کا انتخاب ہے، ترتیب غیر تاریخی ہے۔ غزلوں کی سن پیدائش کا کچھ اندازہ رسائل میں ان کی اشاعت سے ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں نقوش لاہور، نیا دور کراچی، سویرا محمود ایاز کا سوغات، نریندر نشچل کا محور اس کے **بعد** شب خون اور کتاب مددگار ہوں گے۔

○ — عملی طور پر میرا نظریۂ زندگی اور نظریۂ شاعری ذرا بھی طے شدہ نہیں، میرا عمل کسی لمحہ کی شعوری اور غیر شعوری تحریکات کی اکائی ہے۔ کبھی ایک لفظ کا کھردرا پن احساس سے بھرپور شعری تجربے کو مجھ سے جدا کر دیتا ہے، کبھی بے بحری غزل میں مجھے ایسی انوکھی غنائیت محسوس ہو سکتی ہے کہ میں اسے اپنے تمام سے وابستہ کر سکتا ہوں۔

میرے یہاں ہر شعر اپنا نظریۂ شعری اپنے ساتھ لے کر وجود میں آتا ہے۔ ہر شعر کے مکمل ہونے کے ساتھ اس کا نظریہ بھی تمام ہو جاتا ہے۔

○ — میری اور میری شاعری کی وفاداری کسی طے شدہ نظریے اور تحریک سے نہیں، جو لوگ "جدیدیت" کو طے شدہ، اجتماعی نظریات کی تحریک سمجھتے ہیں اس سے میری اور میری شاعری کی واقفیت تک نہیں۔

روشنی کے مقدّر میں نیندیں کہاں چاند میں۔ طاق پر وہ سجائیں کہیں
ہم چراغِ وفا۔ جلنا ہے رات بھر آسماں تا زمیں وہ جلائیں کہیں

دو بھٹکتی ہوئی روحیں جیسے ملیں یوں ملیں وہ نگاہیں مگر خوف ہے
زیست ہے رات میں جنگلوں کا سفر اس جنم میں کبھی ہم کھو نہ جائیں کہیں

شہر میں مثلِ مینارِ عظمت ہمیں آسماں کی طرف لے چلی ہیں مگر
جی میں ہے "سبز پیغمبروں" کی طرح سینہ سنگ۔ سے سر اٹھائیں کہیں

۲

برف سی اُجلی پوشاک پہنے ہوئے، پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہیں
وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

کوئی کتبہ نہیں ہیں سرِ راہ ہم جس پہ اقوالِ زرّیں بدلتے رہو
ہم تو آنسو ہیں پلکوں پہ رکھ لو ہمیں جب اشارہ کرو ٹوٹ جائیں کہیں

اَن کہے شعر ہیں وادئی ذہن میں مختلف رنگ کے جھلملاتے دِیے
دستِ الفاظ محفوظ کر لے انھیں چل رہی ہے ہوا بجھ نہ جائیں کہیں

ایسا نغمہ ہیں جس میں صدا تک نہیں، ایسی آندھی ہیں جس میں ہوا تک نہیں

زندگی کی طرح جاوداں بیکراں، اتنے مجبور جتنی قضا تک نہیں

چلتے مضمونوں کے نوٹس اور ترجمے، اُجلے شوکیس میں سج گئے ٹھیک ہے

کیوں دوکاں دار رکھے کتابِ ادب، جب اُسے اب کوئی پوچھتا تک نہیں

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں

آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

رات کا کالا جادو رہے زلف میں، اپنے چہرے پہ سورج کا چہرہ رکھو

تیز نیزوں سے لوگوں پہ حملہ کرو، یوں کسی کو کوئی پوچھتا تک نہیں

لکڑیوں سے تراشی ہوئی لڑکیاں، ٹین کے نوجواں، مختلف رنگ میں

دوست ہیں، دوستی سے مگر بے خبر، دشمنِ جاں ہیں لیکن خفا تک نہیں

زعفراں رنگ کے گیسوؤں کی گھٹا آسماں رنگ کے کوٹ پر چھا گئی

نرم یادوں کے اُجلے فرشتوں کے پر دودھیا خامشی اور ہوا تک نہیں

اپنی کھوئی ہوئی جنّتیں پا گئے زیست کے راستے بھولتے بھولتے

موت کی وادیوں میں کہیں کھو گئے تیری آواز کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے

مست و سرشار تھے کوئی ٹھوکر لگی آسماں سے زمیں پر یوں ہم آ گئے

شاخ سے پھول جیسے کوئی گر پڑے رقصِ آواز پر جھومتے جھومتے

کوئی پتھر نہیں ہوں کہ جس شکل میں مجھ کو چاہو بنایا بگاڑا کرو

بھول جانے کی کوشش تو کی تھی مگر یاد تم آ گئے بھولتے بھولتے

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں

وہ تو کہیے انھیں کچھ ہنسی آ گئی، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

اب وہ گیسو نہیں ہیں جو سایہ کریں اب وہ شانے نہیں جو سہارا بنیں

موت کے بازوؤ تم ہی آگے بڑھو تھک گئے آج ہم گھومتے گھومتے

دل میں جو تیر ہیں اپنے ہی تیر ہیں، اپنی زنجیر سے پا بہ زنجیر ہیں

سنگ ریزوں کو ہم نے خدا کر دیا آخرش رات دن پوجتے پوجتے

سبزۂ کہساروں پر سر اُٹھاتا رہا، ریگزاروں میں گُل مسکراتے رہے
موت کے تیرہ و تار شمشان میں، زندگی کے کنول جگمگاتے رہے

غزلیں کمھلا گئیں، نظمیں مُرجھا گئیں، گیت سنولا گئے، ساز چپ ہو گئے
پھر بھی اہلِ چمن کتنے خوش طبع تھے، نغمۂ فصلِ گُل گنگناتے رہے

تیری سانسوں کی خوشبو، لبوں کی مہک جانے کیسے ہوائیں اُڑا لائی تھیں
رات کا ہر قدم کچھ بہکتا رہا، وقت کے پاؤں بھی ڈگمگاتے رہے

جیسے کشمیری جھیلوں کی آغوش میں ننھے ننھے ستارے اُتر آئے ہوں
رات اُن نیلی آنکھوں میں کچھ ایسے ہی آنسوؤں کے دیے جھلملاتے رہے

شاہدِ زندگی تو نے بھولے سے بھی، ہم غریبوں کی جانب دیکھا کبھی
اور ہم تو تری عظمتوں کے لئے سر کٹاتے رہے جاں گنواتے رہے

تیرے لب کی دہک میرے بازو کا بل تیری آنکھوں کا رس میرے ہاتھوں کا جس
سالہا سال سے جنسِ بازار ہیں صاحبِ نقد بولی لگاتے رہے

رات موسم بہت فتنہ انگیز تھا، اس پہ یادوں کی زلفیں بھی لہرا گئیں
دیر تک دل سے تیری ہی باتیں رہیں بھولی بسری کہانی سناتے رہے

خواہشیں، جیسے افریقہ کی بیٹیاں، جنگِ آزادی میں سر سے باندھے کفن

حلقۂ نور میں آگے بڑھتے ہوئے دھوپ کو چھیڑتے آبنوسی بدن

ان ہواؤں سے موسم بدلنے لگا دھوپ میں پیار کی نرم چمکار ہے

پھر کبوتر کے جوڑوں کے دل میں بھی تنکے چُن چُن کے لانے کی فطری چبھن

شہر و صحرا کی تقسیم ممکن نہیں، ایک قیمت ہے جس کے بہت روپ ہیں

ان پہاڑوں میں بھی پیار کا ظلم ہے ان مشینوں میں بھی ظلم کا پیار پن

مرنے والے مصوّر کے تکیے تلے ایک کاغذ ملا جس پہ یہ درج تھا

روشنی کے لباسوں سے لپٹا ہوا آئینہ خانے میں خوشبوؤں کا بدن

اونچے گرجا گھروں میں گھرے نوجواں راہبوں کے دلوں میں دبی خواہشیں

جیسے بیروت کی ساحلی ریت پر دھوپ کھاتی ہوئی لڑکیوں کے بدن

اُڑتے بادل، بزرگوں کی شفقت بنے، دھوپ میں لڑکیاں مسکراتی رہیں
جب سے جانا کہ اب کوئی منزل نہیں، منزلیں راہ میں آتی جاتی رہیں

رات، پریاں، فرشتے، ہمارے بدن مانگ کر برف میں جل رہے تھے مگر
کچھ شبیہیں، کتابوں کے بجھتے دیے، کاغذی مقبروں میں جلاتی رہیں

سارے دن کی تپی ساحلی ریت پر دو تڑپتی ہوئی مچھلیاں سو گئیں
اپنے ملنے کی وہ آخری شام تھی، لہریں آتی رہیں لہریں جاتی رہیں

ننگے پاؤں فرشتوں کا اک طائفہ آسماں سے زمیں پر اُترنے لگا
سر برہنہ فلک زادیاں عرش سے آنسوؤں کے ستارے گراتی رہیں

اک دریچے میں دو آنسوؤں کا سفر رات کے راستوں کی طرح کھو گیا
نرم مٹی پہ گرتی ہوئی پتیاں، سونے والوں کو چادر اڑھاتی رہیں

میری یادوں کی اک اک گلی سو گئی، میرے خوابوں کے سارے نگر سو گئے
دل شبِ تار کی سلطنت ہو گیا، جب سے اشکوں کے شہزادگاں سو گئے

پتھروں کی زمیں۔ پتھروں کے شجر۔ پتھروں کے مکاں۔ پتھروں کے بشر
کب سویرا ہوا ہم کدھر کو چلے کس گلی شام آئی۔ کہاں سو گئے

کیا ہوا، آج کیوں خیمۂ زخم سے کج کلاہانِ غم پھر نکلنے لگے،
ہم تو سمجھے تھے اب شہرِ دل مٹ چکا تھک گئے درد کے کارواں سو گئے

اس کی آمد پہ دل کی تمناؤں نے روشنی کے گھروندے بنائے بہت
ایک وہ کیا گیا سب دیے بجھ گئے آرزوؤں کے سارے مکاں سو گئے

نفرتوں کے الاؤ میں جلتے بدن، زیست کی دوپہر میں سلگتے چمن
عہدِ دانش کے مارے یہ انساں نما پیار کی چھاؤں پائی جہاں سو گئے

عقل کی لشکری آہنی آہٹیں۔ جیسے بکھرا گئی خوشبوؤں کی دکاں
دل کے بازار میں خاک اڑنے لگی۔ ڈر کے یادوں کے سوداگراں سو گئے

آج کی رات اتنی اندھیری ہے کیوں؟ آج کی رات اتنی اکیلی ہے کیوں
جو سرِ شام ہم کو جگا آئے تھے۔ ایک آواز دے کر کہاں سو گئے

شعلۂ فکر و احساس میں بتدریج آخرش ہم تو آتش بجاں ہو گئے
ہاں۔ مگر اپنے شعروں کے پیغمبراں آگ میں پھول کا امتحاں ہو گئے

دور تک ریت ہی ریت ہے زندگی، دور تک دھوپ ہی دھوپ ہے زندگی
العطش العطش کوثرِ علم و فن۔ اب تو کانٹوں کی سوکھی زباں ہو گئے

میں تو گیتی کے سینے کی نم آگ تھا، ابر بن کر برستا بکھرتا رہا
میری شبنم نظر جن کے منہ دھو گئی، وہ ہی ذرّے مہ و کہکشاں ہو گئے

جنسِ دل پہلے بھی کیا گراں مایہ تھی اور اب اس ترقیٔ معکوس میں
سنگریزوں کے تاجر مرے دور میں آئینہ ساز و شیشہ گراں ہو گئے

کون ہیں اور کیا ہیں خبر کچھ نہیں، ہاں مگر نبضِ دوراں ترے واسطے
ہم کبھی آتشِ گل کی نم بن گئے۔ ہم کبھی پتھروں کی زباں ہو گئے

وہ سادگی نہ کرے کچھ بھی تو ادا ہی لگے
وہ بھول پن ہے کہ بے باکی بھی حیا ہی لگے

یہ زعفرانی پلوور، اُسی کا حصّہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

نہیں ہے میرے مقدّر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں، خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

حسیں تو اور ہیں، لیکن کوئی کہاں تجھ سا
جو دل جلائے بہت، پھر بھی دلربا ہی لگے

ہزاروں بھیس میں پھرتے ہیں رام اور رحیم
کوئی ضروری نہیں ہے بھلا، بھلا ہی لگے

پھول برسے، کہیں شبنم، کہیں گوہر برسے
اور اس دل کی طرف برسے تو پتھر برسے

کوئی بادل ہو تو تھم جائے مگر اشک مرے
ایک رفتار سے دن رات برابر برسے

برف کے پھولوں سے روشن ہوئی تاریک زمیں
رات کی شاخ سے جیسے مہ و اختر برسے

پیار کا گیت اندھیروں پہ اُجالوں کی پھوار
اور نفرت کی صدا، شیشے پہ پتھر برسے

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

سو خلوص باتوں میں، سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

یوں کسی کی آنکھوں میں صبح تک ابھی تھے ہم
جس طرح رہے شبنم پھول کے پیالوں میں

رات تیری یادوں نے دل کو اس طرح چھیڑا
جیسے کوئی چٹکی لے نرم نرم گالوں میں

میری آنکھ کے تارے اب نہ دیکھ پاؤ گے
رات کے مسافر تھے کھو گئے اُجالوں میں

جیسے آدھی شب کے بعد چاند نیند میں چونکے
وہ گلاب کی جنبش اُن سیاہ بالوں میں

چاند سورج کے آنے جانے سے کچھ کمی زیادتی نہیں ہوتی
شہر میں دن کے وہ علاقے ہیں جن میں اب رات ہی نہیں ہوتی

دل وہ پوجا کی تھالی ہے جس میں، زندگی پھول کھنا بھول گئی
اور آنکھیں وہ طاقِ مسجد ہیں جن میں اب روشنی نہیں ہوتی

شام آتی تھی اپنے ساتھ لئے تیری یادوں کے جلتے بجھتے دیے
شام کیا اب تو ساری ساری رات آگ میں روشنی نہیں ہوتی

جلنے والی ہر ایک شے کے لئے آنسوؤں کی بڑی ضرورت ہے
ایسا تھم تھم کے وہ نہیں جلتی جس میں ہلکی نمی نہیں ہوتی

تیرے اور میرے پیار میں اکثر سارے جذبات مشترک ہیں مگر
دھوپ کتنی ہی مہرباں ہو جائے یہ کبھی چاندنی نہیں ہوتی

من کی اُداس بینا کے سب تار کس گئے
بارش ہوئی کہ درد کے نغمے برس گئے

بوجھل اُداس رات تھی دونوں دلوں کے بیچ
ہم مسکرا دئے تو اُجالے برس گئے

دھرتی کی خشک آنکھوں میں ریتلی دھول ہے
اب کے تو بوند بوند کو دریا ترس گئے

کیوں حال پوچھتے ہو کسی گل عذار کا
وہ لُو چلی ہے اب کے کہ پتھر جھلس گئے

اب ہر طرف دھواں ہے سلگتی حیات کا
باتوں میں رس نہیں رہا۔ ہاتھوں کے جس گئے

سادہ ورق اداس ہے نغموں کے نرم خواب
تتلی کی طرح اڑ گئے پھولوں میں بس گئے

بسترِ دل پہ خوں اُگلتے خواب
رات بھر کروٹیں بدلتے خواب

وقت کی دھوپ، ریگزارِ حیات
برف کی طرح سے پگھلتے خواب

پردۂ نور بن کے چھائے ہیں،
آنسوؤں کی طرح مچلتے خواب

بکھرے شیشوں پہ گر کے ٹوٹ گئے
نیند میں ننگے پاؤں چلتے خواب

ایسی سنسان دوپہر میں کہاں
چاند تاروں کی طرح چلتے خواب

یہ ہوائے حقیقتِ فردا،
یہ چراغوں کی طرح جلتے خواب

اب تو انگاروں کے لب چوم کے سو جائیں گے
ہم وہ پیاسے ہیں جو دریاؤں کو ترسائیں گے

خواب آئینے ہیں، آنکھوں میں لئے پھرتے ہو
دھوپ میں چمکیں گے ٹوٹیں گے تو چبھ جائیں گے

نیند کی فاختہ، سہمی ہوئی ہے آنکھوں میں
تیری یادوں کی کمیں گاہوں سے پھر آئیں گے

صبح تک دل کے دریچوں کو کھلا رہنے دو
درد — گمراہ فرشتے ہیں، کہاں جائیں گے

میرے سینے پر وہ سر رکھے ہوئے سوتا رہا
جانے کیا تھی بات میں جاگا کیا روتا رہا

شبنمی میں دھوپ کی جیسے وطن کا خواب تھا
لوگ یہ سمجھے میں سبزے پر پڑا سوتا رہا

وادیوں میں گاہ اترا اور کبھی پربت چڑھا
بوجھ سا اک دل پہ رکھا ہی جسے ڈھوتا رہا

گاہ پانی، گاہ شبنم اور کبھی خوناب سے
ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا

اک تمنائے بے تکاں سے آخرش مرجھا گیا

زندگی بھر جو محبت کے شجر بوتا رہا

لوٹنے والوں نے اٹھا رکھا تھا گھر سر پر مگر

عمر بھر کا جاگنے والا پڑا سوتا رہا

رات کی پلکوں پہ تاروں کی طرح جاگا کیا

صبح کی آنکھوں میں شبنم کی طرح روتا رہا

روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جس رات لوگ

کوئی سایہ میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

شاید مرے آنسو سے اس کا کوئی رشتہ ہے
تپتے ہوئے صحرا میں جو پھول اکیلا ہے

جھنجھلا کے کسی لمحہ وہ توڑ بھی سکتا ہے،
اک بچے کی انگلی سے لپٹی رگِ دنیا ہے

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

ہو سکتا ہے کل سورج سوتا ہی مجھے پائے
اک سانپ مرے دل میں سمٹا ہوا بیٹھا ہے

کب جانے ہوا اس کو بکھرا دے فضاؤں میں

خاموش درختوں پر سہما ہوا نغمہ ہے

اب روئے کہاں ساون اب تڑپے کہاں بادل

آنگن نہ بغیچہ ہے اک چھوٹا سا کمرہ ہے

ٹھہری ہوئی جھیلوں میں اک برق رواں جیسے

ان حیرتی آنکھوں میں یوں "دوڑتی دنیا" ہے

جیسے ورقِ گُل پر انگارہ کوئی رکھ دے

یوں دستِ حنائی پر آنسو ابھی ٹپکا ہے

نظر سے گفتگو۔ خاموش لب۔ تمھاری طرح
غزل نے سیکھے ہیں انداز سب تمھاری طرح

جو پیاس تیز ہو تو ریت بھی ہے چادرِ آب
دکھائی دور سے دیتے ہیں سب تمھاری طرح

بُلا رہا ہے زمانہ مگر ترستا ہوں
کوئی پُکارے مجھے بے سبب تمھاری طرح

ہوا کی طرح میں بے تاب ہوں کہ شاخِ گلاب
لہکتی ہے مری آہٹ پہ اب تمھاری طرح

مثالِ وقت میں تصویرِ صبح و شام ہوں اب
مرے وجود پہ چھائی ہے شب تمھاری طرح

سُناتے ہیں مجھے خوابوں کی داستاں اکثر
کہانیوں کے پُراسرار لب تمھاری طرح

نکل آئے اِدھر جناب کہاں
رات کے وقت آفتاب کہاں

میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں،
ورنہ ان پتھروں میں آب کہاں

سب کھلے ہیں کسی کے عارض پر
اس برس باغ میں گلاب کہاں

میرے ہونٹوں پہ تیری خوشبو ہے
چھو سکے گی انھیں شراب کہاں

رفتہ رفتہ رنگ میں تبدیل ہو گی خاکِ جس

قطرہ قطرہ زندگی ٹپکا رہی ہے اپنا رس

موت جن شہروں کو اجزائے پریشاں کر چکی

پھر انھیں چھونے لگا ہے زیست کے ہاتھوں کا لمس

ہاں کبھی دو بے تکلف دوستوں کے بیچ بھی

خامشی اتنی اذیت ناک ہوتی ہے کہ بس

خشک پتّوں سے یہ کہہ کر رو پڑی جاتی بہار

پھر ملیں گے زندگی لائی اگر اگلے برس

صبح بستر سے اُٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی

دھوپ کی آہٹ پہ چونک اُٹھے ہیں مندر کے کلس

اور دُنیا کی محبّت بڑھ گئی یہ جان کر

سب فنا ہو جائے گا اللہ بس باقی ہوس

سادہ ورق پہ اُبھرے گا شاید قلم کا چاند
شہرِ غزل کی رات ہے یادِ صنم کا چاند

دل کی رہِ حیات میں یہ شوخ تمکنت
لہرا رہا ہے تیز ہوا میں علم کا چاند

کیا زندگی ہماری گلی تک بھی آئی تھی
یہ گیسوؤں کے پھول یہ نقشِ قدم کا چاند

اس بار تجربوں کی ردائیں نظر پہ ہیں
یہ روشن بہت زیادہ تھا پچھلے جنم کا چاند

آنکھیں نہ کھول دینا - اماوس کی رات ہے
ہاتھوں میں لے کے جھوما کرو جامِ جم کا چاند

دروازے شہرِ درد کے کھلنے دو دوستو
نکلے گا مسکراتا ہوا شامِ غم کا چاند

بے تاب ہے رنگت کے لئے پیار کی خوشبو
کب سر کے قریب آئے گی تلوار کی خوشبو

مطلع میں دمک اُٹھتا ہے اس ماتھے کا مطلع
اشعار میں آجاتی ہے رُخسار کی خوشبو

کہتی ہے کہ آنگن کی چنبیلی تھے کبھی ہم
کوٹھے پہ تڑپتی گُلِ بازار کی خوشبو

دیوانی ہوئیں جن کے لئے چاندنی راتیں
وہ نکہتِ گیسو ہے کہ رُخسار کی خوشبو

درکار ہے آرائشِ نکہت کے لئے رنگ
اک سر کا لہو مانگے ہے دیوار کی خوشبو

اب اگلے برس یہ در و دیوار نہ ہوں گے
اس گھر سے بہت آتی ہے اشعار کی خوشبو

وہ غزل والوں کا اسلوب سمجھتے ہوں گے
چاند کہتے ہیں کسے خوب سمجھتے ہوں گے

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

دیکھ کر پھول کے صفحات پہ شبنم کچھ لوگ
میرا اشکوں بھرا مکتوب سمجھتے ہوں گے

بھول کر اپنا زمانہ یہ بزرگانِ جدید
آج کے پیار کو معیوب سمجھتے ہوں گے

یاد کسی کی چاندنی بن کر کوٹھے کوٹھے چھٹکی ہے

یاد کسی کی دھوپ ہوئی ہے زینہ زینہ اُتری ہے

رات کی رانی صحنِ چمن میں گیسو کھولے سوتی ہے

رات برات اُدھر مت جانا اک ناگن بھی رہتی ہے

تم کو کیا، تم غزلیں کہہ کر اپنی آگ بجھا لو گے

اُس کے جی سے پوچھو جو پتّھر کی طرح چُپ رہتی ہے

پتّھر لے کر گلیوں گلیوں لڑکے پوچھا کرتے ہیں

ہر بستی میں مجھ سے آگے شہرت مری پہنچتی ہے

قفل پڑے ہیں اس گھر کی ہر کھڑکی میں، دروازوں میں

پھر بھی درازوں سے اکثر اک آہٹ جھانکا کرتی ہے

مدّت سے اک لڑکی کے رخسار کی دھوپ نہیں آئی

اسی لئے میرے کمرے میں اتنی ٹھنڈک رہتی ہے

دل شکستہ کوئی ہم جیسا یہاں دفن ہے کیا
دیر تک رات کو رونے کی صدا آتی ہے

جیسے چشمے پہ نہاتی ہوئی شہزادیٔ خواب
چاندنی رات جب اشکوں میں نہا جاتی ہے

کیا یہاں دشتِ تمنا میں کوئی پھول کھلا
اب ادھر روز کئی بار صبا آتی ہے

کسی دھنک نے بہت چپکے سے سرگوشی کی
چاند سے چاندنی نزدیک ہوئی جاتی ہے

میری آنکھوں میں اتر آئے ہیں کالے بادل
جاؤ سو جاؤ کہ موسم بڑا جذباتی ہے

خشک پتوں کو کوئی روند رہا ہے شاید
بال بکھرائے ہوئے بادِ صبا آتی ہے

تم نے بھی کم نصیب پہ کچھ کم نگاہ کی
اُس نے تو خیر زندگی اپنی تباہ کی

ہم دونوں دنیا دار نہیں ہیں اسی لئے
صورت کوئی نظر نہیں آتی نباہ کی

پتھر سمجھ کے تم جسے ٹھکرا کے چل دئے
اس دل پہ تھی نگاہ بہت مہر و ماہ کی

اُن کی نظر میں پیار گناہِ عظیم ہے
توفیق دے خدا انھیں ایسے گناہ کی

حالات بے وفائی پہ مجبور کر گئے
ورنہ اسے بھی چاہ بہت تھی نباہ کی

اپنے کو رشکِ میر سمجھتے ہیں بدر جی
گمراہ کر گئی ہے صدا واہ، واہ کی

پچھلی رات کی نرم چاندنی شبنم کی خنکی سے رچا ہے

یوں کہنے کو اُس کا تبسّم، برق صفت ہے شعلہ نما ہے

وقت کو ماہ و سال کی زنجیروں میں جکڑ کر کیا پایا ہے

وقت تو ماہ و سال کی زنجیروں میں اور بھی تیز بڑھا ہے

اک معصوم سے پیار کا تحفہ، گھر کے آنگن میں پایا تھا

اُس کو غم کے پاگل پن میں کوٹھے کوٹھے بانٹ دیا ہے

آنسو، تارے، رنگ، گلاب، سبھی پردیس چلے جاتے ہیں

آخر آخر تنہائی ہے کس نے کس کا ساتھ دیا ہے

نظم، غزل، افسانہ گیت، ایک ترا ہی غم تھا جس کو ہم نے

کیسا کیسا نام دیا ہے، کیسے کیسے بانٹ لیا ہے

آہوں کے بادل کیوں دل میں بن برسے ہی لوٹ گئے

اب کے برس ساون کا مہینہ کیسا پیاسا پیاسا گیا ہے

پھول سی تصویریں ذہن کی دیواروں سے اتار چکا ہوں
پھر کیوں دل میں کانٹا سا رہ رہ کر چبھتا رہتا ہے

مجبوری بھی صبر کیا ہے، پاؤں کو توڑ کے بیٹھ رہے ہیں
نگری نگری دیکھ چکے ہیں، دوارے دوارے جھانک لیا ہے

ان آنکھوں کا متوالا پن، اُن ہونٹوں کی جنبش کم کم،
نشہ ہے جو ڈول رہا ہے، جادو ہے جو بول رہا ہے

مجھ کو اُن سچّی باتوں سے اپنے جھوٹ بہت پیارے ہیں
جن سچّی باتوں سے صدیوں انسانوں کا خون بہا ہے

یارو، سونا چاندی بو کر سونا چاندی کاٹو، جاؤ،
ہم نے آنسو کی کھیتی کی نین نگر آباد کیا ہے

بدرؔ تمھاری فکرِ سخن پر اک علّامہ ہنس کر بولے
یہ لڑکا نوعمر پرندہ، اونچا اُڑنا سیکھ رہا ہے

بزمِ آزمائش ہے، لوگ اپنے شعروں میں تارے توڑ لاتے ہیں
بڑا اچھا موقع ہے دل کی بات کہہ جاؤ وہ بھی سننے آئے ہیں

پتھروں پہ سر رکھ کر رات رات روتے ہو کیا خبر نہیں تم کو
یہ بھی سب سمجھتے ہیں ساتھ ساتھ روتے ہیں اپنا جی دکھاتے ہیں

ہم نے اپنے شعروں میں اپنا دل اُتارا ہے دل میں جو بھی کوئی ہو
وہ ہمارے شعروں کو اپنا عکس کہتے ہیں دیکھ کر لجاتے ہیں

رقصِ نور و نغمہ ہو، (بارشِ کرم ہوگی) آج جشنِ عشرت ہے
پتھروں کے سوداگر، پتھروں کے بھاؤ میں دل خرید لاتے ہیں

روپ دیس کی کلیوں، پنگھٹوں کی سانوریو، کچھ خبر بھی ہے تم کو
ہم تمھارے گاؤں میں پیاسے پیاسے آئے تھے پیاسے پیاسے جاتے ہیں

سردیوں کی راتوں میں اپنے گاؤں میں گرد الاؤ کے بیٹھے
ہم سے کتنے دیوانے تیرے میرے قصّوں میں اپنا غم سناتے ہیں

گاؤں کی کوئی گوری تو رکھ اک ناطہ دور دیس جاتی ہے
ان گھنے درختوں میں آج دف نہیں بجتے، کھیت سر جھکائے ہیں

رنگ و نور کی گڑیو، زندگی کی تصویرو، تم نے رنج و غم میں بھی
اپنی مسکراہٹ سے ہم سے دل شکستوں کے حوصلے بڑھائے ہیں

چاند دیس کے لوگو، دل تمھارے ہوتا ہے، پیار تم سمجھتے ہو،
ہم تو اپنے بچپن سے تم کو چھونے پانے کی حسرتیں چھپائے ہیں

زندگی تری فکریں کھلتے ہی گلابوں کا رس نچوڑ لیتی ہیں
پھول جیسی عمروں کے سوچتے ہوئے بچے بوڑھے ہوتے جاتے ہیں

ایک جاتی دنیا میں، ایک آتی دنیا میں، ایک وقفہ ہوتا ہے
اس سیاہ وقفے میں پھول روندے جاتے ہیں کانٹے پہنے جاتے ہیں

چاند سے کوئی کہہ دو، چاندنی کے شعلوں کے اب الاؤ دہکائے
آج میرے آنگن میں مہکی مہکی زلفوں کے مہکے مہکے سائے ہیں

میں نگارِ فکر و نگاہ کو کبھی بھول کر بھی صدا نہ دوں
یہ عجیب شرطِ وفا ہوئی کہ جو تم کہو میں وہی کہوں

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گذر گئے
جنھیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

مری آرزو ہی کہ ایک رات۔ بس ایک چاندنی رات میں
میں خموش برف کی وادیوں کی اُداس باہنوں میں سو رہوں

یہ ہوا نہ جانے کہاں کہاں بھری دوپہر میں لئے پھرے
مرے برگِ دل ذرا ٹھہر جا تجھے آنسوؤں سے میں سینچ لوں

سرِ شام سے مری منتظر ہے اُداس خوشبوئے دل مگر
مرے لب پہ سرخیٔ دل نہیں مجھے رنگ دو میں بہار ہوں

کسی مصلحت سے بہار خود مرے لب کے پاس ٹھہر گئی
مری آرزو تھی خزاں کے خشک اداس ہونٹوں کو چوم لوں

یہ سفید پھولوں کی چادریں یہ شبنمی کا بنا کفن،
مجھے کچھ نہ دو یہیں رہنے دو کہ اسی گلی کی میں خاک ہوں

میں تو آنسوؤں کا سکوت ہوں لبِ شعر مجھ کو صدا نہ دے
نہ کبیر ہوں نہ نظیر ہوں نہ میں میر ہوں نہ بشیر ہوں

آج دریا، چڑھا چڑھا سا ہے
کوئی ہم سے خفا خفا سا ہے

جسم جیسے بھرا بھرا ساغر
گفتگو میں نشہ نشہ سا ہے

ناک نقشہ بس آپ ہی جیسا،
نام بھی کچھ بھلا بھلا سا ہے

شہر یادوں کا اک بسایا تھا
اب نشاں بھی مٹا مٹا سا ہے

دل سے اک روشنی جہاں میں بھی

یہ دیا بھی بجھا بجھا سا ہے

باغ ہے ایک پھول لاکھوں ہیں

رنگ سب کا جدا جدا سا ہے

شبنمی آگ بھی جلاتی ہے

پھول کا دل جلا جلا سا ہے

کس کو فرصت کہ اک نظر دیکھے

بکار، تنہا بجھا بجھا سا ہے
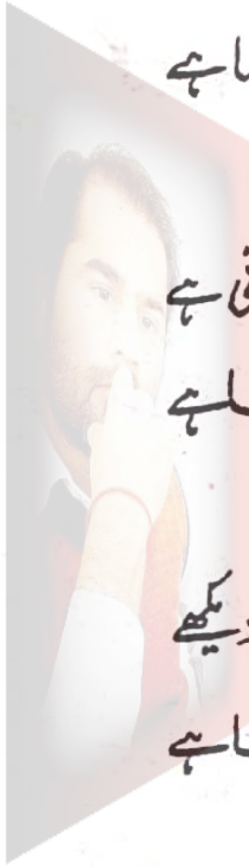
دماغ بھی کوئی مصروف چھاپہ خانہ ہے
وہ شور۔ جیسے کہ اخبار چھپتا رہتا ہے

چراغ جلتے ہی پورس کی فوج بھاگ گئی،
گلی میں تنہا سکندر اُداس بیٹھا ہے

ہزاروں پتّے زمیں پر شہید ملتے ہیں
خزاں کی دھوپ میں نیزہ کوئی چمکتا ہے

زمیں نے مانگ لیا آسماں نے چھین لیا
ہمارے پاس نہ اب جسم ہے نہ سایہ ہے

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رُک جائے
سڑک پہ چلنے لگے تو ہمارا جیسا ہے

جہاں پہ ملتی تھیں دو کرنیں اُس شجر کے تلے
رضائی اوڑھے ہوئے اک فقیر بیٹھا ہے

چائے کی پیالی میں نیلی ٹیبلٹ گھولی،
سہمے سہمے ہاتھوں نے اک کتاب پھر کھولی

دائرے اندھیروں کے، روشنی کے پوروں نے
کوٹ کے بٹن کھولے، ٹائی کی گرہ کھولی

شیشے کی سلائی میں کالے بھوت کا چڑھنا
بام- کاٹھ کا گھوڑا، نیم کا پنچ کی گولی

برف میں دبا مکھن- موت- ریل اور رکشا
زندگی، خوشی رکشا، ریل- موٹریں، ڈولی

اک کتاب، چاند اور پیڑ سب کے کالے کالر پر
ذہنی ٹیب کی گردش منہ میں طوطوں کی بولی

وہ نہیں ملی ہم کو، ہک، بٹن، سرکتی جین،
زپ کے دانت کھلتے ہی آنکھ سے گری چولی

رینگتے دوڑتے ہوئے ڈبّے
سائے کی طرح جھانکتے چہرے

گردنوں میں لٹک رہی ہے زباں
اور آنکھوں پہ رکھے ہیں شیشے

مچھلیاں چل رہی ہیں پنجوں پر
جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے

سازِ پُرشور و کرب ہنستا ہے
بولیاں بولتے ہوئے ڈبّے

اک بڑا۔ کالے جادو کا کمرا
اور پردے پہ لڑکیاں لڑکے

ننگی دیوار کا لباس بنے
کاغذی جسم، رنگ کے چہرے

اب سفر کا نیا طریقہ ہے
لوگ لیٹے ہیں، چلتے ہیں کمرے

کوئی آئینہ ہم کو دے دیتا
دیکھنا یہ ہے ہم بھی کچھ بدلے

دھوپ، کھیتوں میں اُتر کر زعفرانی ہو گئی
سرمئی اشجار کی پوشاک دھانی ہو گئی

جیسے جیسے عمر بھیگی سادہ پوشاکی گئی
سوٹ پیلا، شرٹ نیلی، ٹائی دھانی ہو گئی

اُس کی اردو میں بھی اب کی، مغربی لہجہ ملا
کالے بالوں کی بھی رنگت زعفرانی ہو گئی

سانپ کے بوسے میں کیسا پیار تھا کہ فاختہ
پھڑپھڑا کر اک صدائے آسمانی ہو گئی

نرم ٹہنی دھند کی یلغار کو سہتی ہوئی،
شاخ کی باہوں میں آکر جاودانی ہو گئی

آنکھ لگی تو گلشن گلشن میخانے میخانے تھے
آنکھ کھُلی تو صحرا صحرا ویرانے ویرانے تھے

جیسے سورج کی کرنوں میں پھولوں کا وہ نشو و نما
رنگیں رنگیں، روشن روشن، پیمانے پیمانے تھے

آخر برف کی کفنی پہنے شمع اکیلی اکیلی تھی
جب تک حُسن کا شعلہ چمکا پروانے پروانے تھے

اللہ دین کا چراغ تھا یا جب تک جیب میں نامہ تھا
ساقی ساقی، ساغر ساغر، پیمانے پیمانے تھے

اب جو دل کی بات سُنا دی سب چُپ ہیں سناٹے ہیں
ایک ذرا سی خاموشی پر افسانے افسانے تھے

چلتے ہاتھوں میں دُنیا تھی بڑھتے قدموں کے نیچے
بستی بستی، گلیاں گلیاں، کاشانے کاشانے تھے

تم نے دیکھا کدھر گئے تارے — کس کی آواز پر گئے تارے

یہ کہیں شہرِ آرزو تو نہیں — چلتے چلتے ٹھہر گئے تارے

کب سے ہے آنکھ گود پھیلائے — جھیل میں کیوں اُتر گئے تارے

دور تک نقشِ پائے نور نہیں — جانے کس رہگذر گئے تارے

اُف یہ سائے، اندھیرے سناٹے — جانے کس کے نگر گئے تارے

آج آثارِ صبح سے پہلے — وادیوں میں اتر گئے تارے

سہمے سہمے، بجھے بجھے، مغموم — سر جھکائے گذر گئے تارے

بدر کچھ واں کی بھی خبر ہی تھیں
آنچلوں پر بکھر گئے تارے

بے تحاشا سی لاُابالی ہنسی
چھن گئی ہم سے وہ جیالی ہنسی

لب کھُلے، جسم مسکرانے لگا
پھول کا کھلنا تھا کہ ڈالی ہنسی

مُسکرائی خدا کی محویت
یا ہماری ہی بے خیالی ہنسی

کون بے درد چھین لیتا ہے
میرے پھولوں کی بھولی بھالی ہنسی

وہ نہیں تھا وہاں، تو کون تھا پھر
سبز پتّوں میں کیسے لائی ہنسی

دھوپ میں کھیت گنگنانے لگے
جب کوئی گاؤں کی جیالی ہنسی

ہنس پڑی شام کی اداس فضا
اس طرح چائے کی پیالی ہنسی

میں کہیں جاؤں، ہے تعاقب میں
اس کی وہ جان لینے والی ہنسی

اپنا چاند میں ڈھونڈھ رہا ہوں تیرے چاند ستاروں میں
شاید سچا موتی بھی ہو شیشے کے ان پاروں میں

شاخ پہ جتنے پھول ہیں اکثر بے عطر سے لگتے ہیں
لیکن میں تو اس کی مانوں جو ہنس دے انگاروں میں

لفظ سیاہی کا پردہ ہیں غور سے دیکھو پس منظر
پھول سے چہرے چھپے ہوئے ہیں کاغذ کے انباروں میں

کمرے ویراں - آنگن خالی - پھر یہ کیسی آوازیں
شاید میرے دل کی دھڑکن چُھنی ہے ان دیواروں میں

تقریروں کا جادو اکثر جھوٹ سے ملتا جلتا ہے
اسی لئے تو بات کہی ہے ہم نے صرف اشاروں میں

تیرا جسم اشعار کے آئینہ میں ایسا لگتا ہے
چاند کو جیسے قید کیا ہو شیشے کی دیواروں میں

تہذیبوں کا سورج جب چھپ جاتا ہے تو چپکے سے
الفت دیئے جلا جاتی ہے دل کے گھر سے غاروں میں

چھوٹی سی ہتھیلی کو دکھا کر اک سوداگر نے یہ کہا
صدہا شاعر مل جائیں گے اتنے کم دیناروں میں

اب ہوئی داستاں رقم بابا
انگلیاں ہو گئیں قلم بابا

کاغذی جوئے شیر لاتے ہیں
اپنا تیشہ بھی قلم بابا

چاند اکثر اُداس رہتا ہے
اس کو آخر ہے کس کا غم بابا

آہٹیں، چلمنوں سے پوچھتی ہیں
قید کب تک رہیں گے ہم بابا

اب تو تنہائیاں بھی پوچھتی ہیں
ہے ترا بھی کوئی صنم بابا

عشق نے یہ بھی رُتبہ ہم کو دیا
لوگ کہتے ہیں محترم بابا

نہ جانے کتنے تارے تھرتھرا کے ٹوٹ جاتے ہیں
کبھی جو سُرمگیں آنکھوں میں آنسو جھلملاتے ہیں

یہ سنّاٹا - کہ اپنی سانس کی آہٹ نہیں ملتی
یہ اندھیارا کہ یادوں کے دیے بھی بجھتے جاتے ہیں

پسینے کے سنہرے قطروں یا اشکوں کی لڑیوں سے
بہر صورت یہ دُنیا ہم بناتے ہم سجاتے ہیں

ہر اک خطِّ بدن اُبھرا ہے اُن کا میرے شعروں میں
انھیں اب لوگ غزلوں سے مری پہچان جاتے ہیں

جُھکی پلکیں، گھنے گیسو، حسیں دامن، ڈھلکے آنچل
جہاں کی تپتی راہوں میں یہ سائے یاد آتے ہیں

نہ جانے ان دنوں کیوں صبح کچھ سنولائی رہتی ہے
نہ جانے شام ہی سے کیوں ستارے ڈوب جاتے ہیں

ہمیں کیا، ہم کو مرنا، ہم کو جینا دونوں آتا ہے
ہمیں کیا، ہم تو اپنے خون میں اکثر نہاتے ہیں

رات سے جی ہے سوگوار بہت
یاد آؤ نہ آج یار بہت

پاؤں میں دم رہے دیار بہت
ہاتھ چلتے ہوں روزگار بہت

دل میں ہر وقت ایک ہنگامہ
شہر تنہا ہے شہر یار بہت

دیکھ لیں مہربانیاں تیری
زندگی بن نہ غمگسار بہت

کیا کوئی یار آنے والا ہے
وقت پوچھو ہو آج یار بہت

رات کہتی ہے بدر سو جاؤ
ہو چکا اس کا انتظار بہت

کس دیس میں یہ قافلۂ وقت رُکا ہے
عارض کے اُجالے ہیں نہ زلفوں کی گھٹا ہے

کچھ میری نگاہوں کے تلے دھند بہت ہے
کچھ جشنِ چراغاں سے اندھیرا بھی بڑھا ہے

میں نے تری باتوں کو کبھی جھوٹ کہا تھا
اس جرم پہ ہر جھوٹ کو سچ مان لیا ہے

اے شوخ غزالو، یہاں دو پھول تو رکھ دو
اس قبر میں خوابیدہ محبت کا خدا ہے

عارض سے چھلکتی ہے گلابوں کی گلابی،
میری نگہِ شوق نے وہ رنگ دیا ہے

اب آؤ کلیجے سے لپٹ کر مرے سو جاؤ
باہر کہاں جاؤ گے بڑی سرد ہوا ہے

کچھ دیر میں سانسوں کی بھی آہٹ نہ ملے گی
دل رات کے سنّاٹے میں یوں ڈوب رہا ہے

سرکش پہاڑیوں میں جھرنوں کا بانکپن ہے
کتنا عظیم فانی انسان کا بدن ہے

خوابوں میں اُن گلابی ہونٹوں پہ مسکراہٹ
مہتاب سو رہا ہے، بیدار اک کرن ہے

شاید زمیں کے سینے میں کوئی آسماں ہے
جو ریا کی تہہ میں لرزاں تاروں کی انجمن ہے

اوراقِ سادہ لے کر پریاں اُتر رہی ہیں
پھر سینۂ سخن میں اشعار کی چبھن ہے

اُس برگِ گُل پہ لفظوں کے موتی تھرتھرائے
شبنم ہوا کے رُخ پہ رہا بولتا چمن ہے

سینے پہ پاؤں رکھ کر دنیا گزر رہی ہے
گلرنگ خاکِ دل ہے گلنار یہ چمن ہے

ساحل پہ شام کتنی گمبھیر ہے کہ دریا
رُک رُک کے بہہ رہا ہے آواز میں تھکن ہے

شہرِ نگار میری خاطر اُداس مت ہو
آبِ رواں بھی بے گھر، خوشبو بھی بے وطن ہے

مری غزل کی طرح اس کی بھی حکومت ہے
تمام ملک میں وہ سب سے خوبصورت ہے

کبھی کبھی کوئی انسان ایسا لگتا ہے
پرانے شہر میں جیسے نئی عمارت ہے

جمی ہوئی دیر سے کمرے میں غیبتوں کی نشست
فضا میں گرد ہے، ماحول میں کدورت ہے

بہت دنوں سے مرے ساتھ تھی مگر کل شام
مجھے پتہ چلا وہ کتنی خوبصورت ہے

یہ زائرانِ علی گڑھ کا خاص تحفہ ہے
مری غزل کا تبرک دلوں کی برکت ہے

ہمارا دل، سویرے کا سنہرا جام ہو جائے
چراغوں کی طرح آنکھیں جلیں جب شام ہو جائے

ازل سے ابتدا لے عرضِ دل ہو اور تم چپ ہو
جہاں پر مسکرا کے ہاں کہو انجام ہو جائے

مثالِ غنچہ کھلتے لب کہ جیسے صبح ہوتی ہو
اگر خاموش ہو جائیں سکوتِ شام ہو جائے

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پروئے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں کہ دلِ شاعر پہ چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اُس جانِ تغزل نے جب بھی کہا۔ کچھ کہیے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

صدیوں رہے اُجالا وہ نور بخشتا ہوں
اک چوٹ کھائے دل کے زخموں کا ہیں دیا ہوں

الزام بے وفائی کے اُن کو دے رہا ہوں
شک ہو رہا ہے مجھ کو میں خود ہی بے وفا ہوں

ہر جسمِ گُل فروشاں اب مرکزِ نظر ہے
تم سے بچھڑ کے کتنا آوارہ ہو گیا ہوں

اس شامِ بے کسی میں دل کی خبر نہیں ہے
کب سے کہاں کہاں میں آواز دے رہا ہوں

بیتے ہوئے دنوں کے غم یاد آ گئے ہیں
ان کو گلے لگا کر میں آج رو پڑا ہوں

اس لمحۂ خوشی میں افسانۂ شبِ غم
کچھ تم بھی بھولتے ہو کچھ میں بھی بھولتا ہوں

میرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی
میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

ان پہاڑوں میں رہتے ہیں ہمزاد
بول کر دیکھو بولتا ہے کوئی

آج میں جاگوں گا کہ سوتے میں
میری پلکوں کو چومتا ہے کوئی

میرا شیطان مر گیا شاید
میرے سینے پہ سو رہا ہے کوئی

رنگ یہ بھی بہت پرانا ہے
سوچتا کوئی، بولتا ہے کوئی

سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا
کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی

کوئی ہاتھ نہیں خالی ہے
بابا، یہ کیسی نگری ہے

کوئی کسی کا درد نہ جانے
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے

اُس کا بھی کچھ حق ہے آخر
اُس نے مجھ سے نفرت کی ہے

پھول دوا جیسے جھکے ہیں
کس بیمار کی صبح ہوئی ہے

جیسے صدیاں بیت چکی ہوں
پھر بھی آدھی رات ابھی ہے

کیسے کٹے گی تنہا تنہا
اتنی ساری عمر پڑی ہے

ہم دونوں کی خوب نبھے گی
میں بھی دکھی ہوں وہ بھی دکھی ہے

اب غم سے کیا ناطہ توڑیں
ظالم بچپن کا ساتھی ہے

دل کی خاموشی پہ نہ جاؤ
راکھ کے نیچے آگ دبی ہے

قدم سے آگے آگے چل رہی ہے
مسافر کو گلی پہچانتی ہے

ترے بیمار کا اب تپ لگا ہے
یہ حالت گفتنی کم، دیدنی ہے

نہ جانے کس طرف سے آ رہی ہیں
ہواؤں میں بڑی افسردگی ہے

یہ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں
ستاروں کے لبوں پر کپکپی ہے

ابھی کچھ زندگی کا آسرا ہے
چراغوں میں ابھی کچھ روشنی ہے

سحر کے قافلے یہ جانتے ہیں،
ابھی اک رات کی منزل پڑی ہے

جب سحر چُپ ہو، ہنسا لو ہم کو
جب اندھیرا ہو جلا لو ہم کو

ہم حقیقت ہیں نظر آتے ہیں
داستانوں میں چھپا لو ہم کو

خون کا کام رواں رہنا ہے
جس جگہ چاہو، بہا لو ہم کو

دن نہ پا جائے کہیں شب کا راز
صبح سے پہلے اُٹھا لو ہم کو

دور ہو جائیں گے سورج کی طرح
ہم نہ کہتے تھے، اُچھالو ہم کو

ہم زمانے کے ستائے ہیں بہت
اپنے سینے سے لگا لو ہم کو

وقت کے ہونٹ ہمیں چھو لیں گے
ان کہے بول ہیں گا لو ہم کو

پیار کی چھاؤں میں دو دل جو ذرا مل بیٹھے
بزم میں غزلیں ہوئیں شہر میں افسانے چلے

صبح پھر اپنے ہی تیشے سے کرن پھوٹے گی
رات آئی ہے کسی شہناز کے کاشانے چلے

رس میں ڈوبی ہوئی ان آنکھوں کی جنبش جیسے
مے سے لبریز چھلکتے ہوئے پیمانے چلے

آخری بار گریباں گلے لگ جا میرے
پھر مہکتے ہوئے رومالوں کے نذرانے چلے

ہم بکھرتے ہیں تیرگی کی طرح
درد بڑھتا ہے روشنی کی طرح

ہم خدا بن کے آئیں گے ورنہ
ہم سے مل جاؤ آدمی کی طرح

برف سینے کی جیسے جیسے گلی
آنکھ کھلتی گئی کلی کی طرح

جب کبھی بادلوں میں گھرتا ہے
چاند لگتا ہے آدمی کی طرح

کسی روزن، کسی دریچے سے
سامنے آؤ روشنی کی طرح

سب نظر کا فریب ہے ورنہ
کوئی ہوتا نہیں کسی کی طرح

خوبصورت، اداس، خوفزدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی

اُجالوں کی پریاں نہانے لگیں
ندی گنگنائی، خیالات کی

میں چپ تھا تو چلتی ہوا رُک گئی
زباں سب سمجھتے ہیں جذبات کی

مقدّر مری چشمِ پُر آب کا
برستی ہوئی رات برسات کی

کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

سورج مکھی کے گالوں پہ تازہ گلاب ہے
یہ میرا آفتاب، مرا ماہتاب ہے

ہر تار کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی دعا
یہ آسمان، حمد و ثنا کی کتاب ہے

بادل ہوا کی زد پہ برس کر بکھر گئے
اپنی جگہ چمکتا ہوا آفتاب ہے

ناحق خیال کرتے ہو دنیا کی بات کا
تم کو خراب جو کہے وہ خود خراب ہے

سب رشتے ٹوٹ جاتے ہیں برگِ بہار کے
اُڑنا ہوا کے دوش پہ کیسا عذاب ہے

بدستِ چرخ بریں ماہ ناے جام اٹھا
صد آفتاب گلابی مہ تمام اٹھا

گدائے جرعہ کو بہت حقیر نہ جان
کہ اس فقیر سے اس میکدے کا نام اٹھا

بہت سیاہ، بہت چپ، بہت اداس ہے رات
برنگِ خونِ تمنا، اک اور جام اٹھا

بایں مظاہرۂ التفاتِ ساقی وے
کسے خبر کہ کوئی کتنا تشنہ کام اٹھا

حضورِ جبر کسی مصلحت کے پیشِ نظر
وہ دست مرد نہیں جو پئے سلام اٹھا

صدائے ساز پہ یاں سوئے درد جاگ پڑے
میانِ بزمِ طرب کون شاد کام اُٹھا

وہ رُک گئے تو زمیں اپنا رقص بھول گئی
قدم اٹھائے تو پھر محشر خرام اُٹھا

سمندروں میں یہ طوفان روز آتے ہیں،
اُٹھ اور کارگہِ زندگی کے کام اُٹھا

کسے بقا ہے کہ روئیں بشیرؔ بدر کو ہم
مگر زمانے سے اک قادر الکلام اُٹھا

مجھ کو براہِ راست کوئی تجربہ نہیں
اِن گل رخوں میں کہتے ہیں بوئے وفا نہیں

کچھ بے وفائیاں بھی ضرور ہیں عشق میں
ورنہ خدا گواہ ہے میں بے وفا نہیں

خوابوں کے قافلے کہیں نرغوں میں کھو گئے
آنکھوں میں آج نیند کا کوسوں پتہ نہیں

شکرِ خدا نظر کبھی نیچی نہیں ہوئی
یہ سر بھی آج تک کبھی بے جا اُٹھا نہیں

یہ آگ بجھ رہی ہے اسے اب ہوا نہ دو
تم سے تو کوئی راز ہمارا چھپا نہیں

رنج اُس نے کچھ سوا دئیے یہ حق اُسی کا تھا
اتنا قریب دوسرا کوئی رہا نہیں

مجروح بہت ہے دل پھر بھی شفقستاں ہے
یہ برگِ خزاں دیدہ ہمرازِ بہاراں ہے

طاقوں کے دیے سوئے آنکھوں کے دیے جاگے
یہ صبح چراغاں ہے یا شامِ چراغاں ہے

اس رہگذرِ دل سے یوں لشکرِ غم گذرا
جو شہر نگاراں تھا وہ شہرِ خموشاں ہے

اے چاند کے سودائی، تاروں کے تمنائی
آنسو بھی نہ آئیں گے یہ شامِ غریباں ہے

اُس چشم کی معصومی، چالاکی و حیرانی
اور رمز و کنائے بھی گویا غزلستاں ہے

جب چاہے جدھر چاہے وہ بارشِ گُل کر دے
اُس جانِ گلستاں کے ہاتھوں میں گلستاں ہے

دل پر کبھی غیروں کا سایہ بھی نہ پڑ پائے
یہ خطۂ محبوباں، یہ شہرِ عزیزاں ہے

ذرّوں میں کنمناتی ہوئی کائنات ہوں
جو منتظر ہے جسموں کی میں وہ حیات ہوں

دونوں کو پیاسا مار رہا ہے کوئی یزید
یہ زندگی حسین ہے اور میں فرات ہوں

"نیزہ زمیں پہ گاڑ کے گھوڑے سے کود جا"
پر میں۔ زمیں پہ آبلہ پا خالی ہات ہوں

کیسا فلک ہوں، جس پہ سمندر سوار ہے
سورج بھی میرے سر پہ ہے میں کیسی رات ہوں

اندھے کنوئیں میں مار کے جو پھینک آئے تھے
ان بھائیوں سے کہیو، ابھی تک حیات ہوں

آتی ہوئی ٹرین کے جو آگے بکھر گئی
اس ماں سے یہ نہ کہنا بقیدِ حیات ہوں

بازار کا نقیب سمجھ کر مجھے نہ چھیڑ
خاموش رہنے دے میں ترے گھر کی بات ہوں

مری نظر میں خاک، ترے آئینے پہ گرد ہے
یہ چاند کتنا زرد ہے، یہ رات کتنی سرد ہے

کبھی کبھی تو یوں لگا کہ ہم سبھی مشین ہیں
تمام شہر میں نہ کوئی زن نہ کوئی مرد ہے

خدا کی نظموں کی کتاب ساری کائنات ہے
غزل کے شعر کی طرح ہر ایک فرد، فرد ہے

حیات آج بھی کنیز ہے حضورِ جبر میں
جو زندگی کو جیت لے وہ زندگی کا مرد ہے

اسے تبرک حیات کہہ کے پلکوں پر رکھوں
اگر مجھے یقین ہو یہ راستے کی گرد ہے

وہ جن کے ذکر سے رگوں میں دوڑتی تھیں بجلیاں
انھیں کا ہاتھ ہم نے چھو کے دیکھا کتنا سرد ہے

رات بھیگی تو تھکے شہر کو یاد آنے لگے
نیند کے گاؤں جو آباد ہیں پلکوں کے تلے

ڈاکٹر، خواب کے ناخن تھے ہلاہل میں بجھے
حسبِ معمول بڑی زور سے ہم چیخ پڑے

جیسے سچ مچ ہو بڑی نیند میں اس شوخ کی یاد
ایسا سینے میں بنی لیٹی ہے آنکھیں میچے

میں نے سمجھایا کہ سورج بھی جھکے گا در پر
ورنہ تاروں کی طرف منہ کیے دروازے تھے

کل جسے رات کی گاڑی پہ ہمیں نے چھوڑا
وہ تو آنکھوں میں پھرے ہی مگر ہم ہی نہ پھرے

اک پری کے ساتھ موجوں پر ٹہلتا رات کو
اب بھی یہ قدرت کہاں ہے آدمی کی ذات کو

جن کا سارا جسم ہوتا ہے ہماری ہی طرح
پھول کچھ ایسے بھی کھلتے ہیں ہمیشہ رات کو

ایک اک کر کے سبھی کپڑے بدن سے گر چکے
صبح پھر ہم یہ کفن پہنائیں گے جذبات کو

پیچھے پیچھے رات تھی تاروں کا اک لشکر لئے
ریل کی پٹری پہ سورج چل رہا تھا رات کو

آب و خاک و باد میں بھی لہر وہ آجائے ہے
سرخ کر دیتی ہے دم بھر میں جو پیلی دھات کو

صبح بستر بند ہے جس میں لپٹ جاتے ہیں ہم
اک سفر کے بعد پھر کھلتے ہیں آدھی رات کو

سر پہ سورج کے ہمارے پیار کا سایہ رہے
مامتا کا جسم مانگے زندگی کے ہات کو

سفاک آنکھیں، تیز ٹرک کی مجھے لگا / اک موت کا فرشتہ تھا ہنستا گذر گیا

وہ پھول تیرے ہونٹوں کے چھونے سے جو کھلا / وہ پھول، اور جون کی آتش بھری ہوا

نیزوں نے مجھ کو جیسے زمیں سے اُٹھا لیا / میں تیرے نرم سینے سے جب دم جدا ہوا

جیسے کہ سارے شہر کی بجلی چلی گئی / آنکھیں کھُلی کھُلی تھیں مگر سوجھتا نہ تھا

تصویر میری پردۂ تخلیق بن گئی، / چڑیا نے اس کی آڑ میں اک گھر بسا لیا

باتیں کہ جیسے پانی میں جلتے ہوئے دیے / کمرے میں نرم نرم اُجالا سا بھر گیا

سر درد، جیسے نیند کے سینے پہ سو گیا / اُن پھول جیسے ہاتھوں نے ماتھا جونہی چھوا

اک لڑکی، ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی / میں اُجلی، دھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا

سناٹے آئے درجوں میں جھاڑ کا چلے گئے / گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

ٹہنی گلاب کی مرے سینے سے لگ گئی / جھٹکے کے ساتھ کار کا رکنا غضب ہوا

گاؤں چھوڑا تو کئی آنکھوں میں کاجل پھیلا　　شہر پہنچا تو کسی ماتھے پہ جھومر جھوما

زندگی تو نے مجھے مار دیا تھا لیکن　　یہ تو میں تھا جو ترے زندوں سے بہتر ہی جیا

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے　　انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

وہ تو انساں تھی۔ تری یاد کی محویت میں　　در و دیوار کو سینے سے لگا کر چوما

آج کی شام دوبارہ نہ کبھی آئے گی　　آج کی شام نہ یہ سوچ کہ کل کیا ہوگا

دکھ بھرا پیار، سمندر کی طرح لامحدود　　غمزدہ حسن رواں پانی میں گھلتا سونا

میرے ہاتھوں سے کبھی چھوٹا تھا اک آئینہ　　عمر بھر جس کو مری آنکھوں نے پلکوں سے چنا

رات خاموشئ دل چھا گئی جب دنیا پر　　کوئی بولا تھا بہت پاس وہ تم تھے کہ خدا

خوبصورت ہے بہت پیار کی خوش فہمی بھی　　بند پلکوں کو ترے ہونٹوں نے جیسے چوما

کوئی آیا تھا۔ نہیں۔ تیز ہوا تھی شاید　　میز اور فرش پہ بکھری ہوئی ہے لو لیتا

جب تک نگارِ دشت کا سینہ دُکھا نہ تھا — صحرا میں کوئی لالۂ صحرا کھلا نہ تھا

دو جھیلیں، اُس کی آنکھوں میں لہرا کے سو گئیں — اس وقت میری عمر کا دریا چڑھا نہ تھا

جاگی نہ تھیں نسوں میں محبت کی ناگنیں — اس گندمی شراب کو جب تک چکھا نہ تھا

ڈھونڈا کرو جہانِ تحیر میں عمر بھر — وہ چلتی پھرتی چھاؤں ہو میں نے کہا نہ تھا

اک بے وفا کے سامنے آنسو بہاتے ہم — اتنا ہماری آنکھ کا پانی مرا نہ تھا

دو کالے ہونٹ، جام سمجھ کر چڑھا گئے — وہ آب جس سے میں نے وضو تک کیا نہ تھا

سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کو لائے تھے — اک ہم ہی ایسے تھے کہ ہمارا خدا نہ تھا

وہ کالی آنکھیں، شہر میں مشہور تھیں بہت — تب اُن پہ موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھا نہ تھا

میں صاحبِ غزل تھا حسینوں کی بزم میں — سر پہ گھنیرے بال تھے ماتھا کھلا نہ تھا

موجۂ گل کے پیچھے پڑ کر کیوں دیوانی ہوئی ہے مٹی
ٹھوکر کھا کر خود آئے گا جس کی جہاں لکھی ہے مٹی

کلیاں گھپ ہیں، میداں چپ ہیں، زرد دیوانہ بھی نہیں
مٹی کا دل بیٹھ گیا ہے کس کی آج اٹھی ہے مٹی

آنکھیں آنسو، دل بھی آنسو، شاید ہم سر تا پا آنسو
تھوڑی مٹی اور رلا دے ابھی بہت گیلی ہے مٹی

مٹی کا اک اور کھلونا زیست بنانے والی ہے
خاموشی سے دیکھ تو آؤ اس آنچل میں بندھی ہے مٹی

…ہن جیسی دیواروں ہوں یا انساں کا جسم خاکی
مٹی کی فطرت آزادی ہے قید نہیں رہ سکتی مٹی

پچھلے سال یہیں بہت سی ٹوٹی قبریں منہ کھولے تھیں
دھرتی کے زخموں کو کتنی جلدی بھر دیتی ہے مٹی

…ں ٹھہرا مٹی کا مادھو، جا دیوانی رادھے اپنی
تو سونے چاندی کی مورت خود کو کیوں کہتی ہے مٹی

…جو دل سے نازک تر تھی پہلے اک پتھر کا بت تھی
صدیوں یہ آنکھیں روئی ہیں صدیوں تک بھیگی ہے مٹی

…ذرے میں راز نیا ہے گو مٹی کے تم ہو کھلونے
اک اک شعر میں بدر تمھارے جلنے والی ہے مٹی

بزم و بازار میں ہر جا ٹھہرا   دل اکیلا تھا اکیلا ٹھہرا

دوڑتے پیڑ گرے میری طرح   ساتھ چلتا ہوا صحرا ٹھہرا

یاد، ٹھہرے ہوئے دریا کا بہاؤ   فکر، بہتا ہوا دریا ٹھہرا

گرد آلود ہوا دشتِ ادب   جب بھی احساس کا دریا ٹھہرا

بد نظر صاحبِ دیدہ کہلائے   میں نے گھورا نہیں، اندھا ٹھہرا

ضبط و تہذیب کی قدریں بدلیں   میں نہ چیخا وہاں گونگا ٹھہرا

تاڑ کی طرح میں سیدھا سچّا   ترچھا دیکھا مجھے ترچھا ٹھہرا

ابتدا میں کئی ہم جیسے تھے   آخرش کوئی نہ ہم سا ٹھہرا

آنکھ پر شیشۂ زرد رنگ چڑھا   دھوپ کا رنگ سنہرا ٹھہرا

نقرئی قہقہہ شرما کے رکا   رنگ اور نور کا دریا ٹھہرا

بادر، دو آنکھیں۔ بہت ڈھونڈھ رہی ہیں تمکو
چاند کی چودھویں تاریخ ہے اوپر دیکھو

رات سوئی رعنائیوں نے مجھ سے کہا
ہم تمھاری ہی غزل ہیں کبھی ہم کو بھی کہو

چاندنی رات میں کہہ جاتی ہے آہٹ جیسے
ہم بہت پاس ہیں آواز نہ دو ہمکو سنو

جس سے امیدِ وفا ہوگی وہی دکھ دیگا
بے وفا جان کے چاہو جسے اب کی چاہو

اُس کی قدرت میں نہیں کہ کوئی بات سُنے
وقت آواز ہے، آواز کو آواز نہ دو

منتظر کب سے ہیں اوراق کتابِ ہستی
دل کا کچھ رنگ کرو نوکِ قلم کو چومو

ایک آواز بہت کافی ہے سوتے کے لئے
لوگ سمجھیں گے بنے لیٹے ہو اب جاگ پڑو

آج کمرے میں نہیں بیٹھنے والا موسم
برف گرنے کی خبر گرم ہی گھر سے نکلو

خفتہ شجر لرز اٹھے جیسے کہ ڈر گئے — کچھ چاندنی کے پھول زمیں پر بکھر گئے

شیشے کا تاج سر پہ رکھے آ رہی تھی رات — ٹکرائی ہم سے چاند ستارے بکھر گئے

وہ خشک ہونٹ، ریت سے نم مانگتے رہے — جس کی تلاش میں کئی دریا گزر گئے

چاہا تھا میں نے چاند کی پلکوں کو چوم لوں — ہونٹوں پہ میرے صبح کے تارے بکھر گئے

میرے لبوں پہ چاند کی قاشیں لرز گئیں — آنکھوں پہ جیسے رات کے گیسو بکھر گئے

تلوؤں میں نرم دھوپ لئے جب گئی سحر — پلکوں پہ سوئے چاندنی کے خواب، ڈر گئے

ساحل پہ رک گئے تھے ذرا دیر کے لئے — آنکھوں سے دل میں کتنے سمندر اتر گئے

پایا جو مسکراتے ہوئے کہہ اٹھی بہار — جو زخم پچھلے سال لگائے تھے بھر گئے

جن پر لکھی ہوئی تھی محبت کی داستاں — وہ چاک چاک پرزے ہوا میں بکھر گئے

خون پتوں پہ جما ہو جیسے
پھول کا رنگ ہرا ہو جیسے

بارہا یہ ہمیں محسوس ہوا
درد سینے کا خدا ہو جیسے

یوں ترس کھا کے نہ پوچھو احوال
تیر سینے پہ لگا ہو جیسے

پھول کی آنکھ میں شبنم کیوں ہے
سب ہماری ہی خطا ہو جیسے

کرچیں چبھتی ہیں بہت سینے میں
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے

سب ہمیں دیکھنے آتے ہیں مگر
نیند آنکھوں سے خفا ہو جیسے

اب چراغوں کی ضرورت ہی نہیں
چاند اس دل میں چھپا ہو جیسے

جی میں آتا ہے کہ سجدہ کر لیں
دل کی آواز خدا ہو جیسے

روز آتی تھی ہوا اس کی طرح
وہ بھی یوں آیا ہوا ہو جیسے

صورتِ شمع ساری رات جلو　　صبح لیکن مثالِ غنچہ ہنسو

چاند کا داغ دیکھنے والو　　اپنے دامن کا داغ بھی دیکھو

چاہے آنکھوں کی روشنی لے لو　　آنسوؤ آج رات بھر چمکو

اے شبِ غم کے جاگتے تارو　　رات کافی ہے جاؤ سو جاؤ

آؤ اک دوسرے کا غم بانٹیں　　کچھ ہماری سنو کچھ اپنی کہو

کون جانے کہاں بچھڑ جائیں　　راہ تاریک ہے قریب رہو

یہ زمیں مدتوں کی پیاسی ہے　　آنسوؤں دل پہ ٹوٹ کر برسو

وقت سب منصفوں کا منصف ہے　　وقت آئے گا انتظار کرو

چشم مانگے ہے آج دل کا لہو

بدر صاحب کا کوئی شعر پڑھو

شعلۂ گل، گلاب شعلہ کیا　　　آگ اور پھول کا یہ رشتہ کیا

تم مری زندگی ہو یہ سچ ہے　　　زندگی کا مگر بھروسہ کیا

کتنی صدیوں کی قسمتوں کا امیں　　　کوئی سمجھے بساطِ لمحہ کیا

جو نہ آداب دشمنی جانے　　　دوستی کا اسے سلیقہ کیا

جب کمر باندھ لی سفر کے لئے　　　دھوپ کیا مینھ کیا ہمسایہ کیا

جن کو دنیا غزل سمجھتی ہے　　　پوچھتے ہیں وہ شعر و مصرعہ کیا

کام کی پوچھتے ہو گر صاحب　　　عاشقی کے علاوہ پیشہ کیا

بات مطلب کی سب سمجھتے ہیں　　　صاحبِ نشہ، غرقِ بادہ کیا

دل دکھوں کو سبھی سناتے ہیں　　　شعر کیا، گیت کیا، فسانہ کیا

سب ہیں کردار اک کہانی کے
ورنہ شیطان کیا، فرشتہ کیا

جان کر ہم بشیر بدر ہوئے
اس میں تقدیر کا نوشتہ کیا

زخم یوں مسکرا کے کھلتے ہیں — جیسے وہ دل کو چھوتے گزرے ہیں

درد کا چاند، آنسوؤں کے نجوم — دل کے آنگن میں آج اترے ہیں

راکھ کے ڈھیر جیسے سرد مکاں — چاند ان بدلیوں میں رہتے ہیں

پتھروں پر انھیں کہاں لائیں — وہ ابھی رنگ و بو میں رہتے ہیں

آئینوں کا کوئی قصور نہیں — اُن میں اپنے ہی عکس ہوتے ہیں

غور سے دیکھ، خاک تنہا نہیں — ساتھ پھولوں کے رنگ اڑتے ہیں

کوئی بیمار کے قریب رہو — شام ہی سے چراغ سوئے ہیں

الاماں شاعرانِ خستہ حال — کتنے عاشق مزاج ہوتے ہیں

اب شبِ ہجر بھی نہیں آتی — ان دنوں ہم بہت اکیلے ہیں

اِن سے احوالِ شب سنو صاحب،

ہم رجی رات رات گھومے ہیں

یہ اُداسی، دھواں، چاندنی چوک میں
چاندنی ہے کہاں چاندنی چوک میں

ایک ہی گشت میں اگ سی لگ گئی
سردیاں ہیں کہاں چاندنی چوک میں

ہر حسینہ دار زہرہ جبیں، سمن بدن
ہر دکاں کہکشاں چاندنی چوک میں

ایک لڑکی کی صورت میں دیکھا گیا
خوابِ صد شاعراں چاندنی چوک میں

آج عہدِ گذشتہ کے اک مہرباں
مل گئے ناگہاں چاندنی چوک میں

میری آنکھوں میں اک چاندنی چوک ہے
گزری عمرِ رواں چاندنی چوک میں

نقرئی قہقہے، غم دبائے ہوئے
یہ بہارِ خزاں، چاندنی چوک میں

مشقِ شعر و سخن میں ملے گا کہیں
لشکرِ شاعراں چاندنی چوک میں

فکرِ اصلاحِ دنیا میں کھوئے ملے
آلِ پیغمبراں چاندنی چوک میں

بیچ بازار میں گا رہا تھا کوئی
آؤ نا میری جاں، چاندنی چوک میں

دولتِ جسم و جاں کا بھروسہ نہیں
کچھ خرید و میاں چاندنی چوک میں

وہ پیاسے جن کے بہت پیاسے لوٹ جاتے ہیں
جو دور دور سے بادل اڑا کے لاتے ہیں

کوئی لباس نہیں دل کی بے لباسی کا
اگرچہ روز نئی چادریں چڑھاتے ہیں

خلوصِ شبنم و نکہت، وفورِ آتشِ گل
وہ ہونٹ جو تری پلکوں پہ کپکپاتے ہیں

یہ بات کیوں کہی مجھ سے سکوتِ دریا نے
چراغ پانی میں اکثر بہائے جاتے ہیں

ستارے کھوئے ہوئے بچے ہیں جنھیں اکثر
وہ ساتھ کھیلے ہوئے دوست یاد آتے ہیں

پکار اٹھے مسافر کو جیسے چاند کا شہر
کہ خفتہ جسم کبھی یوں بھی جاگ جاتے ہیں

لرز رہے ہیں ستارے سحر کی آنکھوں میں
چمن کے شبنمی رخسار تھرتھراتے ہیں

ہمارے شعر گناہِ زمیں کا وہ نغمہ
جسے فلک کے فرشتے بھی گنگناتے ہیں

قصیدہ حسن کا اور حسن کو سناؤ گے
بتاؤ پھول کو خوشبو کہیں سنگھاتے ہیں

ستارہ بن کے بھٹکتے ہیں ساری ساری رات
جو وعدہ کر کے وفا کرنا بھول جاتے ہیں

ترا سکوت ہے اکثر تحیرِ نغمہ
خموش رہ کے بھی یہ ہونٹ گنگناتے ہیں

میں دن ہوں میری جبیں پر دکھوں کا سورج ہے
دیئے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

جلا رہا ہے ستاروں کو انتظار مرا
مگر وہ اشک جو پلکوں پہ تھرتھراتے ہیں

انھیں کے پاس ملیں گے کئی نوادرِ غم
وہ قافلے جو رہِ دل پہ آتے جاتے ہیں

گھنے درختوں کے جنگل بھی سوکھ جاتے ہیں
گلاب سا وہ بدن کیا ہوا ئے درد میں تھا

خوشا یہ قدر تو ہے اس اداس نسل کے پاس
اُداس بھی جو نہ ہوں گے وہ لوگ آتے ہیں

وہ صورت گردِ غم میں چھپ گئی ہو
بہت ممکن یہ وہ ہی آدمی ہو

میں ٹھہرا آبشارِ شہرِ پُرفن
گھنے جنگل کی تم بہتی ندی ہو

بہت مصروف ہے انگشتِ نغمہ
مگر تم تو ابھی تک بانسری ہو

مری آنکھوں میں ریگستاں بسے ہیں
کوئی ایسے میں ساون کی جھڑی ہو

دِیا جو بجھ چکا ہے پھر جلانا
بہت محسوس جب میری کمی ہو

یہ شب جیسے کوئی بے ماں کی بچّی
اکیلے روتے روتے سو گئی ہو

وہ دریا میں نہانا چاندنی کا
کہ چاندی جیسے گھُل کر بہہ رہی ہو

کہانی کہنے والے کہہ رہے ہیں
مگر جانے وہی جس پر پڑی ہو

میاں! دیوان کا مت رعب ڈالو
پڑھو کوئی غزل جو واقعی ہو

غزل وہ مت سنانا ہم کو شاعر
جو بے حد سامعین میں چل چکی ہو

منزل پہ حیات آ کے ذرا تھک سی گئی ہے
معلوم یہ ہوتا ہے بہت تیز چلی ہے

شاید شبِ ہجراں سے ترا ذکر ہوا تھا
اے موت بھلی آئی۔ تری عمر بڑی ہے

اب انجمنِ ناز سے وحشت کا سبب کیا
شاید مجھے تنہائیِ شب ڈھونڈ رہی ہے

بیمار کے چہرے پہ سویرے کی سپیدی
خاکم بدہن اب یہ چراغِ سحری ہے

یہ بات کہ صورت کے بھلے دل کے بُرے ہوں
اللہ کرے جھوٹ ہو بہتوں سے سُنی ہے

تا حدِ نظر شہرِ خموشاں کے نشاں ہیں
اللہ مُسافر کی کہاں شام ہوئی ہے

ہم دلّی بھی ہو آئے ہیں لاہور بھی گھومے
اے یار! مگر تیری گلی۔ تیری گلی ہے

وہ ماتھے کا مطلع ہو کہ ہونٹوں کے دو مصرعے
بچپن سے غزل ہی مری محبوب رہی ہے

غزلوں نے وہیں زلفوں کے پھیلا دئے سائے
جن راہوں پہ دیکھا کہ بہت دھوپ کڑی ہے

محفلِ میکشاں کوچۂ دلبراں　ہر جگہ ہو لیے اب چلیں دل کہاں

مصلحت چاہتی ہے کہ منزل ملے　اور دل ڈھونڈھتا ہے کوئی کارواں

چاندنی بھی مری طرح حیرت میں ہے　چھپ گیا کوئی آواز دے کر کہاں

اب وہاں پیار کی بستیاں بس گئیں　جس گلی سے گئے تھے تمہی بے نشاں

جانی پہچانی ہے ہر ادا ہر نظر　ہاں، مگر یہ نہیں یاد دیکھا کہاں

رات یوں غم نے پھر دل میں آواز دی　جیسے صحرا کی مسجد میں شب کی اذاں

گرد اُڑ اُڑ کے مُنہ اپنا دیکھا کرے　رکھی ہے راہ میں آئینوں کی دُکاں

کچھ تو میں بھی بہت دل کا کمزور ہوں　کچھ محبت بھی ہے فطرتاً بدگماں

تذکرہ کوئی ہو، ذکر تیرا رہا　اول و آخرش، درمیاں درمیاں

جانے کس دیس سے دل میں آجاتے ہیں　چاندنی رات میں درد کے کارواں

درمیاں میں نہ لائیں خدا کو بھی ہم　بس وہی وہ سُنے جس کی ہے داستاں

گرد آلود چہرے پہ حیرت نہ کر دشت در دشت گھومی ہی عمرِ رواں

بدرؔ صاحب اُدھر کا نہ رُخ کیجیے

دلّی، لاہور ہیں شہرِ جادو گراں

ہم کو کافی ہیں یہی حلقۂ زنجیرِ سخن
جاؤ مِل جُل کے تمھیں بانٹ لو جاگیرِ سخن

وارثِ ملکِ غزل روئے تو رو لینے دو
غسلِ اشکیں سے ہوا کرتی ہے تطہیرِ سخن

زندگی رات ہی اور رات بھی بیمار کی رات
درد بن بن کے چمکتی رہے تنویرِ سخن

گفتگو، جیسے کہیں دور غزل گائے کوئی
خامشی جیسے کہ لب کھولے ہو تصویرِ سخن

ضبط کی دھار سے کٹ جاتا ہی آہن کا جگر
لوگ پھولوں پہ رواں کرتے ہیں شمشیرِ سخن

ہم بھی آئینہ صفت تھے کبھو لیکن اب تو
اپنے ماتھے پہ اُبھر آئی ہے تحریرِ سخن

ہم جو مٹ جائینگے مٹ جائیگی تہذیبِ غزل
اپنی تقدیر میں پوشیدہ ہی تقدیرِ سخن

واہ وا کیسی میاں، آہ بھی کرنی ہو محال
واقعی سینے میں لگ جائے اگر تیرِ سخن

بدرؔ، ہر فرد کو انسان نہیں کہہ سکتے
بدرؔ، ہر شعر میں ہوتی نہیں تاثیرِ سخن

یہ وحشتِ غم کی تپش بیش از عذابِ لنا — نہ کوئی چھاؤں گھنی ہے نہ سایۂ دیوار

ز فرق تا بقدم ایک موجۂ مے ناب — تکلمش کہ بجے جیسے چاندنی میں ستار

تمام رات میں خوابوں میں جاگتا ہی رہا — چڑھا ہوا ہے ان آنکھوں میں رات بھر کا خمار

ڈھلا جوانی کا سورج، وہ دھوپ چھاؤں گئی — نہ اب وہ پاؤں میں چکّر نہ کوچۂ دلدار

تمام دوستوں کا اعتبار چھین لیا — اُس اجنبی نے نہیں جس سے کوئی قول و قرار

ازل کی تشنگی دل کو اور تیز کرے — یہ تیری نرم نگاہی کی نرم نرم پھوار

نہ جانے کون ادا تیری ہم کو لوٹ گئی — نہ ہم ستم کے ستائے نہ ہم کرم کے نثار

یہاں تو ساز کی موجوں میں بزم ڈوبی ہے — سنے گا کون بھلا اک خموش دل کی پکار

بجھی بجھی سی فضائیں، رگیں سی ٹوٹتی ہیں — نشہ اُتر چکا کب کا، اُتر رہا ہے خمار

پھر اس کے بعد مرے زخمِ دل گنے گا کوئی — ابھی تو چاند ستاروں کا ہو رہا ہے شمار

مری نگاہ جدھر بھی گئی خزاں ہی ملی
نہ جانے کتنے برس ہو گئے نہ دیکھی بہار

رات اک خواب ہم نے دیکھا ہے — پھول کی پنکھڑی کو چوما ہے

دل کی بستی بھی شہر دلی ہے — جو بھی گذرا ہے اس نے لوٹا ہے

خندۂ گل فریب ہے گل کا — رات بھر چپکے چپکے رویا ہے

ہم تو کچھ دیر ہنس بھی لیتے ہیں — دل ہمیشہ اُداس رہتا ہے

اب بجز تیری یاد کے اے دوست — اس خرابے میں کون آتا ہے

پیسہ ہاتھوں کا میل ہے بابا — زندگی چار دن کا میلہ ہے

کوئی مطلب ضرور ہوگا میاں — یوں کوئی کب کسی سے ملتا ہے

تم اگر مل بھی جاؤ تو بھی ہمیں
حشر تک انتظار کرنا ہے

پہلا سا وہ زور نہیں ہے میرے دکھ کی صداؤں میں

شاید پانی نہیں رہا ہے اب پیاسے دریاؤں میں

جس بادل کی آس میں جوڑے کھول لئے ہیں سہاگن نے

وہ پربت سے ٹکرا کر برس چکا صحراؤں میں

جانے کب تڑپے اور چمکے سونی رات کو پھر ڈس جائے

مجھ کو ایک روپہلی ناگن بیٹھی ملی ہے گھٹاؤں میں

پتّہ تو آخر پتّہ تھا گنجان گھنے درختوں نے

زمیں کو تنہا چھوڑ دیا ہے اتنی تیز ہواؤں میں

دن بھر دھوپ کی طرح سے ہم چھائے رہتے ہیں دنیا پر

رات ہوئی تو سمٹ کے آ جاتے ہیں دل کی گپھاؤں میں

کھڑے ہوئے جو ساحل پر تو دم میں پلکیں بھیگ گئیں

شاید آنسو چھپے ہوئے ہوں صبح کی نرم ہواؤں میں

غزل کے مندر میں دیوانہ مورت رکھ کر چلا گیا

کون اسے پہلے پوجے گا بحث چلی دیوتاؤں میں

دھوپ کی آگ میں گلزارِ خزاں روشن ہے

زرد پتّوں میں کوئی دردِ تپاں روشن ہے

جس کو دیکھو مرے ماتھے کی طرف دیکھے ہے

درد ہوتا ہے کہاں اور کہاں روشن ہے

یاد جب گھر کی کبھی آتی ہے تو لگتا ہے

رات کی راہ میں شیشے کا مکاں روشن ہے

چاند جس آگ میں جلتا ہے اُسی شعلے سے

برف کی وادی میں کہرے کا دھواں روشن ہے

جیسے دریاؤں میں خاموش چراغوں کا سفر

ایسا نس نس میں مرے دردِ رواں روشن ہے

صبح سے ڈھونڈھ رہے تھے کہ کہاں ہے سورج

اب نظر آئے ہو تو سارا جہاں روشن ہے

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

اک ذہنِ پریشاں میں خوابِ غزلستاں ہے
پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے

دل سے جو چھٹے بادل تو آنکھ میں ساون ہے
ٹھہرا ہوا دریا ہے، بہتا ہوا پانی ہے

ہم رنگِ دلِ پُرخوں ہر لالۂ صحرائی
گیسو کی طرح مضطرب اس رات کی رانی ہے

جس سنگ پہ نظریں کیں خورشید حقیقت ہے
جس چاند سے منہ موڑا پتھر کی کہانی ہے

اے پیرِ خردمنداں دل کی بھی ضرورت ہے
یہ شہرِ غزالاں ہے یہ مُلکِ جوانی ہے

غم وجہِ فگارئ دل، غم وجہِ قرارِ دل
آنسو کبھی شیشہ ہے آنسو کبھی پانی ہے

اس حوصلۂ دل پر ہم نے بھی کفن پہنا
ہنس کر کوئی پوچھے گا کیا جان گنوانی ہے

دن تلخ حقائق کے صحراؤں کا سورج ہے
شب گیسوئے افسانہ یادوں کی کہانی ہے

وہ حُسن جسے ہم نے رسوا کیا دنیا میں
نادیدہ حقیقت ہے ناگفتہ کہانی ہے

وہ مصرعِ آوارہ دیوانوں پہ بھاری ہے
جس میں ترے گیسو کی بے ربط کہانی ہے

ہم خوشبوئے آوارہ ہم نورِ پریشاں ہیں
اے بدرِ مقدر میں آشفتہ بیانی ہے

میں سو رہا تھا کہ اک لمحہ نے جھنجھوڑ دیا

سلاخ سرخ تھی، جس طرح چاہا موڑ دیا

سجھائی کچھ نہیں دیتا شکستہ یادوں نے

کسی کا چہرہ کسی کے بدن میں جوڑ دیا

بھلے ہی مر رہا ہے قطرہ قطرہ ریت اب پہ

یہ آبِ زندہ تھا دریا کا ساتھ چھوڑ دیا

سیاہ تختی پہ اک سُرخ نقطہ پھیل گیا

ہوا نے اڑتے پرندے کا بازو توڑ دیا

یہ کہہ کے تم دُر نایاب اور دُنیا غریب

مجھے اکیلا سمندر کی تہہ میں چھوڑ دیا

دہکتے تیندووں سے یہ رات حملہ کر دے گی
سجا کے چاند کی کشتی میں میرا سر دے گی

چڑھے گا سورج کھلے بدن میں لہو کا فوّارہ
یہ سرخ چاندنی خالی گلاس بھر دے گی

تھرکتی مچھلی نکل کر سر کٹے پیڑوں سے
تمام رات کو اب بے لباس کر دے گی

یہ نرم بلّی جو سوئی ہے میرے سینے پر
میں سو گیا تو کلیجہ ہی چاک کر دے گی

بدن کے پیڑ کو خود اُس کی شاخ کاٹے گی
یہی تراش زمیں کو نیا شجر دے گی

بہار اب کے لہو کے چڑھے سمندر کو
قلم کئے ہوئے بازو بریدہ سر دے گی

اسی خیال سے پتھر ہے بیچ پانی میں
کوئی تو موج گہر کی اُسے خبر دے گی

طوافِ دائرہ اب پہلی بار ٹوٹا ہے
یہ رہگذر ہمیں اک اور رہگذر دے گی

چڑھا کے پیٹھ پہ بکری کے بچے گھومیں گے
یہ دنیا اب ہمیں سرکس کا شیر کر دے گی

لیکن یہ تحریر ان دنوں کی ہے جب میں اپنے خطوط میں وزیر آغا کے رسالے اور ان کے مضمون کی جی کھول کر تعریفیں لکھ چکا تھا۔

اس طرح کے بے شمار خطوط ہیں لیکن میری بے ایمانی سب پر شک کرتی ہے۔ ایک خط رشید افروز کا پرکاش فکری کے نام ہے۔ رشید سے میری خط و کتابت، سلام و پیام کچھ بھی نہیں۔ پرکاش فکری ۲۲ اپریل ۹۶ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

آپ کی حالیہ غزلوں نے کافی لوگوں کو چونکا دیا ہے، کچھ لوگوں کو اس کا افسوس بھی ہے۔ مثلاً رشید افروز نے لکھا ہے۔

بشیر بدر جیسا پیارا شاعر جس کا ایک ایک شعر لوگوں کے دیوان پر بھاری ثابت ہو سکتا ہے۔

اجالے اپنی یادوں کے۔ وہ "بابا" ردیف والی غزل ——— آنی لگتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری ——— اور ہونٹوں کے دو مصرعوں وغیرہ وغیرہ غزلیں کتنی پیاری اور خوبصورت غزلیں ہیں۔ کیا ہم ان غزلوں کو غزل نہیں کہہ سکتے۔ بدر جی کا اپنا انفرادی رنگ بہترین ہے۔ مگر ڈبے اور ڈاکٹر جیسی غزلیں پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ (رشید افروز)

میں نے اپنے ڈھنگ سے آپ کی اس تبدیلی کو سراہا ہے اور ان سے قائل کرنے کی کوشش کی ہے۔

آپ کی صبا والی غزلوں کی اس نے تعریف کی ہے۔ ....

میری نظر میں کوئی فنکار ایسا نہیں جس کے یہاں لہجے اور فکر کی یہ ارتقائی صورت نہ پائی جاتی ہو اور جس کے یہاں یہ عمل مفقود ہے اس کی فنی موت بہت جلد واقع ہو جاتی ہے۔ (پرکاش فکری)

رشید افروز کے خط کے جواب میں میرا شک خاموش ہے۔

شاعری پڑھنے والوں کو میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ شاعری براہ راست پڑھنے میں ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔

بشیر بدر

بشیر بدر
نئی آواز
ڈاکٹر رفعت سلطان

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

مسافر ہیں ہم بھی، مسافر ہو تم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

کبھی یوں بھی آ مری آنکھ میں کہ مری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے مگر اسکے بعد سحر نہ ہو

وہ بڑا رحیم و کریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
تجھے بھولنے کی دُعا کروں تو مری دُعا میں اثر نہ ہو

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اُٹھے اپنے ہی دل پر برسے

آگ گلاب برابر دونوں۔ سارے جام تمھارے نام
سورج دریا میں اُترے گا، جانم شام تمھارے نام

ان کمروں کے دروازوں پر یادوں کے پردے لٹکا دو
دن دنیا کا، رات خدا کی، پوری شام تمھارے نام

سر پر بوڑھا پاگل سورج، پیٹھ پہ بخچی سی دنیا
سارے کام ہمارے ذمے، سب آرام تمھارے نام

سوکھی پتی، ٹوٹی ٹہنی، مالی لوگ بٹوریں گے
باغ کے وارث تم شہزادے، گُل گلفام تمھارے نام
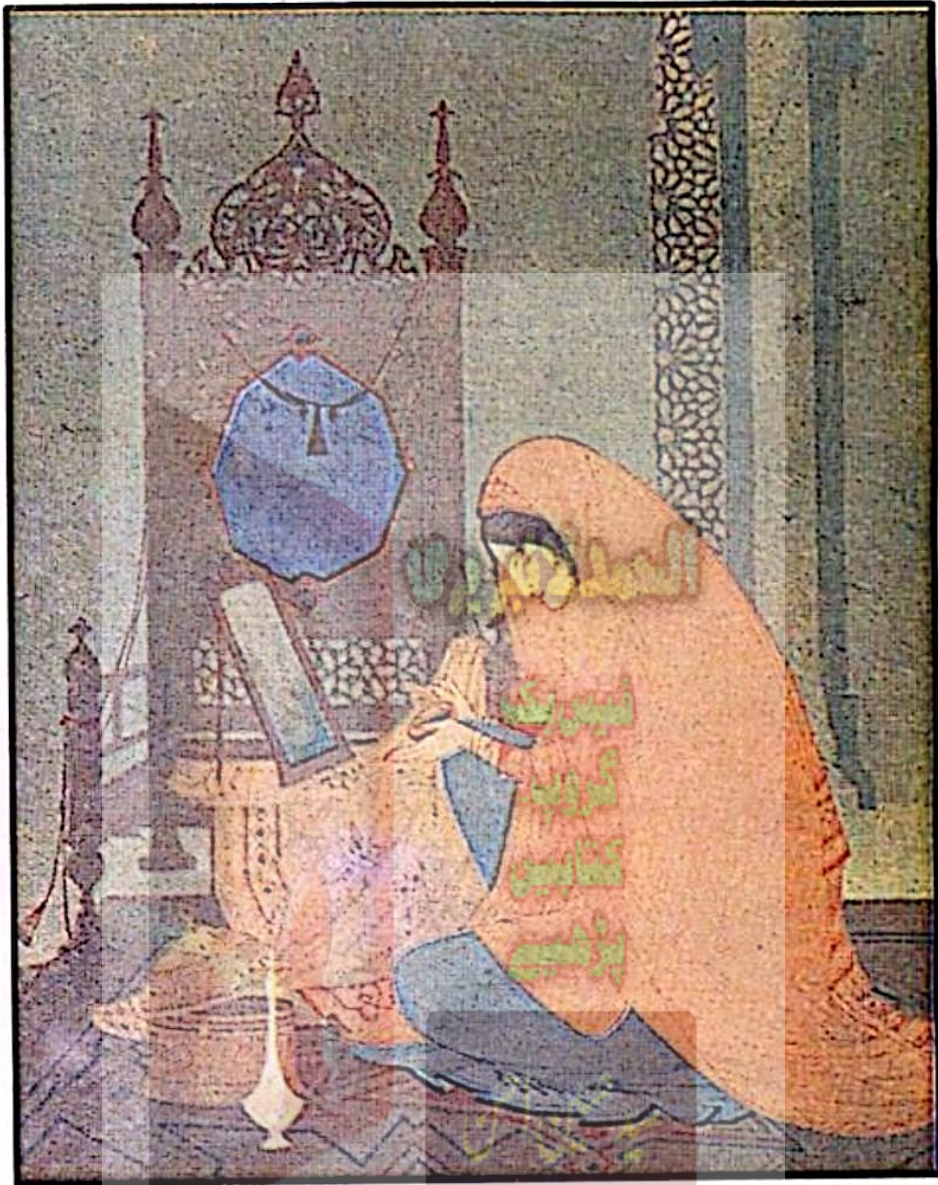
جاگی ہوئی غزل، کبھی سوئی ہوئی غزل
ہر دم ترے خیال میں کھوئی ہوئی غزل

پلکوں کے سائباں تلے جھلمل سی چاندنی
میراؔ کے آنسوؤں میں بھگوئی ہوئی غزل

پت جھڑ کے ساتھ ساتھ بڑی دور تک گئی
اس بار شاخ شاخ پروئی ہوئی غزل

سوئی ہے گہری نیند میں، بے خواب ریت پر
احساس کی ندی میں ڈبوئی ہوئی غزل

ہم بستری میں دھوپ سا خرگوش محوِ خواب
خالی نہیں، لحاف میں سوئی ہوئی غزل

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

آٹوگراف

محترم حضرات، سردار جعفری، کیفی اعظمی، شوکت کیفی صاحبہ، پیرزادہ قاسم، احمد فراز، خاطر غزنوی، راغب مرادآبادی، ڈاکٹر شارب ردولوی

(بنام سید طیب بدر)

ڈاکٹر بشیر بدر

مجلسِ فروغِ اردو ادب، جشنِ بشیر بدر ۲۱ ستمبر ۲۰۰۰ء دوحہ قطر

ئیں سے بیٹھے ہوئے) حق کانپوری، خالد شرایت، انجم بارہ بنکوی، مفتی جتنم، عبدالودود، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، ذکیہ غزل، انیتا موہن، شمیم عتیق، شہناز حمید، شاہدہ جعفری، راحت بدر، کرشنا پال، شکیلہ جوشی، اے۔ بی۔

ت علی اخلاص، منظر بھوپالی، رخسانہ ناظم آبادی، سلیم کوثر، اوج کمال، پروفیسر شہریار، عزم بہزاد، احمد نوید، خوشبیر سنگھ شاد

طرے ہوئے) انور مسعود، فرتاش سید، افضل منگلوری، امجد اسلام امجد، ظفر اقبال، ادریس دہلوی، قائم علی، انعام راہی، جاوید ہمایوں، گوپی چند نارنگ، افتخار عارف، جنرل (ر) معین الدین حیدر، ملک رویمیح، ملک زادہ منظور

الحسن رضوی، چانگ شی شوان، امبیسیڈر عارف کمال، محمد عتیق، احمد رشید، جوگندر پال، سرفراز رضوی، ملک مصیب الرحمٰن (باقی سبھی)
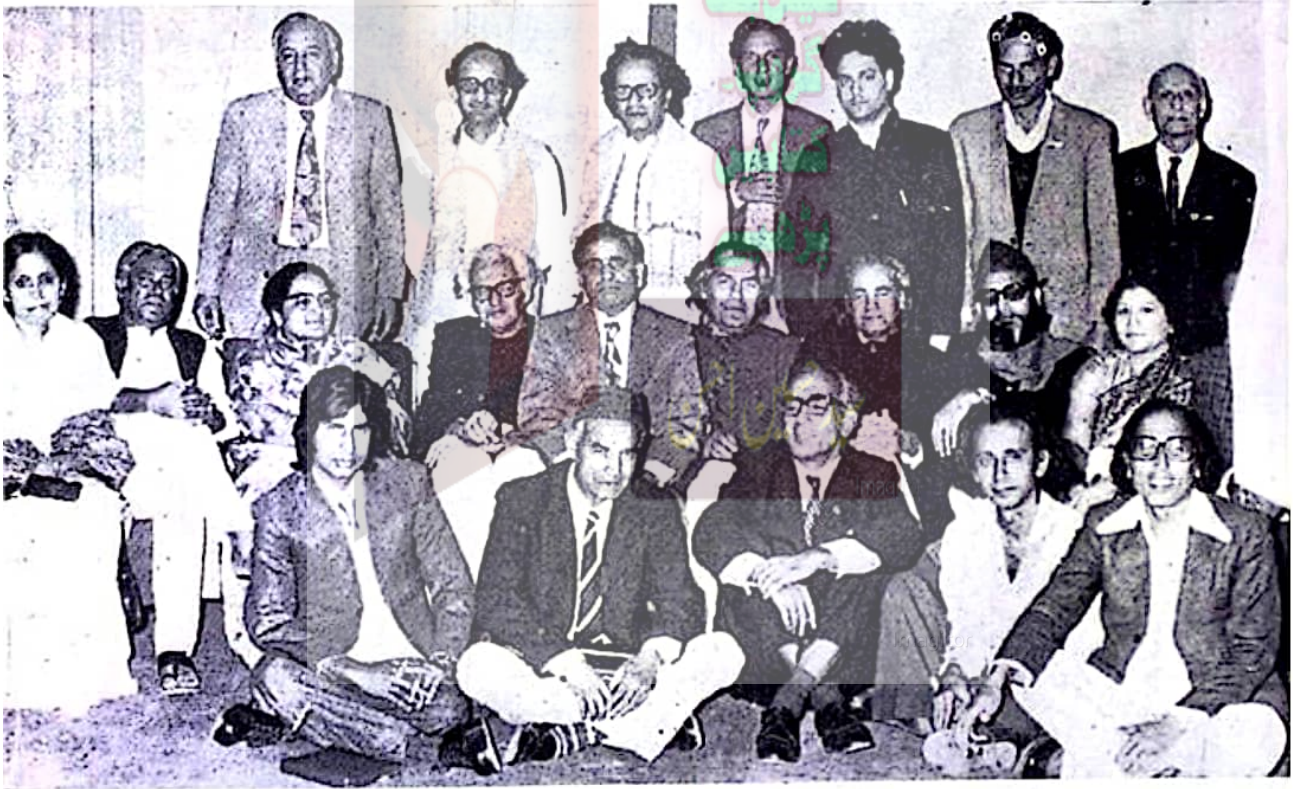
Mushaira DCM-78
Sitting : Tariq Sabzwari, Ayaz, Mr. J. Azad, Nida Fazli, Bashir Badr
Sitting on Chair : Meena Qazi, Akhtarul Iman, Mumtaz Mirza, Ghulam RabbaniTaban, Dilawar Figar, Sunoon Barbankvi, Sardar Jafri, Bekal, Jamila Banu,
. Standing : Convenor, Rashid Azar, Shaz Tamkant, Sheryar, Md. Yasin and others

بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں— ڈاکٹر مختارالدین احمد، پروفیسر آل احمد سرور، بشیر بدر (موجودہ ایڈیٹر) پروفیسر رشید احمد
صدیقی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی، ڈاکٹر قمر رئیس۔
کھڑے ہوئے— اسلم قریشی، [illegible]، اشرف، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، شہزاد

Bashir Badr, Shabnam Naqvi, Hasan Shahir, Waqif Raibarelvi
(1955-56)

Bimal Krishan Ashk, Vajr Matri, Bashir Badr, Md. Alvi, Sheryar
and ohers (Ahmedabad 1961)
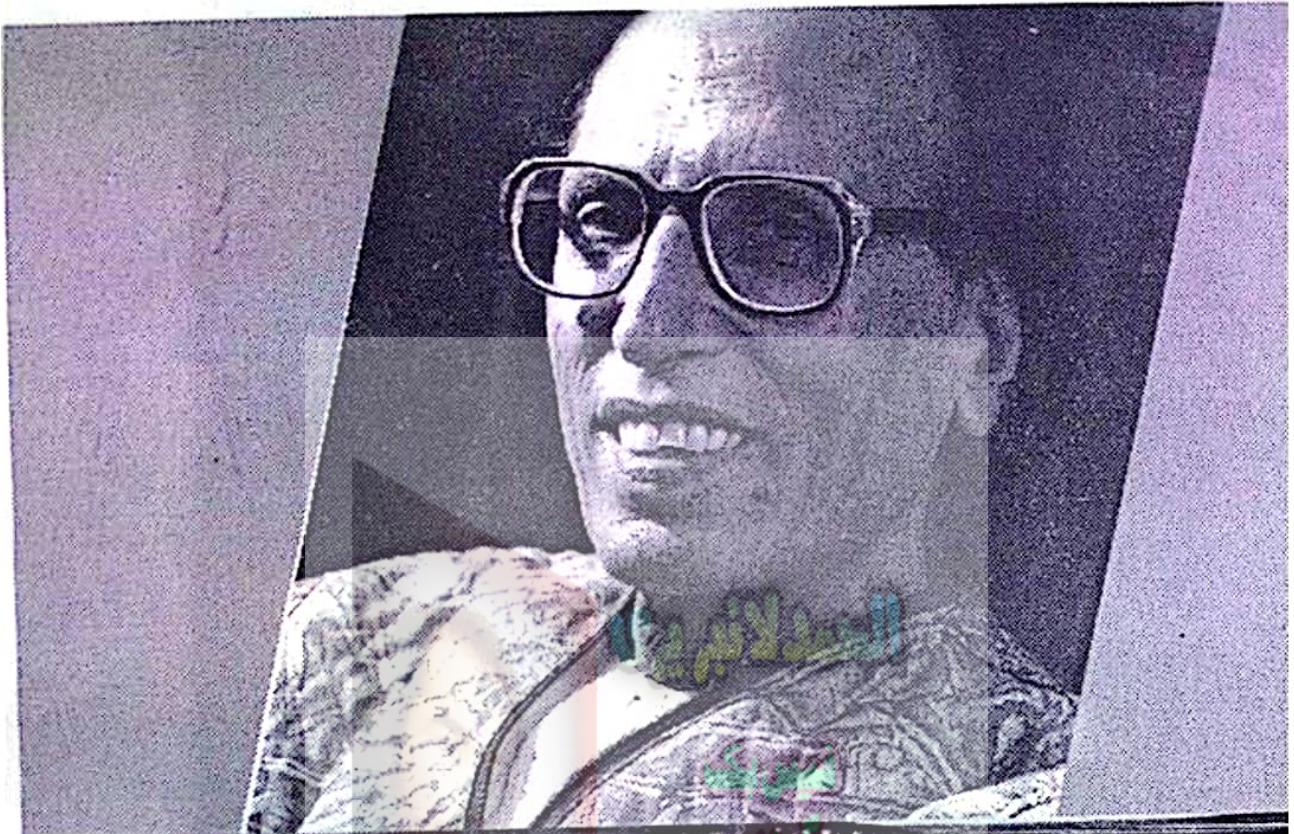
نئی آواز

ڈاکٹر رفعت سلطان

کتاب کا نام نئی آواز

مصنفہ ڈاکٹر رفعت سلطان

سنہ اشاعت ۲۰۰۱ء

قیمت Rs. 175/-

کتابت محمد حامد بستوی

ناشر لاریب کمپیوٹر سینٹر بھوپال

طباعت آہ پرنٹرس

تعداد پانچ سو
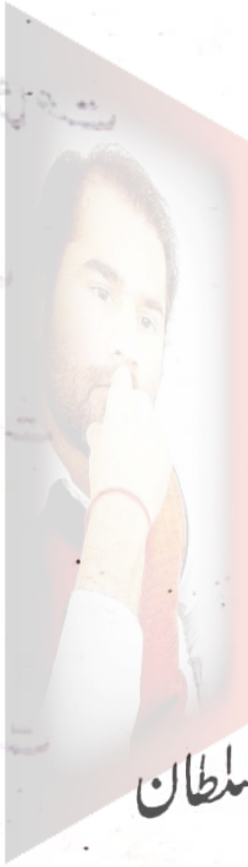
NAI AAWAZ BY Dr. RAFAT SULTAN

یہ کتاب

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

ترتیب

پیش لفظ

بشیر بدر کے فکر و فن پر ڈاکٹر رفعت سلطان کا یہ تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ، اردو کی جدید تنقید کا خوشگوار نمونہ ہے۔

ڈاکٹر رفعت سلطان اردو و عربی زبان پر یکساں قدرت رکھتی ہیں انھوں نے پہلے عربی ادبیات میں پی ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد اردو میں ایم.اے امتیازی کامیابی کے ساتھ پاس کیا اور اب درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

اس تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کی امتیازی شناخت یہ ہے کہ رفعت صاحبہ کی ادبی تربیت عربی زبان اور اس کی جدید تبدیلیوں میں ہوئی ہے۔ڈاکٹر بشیر بدر کی جدید غزل کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے اردو کے کلاسیکل شعری مبادیات کے ساتھ عصری تبدیلیوں کے موازن مطالعہ کی بنیادی شرط تھی۔ بشیر بدر عظیم اور قدیم غزل کی زمین پر نئی غزل کا ''آئکن'' ہیں اور عالمی شعری رویوں کے ساتھ نصف صدی کی جدید اردو غزل کے مزاج کی زندہ علامت ہیں۔

بشیر بدر نے پچاس برس پہلے جب اپنا شعری سفر نیاز فتحپوری کے نگار اور علامہ سیماب اکبر آبادی اور محترم اعجاز صدیقی کے مستند رسالہ شاعر سے شروع کیا تھا تو ان کا کلاسیکل لہجہ فارسی آمیز اردو کی غزل کا شگفتہ پھول جیسا تھا لیکن بسنت کی دھوپ میں اس لہجے نے نئے معصوم بچوں کی نرسری زبان کو اردو کی روایتوں میں رچا بسا کر غزل کا نیا عالمی لہجہ بنایا ہے۔اس کی تشریح کے لیے عصری آگہی

کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر رفعت سلطان نے اردو کے ان جدید نقادوں کا بھی مطالعہ کیا جو شکاگو (امریکہ) کی اعلیٰ یونیورسٹی میں رہ کر غزل کے داخلی آہنگ کو زبانوں کی صوتیاتی نفسیات کی لہروں کے ساتھ بھی پرکھتے رہتے ہیں۔ ان نئی تبدیلیوں کو اردو اور فارسی کی غزل کی امانت داریوں کے ساتھ پرکھنا اور ان کا تجزیہ کرنا خاصہ مشکل کام تھا۔

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر رفعت سلطان نے بشیر بدر کی غزل کو ایک خوبصورت آئینہ خانہ دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر رفعت سلطان کا یہ تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ جدید غزل کے افہام و تفہیم میں ایک قابل قدر کارنامہ سمجھا جائے گا۔

عزیز قریشی

چیئرمین ایم. پی. اردو اکادمی بھوپال

سوانحی پس منظر

بشیر بدؔر بیک نظر

نام : سید محمد بشیر

تخلص : بشیر بدؔر

آبائی وطن : موضع بکیا ضلع فیض آباد (یو۔ پی)

تاریخ پیدائش : ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء کانپور یوپی

والد : سید محمد نظیر مرحوم

والدہ : عالیہ بیگم مرحومہ

اہلیہ : (۱) قمر جہاں شہناز مرحومہ (۲) ڈاکٹر راحت بدر

اولادیں : معصوم تمکنت، نصرت بدر، صبا واحد، طیّب بدر

تعلیم : ہائی اسکول (اسلامیہ کالج اٹاوہ یو۔ پی)

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۔ ایم۔ اے پریویس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام مضامین کے طلباء میں اوّل رہنے پر سرو لیم اسکالرشپ ملا۔

۲۔ ایم۔ اے اردو میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن لانے پر یونیورسٹی گولڈ میڈل اور سارے مضامین کے ٹاپرس میں فرسٹ

رہنے پر رادھا کرشن پرائز ملا۔

۳۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین کی ادارت (۱۹۶۹ء)

ملازمت : علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ابتدائی چند سال،

میرٹھ یونیورسٹی (صدر شعبۂ اردو) ۱۹۹۴ء تک۔

مجموعہ اردو : ''اکائی'' (مجموعۂ غزلیات) علیگڑھ ۱۹۶۹ء

''امیج'' (مجموعۂ غزلیات) لکھنؤ ۱۹۷۳ء

''آمد'' (مجموعۂ غزلیات) لکھنؤ ۱۹۸۵ء

''آس'' (مجموعۂ غزلیات)

''آسمان'' (مجموعۂ غزلیات)

''آہٹ'' (مجموعۂ غزلیات)

''کلیاتِ بشیر بدرؔ'' (مجموعۂ غزلیات)

''کوئی شام گھر بھی رہا کرو'' (مجموعۂ غزلیات) کراچی

''آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ'' (پی ایچ۔ ڈی

کے لئے مقالہ)

''بیسویں صدی میں غزل'' (تنقید) ۱۹۸۱ء

دیوناگری : ''تمہارے لئے'' (غزلیات) ابوہر پنجاب ۱۹۸۵ء

''اجالے اپنی یادوں کے'' (غزلیات) جبلپور ایم۔ پی ۱۹۹۰ء

''آنچ'' (غزلیات) ودیشہ ایم۔پی ۱۹۹۴ء

''اجالے اپنی یادوں کے'' (غزلیات) دہلی ۱۹۹۶ء

''دھوپ کی پتیاں ہرا ربن'' (غزلیات) ۱۹۹۸ء

''افیکشن'' (غزلیات) ودیشہ ایم۔پی ۱۹۹۸ء

''آس'' (غزلیات) دہلی ۲۰۰۰ء

''کلچر یکساں'' (کلیات) (غزلیات) دہلی ۱۹۹۹ء

رسائل کے خاص : سہ ماہی ''لہجے لہجے'' بدایوں

نمبر و گوشے ماہنامہ شاعر بمبئی

سہ ماہی ''فکر آگہی'' دہلی ۱۹۸۸ء

سہ ماہی ''انتساب'' سرونج ۲۰۰۱ء

شخصیت اور فن : ''بشیر بدر شخصیت و فن'' ڈاکٹر رضیہ حامد ڈاکٹر رفعت سلطان

: برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال، دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور اور وکرم یونیورسٹی اوجین سے بھی مقالات لکھے گئے ہیں۔

''بشیر بدر کی شاعری'' (گجراتی) مرتبہ ندا فاضلی

''پری پریشن'' (بشیر بدر کے مضامین) مرتبہ: انجم بارہ بنکوی

''لاسٹ لگیج'' (خاص مجلّہ) مرتبہ ڈاکٹر راحت بدر

انعامات : پدم شری ۱۹۹۹ء حکومت ہند (دہلی)

و : ''جشن'' بشیر بدر ۲۰۰۰ء (مجلس فروغ اردو ادب دبئی/دوحہ)

اعزازات : اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۶۹ء

ہندی اردو کمیٹی ایوارڈ لکھنؤ ۱۹۷۳ء

میر تقی میر کل ہند ایوارڈ ۱۹۸۱ء مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال

''امتیاز میر'' میر تقی میر اکادمی لکھنؤ

بہار اردو اکادمی پٹنہ ۱۹۸۶ء

ہندی اردو کمیٹی ایوارڈ لکھنؤ ۱۹۹۷ء

میر تقی میر کل ہند ایوارڈ ۱۹۹۷ء مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دہلی (۲۰۰۰ء)

امیر خسرو ایوارڈ دہلی ۲۰۰۰ء

آختر الایمان ایوارڈ دہلی ۲۰۰۰ء

چراغ حسن حسرت ایوارڈ جموں کشمیر ۲۰۰۰ء

اداروں کی رکنیت : رکن مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال

ممبر ساہتیہ اکادمی دہلی

رکن مجلس انتظامیہ اور مجلس عامہ اردو اکادمی لکھنؤ

رکن مجلس انتظامیہ ترقی اردو بورڈ (مرکزی حکومت ہند) دہلی

صدر بورڈ آف اسٹڈیز، ریسرچ ڈگری کمیٹی، میرٹھ یونیورسٹی

اکسپرٹ، انعامی کمیٹی، ہماچل پردیش اکادمی

ممبر، بورڈ آف اسٹڈیز، کروکشیتر یونیورسٹی

سوانحی پس منظر

شاہ محمد بشیر (ڈاکٹر بشیر بدر) کے آبا و اجداد ایران، لاہور، دہلی، بنارس، جون پور سے ہوتے ہوئے فیض آباد منتقل ہوئے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کے خاندانی حالات کی ایک کتاب تھی جس میں خاندان کا بڑا بزرگ فرد قابلِ ذکر حالات لکھ دیا کرتا تھا۔ کئی بار بشیر بدر نے اس کتاب کو خطِ شکستہ سے نستعلیق میں منتقل کرنے کی کوشش کی لیکن کہیں کہیں پوری پوری سطروں کے مدہم ہو جانے کی وجہ سے وہ اس میں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ ان کے بیان کے مطابق میرٹھ کے فسادات سے قبل خاندانی شجرہ اور افرادِ خاندان کے قصبات میں قاضی ہونے کی تقرری کی مہریں بھی ان کے پاس خاندانی قیمتی اثاثے کے طور پر موجود تھیں لیکن میرٹھ کے فرقہ وارانہ فساد میں ان کے گھر کو لوٹنے کے ساتھ اسباب کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ سوائے راکھ کے ڈھیر کے کچھ باقی نہ بچا۔

ہندوستان میں بشیر بدر کے خاندان کے لوگ فیض آباد، لکھنؤ، آگرہ، مین پوری اور میرٹھ میں آباد ہیں۔ تقسیم کے بعد کئی گھرانے مشرقی ممالک اور مغربی ممالک ترکِ وطن کر کے چلے گئے تھے۔ چند برس پہلے کراچی (پاکستان) اور ٹورنٹو (کناڈا) میں خاندان کے افراد سے ان کی اتفاقیہ ملاقات بھی ہوئی۔ سرِ دست ان کے دادا قاضی شاہ محمد اصغر علی کے بارے میں ان کے منجھلے پوتے شاہ محمد ضمیر کی تحریر نقل کی جا رہی ہے۔

"عالی جناب قاضی شاہ محمد اصغر علی جو سرکارِ دو سردار سید اشرف جہانگیر سمنانی، کچھوچھہ شریف فیض آباد کے غلام میرے اور میرے بڑے بھائی جناب شاہ محمد بشیر کے دادا محترم تھے۔[1]"

---

[1] سہ ماہی "نکہتِ آگہی" بشیر بدر نمبر، شائع کردہ باب العلم پبلیکیشنز، نوئیڈا، ص ۲۱۱

محمد ضمیر اپنے دادا کی مذہبی ولایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"خداوندکریم کا احسان ہے کہ آج ۱۹۳۹ء کا واقعہ چھیالیس سال گذر جانے کے بعد بھی ضلع بنا تحصیل ٹانڈہ، تھانہ بسکھاری، پوسٹ شکل بازار ضلع فیض آباد یوپی (بھارت)، کے عمر رسیدہ لوگوں کو یاد ہے گاؤں کے اپنے پرائے بتاتے ہیں کہ وہ ایک ولی صفت انسان تھا، جس نے شام کو داعی اجل کو لبیک کہنے سے پہلے گاؤں والوں کے حقوق ادا کر دیئے تھے اور نائی کو بلا کر اپنی چارپائی اور بستر تک عنایت فرما دیا تھا، اور دن بھر یادِ خدا میں سرگرم رہا، جس طرح تقریباً اپنی زندگی کے نوے سال عاجزی انکساری اور بہادری کے ساتھ گذارے۔ اسی طرح شاندار طریقے سے موت کا استقبال کیا۔ دنیائے فانی سے رخصت ہونے والے دن گھر والوں کو نمازیں پڑھوائیں، کھانا کھلوایا اور پھر تلقین و وصیت بھی فرمائی تھی۔ فرمایا تھا سب کو مالک حقیقی سے ایک دن ضرور ملنا ہے۔ دنیاوی زندگی محض آزمائش کی گھڑیاں ہیں جو شکر ہے امید و خوف میں گذر گئیں۔ پھر فرمایا دو دن بعد میری اہلیہ بھی رخصت ہو کر مالک حقیقی سے جا ملے گی۔ آبائی باغ میں دونوں قبریں پاس پاس بنائی جائیں آخر میں کلمۂ طیبہ خود پڑھا اور سب سے پڑھوایا۔"[1]

روایت کرنے والوں کا بیان ہے کہ مرحوم کی پیشن گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔" ایک مرتبہ یہی بزرگ ایک مقدمہ میں حاضر عدالت کچہری شہر فیض آباد میں ہوئے۔ حاکم عدالت نے بنا سماعت اگلی تاریخ تعین فرمادی۔ ایسا ہونے پر کسی غصہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ فرمایا کچھ ترمیم کر دی جائے۔ حاکم نے تیور بدل کر گفتگو کی اور کہا کہ یہ عدالت ہے گاؤں کی چوپال نہیں۔ ولی کامل نے فرمایا:

"سب سے بڑی چوپال اللہ کی ہے وہاں کا حکم یہ ہے کہ خادم تو حاضر ہو جائے گا مگر حاکم مقررہ وقت پر نہ آ سکے گا" اور یہی ہوا حاکم مقررہ تاریخ پر اپنے لختِ جگر کی اچانک رحلت کی وجہ سے عدالت کا کام انجام نہ دے سکا اور اس طرح آئندہ کی تاریخ مقرر ہوئی جو وہ بزرگ چاہتے تھے[2]

---

[1] فکر و آگہی دہلی بشیر بدر نمبر ۱۹۸۸ء ص ۲۰۹

[2] فکر و آگہی دہلی بشیر بدر نمبر ۱۹۸۸ء ص ۲۱۰

قاضی شاہ محمد اصغر کے دو صاحبزادے تھے، بڑے شاہ محمد نظیر اور چھوٹے شاہ محمد خلیل۔
یہی شاہ محمد نظیر بشیر بدر کے والد بزرگوار تھے۔ ان کا بچپن قصبے میں گذرا لیکن ہوش سنبھالتے ہی اپنے خاندان اور قصبے کے صوفیانہ ماحول وضع داریوں کی روایت سے انحراف کر بیٹھے، نوعمری میں گھر کو خیرآباد کہا کیونکہ ان کے والد کو بھی ان کی بے راہ روی پر سخت اعتراض تھا۔
نوعمری میں گھر سے نکلے اور شہر کا رخ کیا اپنی محنت سے اتنی آمدنی کی کہ وہ ہائی اسکول پاس ہو گئے۔
اس کے بعد محکمۂ پولس کے اکاؤنٹ سیکشن میں ان کا تقرر ہو گیا۔ لکھنؤ کے ایک دین دار گھرانے میں ان کی شادی ہو گئی۔

ڈاکٹر بشیر بدر بتاتے ہیں کہ

"والدہ کا نام سیدہ عالیہ بیگم ہے غالباً ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئیں ان کے والد یعنی میرے نانا کا نام محمد حسن تھا، والدہ صاحبہ حیات ہیں[1]، آگرہ میں چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتی ہیں"

والدہ کے بارے میں محمد ضمیر لکھتے ہیں:

"والدہ محترمہ عالیہ بیگم جو سیدنا مصباح الحسن رحمۃ اللہ علیہ پھپوند شریف اٹاوہ کی مریدہ ہیں[2] شاہ محمد نظیر کی سات اولادیں ہوئیں۔ سب سے بڑے بیٹے شاہ محمد شمیم، دوسرے شاہ محمد بشیر تیسرے شاہ محمد ظہیر، شاہ محمد ضمیر، رقیہ بیگم، شاہ محمد صغیر اور ان کے بعد رابعہ بیگم۔ شاہ محمد شمیم اور شاہ محمد ظہیر دونوں چھ مہینے سے زیادہ عمر نہ پا سکے۔ بچپن میں ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

بشیر بدر کا بیان ہے کہ ان کے والد غصہ ور شخصیت کے حامل تھے۔ نوجوانی میں اپنے سالے سید محمود الحسن کے ساتھ جو ان کے عزیز دوست بھی تھے، گانا سننے کے شوق میں کوٹھے پر بھی جایا کرتے تھے۔ ادبی رسائل بہت پابندی سے منگاتے اور بڑے شوق سے پڑھتے۔ ان کے پاس جو رسائل آیا کرتے تھے ان میں بشیر بدر کو نگار، شاعر، جمالستان (دہلی)، آریہ ورت (دہلی) شمع (دہلی)، وغیرہ کے نام یاد ہیں۔ ان کی ایک بیاض بھی تھی جس میں پسندیدہ غزلیں اور اشعار

---

[1] رسالہ فکر و آگہی بشیر بدر نمبر ۲۰۰۸ء ص ۲۱۱   [2] ۱۹۹۱ء میں مکہ مکرمہ میں دوران سفر حج انتقال ہوا۔

نوٹ کیا کرتے تھے۔

بشیر بدر ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب محکمۂ پولس کے Account Section میں ملازم تھے۔ مختلف سپاہی گھر کے کاموں پر مامور تھے۔ بشیر بدر نے جب ہوش سنبھالا تو وہ اپنی والدہ کے چہیتے بیٹے تھے اور اپنے والد سے بہت خائف رہتے تھے۔ بشیر بدر کے بڑے بھائی نسیم اور چھوٹے بھائی ظہیر چھ چھ ماہ کی عمر پا کر سپردِ خاک ہو چکے تھے۔ بشیر بدر بھی اکثر بیمار رہتے تھے، ان کی والدہ کا بیان ہے کہ تین چار ماہ کی عمر میں ان کا پیشاب رُک گیا۔ اس وقت عام آدمی کی دسترس میں جراح نہیں تھی، ایک جراح نے بڑی سوجھ بوجھ سے ان کا علاج کیا۔

ڈاکٹر بشیر بدر نے بتایا کہ ان کی والدہ حق و صداقت کا نمونہ ہیں۔ وہ ان کی تربیت و نگہداشت میں کسر نہیں چھوڑتی تھیں۔ وہ اس سلسلے میں تعصب کی حد تک سخت تھیں ان کا خیال تھا کہ شائستہ گھرانوں کے لڑکوں کو ناشائستہ لڑکوں سے دُور رہنا چاہیئے اور ان کو ہمیشہ اس کی فکر رہتی تھی کہ ان کے بچے کسی سے گالی بکنا یا کوئی اور دل آزاری والی بات نہ سیکھ لیں۔

ڈاکٹر بشیر بدر نے بتایا کہ ان کو اپنی والدہ کی بس ایک بات پسند نہ تھی کہ وہ ان کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھیں، اس زمانے میں ان کی والدہ پردہ کرتی تھیں، باہر باغ میں انہیں صرف اتنی دُور جانے کی اجازت تھی کہ اگر وہ دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائیں تو بغیر ایک منٹ دیر کے بچے فوراً گھر میں داخل ہو جائیں۔

خاندانی رسوم کے مطابق بشیر بدر کی رسم بسم اللہ بڑی دھوم سے ہوئی اُس وقت ان کی عمر چار سال سے بھی کم تھی، اس وقت شیشے پلاسٹک اور لاکھ کی چوڑیاں اور دیگر سامانِ آرائش کا بہت رواج تھا۔ باغ نما وسیع آنگن میں لاکھ کا باغ بنوایا گیا جس میں پیالی نما پھولوں کے دیئے رُوشن کئے گئے۔

بشیر بدر کو بہت اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اس تمام اہتمام سے خوف زدہ تھے کیونکہ وہ اپنے ننھے منے ذہن میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا اور ابا نے اس قدر اہتمام میرے قرآن پڑھنے کے لئے کروایا ہے۔ ننھے دولہا کی طرح سجا کر جب انہیں زنان خانے سے مردان خانے میں لایا گیا تو وہ بے تحاشہ چیخیں مار کر رونے لگے۔ والد صاحب کو بے حد غصہ آیا اور انہوں نے بشیر بدر کو پیٹنا شروع کر دیا، بشیر بدر کے ایک ماموں جو ان کے والد کے گہرے دوست بھی تھے، انہیں کو اتنا حوصلہ تھا کہ والد صاحب

کو روک سکیں، انھوں نے اپنے بہنوئی کو ڈانٹا اور بشیر بدر کو گود میں لے کر بہلایا اور کہا کہ وہ کچھ نہیں پڑھے گا اور بولے کہ "بیٹا جو میں کہوں وہ کہو"، انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا۔ بشیر بدر کہتے ہیں میں نے بہت خوشی سے دہرا دیا اور مبارک سلامت کی صداؤں میں مجھے معلوم ہوا کہ میں بلاوجہ اتنا خوفزدہ اور سراسیمہ تھا۔ سات سال کی عمر میں ڈاکٹر بشیر بدر کا قرآن شریف ختم ہوا۔ ان کی والدہ بتاتی ہیں کہ جب وہ مردانے میں تلاوت کرتے تھے تو آس پاس کے بزرگ ان کی خوش الحانی پر تعریفی جملے کہے بغیر نہیں رہتے۔ والدہ کی تربیت ونگہداشت سختیوں میں بشیر بدر بڑے ہوئے۔ ان ہی کی توجہ سے نماز روزے کے پابند اور قرآن پاک کی مختلف سورتوں کو حفظ کر سکے۔

بشیر بدر کی والدہ نے بتایا کہ بشیر بدر کی عمر ۳ یا ۴ سال کی ہوگی خانگی ملازم جس کا نام فخر اللہ تھا دکان سے سامان لینے جا رہا تھا، بشیر بدر بھی ساتھ ہو لئے واپسی پر ان کے ہاتھ میں کوئی چھوٹی سی چیز تھی انہوں نے نوکر سے پوچھا کہ بشیر کے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ نہ میں نے کچھ دلایا! انھوں نے سختی سے حکم دیا کہ جاؤ ابھی اس کو دوکان دار کے پاس لے کر جاؤ اور سب لوگوں کے سامنے بتاؤ کہ یہ چور ہے اور یہ چیز واپس کر کے آؤ۔ بشیر بدر بہت روئے لیکن بالآخر انہیں دوکان دار کے پاس جانا پڑا

بشیر بدر کہتے ہیں کہ "وہ ندامت مجھے آج تک یاد ہے جو اس واقعہ کے بعد پیش آئی"۔

تیسرے درجے تک کانپور کے حلیم مسلم کالج میں زیر تعلیم رہے، والد صاحب کا تبادلہ اٹاوہ میں ہو گیا۔ اٹاوہ اسلامیہ کالج (جو اب حافظ محمد صدیق اسلامیہ انٹر کالج ہے) میں بسلسلہ تعلیم داخل ہوئے۔ بشیر بدر کا کہنا ہے کہ اسلامیہ کالج بالکل منی علی گڑھ تھا۔ اسلامیہ کالج کا ہال علی گڑھ کے اسٹریچی ہال کا اختصار تھا۔ وہی ڈیزائن، وہی انداز، ویسے ہی کتبے، ویسی ہی تصاویر، ویسے ہی ہوسٹل۔ تقسیم سے قبل تقریباً انیس سو طلباء ہوسٹل میں رہتے تھے۔ اس کو قائم کرنے والے مولوی بشیر الدین صاحب تھے جن کو سرسید ثانی کہا جاتا تھا۔ سرسید کی طرح انہوں "البشیر" نام کا ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کے ایڈیٹر وہ خود تھے۔

بشیر بدر نے VI کلاس میں تاریخ کی چند کتابوں کو سامنے رکھ کر لال، ہری، نیلی، کالی روشنائی سے تاریخ کی ایک کتاب مرتب کی جیسا کہ بشیر بدر کہتے ہیں یہ کتاب ان کی اس قید تنہائی کی مصروفیت تھی ان کی والدہ ان کو گھر سے باہر نکلنے اور فضول بکواس لٹریچر پڑھنے اور خراب لڑکوں کی صحبت میں رہنے سے ہمیشہ

بچاتی رہیں۔ بشیر بدر کا بیان ہے کہ اسکول سے چھٹی کا دن میرے لئے سب سے زیادہ روح فرسا دن ہوتا تھا کیونکہ چھٹی ہوتے ہی گھر کی چہار دیواری کی قید کا تصور ذہن پر غالب آجاتا تھا۔

تاریخ کی یہ کتاب بشیر بدر کی وہ پہلی تصنیف ہے، جو انہوں نے قید تنہائی سے چھٹکارا پانے کیلئے لکھی تھی اور تنہائی کے احساس نے انہیں کچھ سوچنے اور کرتے رہنے پر مجبور کیا تھا۔ آٹھویں کلاس کے طالب علم ہونے تک بشیر بدر کو ان کی والدہ نے گھر سے باہر اور اسکول بھی تنہا نہیں نکلنے دیا۔

اس زمانے میں ملیریا کا زور تھا۔ بشیر بدر بھی اس کا شکار ہو گئے۔ بشیر بدر کے والد ہومیو پیتھک سے شغف رکھتے تھے۔ بشیر بدر کی بیماری میں اپنی دواؤں کو ان پر آزماتے۔ لیکن بقول بشیر بدر "میرا بخار ان کی دوا سے کبھی نہیں جاتا تھا، کونین ہی سے جاتا تھا۔" اور والد کہا کرتے تھے کہ اس کی آنکھیں کونین سے کمزور ہوتی ہیں اور دل و دماغ پر بھی خوف ہے اسی لئے وہ اپنی ماں کے کہنے پر ہمیشہ مصلّے بچھائے رہتا ہے"۔

بشیر بدر کے والد شعر و شاعری کو پسند کرتے تھے، لیکن کبھی انہوں نے شعر نہیں کہا۔ نہ ہی بشیر بدر نے کبھی ان کی زبان سے کسی مشاعرے کا ذکر سنا۔ شعر سننے اور شعر نوٹ کرنے کا شوق تھا۔ ان کی ایک بیاض تھی جس میں اس عہد کی مشہور گانے والیوں کی غزلیں نوٹ تھیں۔ انہیں یاد ہے کہ والد کے پاس داغ، امیر، بہزاد اور بہت سے لکھنوی شعرا کی غزلیں لکھی ہوئی تھیں، لیکن بشیر بدر کو اسے دیکھنے کی اجازت نہیں تھی اور اگر وہ کبھی چپکے چپکے دیکھتے ہوئے پکڑے جاتے تو والدین بہت ناراض ہوتے۔

اس زمانے میں بشیر بدر کو شعر و شاعری بالخصوص خوب صورت مترنم غزلیں بہت اپیل کرنے لگی تھیں۔ وہ موزوں طبع قریب قریب شروع سے تھے۔ ان کو اپنا پہلا شعر یاد ہے جو یہ ہے ؎

ہوا چل رہی ہے اُڑا جا رہا ہوں
ترے عشق میں مرا جا رہا ہوں

انہوں نے کہا کہ یہ شعر میرے بنیادی مزاج کا پتہ دیتا ہے یعنی عشق اول اور اس کے بعد ہوا کے ساتھ چلنے کی بے بسی، قدرتی مناظر کا احساس بھی اس میں شامل ہے۔"

جب بشیر بدر ساتویں درجہ کے طالب تھے۔ اٹاوہ کے اسلامیہ کالج کے طلباء کے مشاعرے میں انہوں نے یہی غزل تحت میں پڑھی، جس پر انہیں اول انعام دیا گیا۔

بشیر بدر کا ذوقِ شاعری پروان چڑھا تو انہوں نے غزلوں کو کسی اچھے رسالے میں شائع

کروانے کی تدابیر سوچنا شروع کیں اور نیاز فتحپوری کو جو اس وقت "نگار" نکال رہے تھے۔ اپنی غزلیں ارسال کیں۔ نیاز فتحپوری بڑے بڑے غزل گو شعرا کی پوری غزل کبھی نہیں چھاپتے تھے بلکہ دو تین شعر کا انتخاب کرتے تھے۔ بشیر بدر نے اپنی تمام تر ہوشیاری سے نیاز کو ایک غزل بھیجی جس میں اپنا نام بشیر بدر رسا اور پتہ (اس خوف سے کہ والدین تو خط کا جواب ہاتھ نہیں آنے دیں گے) اسلامیہ کالج اٹاوہ کا تحریر کیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلامیہ کالج اٹاوہ کے بانی مولوی بشیر الدین تھے، جن سے نیاز فتحپوری کے تعلقات خورد و کلاں جیسے تھے۔ مولوی بشیر الدین کو سرسید ثانی کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ مسلم کالج کے علاوہ انہوں نے "البشیر" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ ان کے صاحبزادے سے بشیر بدر کی دوستی تھی چنانچہ بشیر بدر نے "البشیر" اسلامیہ کالج اٹاوہ کی معرفت اپنی غزل بھیج دی۔ ۱۹۴۵ء/۱۹۴۶ء کے کسی پرچے میں وہ غزل جو تقریباً سات یا آٹھ اشعار پر مشتمل تھی بڑی شان سے چھپی۔ اٹاوہ کے مستند شعرا کے حلقے میں کہرام مچ گیا اور نیاز فتحپوری کو خطوط بھیجے گئے کیونکہ لوگوں کو حیرت تھی کہ اردو کا عظیم نقاد نیاز فتحپوری جو جگر کی شاعری کو کھجلی بتاتا ہے، جوش کو معمولی نظم گو کہتا ہے۔ اس نے ساتویں کلاس کے ایک طالب علم کی غزل اس شان سے شائع کردی۔

بشیر بدر کا بیان ہے کہ اس کے بعد انہوں نے کئی بار غزلیں بھیجیں، جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھے لیکن نیاز فتحپوری نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا اور اسی دن سے ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ "ایڈیٹر یا نقاد شعر فہم نہیں ہوتا تو مجھ سے خراب نو مشق مبتدی کے شعر کیوں چھاپتا اور اگر مبتدی میں کوئی بات تھی تو لوگوں نے جب اس کی عمر بتا دی تو حقیر ہوگیا۔"[1]

۱۹۴۹ء میں اسلامیہ کالج اٹاوہ سے ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اردو اور ریاضی میں ڈسٹنکشن ملا۔ تاریخ ان کا پسندیدہ مضمون تھا لیکن اس میں ۳۰ فیصد نمبر حاصل ہوئے جس کا انہیں آج بھی قلق ہے۔

تاریخ کے تذکرے کے ساتھ انہوں نے ۱۹۴۶ء کا ایک واقعہ سنایا "ہسٹری کا پیریڈ تھا انسپکٹر

---

[1] ایک ملاقات۔ بشیر بدر سے (غیر مطبوعہ مضمون) از راقم السطور

آف اسکول معائنہ کرنے آئے اس وقت وہاں ہسٹری کے استاد بخاری صاحب تھے جو بارہ سال قبل سیفیہ کالج کے مشاعرے میں ملے تھے اور اس وقت یہاں کسی محکمہ کے ڈائریکٹر تھے۔ دونوں بہت بدل چکے تھے۔ بخاری صاحب کا کہنا تھا کہ انہوں نے بشیر بدر کو ان کی منفرد ہنسی سے پہچان لیا۔ یہی بخاری صاحب اسلامیہ کالج میں تاریخ پڑھا رہے تھے۔ انسپکٹر آف اسکول نے سوال کیا کہ ۱۸۵۷ء کی کیا اہمیت ہے؟ کئی ہاتھ جواب دینے کے لئے اُٹھے۔ بشیر بدر نے کہا "ہندوستان کی تاریخ روز اول سے ۱۸۵۷ء تک روشنائی سے لکھی گئی اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء سے آج تک ہمارے لہو سے لکھی جارہی ہے" ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا مگر اس ہندوستانی انسپکٹر آف اسکول کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا Bravo یعنی شاباش بہادر" پھر اس نے بشیر بدر کو اپنے پاس بلایا۔ بشیر بدر کے جوتوں کے لیس کھلے تھے۔ اس نے کہا کہ تم اتنے ذہین ہو بہادر ہو کپڑے بھی اچھے پہنے ہو لیس کیوں نہیں باندھے ہیں۔ بشیر بدر نے جواب دیا کہ آج ہمارا نوکر نہیں آیا تھا۔ انسپکٹر نے کہا کہ یہ بہت بُری بات ہے۔ اپنا ہر کام خود کرنا چاہیئے۔ بشیر بدر نے برجستہ جواب دیا کہ میں اپنا ہر کام خود کرتا ہوں لیکن لیس نہیں باندھتا کیونکہ جو لوگ لیس باندھنے میں ماہر ہو جاتے ہیں۔ وہ دوسروں کے جوتوں کے فیتے باندھ کر بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ انسپکٹر آف اسکول مسکرادیا اور ران پیٹھ تھپتھپاتا ہوا واپس چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں مسلمان جن حالات سے نبرد آزما تھے وہ انتہائی صبر آزما اور نتیجہ خیز تھے۔ بشیر بدر کے والد محکمۂ پولس میں اکاؤنٹ انچارج تھے۔ ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ مسلمان ہجرت کر رہے تھے۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ کی تقسیم کے وقت ۷۰۰۰ روپے کم ہو گئے۔ کاغذ پران کے دستخط موجود تھے کہ روپیہ خزانہ میں لایا گیا اور تقسیم ہوا۔ بشیر بدر کہتے ہیں کہ وہ رات عجیب کہرام کی رات تھی۔ مسلمان غبن کر کے بھاگنے کے الزام اور شک میں پکڑے جارہے تھے اور اسی دوران ہمارے والد صاحب کے ساتھ اس حادثے کا پیش آنا۔ گھر کا سارا اثاثہ راتوں رات بیچ دیا گیا والد صاحب کے دوستوں نے مدد کی اور کچھ رقم قرض لی گئی۔ صبح تک مطلوبہ رقم پوری جمع کر لی گئی۔ والد صاحب یک لخت صوفی ہو گئے اور اس حادثے نے ان کی دنیا بدل کر رکھ دی۔ نوکری سے غیر حاضر رہتے۔ ویران مسجدوں میں نمازیں پڑھتے رہتے۔ اس زبردست حادثہ کے بعد غم سے سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ پیروں پر ہمیشہ ورم رہتا میں ہی بچوں میں بڑا اور سمجھدار تھا انہیں تلاش کر کے گھر لاتا۔" ؎

گھر کے پریشان کُن حالات کی وجہ سے بشیر بدر کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ انٹر کالج میں داخلہ لے سکیں۔ بقول بشیر بدر "عجیب بے سرو سامانی اور ویرانی کے دن تھے کہ آج بھی ان دِنوں کے تصور سے کانپ جاتا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے کا غم، فکرِ معاش، چار چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم اور والدین کی گرتی ہوئی صحت۔ بس ایک ہی دُھن کہ نوکری مل جائے...... دنیا اتنی بری نہیں، چنانچہ اسی پولس کے محکمہ میں جس سیکشن کے ان کے والد سب سے بڑے آفیسر تھے، بشیر بدر کو اسسٹنٹ اکاؤنٹینٹ کی عارضی نوکری مل گئی اور اس وقت ان کی تنخواہ ۸۵ روپے ماہوار تھی۔ بشیر بدر کی نسبت ان کی چچا کی بیٹی قمر جہاں شہناز سے طے تھی، حالات اعتدال پر آئے تو بزرگوں نے بشیر بدر اور قمر جہاں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔ بشیر بدر نے بتایا کہ

"عزیز صاحب ہمارے والد کے چچازاد بھائی تھے۔ ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور والد صاحب بکل محویت کے عالم میں تھے۔ لیکن دونوں کا پرانا وعدہ تھا سو وہ پورا ہوا، قمر جہاں سے شادی کی تاریخ مجھے یاد نہیں۔"

بشیر بدر نے محنت جدوجہد اور حوصلے سے اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نبھائی بھائیوں میں محمد ضمیر اور صغیر دونوں نے انٹر پاس کر لیا، محمد ضمیر کو ملازمت مل گئی، دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی ہو گئی۔ دونوں آج کل لکھنؤ میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔

زندگی کے ان تمام ہنگاموں کے ساتھ بشیر بدر کا شعری ذوق بھی پروان چڑھتا رہا شاعری سے تعلق کی ابتدا ۸ سال کی عمر سے ہو چکی تھی۔ لیکن دوبارہ جب وہ باقاعدہ غزل کے میدان میں آئے تو ان کی عمر بیس سال تھی۔ نقوش (لاہور) سویرا (لاہور) سے ہندوستان کی شاہراہ تک کئی ادبی رسائل میں ان کا نام منظر عام پر آ رہا تھا گھر کے افراد تک اس بات سے ناواقف تھے کہ وہ اس قدر باقاعدگی کے ساتھ شاعری کرتے ہیں۔

ڈاکٹر بشیر بدر کی پہلی شریک حیات قمر جہاں شہناز تھیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے بتایا کہ وہ انتہائی صابر حوصلہ مند اور شوہر پرست خاتون تھیں۔ موزوں طبع تھیں، غزل اور نظم کہتی تھیں، شہناز تخلص تھا۔ اکثر رسائل میں ان کی غزلیں شائع ہوئیں۔ ان کی کوئی نظم شائع نہیں ہوئی۔ ان کے انتقال کے

بعد ایک ڈائری کے ذریعہ معلوم ہوا کہ وہ نظم کہنے کا اچھا شعور رکھتی تھیں''
۲۱؍مئی ۱۹۸۴ء کو بہت مختصر علالت کے بعد اچانک انتقال ہوگیا۔ میرٹھ میں ہی دفن ہوئیں۔
قمر جہاں شہناز کے بطن سے دو بیٹے معصوم اور نصرت اور ایک بیٹی صبا ہے۔ بڑے بیٹے معصوم عرف ٹیٹو نے انٹر پاس کیا اور تعلیم چھوڑ دی۔ چھوٹے بیٹے نصرت (عرف بینو) نے بی کام کیا۔ دونوں کی شادی ہو چکی ہے اور بڑا بیٹا علی گڑھ چھوٹا میرٹھ میں رہتا ہے۔

صبا کے متعلق ڈاکٹر بشیر بدر نے بتایا کہ ''وہ شروع سے بہت ذہین سمجھدار اور پڑھنے کی شوقین تھی۔ اللہ نے اس حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت سے بھی مالا مال کیا۔ بی اے میں مس یونیورسٹی بنی۔ ایم اے سال اول میں تعلیم حاصل کر رہی تھی کہ قمر جہاں کا انتقال ہوگیا اب وہ گھر میں تنہا ہوگئی۔ تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے بہت جلد ڈاکٹر بشیر بدر نے اس کی شادی میرٹھ کے ایک راجپوت خاندان میں کر دی۔ صبا کے شوہر کا نام کنور واحد ہے۔ جو ایم۔بی۔اے (M.B.A) ہیں۔ میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور میں ان کے باغات اور زمین و جائداد ہے۔ خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کنور واحد، کنور محمود علی خاں سابق گورنر مدھیہ پردیش کے حقیقی بھتیجے ہیں۔

چھوٹے بیٹے نصرت (عرف بینو) کی شادی جون ۸۹ء میں دہلی کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی سے ہوئی۔ نصرت میرٹھ میں ملازمت کرتے ہیں۔ ان تینوں بچوں کی پیدائش ڈاکٹر بشیر بدر کے علی گڑھ تعلیم حاصل کرنے جانے سے پہلے کی ہے۔

اگرچہ بشیر بدر کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوئے خاصہ طویل عرصہ ہوگیا تھا لیکن لکھنے پڑھنے کا شوق ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا۔ ہندی زبان نہ آنے کی وجہ سے انٹر پاس کرنا ناممکن تھا چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں ادیب ماہر جامعہ علی گڑھ سے پاس کیا۔ فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن آنے پر سر سید میڈل ملا۔ ۱۹۶۳ء میں بشیر بدر نے ادیب کامل کا امتحان دیا۔ اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے پری یونیورسٹی انگریزی کیا۔ ۱۹۶۶ء میں بی اے (فرسٹ) انگریزی ادبیات پاس کیا۔ ۱۹۶۷ء میں بی۔اے (سیکنڈ) فائنل پاس کیا۔ تعلیم کے ساتھ ملازمت بھی جاری تھی لیکن ۱۹۶۷ء میں جب کہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولس تھے۔ ملازمت ترک کر دی اور علی گڑھ یونیورسٹی میں سلیمان ہال میں قیام رہا، علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر

ہوئے۔ غالب نمبر نکالا جو آج بھی اتنا مقبول ہے کہ یونیورسٹی کے شعبۂ نشرواشاعت میں کتابی صورت میں ملتا ہے۔

۱۹۶۸ء میں یونیورسٹی کے ایم۔اے (سالِ اوّل) ٹاپ کرنے والوں کی فہرست میں اوّل آنے پر ۱۰۰ روپیہ ماہانہ سرولیم موریس اسکالرشپ ملا۔ ۱۹۶۹ء میں اردو میں ایم اے میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن لانے پر یونیورسٹی گولڈ میڈل ملا۔ دیگر مضامین کی ٹاپرس لسٹ میں اول آنے پر رادھا کرشنن پرائز ملا۔

ایم اے میں ۱۰۰۰ میں سے ۷۴۳ لانے کا ریکارڈ ہے جو اب بھی بدستور قائم ہے۔ تحریری پرچوں میں ۷۵ فیصد سے زیادہ نمبر آئے اور Viva میں اختلافی مسائل پر مدلل بحث ہوئی جس میں سو میں سے اڑسٹھ نمبر دیئے گئے۔

ایم اے کے بعد شعبۂ اردو کے پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں انھوں نے پی ایچ ڈی کیا۔ تحقیق کا موضوع "آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ" (ہندوستان اور پاکستان میں)۔

۲۸ فروری ۱۹۷۴ء کو اکیڈمک کونسل کی منظوری سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔[1]

مسلم یونیورسٹی کے تعلق سے کچھ باتیں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ جب بشیر بدر ایم اے کرنے یونیورسٹی آئے تو یونیورسٹی کے ایم اے اردو کے ایک پرچے میں داخل نصاب تھے۔ یہ پرچہ جدید تر غزل کے نام سے پڑھایا جاتا تھا۔ اس نصاب کو رسالہ "شب خون" نے شائع کیا تھا جس کی نقل پیش ہے۔

۱۔ یگانہ فراق کے بعد غزل نیا عنصر نیا لہجہ
۲۔ غزل کی نئی علامتیں اور نئے لفظی تلازمے

ناصر کاظمی، سلیم احمد، احمد مشتاق، ظفر اقبال، شکیب جلالی، شہزاد احمد، احمد فراز، شہریار، بمل کرشن اشک، محمد علوی، بشیر بدر، ساقی فاروقی وغیرہ[2]

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ علی گڑھ میں ہر سال شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید کا مقابلہ ہوتا تھا۔

---

[1] بشیر بدر سے ایک ملاقات۔

[2] رسالہ شب خون نومبر ۱۹۶۸ء صفحہ ۸۶

تنقید میں جو اول آتا تھا اسے علی گڑھ میگزین کی ادارت ملتی تھی۔ بشیر بدر اس مقابلہ میں شریک ہوئے اسی سلسلہ میں بشیر بدر کو میگزین کی ادارت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کے علاوہ بشیر بدر کو اس سال شاعری کا بھی پہلا انعام ملا۔ اس انعام میں حامد حسن قادری کی کتاب "داستان اردو" دی گئی لیکن اس کے بعد آل احمد سرور صاحب صدر شعبۂ اردو علی مسلم یونیورسٹی نے بشیر بدر کو منع کیا کہ وہ آئندہ اس مقابلے میں شریک نہ ہوں اگر ہوں گے تو اس سے دوسرے طلبا کی حق تلفی ہوگی، اس کے بعد انہوں نے کسی شعری مقابلے میں حصہ نہیں لیا۔

علی گڑھ میگزین دو سال تک بشیر بدر کی زیر ادارت نکلتا رہا، رسالے کو نکلتے ہوئے ۵۰ سال پورے ہو رہے تھے۔ بشیر بدر نے بڑی محنت و تحقیق سے غالب نمبر کی تیاری شروع کی۔

علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم جب قائم ہوا تو علی گڑھ گزٹ نکلتا تھا جس کے کچھ صفحات اردو، ہندی کے میگزین کے لیے تھے۔ جس کی ادارت شبلی کرتے تھے۔ انہیں کی ادارت میں یہ رسالہ الگ رسالہ کی صورت میں 'علی گڑھ منتھلی' کے نام سے نکالا جانے لگا۔ رشید احمد صدیقی صاحب جو کہ انتہائی مہذب خوش مذاق انسان تھے جب اس کے ایڈیٹر ہوئے تو انھوں نے رسالے کے نام سے منتھلی کاٹ کر اس کا نام 'علی گڑھ میگزین' رکھ دیا۔

بشیر بدر نے اس رسالہ کا جو غالب نمبر نکالا وہ اس رسالہ کی ۵۰ویں سالگرہ بھی تھی۔ انہوں نے بہت تحقیقی محنت سے ابتدائی شماروں کے اوراق کی تصویر چھاپی اور جتنے سابق ایڈیٹر تھے انہیں علی گڑھ میں جمع کر کے ایک گروپ فوٹو کھچوایا۔ یہ نادر اور یادگار تصویر میگزین کی زینت بنی ہوئی ہے جس میں رشید احمد صدیقی، آلِ احمد سرور، قمر رئیس، خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر مختار الدین آرزو، نسیم قریشی، شہریار اور دیگر کئی سابق ایڈیٹرس کی تصاویر شامل ہیں۔ بشیر بدر نے ایک تحقیقی مضمون مرتب کیا جس میں بتایا کہ شروع سے آج تک کون کون اس کا مدیر رہا۔ جاں نثار اختر، راہب مرادآبادی اور کئی اہم لوگ بھی اس کے ایڈیٹر تھے لیکن وہ اس گروپ فوٹو میں شریک نہیں ہو سکے۔

اس کے علاوہ بشیر بدر نے ایک فہرست تیار کی کہ علی گڑھ میگزین نے کس سن میں کس کا خاص نمبر نکالا۔ اس تحقیقی کام پر انہیں رشید احمد صدیقی بہت داد دی۔

ایم اے اردو کرنے کے بعد بشیر بدر نے پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی نگرانی میں تحقیقی کام

کرنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی شعبۂ اردو میں عارضی طور پر کام کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک وہ کئی بار عارضی لکچرر منتخب ہوئے۔ U.G.C اسکالرشپ ملنے کی وجہ سے لکچرر نہ ہونے کے باوجود بھی کلاسیز لینے کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری مل جانے کے بعد ۱۴ر اگست ۱۹۷۴ء کو ان کا تقرر میرٹھ کالج کے شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرار ہوگیا۔

میرٹھ کالج میں تقرری کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنی بیوی اور تینوں بچوں کے ساتھ میرٹھ منتقل ہوگئے۔ سی ۵۶ شاستری نگر میں کرائے کے مکان میں مستقل قیام پذیر ہوئے لیکن ۱۹۸۳ء میں انہوں نے شاستری نگر میں ۱۲۰ نمبر کا ایم۔ آئی۔ جی فلیٹ خرید لیا اور اپنی رفیقۂ حیات کی خواہش کے مطابق اس میں بہت جلد منتقل ہوگئے۔ اب ڈاکٹر بشیر بدر کے گھر میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور بشیر بدر درس و تدریس کی مصروفیت کے ساتھ شاعروں میں چھائے ہوئے تھے۔ بشیر بدر کے دوست میرٹھ کے انگریزی اردو صحافی گیان چند گرداب لکھتے ہیں:

"اپنے مکان میں آکر ڈاکٹر صاحب کا رہن سہن بالکل بدل گیا۔ ڈرائنگ روم میں نیا صوفہ سیٹ اور کھانے پینے کی نئی میز کرسیاں لگائی گئیں۔ اس میں ٹی وی سیٹ اور فریج رکھا پہلے ڈاکٹر صاحب کے پاس اسکوٹر تھا اب ایک فیئٹ کار بھی پورچ میں کھڑی ہوگئی۔"[1]

لیکن قدرت کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ مئی ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر صاحب کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر بشیر بدر انڈو پاک مشاعرہ میں شرکت کے لئے پاکستان گئے ہوئے تھے۔ بشیر بدر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بروقت اطلاع نہ مل سکی اور ان کی غیر موجودگی میں بیگم بدر کی تدفین عمل میں آئی۔ میرٹھ کے مسلمانوں کے علاوہ ہندو دوستوں اور پڑوسیوں نے کثیر تعداد میں جنازے میں شرکت کی۔ ۲۲ر مئی کو ڈاکٹر بشیر بدر میرٹھ پہنچ سکے۔

اگرچہ شریکِ حیات کے یکایک مفارقت نے ان کے دل کو رنج و ملال سے بھر دیا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو بچا کیا، شعر و شاعری کی مصروفیت میں اپنے غم کو بھلانے کی کوشش کی۔ ان کے دوست گیان چند گرداب آگے لکھتے ہیں:

---

[1] سہ ماہی فکر و آگہی، بشیر بدر نمبر ۱۹۸۸ء، صفحہ ۲۳۰

”میرا قیاس تھا کہ بیگم بدر کی وفات کے بعد ان کی تخلیقی قوتیں کسی حد تک مفلوج ہو جائیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا وہ نہ صرف جلد ہی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ بلکہ ان کے بحر سخن سے ایسے آب دار موتی نکلے کہ لوگ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ چند مہینے تو ڈاکٹر صاحب کے دماغ پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا لیکن یک بیک آسمان سے بجلی گری اور کاشانۂ سکونِ قلب جل کر خاکستر ہو گیا، دراصل ڈاکٹر صاحب کو اپنی رفیقۂ حیات سے والہانہ محبت تھی وہ ان کی بے پناہ محبت سے محروم ہوئے تو دامنِ صبر و شکیب ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دماغی ٹینشن (تناؤ) کے شکار ہو گئے۔ . . . ان دنوں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت جو بگڑی تو بگڑتی ہی چلی گئی۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب انہوں نے باہری لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ . . . . مشاعروں میں شرکت کیلئے دُور دُور سے دعوت نامے آتے تھے لیکن وہ اس وہم میں مبتلا تھے کہ اب میں دوڑ دھوپ کر ہی نہیں سکتا۔“[1]

ڈاکٹر بشیر بدر کی بیٹی صبا نے مجھے بتایا کہ پاپا (بشیر بدر) ان دنوں بیحد خاموش اور کھوئے کھوئے رہنے لگے تھے۔ بے خوابی اور بد حواسی کی کیفیت طاری رہتی تھی وہ اتنے دل گرفتہ اور غمگین تھے کہ ہم لوگ ممی کا غم بھول کر دن رات ان کیلئے فکر مند رہنے لگے تھے[2]

بشیر بدر کے بچوں نے ان کی تیمار داری اور دل جوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ مخلص دوست واحباب بھی متفکر تھے اور چاہتے تھے کہ وہ صحت یاب ہو کر دوبارہ زندگی کی دوڑ میں شریک ہو جائیں۔

وقت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے زخم مندمل ہوئے، پہلے اپنے بڑے بیٹے ٹیٹو کی شادی علی گڑھ میں کی۔ اس کے بعد صبا کی شادی کے فرائض سے سبکدوش ہوئے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان تمام حادثات نیز افراتفری کے باوجود شعر و شاعری سے انہوں نے کبھی قطع تعلق نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے قریبی دوست اور گھر کے بزرگ کی طرح آمد و رفت رکھنے والے

---

[1] سہ ماہی فکر و آگہی، بشیر بدر نمبر ۱۹۸۸ء، صفحہ ۲۴۳

[2] ایک ملاقات جون ۱۹۸۹ء از راقم السطور

گیان چند گرداب نے لکھا ہے کہ:

"دورانِ علالت دو باتیں ایسی ہوئیں جن کا ذکر ازحد ضروری ہے ایک تو یہ کہ شدید علالت کے باوجود ڈاکٹر صاحب غزلیں لکھتے رہے حقیقت یہ ہے اِن دِنوں جو شاہکار غزلیں ان کے قلم سے نکلیں ویسی تو شاید انہوں نے کمالِ صحت میں بھی تخلیق نہیں کی تھیں۔ تنہائی ان کے لئے سوہانِ روح تھی۔ اپنے گھر میں اکیلے بیٹھے بیٹھے جب ان کا دل گھبرانے لگتا تو پیدل چل کر میرے گھر آجاتے اور کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہتے۔ آج سویرے ہی ایک غزل کے کچھ اشعار لکھے ہیں کہو تو سناؤں۔ جب میں ان کا کلام سنتا تو ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا کہ اتنے شدید دماغی انتشار کے باوجود وہ اتنے اچھے شعر کہہ لیتے ہیں۔ ان دنوں بیماری کی حالت میں بدر صاحب نے جو خوبصورت اور شاندار غزلیں لکھیں ان میں سے "چند مٹھی بھر غزلیں" کے عنوان سے بمبئی کے ماہنامہ شاعر میں شائع ہوئی ہیں۔ ناظرین انہیں پڑھ کر خود ہی اندازہ لگائیں کہ ایک بیمار شاعر نے اتنی صحت مند غزلیں کیسے لکھ ڈالیں۔

دوسری بات یہ کہ بدر صاحب کے حاسدوں اور دشمنوں نے بیماری کا پورا فائدہ اٹھایا اور ان کے متعلق بے بنیاد افواہیں پھیلانا شروع کر دیں۔ کسی نے کہا کہ بدر صاحب نے ایک ۱۸ سالہ حسین و جمیل لڑکی سے شادی کرلی ہے اور اس کے چکر میں دیوانے ہو گئے، کسی نے یہ بے پر کی اڑائی کہ گھر بار چھوڑ کر تارک الدنیا ہو گئے، اس لئے ان کو مشاعرہ میں بلانا بے کار ہے۔"[1]

ایک سال کی طویل خاموشی کے بعد بشیر بدر باقاعدہ کالج جانے لگے اور مشاعروں میں گونج اٹھے۔ ہندوستان کے علاوہ بین الاقوامی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ تندرست ہونے کے بعد ۱۹۸۶ء میں وہ نیویارک، واشنگٹن، سان فرانسسکو اور اٹلانٹا گئے۔ مسقط (عمان) کے دو روزہ مشاعرہ میں شرکت کی۔ دو بار قطر میں سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

---

[1] سہ ماہی فکر و آگہی، بشیر بدر نمبر ۱۹۸۸ء، صفحہ ۲۲۴

ڈاکٹر بشیر بدر نے زندگی کے اہم واقعات میں ۱۹۸۷ء کا میرٹھ کا فساد بھی شامل ہے جس نے ان کے بڑی محنت و جدوجہد سے بنائے ہوئے گلستاں کو ریگستاں میں تبدیل کر دیا تھا۔

میرٹھ میں شاستری نگر نامی ایک نئی کالونی میں بشیر بدر نے MIG فلیٹ خریدا۔ فلیٹ خریدتے ہوئے تین سال بھی نہ ہوئے تھے کہ مئی ۱۹۸۷ء میں ان کا مکان فرقہ وارانہ فساد کی نذر ہو گیا ہندوستان کے کروڑوں عوام اور سیکڑوں اخبارات نے اس فساد کی مذمت کی۔

ڈاکٹر بشیر بدر کا بیان ہے کہ وہ ترقی اُردو بورڈ (مرکزی حکومت) میں اتر پردیش کی نمائندگی کرنے دہلی گئے ہوئے تھے کہ ۱۸ اور ۱۹ مئی کی شب میں میرٹھ میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ ۱۹ مئی کو ان کے بڑے صاحبزادے معصوم سے پڑوسیوں نے کہا کہ وہ اپنے کنبے کے ساتھ شاستری نگر سے چلے جائیں معصوم ڈیٹوٹی خطرہ کی بو سونگھ کر اپنی اہلیہ اور اپنے ایک سال کے بچے کے ساتھ پڑوس کے ہی چودھری دھرم پال سنگھ کے گھر میں چھپ گئے۔ چھوٹا لڑکا نصرت گھر میں ہی رہا۔ ۲۱ مئی کی صبح جب نصرت (بینو) اپنے بڑے بھائی اور بھاوج کی خیریت دریافت کرنے گھر سے نکلا تو فسادی صدر دروازے سے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کا قیمتی اثاثہ لوٹ لیا گیا اور بہت ہی بیش قیمت اشیاء میں تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ جس میں بے شمار قیمتی رسائل، کتب، تصاویر، دستاویزیں، ڈاکٹر صاحب کی تحریریں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے تعلیمی اسناد اور پاسپورٹ بھی جلے ہوئے نشانات کے ساتھ ان کے پاس موجود ہے۔ ان کے چھوٹے بیٹے کا کہنا ہے کہ

''وہ بھی فسادیوں میں شامل ہو کر اپنے گھر کو جلتا ہوا دیکھتا رہا''

فسادی ڈاکٹر صاحب کے لڑکوں کی تلاش میں رہے۔ ان کے بڑے بیٹے اور بہو کو چودھری دھرم پال نے اپنے گھر میں پناہ ہی نہ دی بلکہ چودھری صاحب اور ان کے بڑے بھائی ریوالور لے کر چھت پر مقابلے کے لئے تیار رہے اور اسی روز انہوں نے رات کی تاریکی میں بشیر بدر کے افرادِ خاندان کو ایک بس میں بٹھا کر حسن پور روانہ کر دیا۔

ڈاکٹر بشیر بدر نے بتایا کہ

''ان کی ماروتی ان کے ایک دوست مسٹر اگروال نے خطرناک صورت حال کے پیش نظر ایک روز قبل ہی پولس اسٹیشن میں جمع کروائی تھی۔ وی سی آر کسی پڑوسی

مانگا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ باقی تمام سامان کتب، چیک، تصاویر، زیورات اور نقدی فسادی لوٹ کر لے گئے یا نذرِ آتش کر دیا۔"

میرٹھ کے فسادات نے تمام انسانیت کی نظریں جھکا دیں تھیں اخبارات نے جلی حروف میں ڈاکٹر بشیر بدر کے اشعار کے ساتھ ان کی بربادی کی داستان لکھی، چند اقتباسات بطور نمونہ پیش ہیں۔

Dushmani gam kar karo lekin yeh gunjaish rahe
gab kabhi ham dost ho gaayen to sharminda na hon

The city is pasing through a similar phase, the words of Dr. Basheer Badr seem to have added a new dimension to it.
Tne famous Urdu poet with out whom no Mushaira was considered complete, had perhaps little in mind that one day, he will be passing through the same tramatic experience. ۱

میرٹھ کی تاراجی کی تفصیل لکھتے ہوئے اسی اخبار نے اپنی رپورٹ کے اختتام میں لکھا

Dr. Badar perhapes had a promotion of the devide when he wrote.

HUM NAHIN JANTE CHIRAGHON NE
KYON ANDHERO SE DOSTI KARLI
DHARKANE DAFN HO GAYI HONGI
DIL MEIN DIWAR KYON KHARI KARLI

میرٹھ کے فسادات کے سلسلہ میں روزنامہ ہندی ہندوستان، ہفتہ وار یک مارگ اور

---

۱ Indian Express, Delhi, 7th June 1987

۲ Indian Express, Delhi, 7th June 1987

The Times of India نے بشیر بدر کے اشعار کے ساتھ اپنی رپورٹ شائع کی۔ ابتداء میں روزنامہ امراجالا نے لکھا۔

دشمنی کا سفر اک قدم دو قدم
تم بھی تھک جاؤ گے ہم بھی تھک جائیں گے [1]

اور اختتام اس شعر پر کیا:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے یہاں فاصلے سے ملا کرو

The Times of India نے ۲ر جون کو PAC Focus Marat' کے عنوان سے رپورٹ شائع کی اور بشیر بدر کے مشہور شعر سے کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا۔۔۔۔ سے اس کا اختتام کیا۔

ہندی کے مشہور روزنامہ امراجالا نے لکھا۔

دشمنی کا سفر اک قدم دو قدم
تم بھی تھک جاؤ گے ہم بھی تھک جائیں گے

یہ ہے جانے مانے شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کی نظم (غزل) کے کچھ ٹکڑے جن کا گھر اس بار دنگے میں جل کر راکھ ہو گیا اب اگر ان سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہیں گے۔

اب اگلے برس یہ در و دیوار نہ ہوں گے
اس گھر سے بہت آتی ہے اشعار کی خوشبو

اس اخبار نے میرٹھ کی بربادی کی داستاں یوں ختم کی ہے
"میرٹھ کالج کے اردو وبھاگ کے پردھیا پک ڈاکٹر بشیر بدر سے ویکتی گت ملاقات سمبھو نہ ہو سکی۔ ٹیلیفون پر انہوں نے اپنا ہی لکھا یہ شعر سنایا۔

---

1. The Times of India 2 June 1987

2. امراجالا (ہندی) میرٹھ مئی ۱۹۸۷ء

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

''سٹری بدر نے کہا: دہشت گردی کے ماحول میں دوسرے مذہب کے پڑوسیوں کو بچانے والی چھوٹی سے چھوٹی کوشش کرنے والے ہی صحیح معنوں میں سوسائٹی کے ذمہ دار لوگ ہیں۔ دنگا آج نہیں کل ختم جائے گا۔ وقت کا مرہم لوگوں کے گھاؤ بھر دے گا، پھر ایک بار سب مل جل کر کام کریں گے لیکن جس نے بُرا کیا ہے وہ بھلے ہی آج کسی دھرم یا مذہب کا ٹھیکے دار بنا ہوا اس کی حقیقت کا پتہ چلے گا تو اسے کوسنے والوں کی تعداد بڑھے گی اور اس وقت ان ہمدرد لوگوں کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا اور آج کے جنونی لوگوں کو محسوس ہوگا کہ وہ سچے نہیں تھے وہ ظالم تھے انسانیت دشمن تھے وہ بھی محسوس کریں گے کہ یہ سچائی نہیں ہے جو چند دن خون خرابہ، لوٹ مار، آتش زنی، بربادی اور کرفیو لگا کر چلی گئی''[1]

فساد نے بشیر بدر کے حوصلوں پر پانی نہیں پھیرا بلکہ انہوں نے معمول کے مطابق مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت جاری رکھی۔

''عوام و خواص کے اصرار کے باوجود سال ڈیڑھ سال تک کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں لکھا جس میں ان کی بربادی کا تذکرہ ہو''

کانپور میں ایک مشاعرے کے دوران ڈاکٹر راحت اندوری نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا ''ہم تو ظلم کے خلاف لکھ رہے ہیں لیکن جن کا گھر جل گیا ہے وہ بہت نشاطیہ انداز میں آپ کے سامنے شعر پڑھ رہے ہیں''

''کانپور کے عوام نے بشیر بدر کو گھیر لیا اور ان سے استفسار کیا''۔ بشیر بدر نے کہا:
''درحقیقت تخلیقی عمل ایک داخلی عمل ہے اسے شعوری طور پر اخبار کی رپورٹ کی طرح نہیں لکھا جا سکتا''[2]

اس واقعہ کے تقریباً ایک سال بعد بشیر بدر نے کچھ ایسے اشعار سپرد قلم کئے۔ جن میں

---

[1] امر اجالا (ہندی)، ۹ر جون ۱۹۸۸ء، میرٹھ

میرٹھ کے فسادات کی تاراجی کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً

بڑے شوق سے میرے گھر جلا کوئی آنچ تجھ پہ نہ آئے گی
یہ زباں کسی نے خرید لی یہ قلم کسی کا غلام ہے

ایک اور شعر ہے ؎

کل اس کے باپ نے پہچان لیا — وہ ایک لڑکی فسادات میں جو کھوئی تھی

حال ہی میں انھوں نے ایک غزل ایسی کہی ہے جس میں کچھ غیر انسانی اور بے رحم فسادات کی جھلک ہے۔

دل اک پاکیزہ چادر سر پہ یہ چادر رکھنا — دروازے کی راکھ بھی گھر ہے مٹھی میں یہ گھر رکھنا
جلی ہوئی ٹوٹی دیوار میں میرے زخمی کاندھے ہیں — چاندنی رات چھپ کر آنا ان پر اپنا سر رکھنا
جس کاغذ پر میں لکھوں گا وہ کاغذ جل جائے گا — تتلی پر تیزاب چھڑکنا، پھولوں پر خنجر رکھنا
بھری رہے تاروں کی لڑی سی سندور سے مانگ — رہے کلائی سدا کھنکتی۔ کانچ کے یہ زیور رکھنا
پیار کیا تھا پیار کروں گا پیار ہے اپنی دھرتی سے — میں جب جاؤں میرے تن پر ماٹی کی چادر رکھنا
لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں — تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

ڈاکٹر بشیر بدر نے جو بے انتہا وسیع النظر اور وسیع القلب ہیں۔ اپنے معمول کے مطابق تمام دوستوں اور ساتھیوں سے ملتے جلتے رہے چنانچہ ۸ راگست ۱۹۸۷ء کو امر اجالا کی یہ خبر ہے جو بڑے جلی عنوان کے ساتھ چھپی کہ

"اس آگ اور خون اور کرفیو کے ماحول میں بشیر بدر راکھی کے تہوار پر اپنی بہن سرلا جی سے راکھی بندھوانے آئے۔"[1]

میرٹھ کے طوفان کے بادل چھٹ جانے کے بعد کئی اخبارات و رسائل میں ڈاکٹر بشیر بدر کے انٹرویو شائع ہوئے جن کا ایک ایک لفظ ڈاکٹر صاحب کی ہمت صبر و تحمل، ذہانت و بیباکی کی گواہی دیتا ہے۔

نو بھارت ٹائمس کی (۲۶ رمارچ ۱۹۸۸ء) اشاعت میں بشیر بدر سے ایک طویل ملاقات کی۔

---

[1] امر اجالا۔ ۱۸ راگست ۱۹۸۷ء، مطبوعہ میرٹھ

ایک رپورٹ شائع ہوئی، جس کی سرخی تھی۔

"میرا گھر جلا تو سارا جہاں میرا گھر ہو گیا" [1]

ہندی ہفتہ وار "ساتویں دنیا" بھوپال کے نامہ نگار کو جولائی ۱۹۸۶ء کو انٹرویو کے دوران بشیر بدر نے کہا:

"میرے کس گھر کے جلنے کے بارے میں آپ پوچھ رہے ہیں، میرا گھر چالیس سال سے برابر جل رہا ہے۔" [2]

ڈاکٹر بشیر بدر نے فساد میں گھر کی بربادی کے بعد فوری طور پر کوئی فساد زدہ شعر نہیں کہا۔ اس مصیبت کے وقت اور ایک عرصہ گذر جانے کے بعد آج بھی وہ کسی فرقے کیلئے کوئی برا لفظ حتیٰ کہ کوئی خیال بھی دل میں لانا پسند نہیں کرتے، بلکہ ان کو یقین ہے کہ

"فساد کرنے والوں کا کوئی مذہب کوئی دین نہیں ہوتا۔" [3]

۱۹۸۹ء میں جبلپور میں ایک کوی سمیلن منعقد ہوا جس میں اٹل بہاری واجپئی نے اسٹیج پر آتے ہی بشیر بدر کو گلے سے لگایا اور بڑے تپاک سے ان کی خیریت دریافت کرتے ہوئے کہا کہ بھئی تم کہاں ہو؟ ایک چٹھی لکھ دی ہوتی کہ خیریت سے ہو۔ تمہارے گھر جل جانے کا مجھے بہت دکھ ہوا۔"

بشیر بدر نے جب مائیک سنبھالا تو انہوں نے باجپئی صاحب کی محبت کو سراہتے ہوئے کہا کہ:

"آپ کو صحیح خبر نہیں ملی، میرا گھر نہیں جلا گھر وہ جلتے ہیں جو مٹی، گارے، لوہے اور سیمنٹ کے ہوتے ہیں، میرا گھر تو آپ کا اور دنیا کے کروڑوں کویتا پریمیوں کا دل ہے، آپ نشچنت (بے فکر) رہیں، بھگوان کی کرپا سے وہ بالکل محفوظ ہے۔" [4]

غرض اس مشکل ترین دور میں بھی بشیر بدر نے حوصلہ، امید اور لگن کا دامن تھامے رکھا، ان کے قول و فعل سے ان کی اولوالعزمی، بلند ہمتی، دریادلی اور وسیع النظری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

[1] نو بھارت ٹائمس مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۴ء

[2] ساتویں دنیا بھوپال، جولائی ۱۹۸۶ء [3] ایک ملاقات [4] مشاعرے کی رپورٹ۔ مطبوعہ جبلپور

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے انگریزی اور اُردو کے موثر ترین اخبارات اور رسائل نے بشیر بدر جیسے وطن پرست، سچے، بے لوث محبت کے شاعر کی دکھ بھری داستان کو خود ان کے اشعار، انٹرویوز اور بیانات کی روشنی میں شائع کیا۔ صحافیوں، دانشوروں ادیبوں شاعروں نے میرٹھ میں کئے گئے مظالم کی مذمت کی۔ اور بشیر بدر نے بھی ان کے نقصانات پر ہمدردی کا اظہار کیا لیکن بہت سے موقع پرست لوگوں نے بے بنیاد اور فضول باتوں کے ذریعہ دوبارہ ان کی زندگی میں زہر گھولنے کی ناکام کوشش بھی کی۔

بشیر بدر جو اُن دنوں علی گڑھ میں تھے خبر سن کر متفکر بھی ہوئے مغموم بھی لیکن اپنے بچوں کی عافیت کی خبر پاکر انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ انہوں نے زندگی کی جدوجہد جاری رکھی اور ان کے پائے استقلال میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اسی گھر جو راکھ کا ڈھیر تھا، جس میں جلے ہوئے دروازے اور بے رونق دیواریں تھیں۔ ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر بشیر بدر نے دوبارہ درست کروایا اور گھر کے تمام ضروری ساز و سامان اکٹھا کرنے کے بعد دوبارہ رہائش پذیر ہوگئے۔

گھر کے اندر اور گھر کے باہر ڈاکٹر بشیر بدر خود کو بہت تنہا محسوس کرتے تھے دوست واحباب کے اصرار کے باوجود شادی کیلئے راضی نہ ہوتے تھے لیکن بیٹی کی شادی کے بعد ان کو احساس تنہائی نے دوسری شادی کا ہم خیال بنالیا اور ڈاکٹر بشیر بدر ۴ر جون ۱۹۸۸ء کو بھوپال کی معروف شخصیت سید فتح علی صاحب کی صاحبزادی ڈاکٹر راحت سلطان کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

راحت سلطان جواب راحت بدر کے نام سے جانی جاتی ہیں ۱۹۵۶ء میں بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ بھوپال کی معروف شخصیت سید فتح علی صاحب (سکریٹری بیگم صاحبہ بھوپال) کی صاحبزادی ہیں۔ بی ایس سی کرنے کے بعد اردو میں ایم اے، بی ایڈ اور ڈی ایچ بی (ہومیوپیتھک کورس) کرچکی ہیں۔ کچھ عرصہ میڈیکل پریکٹس بھی کی۔ شادی سے قبل بھوپال کے ایک پرائیویٹ ہائی اسکول "آل سینٹس" All Saint's میں ملازمت کرتی رہیں۔ . . . ڈاکٹر بشیر بدر کا کہنا ہے کہ:

"راحت بہت ہمدرد، ذہین اور باصلاحیت ہیں"

اب تک کے پے در پے غم و فکر نے بشیر بدر کے جسم کو بیماریوں کی آماجگاہ بنا ڈالا۔ بھوپال کے معروف ڈاکٹر انصاف حسین صاحب کے علاج سے انہیں بہت افاقہ ہوا۔ اب ان کی شریک حیات

راحت بدر نے ان کے سفر و حضر میں مسلسل خبر گیری کا ذمہ لے رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک خط کے جواب میں لکھا:

"راحت صاحبہ کی خبر گیری نے مجھے بھرپور زندگی جینے کا حوصلہ دیا ہے۔" [1]

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ

"دوسری شادی کے بعد بشیر بدر اپنے پرانے مکان کو ٹھیک کروا کر دوبارہ رہنے لگے۔ ان کے پڑوسیوں اور محلہ کے بزرگوں جی. سی. بھنڈاری، ڈاکٹر کاشی ناتھ اور کرم سنگھ تیاگی نے ڈاکٹر صاحب کی واپسی پر اظہار مسرت کیا۔ لیکن کچھ شرپسند عناصر نے ۱۶ ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ان کے گھر پر حملہ کرنے کی کوشش کی، گھر والوں کے بیدار ہونے اور پڑوسیوں کی بروقت مدد سے حملہ آور بھاگ کھڑے ہوئے۔"

اس واقعہ کے بعد بشیر بدر نے میرٹھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور تقریباً ایک سال بھوپال میں قیام پذیر رہے۔ لیکن ذہنی پریشانی کی وجہ سے مستقل بیمار رہے۔ بھوپال میں علاج جاری رہا۔ اسی دوران امریکہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے گئے وہاں امریکن ڈاکٹرس کے زیر علاج رہے۔ امریکہ سے صحت مند اور تندرست ہو کر واپس ہوئے تو انھوں نے دوبارہ میرٹھ میں قیام کا فیصلہ کر لیا اور جنوری ۱۹۹۰ء سے بحیثیت صدر شعبۂ اردو میرٹھ کالج جوائن کر لیا۔

۱۹۹۴ء میں بشیر بدر نے بھوپال میں مستقل رہائش کا فیصلہ کر لیا۔ چند ماہ طبیعت ناساز رہی، دھیرے دھیرے بھوپال راس آنے لگا۔ طیب بدر کی ولادت، باسعادت (۸ فروری ۱۹۹۴ء) کے بعد وہ فلیٹ سے کشادہ اور وسیع مکان میں منتقل ہو گئے۔ ماشاء اللہ اس وقت طیب میاں کی عمر ½8 برس ہے۔ طیب بہت ہونہار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے گلشن میں نئی بہار کی آمد کے بعد ان کی صحت و مزاج میں بتدریج تندرستی و توانائی لوٹ آئی وہ اب ہمیشہ سے زیادہ خوش حال اور فعال ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے بعد انھیں کئی ایوارڈ بھی ملے میر تقی میر ایوارڈ، دہلی کشمیر اور یوپی کے صوبائی ایوارڈ اور ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ اس کے علاوہ پدم شری کا اعزاز اردو دنیا کا سب سے بڑا اعزاز 'جشن' دبئی دوحہ (جو ایک سال ہندوستان اور ایک سال پاکستان کو دیا جاتا ہے) ۲۰۰۰ء کا یہ اعزاز "جشن" دبئی، دوحہ ڈاکٹر بشیر بدر کو دیا گیا۔

بشیر بدر کی مقبولیت

ڈاکٹر بشیر بدر کا شمار آزاد ہندوستان کے مقبول ترین غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ اردو ادب ہندوستان و پاکستان کے نمائندہ رسائل میں بشیر بدر کا کلام بڑی باقاعدگی سے شائع ہو رہا تھا اور اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ۱۹۶۰ء سے قبل بشیر بدر کا شمار اردو کے ایسے شعرا میں ہونے لگا تھا جو ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپے ہیں۔

اس دور میں بشیر بدر مشاعروں سے قطعی ناواقف رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی جدید لب و لہجے کی غزلوں کو مشاعروں میں قبول نہیں کیا جا سکے گا۔ ۱۹۶۸ء تک بشیر بدر کسی قابلِ ذکر مشاعرہ میں بحیثیت شاعر یا بحیثیت سامع شریک نہیں ہوئے۔ لیکن ادبی حلقوں میں ان کی اس درجہ پذیرائی ہوئی کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ایم اے اردو کے ایک پرچے میں داخلِ نصاب ہو گئے۔ یہ پرچہ جدید غزل کے نام سے پڑھایا جاتا تھا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۶۸ء کے اردو ایم اے کے نصاب میں بشیر بدر پڑھائے جا رہے تھے اور اسی سال وہ ایم اے اردو میں بطور طالب علم پڑھ بھی رہے تھے لیکن کلام کی مقبولیت کے باوجود مشاعرے کے لئے اجنبی تھے۔

مشاعرے میں ان کی آمد اور مقبولیت کے آغاز کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ٹیلی ویژن کا بول بالا نہیں ہوا تھا اور شعری ذوق رکھنے والوں میں لکھنؤ کے سالانہ مشاعرہ کو بے انتہا شہرت و مقبولیت حاصل تھی۔ مئی ۱۹۶۹ء میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

نے اپنا سالانہ مشاعرہ کیا جو برسوں سے ملتوی ہوتا آرہا تھا۔ اس وقت لکھنؤ ریڈیو کے سالانہ مشاعرے کو امتیازی اہمیت حاصل تھی۔ باذوق لوگ اپنے دوست احباب کے ساتھ مشاعرہ سنتے تھے اور مہینوں اس مشاعرے کی کامیاب غزلوں پر تبصرہ ہوتے تھے فراق، جذبی، روش صدیقی، نشور واحدی اور شکیل بدایونی کو سننے کا بطور خاص انتظار کیا جاتا تھا۔

اس زمانے میں کئی اہم رسائل و اخبارات لکھ رہے تھے کہ اس اہم مشاعرے میں رسائل و جرائد کے جدید شعراء کو نمائندگی دی جائے۔ اس مشاعرے میں فراق سے لے کر مشاعرے کے مقبول شاعر بیکل اتساہی تک ۔۔۔۔ شریک تھے۔ بشیر بدر اور شمس الرحمٰن فاروقی کو جدید شاعر کی حیثیت سے پہلی بار مدعو کیا گیا۔

بشیر بدر نے اس سلسلے میں بتایا۔

دوسرے دن ایم اے فائنل کا Viva تھا، اس لئے شمولیت کا سوال ہی نہ تھا۔ لیکن VIVA لینے آنے والے پروفیسر نورالحسن ہاشمی اس مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے اس لئے عین مشاعرے کے دن ان کا تار شعبۂ اردو میں آیا کہ وہ دوسرے دن Viva لینے نہیں آرہے۔ چنانچہ علی گڑھ مشاعرے میں شرکت کے لئے ۱۱ بجے روانہ ہوا اور ٹرین اور بس کے ذریعے اس وقت مشاعرہ گاہ میں پہونچا جب مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔"

بشیر بدر کے مشاعرہ گاہ پہونچتے ہی ان کا نام پکارا گیا۔ بشیر بدر کے لئے اسٹیج پر کلام سنانے کا پہلا تجربہ تھا۔ لیکن پُر اثر گفتگو کا وہ خوب تجربہ رکھتے تھے۔ مجمع سے انھوں نے کہا۔ "میں پہلی بار مشاعرے میں پڑھ رہا ہوں، رسائل میں ۱۶، ۱۷ سال سے لکھ رہا ہوں۔ مجھ سے صرف ایک شعر سُن لیں اور فیصلہ کر دیں۔"

بشیر بدر نے گنگنا کر مندرجہ ذیل شعر پڑھا:

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انہیں کچھ ہنسی آگئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

بشیر بدر کافی کامیاب رہے، غزل کا ہر شعر بار بار سنایا گیا۔ زوردار فرمائشی آوازوں کے ساتھ بشیر بدر مائیک سے ہٹ گئے۔ ساغر نظامی نے دمشاعرہ کنڈکٹ کر رہے

تھے)، مجمع سے کہا کہ ریڈیو مشاعرہ میں غزل پہلے لکھ کر ڈائرکٹر سے پڑھنے کے لئے منظور کرائی جاتی ہے۔ اب اتنی مہلت دیں کہ دوسری غزل انچارج مشاعرہ سے پڑھنے کے لئے منظور کرالیں یہ صرف سامعین کو تسلی دینے کی ترکیب تھی، کیونکہ بہت سے شعرا موجود تھے جن کو اپنا کلام سنانا تھا۔

اس مشاعرے کے نشر ہوتے ہی بشیر بدر کے پاس مشاعروں کے دعوت ناموں کا انبار لگ گیا۔ اس سال سے آج تک بلا ناغہ وہ شنکر وشاد مشاعرہ دہلی میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ یہ مشاعرہ عالمی پیمانے پر ہوتا ہے۔

اُدارہ روبی" بشیر بدر کی مشاعروں میں مقبولیت کے سلسلے میں لکھتا ہے:۔

"بشیر بدر اردو کے مؤقر ترین رسائل میں گذشتہ ۱۵ سال سے برابر لکھ رہے ہیں لیکن مشاعروں میں ان کی مقبولیت کا آغاز ریڈیو لکھنؤ کے مشاعرے سے ہوا جس میں انھوں نے یہ شعر بھی پڑھا تھا

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انہیں کچھ ہنسی آگئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

اس سلسلے میں انھوں نے ایک مستحسن قدم اُٹھایا کہ وہ جدید غزلیں جن کے بارے میں متفقہ خیال تھا کہ یہ مشاعروں میں مقبول نہیں ہوسکتیں۔ ان کو انھوں نے مشاعروں میں متعارف کرایا۔ ان کی غزل جس کی ردیف بابا ہے جو "روبی" ہی میں شائع ہوئی تھی اسے جب انھوں نے مغربی یوپی کے ایک روایتی شہر (میرٹھ اس وقت ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ انہیں یہاں بسلسلۂ ملازمت ۱۵ سال گذارنے پڑیں گے۔) میں پڑھا تو خود انہیں کے مداحوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ اور جب ان سے پوچھا گیا کہ اب کیا ارادہ ہے تو انھوں نے کہا کہ شاعر اپنے فن کے سوا کسی کا وفادار نہیں ہوسکتا، بدلتی ہوئی قدروں کا تو ساتھ دینا ہوگا اور وہی غزل جو اتفاق سے اس روایتی شہر میں ناکام رہی۔ بالآخر دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، علی گڑھ، ہوشیار پور اور متعدد شہروں میں بیحد پسند کی گئی"[1]

---

[1] ماہنامہ روبی ۱۹۷۲ء، صفحہ ۵۵

بشیر بدر جب مشاعروں میں مقبول ہونا شروع ہوئے تو ان کے بقول مشاعرے میں یہ صلاحیت نہیں کہ مجھے خراب کر سکے، مشاعرے میں مقبول شعرا میں فراق، سردار جعفری، جذبی، مجروح سلطانپوری، روش صدیقی، ساغر نظامی، کیفی اعظمی، اختر الایمان شامل تھے۔ بشیر بدر ان شعرا کو بغور سنتے اور دیکھتے اور مختلف سطح کے سامعین کے ردعمل کا تجزیاتی مطالعہ بھی کر رہے تھے۔

اس وقت مشاعرے میں ایسے شعرا بھی تھے جو رسائل میں باقاعدگی سے چھپتے تھے لیکن ان کی گنجلک علامتی شاعری اور مائک پر سہما سہما جانے کا انداز عوام کی تفریح کا سامان مہیا کرتا تھا۔

بشیر بدر نے ان شاعروں کی ناکامی کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"آج غزل کا مسئلہ کیا ہے، غزل کروڑوں دلوں پر راج کر رہی ہے۔ پڑھنے والے اگر سوا لاکھ ہیں تو غزل سننے والے، غزل کے عاشق مختلف وسیلوں سے کروڑوں ہیں، یہ کروڑوں عاشقانِ غزل ہمارے ذہین نقادوں کی نگاہ میں اس لئے غیر معتبر ہیں کیونکہ یہ فارسی کی اترن لفظیات اور استعارات سے ناواقف ہیں ان کے مقابلے میں میرا خیال ہے کہ ان میں زندگی کے جو ذہین لوگ ہیں وہ ان مُردہ تراکیب سے بے خبر ہیں جن سے انہیں ناواقف ہونا چاہیے . . . . .

آج اردو کے کرم خوردہ الفاظ جیسے ناصح، زاہد، واعظ، دار و رسن، طوق گلو، چارہ گر، عیسیٰ نفس، کاوے کاوے، سخت جانی، قفس، صیاد، گلچیں، چرخ کہن، جیسے پچاس الفاظ کے بجائے ہزاروں زندگی کے الفاظ برتتے ہیں اور یہ الفاظ اس غزل کے شاعر کے منتظر ہیں جو انہیں غزل بنا سکے۔

ہمارے عہد میں سچی غزل کے دو دشمن تھے ایک تو یہی جو اردو کو عربی فارسی کی باندی سمجھنے والے تھے اور دوسرے مشاعرے میں ناچنے گانے والے . . . . . فارسی اور عربی کے غالب کس احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ مشاعرے میں جاتے تو سر کے بل جاتے اور (ہوٹ ہو کر) گالیاں بکتے واپس آتے تھے۔

دوسری طرف مشاعرے کو قوالی کی محفل نوٹنکی کا بدل بنانے والے دلچسپی کا سامان لوگ تھے۔ نہ یہ شاعر تھے نہ وہ شاعر تھے۔ سُننے والے چالاک تھے پہلے (انداز کے شعراکو) گالیاں دیتے اور دوسری صنف سے تفریح لیتے"۔[1]

مشاعروں میں جانے سے قبل بشیر بدرؔ اردو رسائل کی دنیا کے معروف شاعر بن گئے تھے۔ ۱۶ یا ۱۷ سال سے ان کی غزلیں اُردو کے اعلیٰ ترین رسائل میں شائع ہو رہی تھیں۔ ان کی غزلوں میں انفرادیت کا اعتراف پروفیسر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین سے لے کر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور وحید اختر کر چکے تھے۔ ان کے اشعار پر خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے معتبر نقاد نے تشریحی تنقید لکھ دی تھی اور بتایا تھا کہ اردو غزل میں ایک نیا احساس نیا رویہ ہے۔

ہندوستان میں علی گڑھ ایک معتبر و محترم تعلیمی مرکز ہے۔ بشیر بدرؔ جب علی گڑھ پہنچے تو شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت شروع ہو چکی تھی، وہاں کے ماحول سے ان کے فن کو اور عروج حاصل ہوا اور بشیر بدرؔ اپنے ایم اے کی طالب علمی کے زمانے میں اس عہد کی محبوب ترین شخصیت بن گئے۔ علی گڑھ کے باذوق طلبا و طالبات ان کے اشعار کو صوبوں اور شہروں میں علی گڑھ کے تحفے کی حیثیت سے لے جایا کرتے تھے۔

وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے نصاب میں نئی شاعری کے تحت داخل نصاب تھے۔ رانچی یونیورسٹی کے ایم اے کے پرچے میں ان کے مندرجہ ذیل شعر پر تجزیہ کرنے کا سوال آ چکا تھا۔

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

غزل کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشاعرہ سے ناواقف رہ کر بھی دو سو سالہ اردو غزل کا وارث فن مشاعرہ کی اونچ نیچ سمجھ کر مشاعرہ میں آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعروں میں ان کی مقبولیت دن دونی رات چوگنی بڑھتی رہی۔

مشاعروں کے سلسلے میں بشیر بدرؔ ہندوستان کے ہر صوبے کا سفر کئی بار کر چکے ہیں۔

---

[1] آمد، صفحہ ۱۵-۱۶، مطبوعہ مکتبہ دین و ادب لکھنؤ ۱۹۸۵ء۔

جن کو شمار کرنا بہت مشکل ہے اور جن کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں ہے۔ البتہ بیرونی ممالک کے سفروں کی ایک فہرست دی جارہی ہے۔

۱۹۸۲ء میں پاکستان کا سفر کیا۔ جس میں مشاعروں کی شرکت کے علاوہ کراچی یونیورسٹی میں جدید غزل پر لکچر دیا۔ ۱۹۸۳ء میں کناڈا (امریکہ) مشاعروں میں شرکت کے ساتھ ٹورنٹو یونیورسٹی میں غالب پر مقالہ پڑھا۔ ۱۹۸۴ء میں پاکستان، ۱۹۸۶ء میں دُبئی، شارجہ، ابوظہبی (عرب امارات) ۱۹۸۶ء میں امریکہ، ۱۹۸۷ء سلطنت عمان اور ۱۹۸۹ء میں امریکہ ۱۹۹۲ء میں متحدہ عرب امارات، ۱۹۹۳ء میں جدّہ (سعودی عربیہ) مشاعروں میں شرکت کے لئے گئے اور بے حد مقبول رہے۔

بشیر بدرؔ نے مشاعروں میں مقبولیت حاصل کی اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ آیا ان کی منفرد غزل یا غزل پڑھنے کا خوبصورت مترنم انداز۔ ایمان دارانہ ناعاقبت اندیشی صاف گو ذہانت یا گفتگو کا سلیقہ؟

یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر بشیر بدرؔ اور اس عہد کے نقادوں اور شاعروں کو غور کرنا چاہیئے۔ مشاعروں کی طبع شدہ رپورٹوں اور سامعین کے ردِّعمل سے ان کی مقبولیت کی وجوہات کا پتہ لگانا کچھ دشوار کام نہیں۔

بشیر بدرؔ ڈی سی ایم کے مشاعرے میں پہلی بار آئے تو اس کی روداد "دستۂ گل" میں پروفیسر قمر رئیس نے لکھی اور ان کے بارے میں لکھا کہ:۔

> "بشیر بدرؔ کی نئی اسلوب کی غزل ان کے پڑھنے کا بالکل منفرد انداز سن کر دو ایک شعروں تک پبلک مبہوت رہی اور پھر ایک تازہ ترجھونکے کا احساس ہوا اور داد کی بارش ہونے لگی۔"[1]

۱۹۸۴ء میں بشیر بدرؔ پاکستان گئے۔ روزنامہ 'امن' کراچی نے ان کو جدید غزل کا امام کہتے ہوئے لکھا:

---

[1] دستۂ گل ۱۹۶۹ء صفحہ ۵

بشیر بدر عوام و خواص میں یکساں مقبول ہیں۔ کراچی میں غزل کے عاشق ان کے عاشق ہیں۔ ابھی چند روز قبل سکھر کے پاک و ہند مشاعرے میں انکو تاریخ ساز کامیابی ملی۔ ہزاروں افراد ان کے احترام میں کھڑے ہو کر ان کو دوبارہ آنے کی دعوت دیتے رہے۔ . . . . بشیر بدر جتنا ہندوستان میں پسند کئے جاتے ہیں اتنا ہی پاکستان کے عوام و خواص ان سے محبت کرتے نظر آتے ہیں [1]

اسی طرح ٹورنٹو یونیورسٹی (شمالی امریکہ) میں ۲۳ر اکتوبر ۸۴ء میں عالمی مشاعرے کی رپورٹ پر ایک امریکی اخبار نے عنوان دیا تھا۔

Dr. Basheer Badr Carries the day [2]

اخبارات کے تراشوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بشیر بدر کی غزل فن کے اعتبار سے جتنی مستحکم ہے اتنی ہی عوامی شہرت کے اعتبار سے بھی ہے۔

شنکر وشاد DCM کے عالمی مشاعرہ ۱۹۸۸ء میں بشیر بدر نے مشاعرہ کنڈکٹ بھی کیا۔ اخبارات نے اس کی رپورٹ شائع کی۔

اخبار 'ہندو' لکھتا ہے:

"Mushaira gets back seriousness." [1]

دی ٹائمس آف انڈیا نے لکھا:

"The noted Urdu poet Dr. Basheer Badr who was Mir Mushaira had been introducing every poet from India and Pakistan with such verve that it became an enjoyable part of the night's delight. [2]

"نیشنل ہیرالڈ" نے لکھا:

Basheer Badr who needs no introduction did a splendid Job conducing the procedings. [3]

---

[1] روزنامہ امن کراچی ۱۳ر مئی ۱۹۸۸ء، صفحہ ۵۔ [2] بحوالہ سہ ماہی انتخاب ٹونک صفحہ ۲۱

[1] Hindu 1988

[2] The Times of India 1988

[3] National herald 1988

مشاعروں کی دنیا میں بشیر بدر محبوب ترین شخصیت بن گئے، ہندوستان کے بڑے مشاعروں اور ہندی کے کوی سمیلنوں میں ان کی مقبولیت بڑھتی رہی۔

مشاعروں کی براڈ کاسٹنگ نے اور ادبی و شعری پروگراموں نے بشیر بدر کو غزل اور مشاعروں کا ہیرو بنا دیا ہے۔ آج کروڑوں عوام (سرمایہ دار، فیکٹری ورکرس، منیجرس، افسران، ہندی، اردو کے پروفیسرس، اور صاحب دل و صاحب نظر عوام) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غزل میں بھی Super Star کی گنجائش ہے اس Super Star کو اکیسویں صدی کی طرف جاتا ہوا سائنسی وقت قبول کر سکتا ہے۔

ہم نے ان کی مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لیے خطوط کے ذریعہ لوگوں سے دریافت کیا کہ ان کا پسندیدہ موجودہ اردو شاعر کون ہے، جن لوگوں سے یہ سوال کیا گیا تھا ان میں ٹی وی دیکھنے والے ادبی رسائل پڑھنے والے طلبا، اساتذہ اور باذوق عوام شامل تھے۔ ۹۳ فیصد لوگوں نے بشیر بدر کا نام لکھا کہ T.V پر مشاعرہ ہم اسی وقت سنتے ہیں جب اس میں بشیر بدر بھی ہوں۔

آج بشیر بدر اردو غزل کے محبوب ترین شاعر ہیں۔ ان کے اشعار زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں اس پر ان کی خوب صورت دلکش مترنم آواز جادو کا اثر کرتی ہے۔ تحت میں پڑھنے کا انداز بھی بہت سادہ اور قریب الفہم ہوتا ہے۔ ہر لفظ کی مکمل ادائیگی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

ان کا خوبصورت لب و لہجہ بھی ان کی مقبولیت کی پہچان ہے۔ غزل پڑھتے وقت بشیر بدر ہاتھوں کے اشاروں سے اپنی مسکراہٹ اور سنجیدگی سے غزل کے شعر کے مفہوم کو عوام کے دلوں میں اتارنے کا فن جانتے ہیں۔ غزل پڑھنے کا ان کا ایک منفرد انداز ہے۔

آج بشیر بدر کا نام جدید غزل کی دنیا میں عالمی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ان کی فنکارانہ قامت جونہی بلندیوں سے آشنا ہوئی تو مقبولیت اور شہرت نے بین الاقوامی حدوں کو چھو لیا۔ ابو فیض سحر لکھتے ہیں:

"پچھلے کئی برسوں سے بشیر بدر اردو غزل کے مقامی اور عالمی افق پر ایک خوبصورت شفق کی صورت میں نمایاں ہوئے ہیں، جس کی فکری و فنی تابش نے ہندوستان، پاکستان، انگلینڈ، امریکہ، کینیڈا اور مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک کے اردو شعرا اور

ادب کا ذوق رکھنے والوں کے دلوں کی آنکھوں کو پوری کشش اور جاذبیت ——
—— کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کیا حتیٰ کہ ہندی والے بھی اس سحر سے بچ نہ سکے۔"[1]
حقیقت یہ ہے کہ بشیر بدر نے اپنی محنت و ریاضت سے دبستانِ ادب میں اپنی جگہ بنائی۔ نوعمری میں کفالت کا بار اٹھانا پڑا اس کے باوجود انھوں نے تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھایا ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ ان تمام مرحلوں میں وہ اپنے پیروں پر کھڑے رہے اور جہدِ مسلسل سے زندگی کا کامیاب نقشہ مرتب کیا۔ جب مشاعروں میں آئے تو آندھی طوفان بن کر مشاعروں پر چھا گئے۔ ان کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کی وجہ ان کا ترنم یا تحت میں پڑھنے کا مخصوص انداز ہے۔ اور اس سے زیادہ ان کا معیاری کلام ہے۔ جس میں عصری آگہی جا بجا زندگی کی دھوپ اور احساس کے پھول بکھرے پڑے ہیں۔

ایک موقع پر بشیر بدر کی مقبولیت کے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بڑی دلچسپ بات کہی۔

"ڈاکٹر بشیر بدر پیارے شاعر ہیں اتنے پیارے انسان بھی ہیں جب انہیں مشاعرے لوٹتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کیوں کہ ہر دل عزیزی میں جو عوامی جہت شامل ہے۔ ہمارے دور میں اس کا رشتہ بین انسانی نوعیت کا بھی ہے۔ یعنی اُردو کو دوسری علاقائی زبانوں سے جوڑتا ہے۔ اور اس کی بڑی ضرورت ہے . . . . آج سے پندرہ بیس سال پہلے جب ہم مغربی ممالک میں جاتے تھے تو صرف ترقی پسندوں کا نام اردو حلقوں میں جانا جاتا تھا۔ ٹورنٹو میں ایک بار یہ سوال اٹھایا گیا کہ فیض، سردار جعفری، مجروح، اور کیفی اعظمی یعنی کمیونسٹ شاعروں کے علاوہ کیا کوئی دوسرا مسلمان شاعر اُردو کی نمائندگی نہیں کرسکتا، پھر ایک شاعر اسی مطالبہ پر بلائے گئے جو شکل و صورت لباس اور حلیہ اور ریش مبارک سے

---

[1] زندگی کی دھوپ اور احساس کے پھولوں کا شاعر: بشیر بدر۔ ابو فیض سحر۔
رسالہ فکر و آگہی بشیر بدر نمبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۶۴

سے اس کمی کو پورا کر رہے تھے ہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مغربی ممالک میں اُردو شاعروں کی رسائی کسی ازم یا کسی مذہب کے وسیلہ سے آسان تھی۔ اس لئے مجھے شک ہوتا ہے کہ اکثر شاعروں کی شہرت کا سبب ان کی سیاسی پارٹی یا ان کا مذہب ہے۔ آج بشیر بدر مغربی ممالک میں محبوب نام ہیں، لیکن کسی لیبل پر نہیں بلائے گئے۔ اپنے شعر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کرنا بشیر بدر کا امتیاز ہے[1]"

اسی تقریب میں محترمہ محسنہ قدوائی، وزیر شہری ترقیات و سیر و سیاحت حکومت ہند نے کہا:۔

"بشیر بدر ہندوستان ہی میں نہیں بیرونی ممالک میں بھی بہت مشہور ہیں۔ وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں، میں انہیں بہت قریب سے جانتی ہوں وہ ہمیشہ اعلیٰ انسانی قدروں کی حفاظت کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندوستان اور یہاں کے رہنے والوں کے لئے جو سچی محبت ہے۔ وہ ہمیشہ دلوں کو جوڑنے اور بھائی چارہ قائم کرنے کی آرزو کرتی ہے۔ ان کی زندگی میں بڑی بڑی ذاتی پریشانیاں آئیں لیکن وہ اپنی پریشانیوں کو بھول کر دنیا کے دکھ درد کی بات کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اتنی طاقت اور کشش ہے۔

ابھی مجھے ٹورنٹو جانے کا اتفاق ہوا، وہاں لوگوں نے مجھے ایک عالمی مشاعرہ کا کیسیٹ دکھایا۔ جس میں دنیا کے ان ملکوں کے اردو شاعر تھے۔ جہاں جہاں اردو بولی و سمجھی جاتی ہے۔ لیکن سننے والوں نے بشیر بدر کو جس محبت اور عزت سے سنا اس سے مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ صرف ان کی کامیابی نہیں، اردو غزل کی کامیابی نہیں بلکہ ہمارے ہندوستان کی کامیابی ہے"[2]

---

[1] تقریب رونمائی، "فکر و آگہی" دہلی۔ بشیر بدر نمبر۔ منعقدہ غالب اکیڈمی دہلی۔ فروری ۱۹۸۹ء

[2] تقریب رونمائی "فکر و آگہی" بشیر بدر نمبر۔ منعقدہ غالب اکیڈمی دہلی۔ ۱۰ فروری ۱۹۸۸ء

ڈاکٹر بشیر بدر کو خالقِ ازل نے یہ صنعت عطا کی ہے کہ وہ اپنا کلام سامعین کے دلوں اتار دیتے ہیں اور میں نے کوئی مشاعرہ ایسا نہیں سنا جس میں سامعین نے انہیں ایک غزل سننے کے بعد رخصت کر دیا ہو۔ مشاعروں کی ہنگامہ پرور دنیا میں یہ سعادت بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

قومی اور بین الاقوامی سطح پر بشیر بدر کی مقبولیت غزل کی مقبولیت کا دوسرا نام ہے۔ مشاعروں نے بشیر بدر کو جنم نہیں دیا بلکہ خود بشیر بدر نے جدید طرز کے مشاعروں کو جنم دیا ہے۔ لیکن مشاعرہ سازی بشیر بدر کا تخلیقی کارنامہ ہرگز نہیں۔ بشیر بدر کی وہ غزل جس کے ذریعے انھوں نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی۔ بشیر بدر کی دل نواز شخصیت، سادہ لوحی اور ذہین فن کارانہ پیشکش میں بھی ان کی شہرت و مقبولیت کا راز پنہاں ہے۔ نشر و اشاعت کی روز افزوں ترقی اور جدید وسائل کی ہمت افزائی نے بھی ان کی غزل کی مقبولیت اور شہرت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

آج بشیر بدر کی شاعری کی خوشبو ملکی سرحدیں توڑ کر بین الاقوامی سرحدوں میں داخل ہو چکی ہے۔ مشرقی ممالک کے ساتھ مغربی ممالک میں بھی بشیر بدر کی غزل سے عوام و خواص متاثر ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے ادبی رسائل کے علاوہ پاکستانی مشاعروں میں بھی بشیر بدر کو عوامی محبوبیت ملی۔ صرف اردو رسائل ہی نہیں ہندی رسائل کے مطالعہ سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندی والوں میں بھی بشیر بدر کی غزل خوبصورت ماڈل بنی ہوئی ہے، ہندی کے لکھنے والوں پر بشیر بدر کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کی اکثر علاقائی زبانوں میں بشیر بدر کی غزلوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ان میں عنایت حسین عیدن (فرانسیسی) بیدار بخت اور پروفیسر راجندر سنگھ ورما ستور کے انگریزی ترجمے بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

بشیر بدر کے انٹرویوز اور ان کے فن پر مختلف رسائل و اخبارات میں تبصرے و تنقیدی مضامین شائع ہو کر منظر عام پر آتے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ اہم رسائل کے نام یہ ہیں۔

''نقوش'' پاکستان، ''شاہراہ'' دہلی، ''نیا دور'' کراچی، ''محور'' دہلی، ''سب رس'' حیدرآباد دکن، ''آج کل'' دہلی، ''شاعر'' بمبئی، ''سویرا''، ''شب خون''، ''تخلیق'' نئی دہلی، ''سہیل''، ''نئی قدریں''،

چمن زار، فنون، آب و رنگ، ادب لطیف، اوراق، صبا، جام نور، (کراچی)، سات رنگ، فکر و آگہی (دہلی)، لاریب، (لکھنؤ)، بیسویں صدی (دہلی)، شمع، (دہلی)، کتاب نما (دہلی)،
بشیر بدر کی مقبولیت اور ان کی غزل کے نئے لب و لہجہ سے متاثر ہو کر اکثر رسائل نے ان کے فکر و فن پر خاص نمبر یا گوشے بھی شائع کئے ہیں جن کا عکس پیش کیا جا رہا ہے۔
بشیر بدر کے فکر و فن پر جن رسائل کے خاص نمبر یا گوشے ہمیں دستیاب ہوئے ان کے نام ہیں لمحے لمحے ۱۹۸۴ء (بدایوں)، سہ ماہی انتخاب (ٹونک)، ماہنامہ رابطہ (پاکستان)، بیسویں صدی دہلی شاعر بمبئی ۱۹۸۳ء اور فکر و آگہی دہلی۔ سہ ماہی انتساب سرونج

عادات و اطوار

ڈاکٹر بشیر بدر کی نجی زندگی معاملات اور معمولات کے بارے میں ان کی شریک حیات راحت بدر نے جو معلومات فراہم کیں اس کا خلاصہ اس طرح ہے انھوں نے ایک ملاقات میں بتایا:۔

"ڈاکٹر صاحب مزاجاً بہت صاف گو ہیں۔ غصہ انہیں بہت کم آتا ہے اور جب کبھی آتا ہے تو فوراً اس کا اظہار کرتے ہیں لیکن بعد میں باقاعدہ شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں۔ خواہ وہ غلطی پر ہوں، لیکن سامنے والے کو رنجیدہ نہیں دیکھنا چاہتے۔

گھر سے باہر جس سلیقہ سے رہتے ہیں، گھر کے اندر بھی ان کو سلیقہ اور سادگی پسند ہے۔ مزاج میں سادگی انکساری کی حد تک ہے۔ بیحد رحم دل مہربان انسان ہیں۔ خدا سے ان کے عجب معاملات ہیں، شاید ان کی کامیابیوں کا راز ان کی تاریک راتوں کی توبہ ہے۔

اب ان کی آمدنی اور خرچ شاہانہ ہیں دوستوں پر تو بھروسہ سب ہی کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب دشمن پر بھی اس درجہ اعتماد کرتے ہیں کہ اپنی کسی بات کو راز میں نہیں رکھتے ہیں۔ اور اکثر کہتے ہیں "دکھ درد اور خوشیاں دینے والا اوپر والا

ہے، اگر یہ کمزور اور ناتواں انسان کے بس میں سب کچھ ہوتا تو میں اس منزل تک کبھی نہ پہنچ پاتا جس پر ہوں۔" ان کا یہ شعر:۔

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

ان کے اعتماد اور جد وجہد کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک اور ملاقات میں مسز راحت بدر نے مجھے بتایا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں جو بات آجائے اور جس کام کو کرنے کی دل میں ٹھان لیں اس کام کو مکمل کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں عجلت پسند بھی واقع ہوئے ہیں، فیصلہ بہت جلد کرتے ہیں اور اکثر بالکل صحیح فیصلہ کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر بشیر بدر کے معمومات کے بارے میں میرے استفسار پر ڈاکٹر راحت میرٹھ سے ایک خط میں لکھتی ہیں:

"ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ تعلیم کے زمانے سے ہی وہ رات دیر سے سونے کے عادی ہیں، اپنے لکھنے پڑھنے کے ضروری کام، غزلوں کی کاٹ چھانٹ اکثر دیر رات تک کرتے ہیں۔ سرہانے ڈائری رکھتے ہیں۔ اکثر رات میں کم روشنی میں اشعار نوٹ کر دیتے ہیں، نامکمل غزلیں مکمل کر ڈالتے ہیں، خاندانی جھگڑوں، آپسی عداوتوں سے سخت متنفر رہتے ہیں، عبادات میں پابند تو نہیں ہیں لیکن خشوع خضوع اور اہتمام بہت ہے۔

ناشتہ کے بعد کالج جاتے ہیں، کالج سے واپسی پر کھانے کے بعد قیلولہ کرتے ہیں، شام یا تو دوستوں سے ملاقات یا تفریح کے لئے پیدل نکلنے کا معمول ہے۔ گھر کے علاوہ مشاعروں و سیمیناروں میں جب کسی جگہ جاتے ہیں تو ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور ایک خوش کن ہنگامی زندگی رہتی ہے۔ حاضر جواب ہیں۔ ذہانت سے بھرپور جواب دیتے ہیں، پُراثر گفتگو سے محفل بھی

لوٹنا جانتے ہیں. لیکن بعض جگہ خاموشی اور کم گوئی کو ترجیح دیتے ہیں۔"[1]

ان کی شہرت و مقبولیت کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ:

"ہندوستان کا کوئی شہر کوئی صوبہ ہو ڈاکٹر صاحب گھر سے نکلتے ہیں تو راستہ میں لوگ انہیں فوراً پہچان لیتے ہیں، ان کا پیچھا کرتے ہیں اور ان سے نوٹوں پر آٹوگراف لیتے ہیں. کبھی کبھی تو خود بھی حیرت ہوتی ہے کہ اگر ہم کسی کو ان کے واقعات بتائیں گے تو وہ یقین نہیں کرے گا. ایسے سینکڑوں واقعات ہیں جو ریل میں، بس میں یا راستہ چلتے ہوئے پیش آئے، نوجوان لڑکے لڑکیاں راستے میں آٹوگراف لیتے ہیں اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں. ڈاکٹر صاحب کی فطری بات ہے کہ بہت خوش ہوتے ہیں کہ ان کے اتنے چاہنے والے ہندوستان میں ہیں لیکن خوشی کے ساتھ بعض اوقات اسی لمحے ان کے چہرے پر ایسے جذباتی تاثرات ابھر آتے ہیں جن کو کوئی نام دینا مشکل ہے. اور جب تک تنہائی میں اس کامیابی پر سجدہ ریز نہ ہولیں اور آنسو نہ بہالیں تب تک ان کا دل ہلکا نہیں ہوتا۔"

جب ان سے سوال کیا گیا کہ بعض لوگ ڈاکٹر صاحب کو مغرور سمجھتے ہیں؟ آپ کا خیال ہے تو انہوں نے کہا:

"ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں ایک خاص بات ہے، لوگ ان کے رہن سہن اور سنجیدہ اور متین چہرے اور پُراثر گفتگو یا ان کے متعلق واقعات سے جن کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے یا ان کے ادبی، ادعائی بیانات کی وجہ سے خود پسند سمجھتے ہیں. لیکن غرور نہیں اور خود پسندی کا اظہار بھی نہیں ہے یہ جذبہ تو جب سامنے آتا ہے جب ان پر غلط اور بے بنیاد باتیں جوڑ دی جائیں یا ان کی شاعری اور شہرت و مقبولیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جائے. ایسا لگتا ہے کہ بعض اوقات وہ ایسے بیانات جان بوجھ کر بھی دیتے ہیں جن کا مقصد تنقید نگاروں کو Upset کرنا ہوتا ہے۔"

---

[1] خط راحت بدر بنام راقم السطور، مورخہ ستمبر ۱۹۸۹ء

بشیر بدر کا شعری سفر

ڈاکٹر بشیر بدر بنیادی طور پر شاعر اور خصوصاً غزل کے شاعر ہیں اور ان کی انفرادیت' شہرت اور مقبولیت کا انحصار بھی ان کی غزل گوئی پر ہے۔ بشیر بدر کا شمار اپنے عہد کے نامور اور منفرد جدید غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا کلام جس قدر پڑھا جاتا ہے اسی قدر دلچسپی اور شوق سے مشاعروں میں سنا اور پسند بھی کیا جاتا ہے۔ بشیر بدر کا شعری سفر ہنوز جاری ہے۔ اور وہ خوب سے خوب تر کی سمت گامزن ہیں۔ غزلوں کا پہلا مجموعہ اکائی ۱۹۶۹ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا تھا، امیج دوسرا مجموعہ ۱۹۷۳ء میں نصرت پبلیشر لکھنؤ سے چھپا اور آمد، مکتبہ دین و ادب لکھنؤ سے اکتوبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔

بشیر بدر ۱۹۵۵ء سے ہی پاکستانی رسائل میں غزل کے ایک نام کے طور پر ابھرنا شروع ہوئے اور چند ہی برسوں میں وہ نوجوانوں کے نمائندہ غزل گو شاعر کی صورت میں نمایاں ہوتے گئے۔ کراچی میں ان کی شہرت پہلے ہی مشاعرے کے ساتھ آسمان چھونے لگی۔ اُن کے کتنے مجموعے کن کن ناموں سے پاکستان میں شائع ہوئے ہیں یہ شاید محکمہ پولس ہی Investigate کر سکتی ہے۔ مثلاً پاکستان میں چھپنے والے ''امیج پر جس اشاعتی ادارہ کا نام درج ہے وہ انارکلی لاہور پر ہے جو بالکل فرضی ہے۔ بشیر بدر کے متعدد مجموعے ابن انشا مرحوم کے خاندان کے افراد نے مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۱۳۷ اردو بازار کراچی سے متواتر شائع کیے۔ ان میں امیج صفحات ۱۲۵، آمد صفحات ۱۶۰، آسمان صفحات ۱۲۸، آہٹ صفحات ۱۱۲ کے متعدد ایڈیشن منظرِ عام پر آئے ہیں۔

''کلیات بشیر بدر'' کے نام سے آمد، آسمان، امیج اور آہٹ کو یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۶ء تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔

لاہور کے امیج کی composing اور کراچی کی 'امیج' کو 'آس' کا نام اور 'آسمان' کے فوٹو اسٹیٹ کروا کے حسامی بک ڈپو حیدر آباد نے کئی بار چھاپتے رہنے کا ریکارڈ بنایا ہے۔

عباس تابش نے اپنے ادارے الرزاق پبلیکیشنز سے ''کوئی شام گھر بھی رہا کرو''۔ کے عنوان سے ۱۸۳ صفحات کا انتخاب ۱۹۹۶ء میں شائع کیا۔ ۱۹۹۸ء میں دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔ ناصر ریاض نے کچھ غزلوں کے اضافے کے ساتھ ناصر پبلیکیشنز اردو بازار سے اسے نئی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یکم جنوری ۲۰۰۱ء کو ''اللہ حافظ'' کے نام سے خالد شریف ماورا پبلیکیشنز بہادر لیور روڈ لاہور سے غزلوں کی نئی کتاب چھاپی ہے۔

ہندی رسم الخط میں شبد لوک پرکاشن نے ''تمھارے لیے'' کے عنوان سے ۱۹۸۵ء میں ۷۰ غزلوں کا ایک انتخاب چھاپا ہے جس کا پیشِ لفظ چندر ترکھانے لکھا ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چند ہی ماہ میں اس کا دوسرا ایڈیشن آ گیا۔ ہندی بک سینٹر کو ۱۹۹۶ء میں دوبارہ اس کی اشاعت کرنا پڑی۔ ہندی رسم الخط میں بشیر بدر کی کتابوں کی مقبولیت اپنی مثال آپ ہے۔ ''اُجالے اپنی یادوں کے'' نام سے ۱۰۰۱ صفحات پر مشتمل آنجہانی ونیت پاٹھک نے بڑے سائز پر مصور انتخاب 15/2/90 کو جبلپور سے شائع کی۔ اس کی مقبولیت ایک مثال بن گئی۔ اور ہندی کے مشہور ترین پبلشر وانی پرکاشن نے اسی نام سے دوسرا مجموعہ ۱۹۹۶ء میں ۱۱۶ صفحات پر مشتمل کیا ہے۔ یہ مجموعہ ہندی کے مشہور غزل گو وجے واتے نے ترتیب دیا۔ رام کرشن پرکاشن نے ''آنچ'' مرتبہ انوار الاسلام اور ''فیکشن'' مرتبہ آلوک شریواستو (۱۹۹۸ء) شائع کیا۔

''بشیر بدر نئی غزل کا ایک نام'' کے عنوان سے ندا فاضلی نے ہندی اور گجراتی رسم الخط میں ترتیب دیا۔ ہندی ایڈیشن وانی پرکاشن دہلی اور گجراتی ایڈیشن R.R Sheth Co Bombay Ahmadabad ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئے ہیں۔ lost lugage کے عنوان سے ایک باتصویر انتخاب ڈاکٹر راحت بدر نے شائع کروایا۔ اس کے نام سے وانی پرکاشن نے انتخاب ہندی رسم الخط میں شائع کیا جس پر ۱۹۹۹ء کا ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا۔ ''اللہ حافظ'' کے نام سے ۲۰۰۱ء میں اس ادارے نے بشیر بدر کی شاعری کا نیا انتخاب بھی شائع کیا۔

اب تک منظرِ عام پر آنے والے اُردو، ہندی کے تمام مجموعوں میں سب سے بہتر ہندی رسم الخط میں شائع وہ مجموعہ ہے جو آمد، امیج، آسمان، اکائی، آہٹ کے ساتھ ۱۵ نئی غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کا نام ''کلچر یکساں'' ہے اس کے مرتب بسنت پرتاپ (آئی اے ایس) ہیں۔ بسنت پرتاپ تحقیق وتنقید کے اعلیٰ معیاروں کے امانت دار ہیں۔ انھوں نے بشیر بدر کے ایسے بے شمار شعروں کے مختلف متن کو پرکھ کر صحیح متن کا تعین کیا ہے۔ کتاب میں شامل ۳۰ صفحات کا عالمانہ تنقیدی جائزہ قابل قدر تنقیدی تحقیقی جائزہ ہے۔

بشیر بدر کے فکروفن پر کئی رسائل نے اپنے خصوصی گوشے خاص نمبر نکالے ہیں ان میں لمحہ لمحہ بدایوں، شاعر بمبئی اور فکر و آگہی دہلی انتساب سرونج نے اپنے خصوصی نمبر کو نئے موسموں کا پتہ معنون کیا ہے اسکے علاوہ ایک کتاب بشیر بدر فن وشخصیت مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد و رفعت سلطان ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آئی۔

''نئے موسموں کا پتہ'' (ہندی) بشیر بدر کے فکروفن پر پردیپ ساحل کے ترتیب کردہ کتاب وانی پرکاشن دریا گنج سے شائع ہوئی۔ اس میں وہ تمام تصاویر ہیں جو انتساب کے بشیر بدر نمبر میں شامل ہیں اہم ہندی نقادوں کے مضامین مختلف اور نئے ہیں۔ ان اہم نقادوں میں پروفیسر نامور سنگھ، گلزار، بسنت پرتاپ، وجے واتے، گیان پرکاش، وویک جانکی پرشاد، چندر تر کھا، رامیشور شکلا آنچل شامل ہیں۔

اکائی، امیج اور آمد پر ایک نظر

سنہ ۱۹۷۹ء میں یونیورسٹی اینڈ کالج پبلیشرز علی گڑھ نے یہ مجموعۂ غزل شائع کیا۔ غزلوں کی تعداد ۱۰۴ ہے۔ پیش لفظ کسی کا نہیں ہے بلکہ فلیپ پر بشیر بدر نے چند نوٹس دیئے ہیں اور نجی خطوط کو اپنی تنقیدی آرار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنے شعری نظریۂ خیال کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں، اکائی کے فلیپ اور نوٹس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر بھرپور اعتماد کے ساتھ سامنے آرہا ہے، خطرہ کا چوکور نشان بنا کر لکھا ہے۔

"اگر کوئی رسالہ یا اخبار اکائی پر تبصرہ اپنے لئے مفید سمجھتا ہے تو اسے اس کی دو کاپیاں خریدنا لازم ہے۔"

"بشیر بدر نے نوٹس" کے عنوان سے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

• ـــ "اس مجموعے میں سنہ ۱۹۵۶ء سے سنہ ۱۹۶۹ء کی غزلوں کا انتخاب ہے ترتیب غیر تاریخی ہے غزلوں کی سن تخلیق کا کچھ اندازہ رسائل میں ان کی اشاعت سے ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں نقوش، لاہور، نیا دور کراچی، سویرا، محمود ایاز کا سوغات، نریندر نشچل کا محور اس کے بعد شب خون اور کتاب لکھنؤ مددگار ہوں گے۔

• ـــ "عملی طور پر میرا نظریۂ زندگی اور نظریۂ شاعری ذرا بھی طے شدہ نہیں، میرا عمل کسی لمحہ کی شعوری اور غیر شعوری محرکات کی اکائی ہے۔ کبھی ایک لفظ کا کھردراپن احساس سے بھرپور شعری تجربہ مجھ سے جدا کردیتا ہے۔ کبھی بے بحری غزل میں مجھے ایسی انوکھی غنائیت محسوس ہوسکتی ہے

کہ میں اسے اپنے نام سے وابستہ کرسکتا ہوں۔

میرے یہاں ہر شعر اپنا نظریۂ شعری اپنے ساتھ لے کر وجود میں آتا ہے، ہر شعر کے مکمل ہونے کے ساتھ اس کا نظریہ بھی تمام ہوجاتا ہے۔

● میری اور میری شاعری کی وفاداری کسی طے شدہ نظریے اور تحریک سے نہیں، جو لوگ 'جدیدیت' کو طے شدہ اجتماعی نظریات کی تحریک سمجھتے ہیں اس سے میری اور میری شاعری کی واقفیت تک نہیں۔"

فلیپ پر تحریر کردہ ان کی تحریر مندرجہ ذیل ہے۔

"میں کس سے لکھواؤں؟ اور کیوں؟ جن سے کچھ لکھوایا جاسکتا ہے وہ میرے بزرگ یا دوست ہیں وہ کوئی 'غیر جانبدارانہ کلمۂ خیر' لکھ دیں تو بھی میرا شکی دل مطمئن نہ ہوگا۔

وہ نجی خطوط جو چھپنے چھپانے کی نیت سے نہیں لکھے گئے، ان کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔

محمد علوی کے ایک خط (۲۴ر نومبر ۱۹۶۱ء) کا یہ فقرہ ہے۔

"جانِ غزل! میں غزل میں فراق اور ناصر کے بعد بشیر بدر کو ہی مانتا ہوں۔"

یہ خط اس وقت کا ہے جب علوی یہ پوسٹر چھپوا چکا تھا۔

سب مشاعروں سے ہٹ کر ایک مشاعرہ۔ دورِ جدید کے بہترین شاعر بشیر بدر، شہریار ایم اے، پروفیسر گوکل کرشن اشک شرکت کررہے ہیں۔ مقام پریما بھائی ہال۔ احمد آباد شرح ٹکٹ۔

اس دل خوش کن فقرے سے ایک لمبی مسافت کے لئے تیار کرنا تھا اور اس وقت تک بشیر بدر مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے اس کے بعد بھی ۱۹۶۸ء تک وہ مشاعروں میں نہیں آئے۔

عادل منصوری کا خط (۲۳ر اکتوبر ۱۹۶۲ء) کہتا ہے۔

"جدید غزل کا سب سے پیارا نام بشیر بدر ہے" مگر اس کی وجہ میری دوست بنانے والی شخصیت بھی ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ عادل اس سے پہلے لکھ چکا ہے۔

"احمد آباد تمہاری باتوں کا دیوانہ ہے اور تمہارے شعروں سے گونج رہا ہے چیتن، جیلانی اور سرشار تمہارے شعر تمہارے لہجے میں پڑھا کرتے ہیں۔"

وزیر آغا لکھتے ہیں:

"آپ کے ہاں وہ گہرائی اور نکھار صاف ابھر آیا ہے جس کی مجھے آپ سے توقع تھی۔ آپ دبے پاؤں اپنے اندر اترتے چلے گئے ہیں اور نتیجتاً اب آپ کی غزل میں وہ کسک پیدا ہوگئی ہے جن کے بغیر اعلیٰ شاعری کا تصور محال ہے۔"

لیکن یہ تحریر ان دنوں کی ہے جب میں اپنے خطوط میں وزیر آغا کے رسالے اور ان کے مضمون کی بھی کھول کر تعریفیں لکھ چکا تھا۔

اس طرح بے شمار خطوط ہیں لیکن میری بے ایمانی سب پر شک کرتی ہے۔ ایک خط رشید افروز کا پرکاش فکری کے نام ہے۔ رشید سے میری خط و کتابت، سلام و پیام کچھ بھی نہیں۔ پرکاش فکری ۲۳ اپریل ۱۹۸۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کی حالیہ غزلوں نے کافی لوگوں کو چونکا دیا ہے، کچھ لوگوں کو اس کا افسوس بھی ہے مثلاً رشید افروز نے لکھا ہے "بشیر بدر جیسا پیارا شاعر جس کا ایک ایک شعر لوگوں کے دیوان پر بھاری ثابت ہو سکتا ہے۔

اجالے اپنی یادوں کے 'وہ بابا' ردیف والی غزل — آتی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری — اور ہونٹوں کے دو مصرعوں وغیرہ وغیرہ غزلیں کتنی پیاری اور خوبصورت غزلیں ہیں۔ کیا ہم ان غزلوں کو نئی غزل نہیں کہہ سکتے۔ بدر جی کا اپنا انفرادی رنگ بہترین ہے۔ مگر ڈبّے اور ڈاکٹر جیسی غزلیں پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ (رشید افروز)

میں نے اپنے ڈھنگ سے آپ کی اس تبدیلی کو سراہا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کی ہے آپ کی صبا والی غزلوں کی اس نے تعریف کی ہے . . . . . .

میری نظر میں کوئی فن کار ایسا نہیں جس کے یہاں لہجے اور فکر کی یہ ارتقائی صورت نہ پائی جاتی ہو اور جس کے یہاں یہ عمل مفقود ہے، اس کی فنی موت بہت جلد واقع ہو جاتی ہے۔"

(پرکاش فکری)

رشید افروز کے جواب میں میرا اشک خاموش ہے۔

شاعری پڑھنے والوں کو میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ شاعری براہِ راست پڑھنے میں ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے" (بشیر بدر) [1]

اردو اکادمی لکھنؤ سے اس کتاب پر پندرہ سو روپے کا انعام ملا تھا۔[2] "اکائی" پر غیر معمولی طور پر بہت زیادہ تبصرے ہوئے۔ ایک سال میں ستائیس رسائل پر تبصرے ملتے ہیں۔

امیج

غزلوں کا یہ مجموعہ ۱۹۷۳ء میں نصرت پبلشرز لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس پوری کتاب میں ایک بھی اضافت کسی لفظ کے ساتھ نہیں ہے۔ واوِ عطف کا استعمال ہوا ہے۔ جدید ترین تشبیہات، استعارات اور لفظیات اس کی پہچان ہے۔ اکائی کے منتخب اشعار "بہتر پھتر" کے عنوان سے شامل ہیں۔ یہاں یہ بات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ 'امیج' کی نقل لاہور سے اور امیج کے نام سے مختلف غزلوں کا انتخاب کراچی سے بھی شائع ہوا ہے۔

آمد

۱۹۸۵ء میں مکتبۂ دین و ادب امین الدولہ پارک لکھنؤ سے شائع ہوئی یہ کتاب ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۱۶ غزلیں ہیں۔ دو غزلیں دوبارہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ہیں اور اس حساب سے ۱۱۴ غزلیں 'آمد' میں ہیں۔

ابتدا میں بشیر بدر نے ۱۳ صفحات پر مشتمل ایک خط ۲۰۲۵ء کے پڑھنے والوں کے نام لکھا ہے"۔ اردو شاعری کی تیز رفتار تبدیلیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی مقبولیت کے اسباب بیان کئے ہیں۔

'آمد' پر ڈیڑھ ہزار روپیہ اردو اکیڈمی لکھنؤ سے ایک ہزار اردو اکیڈمی بہار سے اور امتیاز میر

---

[1] اکائی (فلیپ) از بشیر بدر

[2] خط بشیر بدر بنام راقم السطور

ایوارڈ میر اکیڈمی لکھنؤ نے دیا۔ 'آمد' کے پانچ سے زیادہ ایڈیشن کراچی سے شائع ہو چکے ہیں۔ 'آمد' حیدر آباد سے بھی شائع ہوتی ہے۔

لکھنؤ سے کتاب کے ناشر والی آسی نے فلیپ پر لکھا ہے۔

"آج بشیر بدر اردو کی نئی غزل کے ایک مقبول اور محبوب شاعر ہیں، مقبولیت کا یہ سہرا ان کے سر ۱۹۶۹ء میں اس وقت بندھا تھا جب وہ لکھنؤ میں آل انڈیا ریڈیو کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے تھے، اس وقت سے 'آمد' کی اشاعت تک ان کی شہرت میں برابر اضافہ ہوتا رہا، آج بشیر بدر کی غزل ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ اور کناڈا اور دیگر ممالک میں اردو اور ہندی داں طبقے کے عوام اور خواص میں یکساں طور پر محبوب اور مقبول ہے"

والی آسی نے جس مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد سے بشیر بدر مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے۔

'اکائی' میں ۱۹۶۹ء تک ہندوستان و پاکستان کے رسائل میں شائع غزلوں کا انتخاب ہے۔ رسائل کی غزلوں کے تقابل سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ غزلیں مجموعے میں بھی شامل نہیں ہیں۔ ایسی غزلوں کا پہلا مصرعہ درج ذیل ہے۔

۱۔	بہت ہیں شہر میں شاعر فسانہ گو فن کار	مطبوعہ سویرا لاہور شمارہ ۲۷ صفحہ ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۱
۲۔	دل کی بربادی پہ کیوں کوئی ترس کھاتا ہے	" " " " " " " صفحہ ۱۴۴، ۱۴۳
۳۔	کسی کی مانگ میں تارے جو مسکراتے ہیں	" " " " " " ۱۴۴، ۱۴۳
۴۔	جتنا خلوص اس نگہ فتنہ گر میں ہے	سنگم جموں ۱۹۶۳ء
۵	ایسا ہی ایک چاند تھا ایسی ہی ایک رات	مطبوعہ سویرا لاہور شمارہ ۲۸ صفحہ ۱۱

اس غزل کا انتخاب شامل ہے ورنہ اس غزل میں تیرہ اشعار ہیں)

۷۔	کتنا رنگین کتنا سجل آشاؤں کا تاج محل	سالانہ راہی	مئی ۱۹۵۹ء
۸۔	کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی	یہ شعر ان کے مجموعے آمد مطبوعہ ۸۵ء میں ملتا ہے۔	

یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا — لیکن سہیل گیا اور شاہراہ دہلی میں ۵۶،۵۷ء میں اس زمین میں ان کے ۷ شعر چھپے تھے۔ جس میں سے انہوں نے صرف دو شعر منتخب کرکے مجموعے میں شامل کئے ہیں۔

خون پتّوں پہ جما ہو جیسے — یہ غزل نقوش ستمبر ۶۵ء صفحہ ۳۲۱ میں شامل ہے اس شمارے کے بعد نقوش کے ہی شمارے میں احسان دانش کی غزل بھی اسی زمین میں چھپی ہے جس میں دو تین مصرعے ملتے جلتے ہیں۔

فضائے نیم شبی ہے بہ حسن صبح حیات — نقوش فروری ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۲۰

ان چند مثالوں کے علاوہ غزلوں میں ترمیم و تنسیخ کے بھی کچھ نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں مثلاً

وہ نہیں ہے تو اُس کی آس رہے
ایک جائے تو ایک پاس رہے — اپج

خوش رہے یا بہت اُداس رہے
زندگی تیرے آس پاس رہے — آمد

اِک ذہن پریشان میں وہ خواب غزلستان ہے
پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے — اکائی

اک ذہن پریشاں میں وہ پھول سا چہرہ ہے
پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے — آمد

غم وجہِ فگارِ دل غم وجہ قرارِ دل
آنسو کبھی شیشہ ہے آنسو کبھی پانی ہے — اکائی

رونے کا اثر دل پر رہ رہ کے بدلتا ہے
آنسو کبھی شیشہ ہے آنسو کبھی پانی ہے — آمد

سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں — اکائی

سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے تیرے شہر والوں میں — آمد

بھول کر اپنا زمانہ یہ بزرگان جدید
آج کے پیار کو معیوب سمجھتے ہوں گے — اکائی

بھول کر اپنا زمانہ یہ زمانے والے
آج کے پیار کو معیوب سمجھتے ہوں گے — آمد

ان تینوں مجموعوں کو سامنے رکھ کر کچھ نتائج سامنے آتے ہیں۔ اکائی ۱۹۶۹ء، امیج ۱۹۷۳ء اور آمد ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئے بشیر بدر نے ترمیم و تنسیخ کے عمل کو جاری رکھا اور اعلیٰ سے اعلیٰ رسالے میں شائع شدہ غزل کو اپنے شعری معیار و مطالبات کے مطابق کرنے کی مہم جاری رکھی جن کی مثالیں گذشتہ اوراق میں پیش کی جا چکی ہیں۔ رسائل میں ان کی چند نظمیں بھی ملتی ہیں، جن میں نظم 'میرے ناقد' مطبوعہ راہی جالندھر دسمبر ۶۵ء۔ نظم 'جزیرے' مطبوعہ نئی قدریں حیدر آباد' میری نظر سے گذریں لیکن انہوں نے نظموں کو کسی مجموعے میں شامل ہی نہیں کیا۔ گویا وہ خود بھی نظم کے میدان کو بہت جلد خیر باد کہہ کر غزل گوئی کے حق میں فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کی کئی غزلیں دوسرے شعرا کو اس زمین میں شعر گوئی کے لئے محرک ثابت ہو سکیں۔

مثلاً:

منزل پہ حیات آکے ذرا تھک سی گئی ہے ؛ معلوم یہ ہوتا ہے بہت تیز چلی ہے

یہ ۱۹۵۷ء میں 'نیا دور' کراچی کے دو صفحات پر چھپی۔ اس کے بعد کے شماروں میں فراق کی غزل اسی زمین میں شائع ہوئی۔ اسی طرح ان کی غزل "خون پتوں پہ جما ہو جیسے" نقوش میں شائع ہوئی اس کے اگلے شمارے میں اسی زمین میں احسان دانش کی غزل شائع ہوئی جس کے شعر ملتے جلتے ہیں۔

رسائل کے مطالعہ سے ایک بات یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بشیر بدر کی غزل :۔

"اے یار مگر تیری گلی تیری گلی ہے" ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد پاکستان کے کئی شعرا نے اسے اپنی غزل میں شامل کر لیا۔

ان کی غزل "بابا" کی ردیف میں سب سے پہلے رسالہ "نیا دور" کراچی ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر رضیہ حامد ایڈیٹر "فکر و آگہی" لکھتی ہیں:۔

"محتاط اور ذمہ دار سروے کے مطابق بشیر بدر کی غزل جس کی ردیف 'بابا' ہے اس سے متاثر ہو کر رسالے اور مشاعرے کے اہم شعرا نے ڈھائی ہزار غزلیں کہیں، اکثر شاعروں نے اپنی غزلیں شائع کراتے وقت ایسی غزلوں کو بشیر بدر کے نام معنون و منسوب کیا۔"[1]

مجموعوں کے تقابلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بشیر بدر ..... اپنی ان غزلوں کی ترمیم و تنسیخ بھی کرتے رہتے ہیں جو ان کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ "اکائی"، "آمد"، "امیج" کے تقابل سے وہ غزلیں سامنے لائی جا سکتی ہیں جن میں انہوں نے ترمیم و تنسیخ کی، بعض جگہ فارسی تراکیب سے اجتناب پیش نظر معلوم ہوتا ہے اور کبھی کسی حسن شعریت کے حصول کیلئے ترمیم کر کے دوبارہ مجموعے میں شامل کرنے کا احساس ہوتا ہے۔

---

[1] بشیر بدر فن و شخصیت ص ۱۶

بشیر بدر کے فکر و اسلوب کا تجزیہ

غزل اُردو شاعری کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب صنف ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اسے اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اُردو شاعری کو دنیا کے شعر و ادب میں امتیازی مقام دلانے میں اردو غزل نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

بشیر بدر عہد جدید کے غزل گو شاعر ہیں ان کی غزلیہ شاعری پر روشنی ڈالنے سے پہلے غزل سے متعلق چند باتیں سمجھ لینا ضروری ہے۔

اُردو غزل تہہ در تہہ مزاج کی حامل ہے۔ اسکی صنفی شناخت کا دارومدار اس کی مخصوص ہیئت پر ہے اور ہیئت کے اعتبار سے غزل کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں۔

مطلع، قافیہ، ردیف، مقطع۔

غزل کا ہر شعر اپنی جگہ اور اپنے آپ میں مکمل وحدت رکھتا ہے اور یہ بلحاظ خیال و موضوع مکمل ہوتا ہے۔ غزل معنی، خیال اور موضوع کے لحاظ سے بے مثل تنوّع کی حامل ہو سکتی ہے۔ غزل کے ہر شعر کی مکمل داستان اس کو آفاقیت عطا کرتی ہے۔ اس خوبی کی وجہ سے شعر مختلف حالات پر بے ساختہ منطبق ہو جاتا ہے اور گھنٹوں میں کہی جانے والی بات لمحوں میں کہہ دی جاتی ہے۔ صنف غزل موضوع کے اعتبار سے وسعت رکھتی ہے۔ ایک عرصہ تک اس میں حسن و عشق کی کیفیات اور جذبات کا اظہار ہی کیا جاتا رہا لیکن اس کا مزاج اسے اس موضوع سے باندھ کر رہنے پر مجبور نہیں رکھ سکا۔ ہر طرح کے خیالات کے اظہار میں غزل نے اپنی قوت کا لوہا منوالیا۔ عہد جدید میں اس کا موضوعاتی تنوّع اس کی تخلیقی توانائی اور وسعت کی نشاندہی کرتا ہے۔ آج غزل میں حسن و عشق کی داستان بھی، کاکل و رخسار کا قصہ بھی ملے گا۔ اس میں ہجر و وصال کے قصے بھی ملیں گے اور غم دوراں کے افسانے بھی۔ غم روزگار کی حکایت و مسرت و شادمانی کے نغموں کے ساتھ یاس و حرماں نصیبی کے چراغ بھی اس میں روشن نظر آئیں گے۔ غزل کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ غزل صاف اور کھل کر کہنے سے زیادہ پردے میں علامات کی مدد سے بیان کرنے کا فن ہے۔ اس کی مخصوص علامتیں ہوتی ہیں۔

جن کے پردے میں بات بیان کی جاتی ہے۔ ہلکا سا ابہام اور خلا سامع کو پُر کرنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی رمزیت اور اشاریت غزل کی تنگ دامانی کے باوجود وسعت بخشتی ہے۔

تغزل غزل کی جان ہے۔ غزل کی مقبولیت میں اسکی غنائی خصوصیت کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں غزل کی غنائی خصوصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"غزل کے ہر عمدہ شعر میں ایک عنصر ایسا ہوتا ہے جو معنی سے تعلق نہیں رکھتا، اس سے جو مسرت یا تاثیر حاصل ہوتی ہے اس کی وہی نوعیت ہوتی ہے۔ جو نغمہ اور موسیقی سے حاصل ہوتی ہے۔ تغزل موسیقی سے بہت قریب ہے"۔[1]

ڈاکٹر بشیر بدر لکھتے ہیں:

"غزل میں تغزل نہ رہے تو وہ ایسا بدن ہے جس میں روح نہیں، روح نظر تو آتی نہیں لیکن وہی زندگی ہے اس لئے تغزل کی کوئی آخری جامد تعریف تو نہیں ہوسکتی لیکن تغزل کے بغیر غزل مُردہ اور بے روح ہے۔ اس تغزل کی کچھ خوبیاں میرے نزدیک شائستگی، آہستگی خوبصورت منظروں میں انسان کی روح کی نغمگی، شہری دوڑ دھوپ اور مشینوں کی لاتعلقی میں انسانی روح کی بیکراں صدا ہے"۔[2]

بشیر بدر کہتے ہیں کہ:۔

"غزل واقعی دھوپ کے پھول پر رات کے پچھلے پہر شبنم برسنے کا فن ہے۔۔۔ وہ ہر لمحہ زندگی کی آگ کو اپنے سینے میں محفوظ رکھتی ہے"۔[3]

بشیر بدر کی غزل ان کی فکری اساس کی آئینہ دار ہے۔ ان کے مزاج میں غزل کی شوخی، شگفتگی اور غزل کی تمام کیفیات کس قدر رچی بسی ہوتی ہے اس کا اندازہ ان کی شعری تخلیقات سے لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے غزل میں ان تمام کیفیات کو سمو دیا ہے جو آج معاشرے پر محیط ہیں۔

---

[1] اردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین خاں صفحہ ۴۷

[2] سہ ماہی فکر و آگہی صفحہ ۱۸ جلد ۲ شمارہ ۲۵ سنہ ۱۹۸۹ء

[3] دستہ گل مطبوعہ ۱۹۸۶ء صفحہ ۹

اور پردۂ فن میں غزل سے متعلق اچھوتی بات کہی۔

اسے فن نہیں پردۂ فن کہو ؛ غزل کو چراغوں کی چلمن کہو

اس چراغوں کی چلمن میں ان کے اندر کا فن کار روح و دل کے پُردرد جذبات کی تصاویر دیکھنے کا خواہش مند رہتا ہے۔

فن اگر روح و دل کی ریاضت نہ ہو ایسی مسجد ہے جس میں عبادت نہ ہو

غزل محبوب کا سراپا ہے۔ محبوب کی زلفوں کا سایہ ہے، جس کی چھاؤں میں زندگی کی دُھوپ دُکھ اور سکھ کا سفر بن جاتی ہے۔ غزل اپنے بنیادی معنوں میں عورت سے گفتگو ضرور ہے لیکن بشیر بدر کے یہاں عورت حیات و کائنات ہے، تہذیب فکر و فن ہے اس لئے ان کی غزل محبوب کے روبرو زندگی کی داستان ہے۔ محبوب سے گفتگو کی بنیاد محبت، خلوص، زندگی کے مسائل ہیں جن شائستگی، آہستگی، نرمی اور روانی ہے۔ ان کے اسلوب میں بنیادی طور پر روایتوں کی میناکاری ہے، کارگہ شیشہ کی توسیع اس طرح کی گئی ہے کہ یہ تتلی کے نازک پنکھوں پر آنسو کی تحریر بن گئی ہے۔ غزل وہ یادیں ہیں جو ہرن کی آنکھ میں کھلی رات کی چاندنی بن کے چمکتی ہیں۔ بشیر بدر غزل کے دو مصرعوں میں آنے والی سحر کا ناول لکھتے ہیں؛

اتنی ملتی ہے میری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو میرا محبوب سمجھتے ہوں گے

غزلوں نے وہیں زلفوں کے پھیلا دیے سائے
جن راہوں پہ دیکھا کہ بہت دھوپ کڑی ہے

ابھی اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کی پلکیں سنوار لوں
مرا لفظ لفظ ہو آئینہ تجھے آئینے میں اتار لوں

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

تتلی کے نازک پنکھوں پر آنسو کی تحریر غزل
لفظوں کی میناکاری کو الہامی اشعار نہ جانو

یہ غزل کہ جیسے ہرن کی آنکھ میں پچھلی رات کی چاندنی
نہ بجھے خرابے کی روشنی کبھی بے چراغ یہ گھر نہ ہو

شام کے بعد بچوں سے کیسے ملوں
اب میرے پاس کوئی کہانی نہیں

میں نے ایک ناول لکھا ہے آنے والی صبح کے نام
برف جمی پلکوں کے اوپر دھوپ کھلی ہے آنکھوں میں

بشیر بدر عام طور پر ایسے منظر نامے سے احساس کی مصوری کرتے ہیں جس کی ترسیل و ابلاغ میں ذہن و فکر کو تادیر مشقت نہیں اٹھانی پڑتی۔ بشیر بدر کے ایسے کچھ اشعار کی مثالیں دی جارہی ہیں جن کا علامتی منظر نامہ درس و تدریس کے انہماک کا مطالبہ کرتا ہے۔

خون پتوں پہ جما ہو جیسے ؛ پھول کا رنگ ہرا ہو جیسے

یہ کسی بھیانک تاراجی کا منظر ہے یہ زلزلہ خیز بربادی انسانی جبر یا قدرتی آفات نے پورے گلستاں کو پیس دیا ہے، پتوں کا رنگ ہرا ہوتا ہے اور پھول کا عام طور پر سرخ یا رنگین لیکن اس تاراجی نے پھول اور پتوں کو روندکر، کچل کر پیس ڈالا ہے۔ اب پھول پتے دونوں ہی بے چہرہ اور بے شناخت ہوگئے۔ شاعر نے تاراجی کی اس منظر نگاری کو پتوں پر خون کی لیپ اور پھول پر ہرے پتوں کی مہندی کی تصوراتی امیجری بنائی ہے، جس کے پس منظر میں جنگ یا فساد کی ہولناکی ہے۔

پیچھے پیچھے رات کی تاروں کا اک لشکر لیے ؛ ریل کی پٹڑی پہ سورج چل رہا تھا رات بھر

آسمانی منظر کے تضاد یعنی جب تارے نکلیں گے تو سورج کہاں ہوگا اور جب سورج نکلے گا ستارے کہاں ہوں گے۔ اس تضاد کو شاعر نے ایک دنیاوی منظر میں دیکھا ریل کی پٹری پر انجن آرہا ہے (سورج مراد ہے) اس کے پیچھے ڈبوں میں ستاروں کی جھلملاہٹ ہے۔ ارسطو نے نے کہا کہ شاعر نقل کی نقل نہیں بناتا بلکہ خدائی کائنات کو از سرِ نو سرتیب کرتا ہے۔ یہ بھی کارِ تخلیق ہے۔ اس سے یکسانیت کی بوریت ختم ہوتی ہے اور یہ بوڑھی فرسودہ کائنات نئی نئی لگتی ہے غالباً اس نئے شعر کا یہی حسن ہے۔

تمام عمر میرا دم اسی دھوئیں میں گھٹا ؛ وہ اک چراغ تھا میں نے اسے بجھا دیا

اردو غزل میں اس موضوع کا تغزل نایاب ہے، اس شعر کا مرکزی کردار قاتل ہے۔ اس قاتل نے کسی کی جان، ایمان، عصمت، امید یا خوابوں کا قتل کیا ہے یہ قاتل عہد بھی اس مہذب معاشرے میں قانون کی نگاہ عدل شناس میں بے گناہ ثابت ہو چکا ہے، لیکن ایک عدالت اور ہے اور وہ ہے انسان کے اپنے ضمیر کی عدالت۔ اس عدالت کی سزا قانون سے زیادہ سخت اور داخلی ہوتی ہے۔ اس شعر کا قاتل اور جابر وہی مظلوم ہے جو اپنے ظلم کا خون بہا قانون دنیاوی سے بچا کر اپنے ضمیر کے دربار میں مسلسل دے رہا ہے۔

ظالم کی مظلومیت پر اردو میں ایک منفرد انداز کا شعر ہے۔

کوئی عشق ہے کہ اکیلا ریت کی شال اوڑھ کے چل دیا
کبھی بال بچوں کے ساتھ آیاں پڑاؤ لگتا ہے رات میں

بشیر بدر نے اس شعر میں غزلیہ فنکاری سے کام لیا ہے عام پڑھنے والا اس شعر کو واقعۂ کربلا کے مرکزی اور محترم لافانی کردار یا امام حسینؑ سے جوڑ بھی نہیں پاتا لیکن یہ شعر انہیں کی زبان سے ان کے اور شہادتِ عشق کی داستان کا نیا اور دردناک پہلو پیش کرتا ہے۔ وہ مجنون سے مخاطب ہیں اور اس کی تنہا ردی صحرانوردی کو عشق نہیں بتاتے، محبوب کے تصور میں صحرا کی گود میں سو جانا کارِ عشق میں راہِ نجات ہے۔ غموں کی یورش سے پناہ حاصل کرنا ہے۔

عشق اپنے اصولوں سے عشق، مذہب کے تقدس اور خدا کے حکم سے، عشق کا تقاضہ ہے کہ ایثار کے لئے آؤ تو علی اکبر جیسا معصوم ساتھ لاؤ اپنے حرم پاک کے ساتھ لاؤ اپنے حرم پاک کے ساتھ یزید کی سفاکیوں کو دعوتِ حق دو۔ اسی شاعرانہ جرأت کے ساتھ مجنوں سے امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ تنہا جان دینا کون کارِ عاشقاں ہے۔ محبت کے امتحان میں تو مع اہل و عیال کسی شہادت کی رات کا انتخاب کرو عشق کا یہ پڑاؤ بال بچوں کے ساتھ یہاں رات میں پڑتا ہے:۔

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

اس شعر کی تشریح نظام صدیقی نے اس طرح کی ہے لکھتے ہیں:۔

سناٹے کی شاخ، زخمی پرندے اور آواز کا صحرا جیسے پُر تضاد اور پیچیدگی کے حامل

بصری اور سماعی پیکروں کے فنی در و بست سے آج کے آدمی کی داخلی اور خارجی احوال کی حشر آگیں کرب و سکون کا بیک وقت انفرادی اور اجتماعی تصور ذہن میں اُبھرتا ہے جو ایک تہذیبی بحران کا المیہ ہے۔ آج کا پورا تہذیبی خرابہ بشیر بدر کی اس مکمل اور بھرپور شعر میں قلمبند ہے۔ اس محشر بدوش خاموشی کی اتنی تخیلی طرفگی اور جمالیاتی نادرہ کاری سے تصویر آفرینی انتہائی دل نشین، جاذب نظر، فکر انگیز ہے، جو ان کے غیر معمولی احساس شعلہ آسا تخیل گداز قلب غیر معمولی شعور اور ریاض فن کا ترجمان ہے۔ جس کی وجہ سے یہ روحانی زلزلہ پیما خاموشی اور لازوال آرٹ میں ڈھل گیا ہے، جہاں آواز کی سسکی، سرگوشی اور چپ چاپ سناٹا باہم دگر جمالیاتی استغراق کی کیفیت میں ہم آغوش ہیں۔[1]

ڈاکٹر بشیر بدر کے اس شعر میں سناٹے کی شاخ کی خوبصورت امیجری معانی کی کلید ہے، اس میں بہ ظاہر نامانوس الفاظ نہیں ہیں لیکن اس میں جو فضا پیدا کی گئی ہے وہ یقیناً نامانوس ہے اس لئے ہے کہ یہ فضا خارجی زندگی نہیں ہے بلکہ اس میں سراسر داخلیت ہے، انسان کے باطن کا کرب بالکل نئی امیج کے ساتھ شعر میں ڈھلا ہے روحانی ناآسودگی اور محرومی کو ایک سناٹے کی صورت کہا ہے۔ وہ غم جو دنیا نے اس انسان کو دیئے ہیں، وہ زخم جو اس کے تجربات نے اس کو بطور سوغات بخشے ہیں ان زخموں کی کسک اس کی روح کو تڑپاتی ہے اور اس کا دل اندر ہی اندر سُلگتا ہے۔ سناٹے کی شاخ کی رعایت سے غموں کی کیفیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بظاہر جو شخص خاموش نظر آتا ہے اور جس کے لب پر کوئی شکوہ نہیں ہے اس کے دل میں ایک طوفان بپا ہے اور نالہ و فریاد کی گھٹی گھٹی کیفیت اس کے باطن میں ہلچل مچائے ہوئے ہے یہ شعر آج کے مجبور انسان کے ذہنی کرب کی علامت ہے۔

ہنسی معصوم سی کاپی پہ بچوں کی عبارت سی ؎ ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت سی

اشہر ہاشمی اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں:

"قاری کو بشیر بدر کا شعر سُن کر گزر جانے میں ہی عافیت نظر آئے گی مگر چونکہ آج کی شاعری سننے سے زیادہ پڑھنے، اور پڑھنے سے زیادہ غور و فکر کا تقاضہ کرتی ہے لہٰذا اس تقاضہ کا اطلاق ہوتے ہی قاری کی نگاہ میں تین پیکر اُبھرتے ہیں (۱) معصوم سی ہنسی (۲) کاپی پر بچوں کی عبارت اور (۳) ہرن

---

[1] بشیر بدر کی غزلیہ شاعری کا وجودی اور جمالیاتی تناظر، از نظام صدیقی۔ ماہنامہ شاعر، بمبئی ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۲

کی پیٹھ پر بیٹھا پرندہ ۔ دوسرا اسپیکر زیادہ اہم ہے ۔ بچے کاپی پر بے مقصد عبارتیں لکھتے ہیں قلم یا پنسل سے کچھ آڑا ترچھا بنا دیا ۔ اس حرکت میں بے مقصدیت اور معصومیت کا امتزاج ہوتا ہے ۔ ایسی ہی بے مقصدیت اور معصومیت اس مذکورہ ہنسی میں ہے مگر اس کا ردِ عمل ؛ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ وہ معصوم سی ہنسی جو صرف ہنسی تھی بے مقصد سی ، جس میں "بلو سگنل" جیسا کوئی پیغام نہیں تھا بے ارادہ سی ، جیسی کہ کاپی پر بچوں کی لایعنی عبارت ۔ جیسی کہ ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت ۔ مگر بشیر بدر نے شرارت کے بعد ہرن کے ردِ عمل کو مخفی رکھ کر قاری کو ایک پیغام دیا ہے کہ وہ اس شعر کی تکمیل اب اپنی تخلیقی شرکت سے کرے ۔ پیٹھ پر بیٹھے پرندے کا چونچ مارنا لازمی ہے ۔ پرندے کی چونچ لگنے کے بعد ہرن قلانچیں بھرنے لگتا ہے اور جنگل کی تہذیب خوب جانتی ہے کہ ہرن کی قلانچوں اور خوشی کا رشتہ کتنا اٹوٹ ہے ۔ قلانچیں اس شعر میں بھی بے پناہ خوشی کی مخفی علامت ہے ۔ کسی معصوم ، لایعنی ، بے ارادہ ، بے مقصد ہنسی نے شاعر کو ویسا ہی مسرور کر دیا ہے جیسے کہ جنگل کی وسعتوں میں قلانچیں بھرتا ہرن ۔ یہاں ایک نامعلوم جزیرے کی دریافت مکمل ہوتی ہے ۔ شعر کہہ کر شاعر کو اطمینان بخش مسرت ملتی ہے اور شعر تک پہنچ کر قاری کو حیرت آمیز خوشی ۔" [1]

تین سمندر دو دریا اس کے آگے ؛؛ ناگن جیسی ایک لکیر چمکتی ہے

اس شعر میں بشیر بدر نے انسان کی زندگی کو تین [3] سمندروں سے تشبیہ دی ہے یعنی (۱) بچپن (۲) جوانی (۳) بڑھاپا ، ان تینوں سمندروں سے گزرنے کے بعد موت کی راہ شروع ہوتی ہے ۔ جس کے لئے ناگن جیسی ایک لکیر سے تشبیہ دی ہے ۔

"امیج پر شمس الرحمٰن فاروقی نے تبصرے میں بشیر بدر کے اس شعر کا حوالہ دیا اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ "کاش وہ ایسی فکر انگیز معنی خیز علامتی غزل پر توجہ دیں ۔" [2]

کوئی کاغذ نہ تھا لفافے میں ؛؛ صرف تتلی کا ایک پر نکلا

شفیع اللہ خاں راز آبادی نے بشیر بدر کے اس رومانی شعر کی تجزیاتی تشریح کرتے ہوئے

---

[1] اشہر ہاشمی ، ماہنامہ شاعر جلد ، ۵ ، شمارہ نمبر ۱۲ صفحہ ۲۱

[2] ماہنامہ شب خون ۱۹۶۸ء ، تبصرہ امیج از شمس الرحمٰن فاروقی

لکھا ہے :۔

”یوں تو جناب ڈاکٹر بشیر بدر صاحب مندرجہ بالا شعر کا مطلب واضح اور سیدھا سادا ہے ، ملفوف کھولا تو اس میں کوئی کاغذ نہ تھا صرف تتلی کا ایک پر رکھا ہوا تھا ۔

بظاہر دیکھنے میں یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ احوال کاغذ پر نہ لکھ کر صرف تتلی کا ایک پر لفافہ میں ارسال کر دیا ۔ لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ قدرتی اظہار حقیقت اور واردات قلبی کا یہ انوکھا ، نادر ، جدید ، دلکش فنکارانہ ، پُراسرار اور اچھوتا شاعرانہ اسلوب ہے ، جسے سمجھا نہ گیا تو میرے نزدیک اس خوب صورت شعر کی مخفی رازدارانہ حق تلفی ہو گی ۔

پیغام کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لئے ہر دور اور زمانے میں Code Language کا استعمال کیا گیا ہے یا ایسے ذرائع ، وسیلے اور تدابیر اپنائی گئی ہے کہ پیغام مخفی انداز سے فرد متعلقہ تک پہنچ سکے ۔

تتلی کے پر سے جن خوبصورت اشارات ، کنایات ، فنی چابکدستی ، دلکش انداز فکر ، انوکھا طریقۂ اظہار خیال ، شاعرانہ پرکاری ، موثر انداز بیان اور حسین و جمیل پیغام رسانی کی سمت اشارا ہے وہ جدید بھی ہے حیرت انگیز بھی ۔

واردات قلبی کیفیات دل اور افسانۂ حیات کی موشگافیوں کو لفظی جامہ پہنانے کیلئے لاتعداد صفحات ناکافی ہیں ۔ لیکن یہاں تتلی کا ایک پر اپنے خوبصورت اور حسین دامن میں ایک رنگت و غم ناک داستانِ حیات سمیٹے ہوئے ہے ۔

ملفوف سے تتلی کا ایک پر جو جامد و ساکت ہوتے ہوئے بھی اپنے غمگین شفق زار میں وہ خاموش رنگینی و رعنائی سموئے ہوئے ہے جس کا مطلب و مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ زندگی کی دلکشی و بہاریں زمانے کی بے التفاتی ، آلام روزگار اور گردشِ دوراں کی بھینٹ چڑھ چکی ہے اب زیست صرف تتلی کے پر کی طرح خاموش ، ساکت و جامد ، بے حس اور نقش فریادی بن کر رہ گئی ہے جس کی المناک اور رنگین داستان تتلی کے پر میں جگمگاتے نقش و نگار ، حالات ، زندگی واردات جسی و جذبات قلبی کا خوبصورت حسین رنگین ، خاموش اور پُر سکون افسانہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی چیختی ہوئی دلکش و سبق آموز حقیقت ہے ، جسے بیان کرنے کے لئے عقل سلیم بے بس ذہن کی موشگافیوں

مجبور، قوتِ گویائی، گنگ اور قلم کے لئے ہزار ہا صفحات قرطاس ناکافی ہیں۔" [1]

نئی علامتوں کے ساتھ بشیر بدر کے یہاں ایسے بے شمار شعر ہیں جن پر تنقید کو توجہ دینا چاہئے اور عصری منظر نامے جو غزل کے قدیم منظر ناموں سے بالکل مختلف ہیں ان پر تنقید کو زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ بشیر بدر نے ہندوستان کی شہری زندگی سے جو پیکر تراشی کی ہے ان سب کے لئے ابھی مشاعروں میں پوری گنجائش نہیں ہے۔ رسالہ آہنگ گیا (۱۹۷۳ء اواخر) میں شمس الرحمن فاروقی نے امیج پر طویل تبصرہ کیا تھا اور امیج کے بہت سے اشعار کو ناپسند کرتے ہوئے اعتراضات بھی کئے لیکن ایک غزل جس کا مطلع یہ ہے :

ناریل کے درختوں کی پاگل ہوا کھل گئے بادباں لوٹ جا لوٹ جا

سانولی سرزمین پر میں اگلے برس پھول کھلنے سے پہلے ہی آجاؤں گا

اس شعر کے بارے میں لکھا کہ "بشیر بدر کی یہ غزل عالمی عشقیہ شاعری کے معیار پر پوری اترتی ہے۔" شمس الرحمن فاروقی کا یہ اشارہ مطالبہ کرتا ہے کہ بشیر بدر کے ایسے اشعار کا انتخاب سامنے آئے جو ہماری عظیم اور قدیم غزل سے الگ اپنی لفظیات، منظر نامہ اور نفسیات رکھتے ہیں۔ مجھے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ بشیر بدر کے جو شعر بہت مشہور ہیں۔ ان کے الگ نئے اشاروں اور کنایوں والے شعروں کا ایک انتخاب اور ان کا بھرپور مطالعہ بہت ضروری ہے۔

شکاگو امریکہ سے نکلنے والے انگریزی میگزین East & West میں 1972 میں Prof. C.M. Nadeem نے صوتیاتی تنقید سے داخلیت تک رسائی کا انوکھا تجربہ کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے استاد قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے اس مضمون کا ترجمہ اردو میں کیا جو جموں سے نکلنے والے رسالے میں شائع ہوا تھا، میری نظر سے یہ اصل اور ترجمہ دونوں گذرے یہ صوتیاتی تجزیہ شعر کی معنویت سے اس کے الفاظ کی صوتیاتی نظام کی مطابقت کو ظاہر کرتا ہے۔ پروفیسر نعیم نے پہلے اردو غزل کو انگریزی حروف میں لکھا ہے، یہی ان کا کلیدی طریقہ ہے۔ مثلاً خفتہ" کی پُراسرار صوتیات کا تجزیہ کرتے ہوئے سوال اٹھایا کہ وہ شاعر جو عام طور پر ہندی

---

[1] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۰

۱. خفتہ شجر لرزا ٹھے جیسے کہ ڈر گئے
کچھ چاندنی کے پھول زمیں پر بکھر گئے

۲. شیشے کا تاج سر پہ رکھے آ رہی تھی رات
ٹکرائی ہم سے چاندنی ستارے بکھر گئے

۳. وہ خشک ہونٹ ریت سے نم مانگتے رہے
جن کی تلاش میں کئی دریا گزر گئے

۴. چاہا تھا میں نے چاند کی پلکوں کو چوم لوں
میرے لبوں پہ صبح کے تارے بکھر گئے

۵. تلوؤں پہ نرم دھوپ نے جب گدگدی سی کی
آنکھوں میں سوئے چاندنی کے خواب ڈر گئے

۶. جن پر لکھی ہوئی تھی محبت کی داستاں
وہ چاک چاک پرزے ہوا میں بکھر گئے!

بشیر بدر

The following is a close rendering in English

1. Slamber trees shivered as if frightened
Some flowers of moonlight got seattered on the ground

2. The night was coming a crystal crown on her head
but when into us,
The moon and the stars were speread.

3. They kept begging for moisture from sand, those dry lips in
whose search several rivers passed through here.

4. I had sought to kiss the moon's eyelids,
but stars of dawn were seattered on my lips.

5. When the sott sunlight tickled my soles
the dreams of moonlight, asleep in my eyes, were frightened

6. On whiet was written the tale of my love,
those torn pieces were scattered in the wind.

56 ؎ عکس غزل مع انگریزی ترجمہ ماخوذ
میگزین East & West

The following is the text, transceription, and word for word translation of the Gazal[3]

1.	xuftaa	Sajar	Laraz	u Thee	Jaisee	ki	Dar-gaee
	sleeping	trees	shivered		as if		were seared
	Kuch	caandnii-kee		phuul	Zamiin-par		bikhar-gaee
	some	moonlight's		flowers	on the ground		seattered
2.	SiiSee-kaa	taaj	sar-pe	rakhee	aa-rahii	thii	rat
	crystal's	crown	on the head	placed	was coming		night
	Takraaii	Ham-see	caand	sitaaree	bikhar-gaee		
	collided	with us	moon	stars	scattered		
3.	woo	xuSk	hooNT	reet-see	nam	maangtee-rahee	
	those	dry	lips	from sand	moisture	kept begging	
	jin-kii	salaas-meeN	kaii	daryaa	guzar- gaee		
	whose	in search	several	rivers	passed by		
4.	caahaa	thaa	maiN-nee	caand-kii	palkoon-koo	cuum-luuN	
	had desired		I	moon's	eye-lashes	(!) may kiss	
	meeree	labooN-pe	subh-kee	taree	bikhar-gaee		
	my	on lips	morning's	stars	scattered		
5	talwoon-pe	narm	dhuup-nee	jab	gudgudii	sii kii	
	on soles	soft	sunshine	when	sort of unkled		
	aaNkhooN-meeN		sooee	caandnii-kee	xaab	Dar-gaee	
	in the eyes		a sleep	moonlight's	dreams	were seared	
6	jin-par	likhii huii thii		muhabbat-kii		daastaan	
	on which	was written		love's		long tale	
	woo	chaak-chaak	purzee	hawaa-meeN		bikhar-gaee	
	those	torn-torn	chits	in the wind		seattered	

پروفیسر نعیم کے مضمون کا عکس پیش کیا جا رہا ہے۔

In a Gazal each couplet is considered a separate entity, and the only unity is of meter and rhyme. But that should not mean that each couplet is to be looked upon exclusively as a discerete poetic experience in itself, without reference to other couplets in the Gazal. One can also ask : what makes a poet write a certain number of couplets in a given meter and rhyme-scheme, and then put them in a certain order to form a Gazal? Of sourse in many instances the answer would refer to the meeds of the context in which a Gazal is usually presented, i.e, the context of a mushaaira, where it would be helpful to begin with a good couplet and let a bad one ride on the applause of the first one. Similarly, the practice of reading of reciting the first line of a couplet twice before delivering the "conclusion" in the second also perhaps influences the arrangement of ideas and words within a couplet. There is certainly never a line-by-line dramatic progression in a Gazal, and the remark that a Gazal is a "string of pearls at random strung" is not for off the mark in that sense. On the other hand there may often be very noticeable thematic relationship between the various couplets, or in the case of more then one theme being employed, a relationship between the various themes. The Gazal tradition is nearly a thousand years old, this genre of poetry has been most popular in Arabic, Persian, Turkish, and Urdu literatures and there is an immensely rich body of conventions which are used by poets to achieve a remarkable degree of brevity and terseness in their individual couplets.

We immediately notice that the poet has used only three different rhyme-words (instead of a possible seven), of which one (bikhar-gaee, " got scattered") has been used four times. another (Dar-gaee," became frightened") twice, and the remaining (guzar-gaee,"passed by") only once. The first two of these words occurs in the opening couplet itself, which is further marked by the occurrence of the syllable are in several other words whose sonority adds to the total effect. But the most important thing to note about the first couplet is the opening sequence of an adjective and a noun, Xufta sajar, "sleeping trees," both of

them being relatively uncommon words borrowed from Persian and Arabic. The sequence stands out from the rest of the couplet. in fact jars on our ears, and in that way forces itself on our attention and startles us in the same way the poet must have been startled in his reverie by the sudden trembling of trees and the scattering of the "flowers of moonlight" on the ground. The closest synonym fivetee lacks the sharp resounding quality of the two short syllables of xufta.

In the second couplet. the image of a collision is structurally supported by the placement of the word tunum at the beginning of the second line.The placement. at ntervals of four fully stressed words (taaj, rakhee, rahii, raat) in the first line makes us expect a similar slow and regular heat in the second but we are jolted out of this expectation by the full stress placed on its very first word.

One may rightfully say that the third couplet is the most "impersonal" of all the couplets in this Gazal, signilieacantly, it also contains the only radiif (end-rhyme), guzar gaee, that is not part of the main experience as we shall see later.

Both the lines of the fourth couplet have a saggestion of alliteration, though of different consonantal sounds. In the first line the prominent sound is the palatal a, in the second the labial b. I am not suggesting that these two particular sounds complement each other, but I do wish to point out that the two lines do seem to complement each other structurally in the placement of the alliterative words. Imagine how poor the couplet would sound if the second line were :

hooNTooN-pe meeree anjum-e sahrii bikhar-gaee

A similar placement of key words is noticeable in the two lines of the fifth couplet, but in this case one must also underscore the fact that these words contrast in meaning. The three pairs of contrasting words are : talwooN, "soles" and aaNkhooN, "eyes" dhuup, "sunlight"

and canndnii, "moonlight," and gudgudii, "tickling" and Dar-gaee, "were frightened."

As for the last couplet, it seems of little consequenee by itself, but viewed within the context of the entire Gazal it takes on an entirely new role.

Let us look at the entire Gazal from a different angle. It opens with the deseription of a natural phenomenon, of something exterior to the poet. The first couplet contains no mention of the poet himself it also fails to tell us what caused the trees to tremble in fear and the "moon-flowers" to seatter on the ground. In the second couplet the poet uses a first person pronominal form, but in the plural which is still a step removed from the purely "personal" singular form. One may add that he could have used the proper singular form, mujh, with no harm to the meter, but in fact he did not. We have already pointed out the "impersonal" nature of the third couplet we can add that the use of a third person pronominal form woo enhanees that feeling. But a change occurs with the fourth couplet : the journey that began from the very external reaches the very internal and personal. Now the poet uses a first person singular form, and we would not be fair to him if we neglect to note the fact. He could have easily used a plural form. e.g., in the following manner:

caahaa thaa ham-nee eaand-kii palkooN koo cuum-leeN leekin labooN-pe subh-kee taaree bikhar-gaee

But he did not. However. after reaching the intimacy of the first person the direction of the poetic experience is reversed. The fifth couplet contains no explicit mention of poet's although the experience is still quite personal. It is the poet whose "soles are tickled by the sun" and whose "dreams of moonlight" are frightened. And then comes the sixth couplet, which concludes the Gazal as well as the poet's experience : we are informed of the destruction and scattering of something that had contained the story of the

poet's love. Notice the curious coincidence : the end-rhyme of the first of the two concluding couplets is the same as that in the firsth line of the matla, the opening couplet. while the end-rhyme of the last couplets is the same as that of the second line. This establishes a kind of identity between the strictly external matural "happening" described in the opening couplet and the more personal experience of the subsequent couplets. The last couplet also gives us the "agent" or the cause of that "happening" It was the wind that moved through the dark trees and caused them to tremble as if in fear, and it was their sudden movement that caused confusion among the patches of moonlight on the ground. The wind hawaa was and important element in this particular poetic experience and could not be entirely pushed away in the background. Viewed in this manner the Gazal takes on the appearance of something other than a "necklace of pearls at random strung." It has a pattern. There exists a structural relationship between its various couplets and a sense to their arrangement. It was inspired by just one poetic experience, which itself is now this Gazal.

It seems to me that an analysis of the above kind adds another dimension to our appreciation of a poem. and allows us to become more closely aware of that poem as a structurally well-integrated poetic experience.

The Gazal is by bashir Badr. It first appeared in the monthly Talaash (April, 1963.p.68)

ـا Literature
East & West 1972
by prof C.M. Naeem

بشیر بدر سے میں نے کئی طویل انٹرویو لیے، کچھ لکھا، کچھ ٹیپ کیا۔ شاعری میں لفظوں کے انتخاب کے سلسلے میں کہتے ہیں۔

لفظ گھر ہوتے ہیں، ہر گھر کا ایک زمانہ میں ایک ماحول ایک تہذیب ہوتی ہے۔ کچھ لفظ شاندار محل سرا اور تہذیبی حویلی کی طرح ہمارے یہاں آئے لیکن کئی سو سالہ وقت کی تبدیلی کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ میں ایک لفظ ساقی لیتا ہوں غزل پڑھتے وقت غزل کا جو طالب علم اپنے آپ کو عہد بہ عہد لفظ ساقی کی تہذیب میں منتقل نہیں کر سکتا وہ اُردو غزل کی عظمتوں سے انصاف نہیں کر سکتا۔

ساقی، ساقی کوثر کے لئے بھی آتا ہے، ساقی پیر طریقت کے لئے بھی آتا ہے اور ساقی خدا کے مفہوم تک کچھ شعرا پہنچاتے تھے۔ ساقی اس نوخیز پاکیزہ اور ان چھوٹے محبوب کے لئے بھی آتا تھا جس کے لئے میر نے کہا تھا۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے ؞ عشق بن یہ ادب نہیں آتا

فراق گورکھپوری نے ساقی اور میخانے کے تلازمے (اور کسی حد تک متحرک امیجری سے) کیسا لازوال شعر کہا تھا۔

فرش میخانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ ؞ دیدنی ہے تیری آہستہ روی اے ساقی

مگر میر کی طرح یہ بھی مانتا ہوں

شعر میرے ہیں گو خواص پسند ؞ پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میں زیادہ دیر رنجیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس وقت تین لاکھ شاعر اور پچیس ہزار غزل نائک جو ساقی، میخانہ، شراب والے شعر گا رہے ہیں وہ غزل کی اعلیٰ تہذیبی زبان سے نابلد ہیں اور کروڑوں (کم از کم تیس کروڑ) عاشقان غزل (بلکہ گجل)، کو رم، وہسکی اور ٹھرا سمجھتے ہیں اور ساقی کے بدن سے اسکی خوشبو (بدبو) آتی ہے اور اسی طرح ان کا نشہ بڑھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں رنجیدہ کیوں نہیں ہوں توعرض ہے کہ غزل خواص کے لئے بھی ہے۔ خواص غزل کی تہذیبی تاریخ پڑھیں گے ایسے شعر کو غزل ہی نہیں مانیں گے جن میں ٹھرے کی بدبو آرہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں (ہم) زندہ ہوں اور مجھے گفتگو عوام سے ہے۔ عوام کی شعری تہذیب اور تربیت کرنا میرا کام ہے لیکن وقت کے فاصلے کو مدِنظر رکھنا ہوگا، خدا، پیر طریقت،

ساقیٔ کوثر کے لئے میں اب ساقی کا لفظ استعمال کرنے میں یہ ڈر سا محسوس کرتا ہوں کہ کہیں ان کی اہانت تو نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ لفظ گھر ہوتے ہیں۔ وہی لفظ جہاں صبح و دم بچے تلاوت کرتے تھے اس گھر سے مجرے کی آواز بھی تو آسکتی ہے تو اس کا کچھ علاج کرنا ہوگا۔ مجرا بند کرانا ممکن نہ ہو تو اس گھر کی طرف میرا راستہ نہیں جائے گا۔"

اس طویل اقتباس کے بعد اور گا ہے گا ہے ان کے انٹرویوز، ان کی نثری کتابیں 'آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ'، 'بیسویں صدی میں غزل'، آمد کا پیش لفظ ۲۰۳۵ء کے پڑھنے والوں کے نام ان کے تصوراتی زبان کے بارے میں ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ ان کے یہاں غزل جہاں نئی زندگی کی برکتوں اور عیاریوں سے آنکھیں ملا رہی ہے ان کی غزلیہ تجربے کس طرح آج کے ماحول کی مرقع نگاری کو آج کی بدلتی ہوئی زبان کے سہارے پیش کرنے کا حوصلہ کر رکھے ہیں تب ہی وہ کہتے ہیں کہ میں زیادہ رنجیدہ نہیں ہوں میں خواص سے آیا ہوں پر مجھے گفتگو عوام سے ہے اور ہر اہم شاعر کو اپنے عوام کو اپنے عہد کی شعری تہذیب اور زبان سے آشنا کرانے کا ہنر آنا چاہیئے اور یہی اس کا منصب اور امتحان ہے۔

ایک مرتبہ دوران گفتگو بشیر بدر نے کہا تھا۔

"اردو زبان کے مستقبل سے وہ متفکر نہیں ہیں ان کا خیال ہے کہ زندہ زبانیں جن میں اخذ و جذب کا عمل مسلسل ہوتا رہتا ہے جو نئے نئے لفظیات کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتی ہیں وہ کبھی کسی پیمانے پر ختم نہیں ہو سکتی۔"

اس سلسلہ میں اپنی تصنیف "آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

"مسئلہ یہ بھی ہے کہ کسی زبان میں جو لفظ شاعرانہ سیاق سباق میں نہ ہوا ہو اس کا پہلی بار شاعرانہ اور تخلیقی استعمال معمولی کام نہیں ہے، ورنہ وہ الفاظ جو نئی زندگی کا چلن ہوتے ہیں ان میں نئی زندگی کی تہہ داریوں اور رمزیت کو پیش کرنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ نئے الفاظ کے نئے مزاج کو پہچاننا اور ان سے پورا کام لینا شاعرانہ قوت اور فن کاری کی دلیل لیکن اس میں شاعری کے ناشاعری کے منظوم نثر ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے اور یہ کام کمزور تخیل اور انفرادیت سے عاری تقلیدی

شعراء کے بس کا نہیں ہے۔"[1]

اسی خیال کو پورے اعتماد کے ساتھ اور مزید وضاحت کے ساتھ وہ 'آمد' کے پیش لفظ 'ایک خط 2035 کے پڑھنے والوں کے نام' میں لکھتے ہیں:

"اب غزل کا عالمی اور جدید منظرنامہ فارسی زدہ اور اردو غزل کے طریقۂ کار اور منظرنامہ سے مختلف ہو چلا ہے۔

آج غزل کا مسئلہ کیا ہے؟ غزل کروڑوں دلوں پر راج کر رہی ہے پڑھنے والے سوا لاکھ ہیں تو غزل سننے والے مختلف وسیلوں سے کروڑوں ہیں۔ یہ کروڑوں عاشقانِ غزل ذہین نقادوں کی نگاہ میں اس لئے حقیر ہیں کہ یہ فارسی غزل کی اُترن، لفظیات اور استعارات سے ناواقف ہیں۔ ان کے مقابلے میں میرا خیال ہے کہ یہ زندگی کے کم ذہن لوگ ہیں جو ان الفاظ اور مردہ تراکیب سے بے خبر ہیں۔ جن سے انہیں واقف ہونا چاہیئے۔"[2]

بشیر بدر کے شعری اسلوب رنگ و آہنگ پر ارشد عبدالحمید کا ایک مضمون خاصا اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں انہوں نے اکائی میں کلاسیکل لفظیات نئی اختراعی تراکیب کا مطالعہ کیا ہے اس کے بعد امیج کے تجرباتی اسلوب کو اس کی لفظیات تشبیہات، استعارات اور منظرنامے سے پرکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ امیج میں شاعر نئی لفظیات اور نئے تجربات کو غزلیات اور تغزل سے ہمکنار کرنے کی تجرباتی جدوجہد کر رہا ہے، اس کے بعد آمد میں بشیر بدر نے کس طرح اپنے شعری بوطیقا کی تشکیل کی، ارشد عبدالحمید کے اس طویل مضمون کے ضروری اقتباسات ان کی معنی خیزی کی وجہ سے نقل کئے جا رہے ہیں۔

بشیر بدر نے پرانی لفظیات کا استعمال بھی اپنے انداز اور اپنی ضرورت کے مطابق کیا ہے: مثل مینار عظمت، سینۂ سنگ، زلیست، کتبۂ اقوال زریں، وادی، ذہن جاودان بیکراں، رات کا کالا جادو ہے زلف میں، دشمن جاں، گیسوؤں کی گھٹا، مست و سرشار، رقص آواز، پابہ زنجیر،

---

[1] آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ ص ۳۰۲ [2] پیش لفظ آمد

موت کے تیرہ و تار شمشان، اہل چمن، نغمۂ فصلِ گل، شاہدِ زندگی، حلقۂ نورِ طائفہ، دلِ شب تار کی سلطنت ہو گیا، خیمۂ زخم سے کج کلاہانِ غم پھر نکلنے لگے، آتش بجاں، العطش العطش کوثرِ علم و فن گیتی، ترقیٔ معکوس، آئینہ ساز و شیشہ گراں، نبضِ دوراں، آتش گل، غزالِ گل عذار، یہ ہوائے حقیقت فردا، گاہ پانی گاہ شبنم اور کبھی خوناب سے، حیرتی آنکھیں، مثال وقت میں تصویرِ صبح و شام ہوں اب، اجزائے پریشان، خامشی اتنی اذیت ناک ہوتی ہے کہ بس، سب فنا ہو جائے گا اللہ بس باقی ہوس، دل کی رہِ حیات میں یہ شوخ تمکنت، جام جم، نکہت گیسو، بزرگانِ جدید، قفل دلِ شکستہ، شہزادیٔ خواب، دشت تمنا، بادِ صبا، برق صفت، شعلہ نما، فکرِ سخن نگار، فکر و نگاہ، جسم جیسے بھرا بھرا ساغر، جوئے شیر تیشہ، جشنِ چراغاں، نگہہ شوق، برگ گل، آب رواں، مثالِ غنچہ، سکوتِ شام، ہر جسم گل فروشاں اب مرکزِ نظر ہے، افسانۂ شبِ غم، یہ حالت گفتنی کم دیدنی ہے، مے سے لبریز چھلکتے ہوئے پیمانے چلے، روزن، چشم پُرآب، حضور جبر کسی مصلحت کے پیش نظر، میاں بزم طرب، محشر خرام، گلِ رخ، یزید، حسینؓ، فرات، نیزہ زمین پہ گارڈ کے گھوڑے سے کود جا۔ آب و خاک و باد، شبِ ہجر، خلوص شبنم و نکہت و نورِ آتشِ گل، آبشار شہرِ پُرفن، خندۂ گل، یہ دشت و غم کی تپس بیش از عذاب النار، الاماں شاعرانِ خستہ حال، غم وجہ فگارِ دل غم وجہ قرارِ دل" ؎

اسی مضمون میں نئی لفظیات کے تخلیقی استعمال کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اکائی" ہی میں بیشتر ایسی غزلیں بھی ہیں جن میں نئی لفظیات کا تخلیقی استعمال ہوا ہے، یہ وہ غزلیں ہیں جنہوں "امیج" اور "آمد" کے شاعر کو ایک ٹھوس لفظیاتی بنیاد فراہم کی ہے۔ اس نئی لفظیات کی ایک مختصر سی فہرست بنائی جائے تو وہ اس طرح ہوگی۔

برف سے اجلی پوشاک، وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں، پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہوں، دستِ الفاظ محفوظ کرلے انہیں، نوٹس، شوکیس، لکڑیوں سے تراشی ہوئی لڑکیاں، ٹین کے نوجوان، آسمان رنگ کا کوٹ، یادوں کے اجلے فرشتے، دودھیا خامشی، یادوں کی زلفیں، خواہشیں جیسے افریقہ کی بیٹیاں، دھوپ کو چھیڑتے آبنوسی بدن پھر کبوتر کے جوڑوں کے دل میں چھپی تنکے چن

؎ فکر آگہی دہلی بشیر بدر نمبر صفحہ ۱۲۳

چن کے لانے کی فطری چبھن، آئینہ خانوں میں خوشبوؤں کا بدن، بیروت کے ساحلی ریت، کاغذی مقبرے، مچھلیاں اک دریچے میں دو آنسوؤں کا سفر، روشنی کے گھروندے، خوشبوؤں کی دکاں، زعفرانی پلوور رات کی شاخ، غم وہ ساون ہے جوان کمروں کے اندر برسے، چاند، پھول کے پیالے، آنکھ کے تارے، گلاب کی جنبش، دھوپ، آنسو، اداس بیتا، تتلی، نیند میں ننگے پاؤں چلتے خواب، نیند کی فاختہ، گمراہ فرشتے، رات کی پلکیں، صبح کی آنکھیں، سایہ، کمرہ صحرا، رگ دنیا، سانپ جو پیاس تیز ہو تو ہے۔ ریت بھی تصویر آب، میری آنکھیں کسی کے آنسو میں گیسوؤں کے پھول نقش قدم کا چاند، تجربوں کی ردائیں، پیار کی خوشبو، یاد کسی کی دھوپ ہوئی ہے، آہوں کے بادل، آنسو کی کھیتی، نین نگر، روپ دیس کی کلیاں، رنگ و نور کی گڑیاں، چاند دیس کے لوگ، پھول جیسی عمر، چاندنی کے شعلے، خموش برف کی وادیاں، خزاں کے خشک و اداس ہونٹ، آنسوؤں کا سکوت، شبنمی آگ، پورس کی فوج، خزاں کی دھوپ، بالکونی، ٹیلیبیٹ، ٹائی کی گرہ، مکھن، ریل، رکشا، موٹر، ڈولی، کالر، ٹیپ، ہک، بٹن، چین، زپ کے دانت، مچھلیاں چل رہی ہیں پنجوں پر، بولیاں بولتے ہوئے ڈبے، کالے جادو کا کمرہ، سرمئی اشجار، سوٹ، شرٹ، دھند، شاخ کی بانہیں، چائے کی پیالی، عارض کے اجالے، سرکش پہاڑیاں، سویرے کا سنہرا جام، کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی، ستاروں کے لبوں پر کپکپی ہے، خدا کی نظموں کی کتاب، بستر بند، ماتا کا جسم، دہکتے نیزے، چاند کی کشتی، لہو کا فوارہ، سرخ چاندنی، پھڑکتی مچھلی، نرم بلی، لہو کا چڑھا سمندر۔"

"اکائی" کی اس نئی لفظیات میں حسی تلازمے، استعارے، علامتیں نیز تشبیہات کے ذریعے شعری زبان کی تشکیل کی گئی ہے، لیکن تشبیہات کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ میر کی طرح بشیر بدر کی لفظیات میں بھی سامنے جیسے، جیسا، طرح، مثل، مثال اور مانند وغیرہ ادوات تشبیہہ کثرت سے استعمال کی گئی ہیں۔ "اکائی" سے لے کر "امیج" اور "آمد" تک تشبیہات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو قاری کے ذہن میں مختلف منظر ناموں کا عکس کھینچتا چلا جاتا ہے۔ "اکائی" کی تشبیہات زیادہ تر فطرت کے شوخ مناظر سے اخذ کی گئی ہیں اور اکثر و بیشتر پیکر نگاری کے ذریعے حسی تلازموں کی تشبیہاتی تجسیم ایک انوکھے آہنگ اور لب و لہجے کو جنم دیتی ہے۔"[1]

[1] سہ ماہی فکر و آگہی، بشیر بدر نمبر ۸۹-۱۹۸۸ء

لفظیات کے ارتقائی نظام کا اندازہ "اکائی" اور "ایمیج" کی لفظیات کے تقابلی مطالعے سے ہوتا ہے۔ "ایمیج" کی چند اہم لفظیات حسبِ ذیل ہیں۔

"سسکتا آب، بوڑھا دیوتا، خوشبو چیختی ہے، جزیرے، شب خون، پتھروں کا جنگل، عرق نچوڑنے والی مشین، فر کے کوٹ، دفتر کا قلم، مل کی مشینیں، دل کے باغی فرشتے، جگنو جھاڑ، خوشبو تتلی، سونے کے پھول پتے، خوشبوؤں کا بدن، رنگوں کے فرشتے، دینار، خواب کا شجر، بدن پہ جمی ہے دھوپ، رومال روشنی کی ہواؤں میں اڑا دوں گا، بدن کی مٹی، نیلے بادل کا گاؤں، روشنی کے بدن، چلتی گھڑیوں کی سوئیاں، رات کا ٹیپ، موسم کے پاک چہرے، سرمئی ہڈیاں، خاکی اشجار، مختلف پیچ میں اک کسی شخصیت، یاد کا پھول، دھوپ کے چھپاتے ہوئے ہاتھ، نیم کے پھول، ناریل کے درختوں کی پاگل ہوا، گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا، یادوں کی کافور جیسی مہک، بید کے زرد مونڈھے پہ بیٹھی ہوئی شام، خشک ڈنٹھل، فاختہ کی گھنی بند پلکیں، لان، جنگلی آم کی جان لیوہ مہک، فاختہ دھوپ کے پل پہ بیٹھی رہی، گیلری میں چھپی دوپہر، ناریل کی طرح توڑ کر پی لیا، سبز پلکیں، دھند کی بند پلکیں کترے ہوئے سائیکل پر چلیں دھوپ کی قینچیاں، درد کا پاک لوبان، ریشمی بالوں والے پھول کی گرم ٹوپی، سرخ خرگوش، کبوتر کا خون، کلینڈر میں بیٹھا ہوا سرخ بلا، کھڑی موج، زرد ساڑی، پس ماندہ قصبے کی پتلی سڑک، ٹریفک، سیاہی، جھاگ کے پہاڑ، کھلے صابنوں کی مہکتی ندی، پاؤں اسٹیل، سینہ سڑک، ہاتھ لکڑی کے جنگلے، چھٹپٹے کی ندیاں، سبز نارنجی سنہری کھٹی میٹھی لڑکیاں، مقبروں کی چادریں، آسمانی گھنٹیاں، شام کا کالا گلاب، جامنوں کے باغ، اودی اودی لڑکیاں، طیارے، گلاس، ابابیل، پول، بلب، مکان، کھیت، سبز کائی کی چادر، رات کارس، راکشش، چاند کی کشتی، لہو کا فوارہ، مائی، دیمک، راکھ پہ دھوپ جمانا، پیار کی گہری پھنکاریں، دیہاتی پانی کے جھوٹے موتی، دھوپ نئی بیل باٹم پہنے سڑکوں کی کشتی پر تیرے، راکھ کا کرتا، دھول کی لنگی، جگنوؤں کا سر، موم بتی کی رانیں، بلیڈ، چاقو، برف کے ثمر، دھوپ کا ہرا بجرا، آگ کا سمندر، دھوپ کی گٹھری، ملبہ، دیوار، خیمے، برف میں رکھی ٹھنڈی بوتل چیک گئی، دونالی، غازی، ڈونگے، گارا، چونا، مچھلی کے کولہے، گنگا جل، چھت چھاگل، دستانے، گھوڑے، اسکوٹر، برف کی ٹافیاں، بیرک، وردیاں، پٹیاں، چیٹیاں، گلہری،

دُودھ، قمیض، اٹیچی، الگنی، سرمہ، مسّی، کنگھی، چوٹی، مینا، کہرے کے لرزیدہ ہاتھ، تلسی اور ادرک کی چائے، شاور، ٹاول، اپنے ہی مرچ پودینے سوکھ گئے، دُودھ جلیبی، غزلیں اب تک شراب پیتی تھیں، نیم کا رس، فکر کی بے لباس شاخیں، گیلے جذبے، فن کی پتی، برقی لڑکی، نور نامہ، کافی ہاؤس، ٹیڈی تہذیب ٹیڈی فکر و نظر، ٹیڈی غزلیں، غیار، کتے، خونخوار بلّی، سنہری پڑیاں، اسٹیشن، بدن کی بتّیاں، گولی، صوفے، مسہری، بھور الحاف، کواڑوں کی اوٹ، جذبوں کی ناگنیں، لفظوں کی بین، مادہ و نر، برادہ، آنگن کی مہندی، سانپ، ریت، تلوے، من، گائے جب گانے کا بدن چاٹے، خرگوش، کوکر، ڈشیں، سناٹے کی شاخیں، خاموشی بذاتِ خود آواز کا چہرہ ہے، پلکوں کے مہہ دا انجم، سُرخ مومی شمعیں، لکھوری اینٹیں، فیتے، جس چھپر کے نیچے گاؤں کے بوڑھے حقہ پیتے ہیں، دھوپ کا شیشہ، پیڈل، کہرے کا کمبل، ہیٹر، کیلے کے چھلکے، کگار، روٹیاں، لادی اٹھا کے گھاٹ پہ جانے لگے ہرن، بلڈنگ، ہلدی، ناف میں پھول، ران پر مچھلی، ایک مٹھی دھوپ، پھول سی قبر، آسماں کا زرد کتا، یاد کے بلغمی بچھونے، چار دن کی چاندنی، چاند کی ڈولی، اُمس، تولیہ میں دھوپ کی خوشبو، لوبان میں چنگاری، کٹورہ، آفتاب"

ان لفظیات کے مآخذ زندگی کے عام بول چال کے الفاظ، آس پاس کی اشیاء اور مناظرِ فطرت کی وہ تصویریں ہیں جو ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں لیکن جن پر عام آدمی کی توجہ بہت کم مرکوز ہوتی ہے۔ ان لفظیات میں ایک خاص بات یہ ہے کہ شاعر کا تعلق اپنے گھر بار اور آس پاس کے مناظر سے اتنا گہرا اور جذباتی ہے کہ اس کی تمام تر لفظیاتی دنیا انہی اشیاء اور مناظر سے ترتیب پاتی ہے۔"[1]

اکائی میں ان کی وہ ابتدائی غزلیں بھی شامل ہیں جن میں بظاہر غزل کی پرانی لفظیات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے ان میں ایسے دو طرح کے شعر ہیں۔

۱۔ جنہیں ہم قدیم غزل سے الگ نہیں کر سکتے۔

۲۔ قدیم اسلوب میں نئے فکر و احساس کو پیش کیا گیا۔ اگرچہ ایسی غزلیں بہت زیادہ نہیں

---

[1] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی، بشیر بدر نمبر ۸۹-۱۹۸۸ء صفحہ

ہیں اور فارسی آمیز لفظیات والے شعروں کو اس خیال سے حذف بھی کیا جا سکتا تھا کہ شاعر اپنا نیا اسلوب نئی لفظیات میں تلاش کر رہا تھا۔ جلد ہی بشیر بدر نے جدید شعری زبان جدید قصباتی زبان۔ دونوں کو غزلیہ اسلوب میں اختیار کیا۔ پرانی لفظیات کے مشق سے ان کے شعری شعور میں غزل کی تہذیب ہمیشہ جاری و ساری رہی۔ ان کے بعض جدید ترین اشعار بھی اس لئے حسن و موسیقی سے عاری نہیں ہوتے کہ ان کے لاشعور میں ماضی سے وابستگی تمام زندہ روائتیں بروئے کار رہتی ہیں۔

یہ مطالعہ بہت معنی خیز ہے کہ انھوں نے جدید زبان کو اپنے شعری سفر کے آغاز میں اپنالیا اور اپنے تربیتی دور میں فارسی آمیز اشعار کو بالکل حذف نہیں کیا تاکہ یہ ان پر کام کرنے والے ان کے شعری رویوں کے ارتقائی شعر کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ رچنانچہ "اکائی" میں تشبیہات کا ایک طویل سلسلہ تھا جو "امیج" میں کچھ کم ہوا لیکن "آمد" میں پھر وہی تشبیہاتی اسلوب دیکھنے کو ملتا ہے "امیج" کے مقابلے میں "آمد" میں استعاروں کا استعمال کم ہوا ہے لیکن علامتی اظہار بدستور قائم ہے۔ "امیج" کے الفاظ کو چھان پھٹک کر "آمد" کی غزلوں میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً غزل کی سچی کتاب، اشتہار، خزاں کی زرد سی شال، اداس پیڑ، دھوپ کی پتیاں، میل، مہکتے ہونٹوں کے چاند، لان، انار، جگنو، دلائیاں، پاندان، میز پوش، پہچان، عطردان سا لہجہ، ہرن، باز، کبوتر، گلاس، دردیش، ریشمی شال، چڑیاں، چاول، صراحی، کھجور، دیمکوں کے قافلے، ڈور کانٹے، بس، سوٹ، سڑک کی لال پیلی بتیاں، مزاروں پہ چادر چڑھائی ہوئی، اداسی کی بیلیں، سرائے، لاری، چھپر، کالی بلی، پشواز، چرواہا، بھیڑ، دھوپ کے گجرے، گور، کھانے کی میز، گڑیا، گدے، کوہ نور، نمبر، بھگوان، من مندر، نورانی داڑھی، اسٹیشن، ساجن، ساگر، گردھر ناگر، جیون، مایا، چادروں اور شامیانے، قالین، کرائے کے گھر، پگڑی، اردو والوں کا کیمپس، تھالی، وغیرہ لفظیات میں "امیج" کے لفظیاتی تجربات کی جھلک ملتی ہے لیکن یہاں اسکی نوعیت محض تجرباتی نہیں ہے بلکہ شعر کی فکری اور داخلی آہنگ میں ان الفاظ کی اکائیاں مکمل طور پر جذب ہو گئی ہیں۔

آمد کی تشبیہات میں مشابہت کے ساتھ ساتھ تشبیہہ کے تلمیحی اور تہذیبی پس منظر کو پوری طرح تخلیقی سطح پر برتا گیا ہے اس طرح تشبیہات میں تہہ داری اور معنویت کا عنصر مشابہت

کے اوصاف کو اور زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر"اکائی" کا ایک شعر ہے ؎

اس کی اُردو میں بھی اب کے مغربی لہجہ ملا ٭ اور بالوں کی سیاہی زعفرانی ہو گئی

اس شعر میں دو تہذیبوں کے سنگم کی طرف اشارہ ہے لیکن شعر بیانیہ سے آگے نہیں بڑھ سکا لیکن اُردو کے ہی حوالے سے"آمد" کا ایک بیانیہ شعر بھی اثر پیدا کرتا ہے جو تشبیہ کی کامیابی ہے

وہ عطر دان سا لہجہ میرے بزرگوں کا ٭ رچی بسی ہوئی اُردو زبان کی خوشبو

یا۔اسی طرح آمد میں ایک اور تشبیہ ہے:۔

خانقاہوں میں خاک اڑتی ہے ٭ اُردو والوں کے کیمپس کی طرح

یا

شام تک کتنے ہاتھوں سے گذروں گا میں ٭ چائے خانے میں اردو کے اخبار سا ؎[1]

"آمد" میں"اکائی" اور"امیج" کا توازن ہے۔"آمد" میں پرانا لفظ نئی معنویت اور حسیت کے ساتھ آیا ہے اور نیا لفظ غزل کی تہذیب میں تربیت پاکر غزل کی بارگاہ میں اذنِ باریابی پاتا ہے، ارشد عبدالحمید نے بشیر بدر کے غزلیہ لفظیات کا انتخاب کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

"اللہ ہی اللہ، خاموش پہاڑوں کی ندا، پیڑوں کی صفیں، پاک فرشتوں کی قطاریں، آنسو کی غزل حمد و ثنا، سورہ والتین، غزل کی سچی کتاب، ذرا فاصلے سے ملا کرو، حسن پردہ نشین، عاشقانہ لباس بے حجاب، گرمیٔ شوق، خزاں کی زرد سی شال، میل کا پتھر، کوئی دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا، جھکتے ہونٹوں کے چاند، شجر، بساط، پرانی دلائیاں، پاندان کی خوشبو، میز پوش، پیچوان، زردلان، عطردان، زعفران، لاالہ الا اللہ، اذان، باز، تاراج و حمارت، تمازت، حرارت، پیغمبر، آیت، بشارت، نوک پلک، ابرو، محترم، تحریر، لشکر، درویش، ابرِ کرم، کھجور کے پیڑ، سیاہی، بے ریا، ردعیں، قدیم قصبے بوسوں کے چراغ، دیمکوں کے قافلے، صحیفے، کہرے کی یورش، تاجر، مزار، چادر، ایوان، مقدس مزاروں پہ قوالیاں، عطر و لوبان، نمائش، سرائے، زلفیں، تحریر و گفتگو، بینائی، سرخ سنہرا صافہ باندھے شہزادہ گھوڑے سے اترا، کالے غار سے کمبل اوڑھے جوگی نکلا، زنداں، میرا امیر، بدگمانی، آسیب، زنجیر

---

[1] سہ ماہی فکر و آگہی بشیر بدر نمبر صفحہ ۱۴۱،۱۴۰

گرفتار، فرشتوں کی صحبت، شکوہ و گلہ، تفصیل شہرِ وفا، پیمبر، عاشقی، قبا، دستِ دعا، تشبیہ، میکدہ، چراغ کا قیدی، گردِ سفر کی تہیں، سانولی شام، شیشہ، چاندنی کا بدن، خوشبوؤں کا سایہ، آئینہ، بالیاں، ہار، اذنِ قیام، گرد و غبار، رحیم و کریم، صفت، محوِ خواب، خرابہ، پائمالی، انگنائی، زرد پھولوں کا قافلہ، سیفنے، نام اور نمبر، شمعیں، زنداں کا اندھیرے، نغماتِ سلاسل، جزیرے، ساحل، خاکسار، سوغات، ستاروں کی ضو، شکستوں کے ڈیرے منڈیروں پہ ہیں، فصیل، پرچم، روح و دل کی ریاضت، دلنوازی، دھوپ کا شجر، جام، تذکرہ، روایت، شہ سوار، پردۂ فن، چلمن، گلوں کو شہیدوں کا بچپن کہو، مدفن، خار و خس، سلطنت، نصاب، صبحِ عارض، شامِ گیسو، مکین گاہ، قفس، خانقاہ، سلام و پیام، تغیر، شاداب، فراق، وصال، محال، یوسف، تاج و تخت، سرِراہ، سرِشام، منظرنامہ، نام نامی وغیرہ لفظیات میں نئی لفظیات کے ساتھ کلاسیکی لفظیات کی آمیزش سے ایک نئی غزلیہ زبان وضع کی گئی ہے جو بشیر بدر کے انفرادی اسلوب سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔

پیکر تراشی "آمد" میں ایک براہِ راست بیانیہ کا ذریعہ بن گئی ہے "اکائی" اور "امیج" کے پیکر یہاں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے موجود ہوتے ہیں اور پیکر نگاری بجائے خود غزل کی زبان بن جاتی ہے۔"[1]

بشیر بدر نے غیر غزلیہ الفاظ جیسے پوڈر، کیمپس، گلاس، سوٹ، میل، کلاس، لان وغیرہ کو جس طرح جدید حسیت اور متغزلانہ معنویت سے آراستہ کیا ہے اور اسے شعر کا محسوس حصہ بنا دیا۔ یہی بشیر بدر کا کارنامہ اور ان کی شناخت ہے:

وہ زعفرانی پلوور اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

خانقاہوں میں خاک اُڑتی ہے
اُردو والوں کے کیمپس کی طرح

نصاب دل کا کہاں رکھ دیا کلاسوں میں
غزل کی آگ ہے یہ کاغذوں کے بس کی نہیں

بہت اچھا سا سوٹ پہنو تنگدستی میں
اُجالے میں چھپی ان بدلیوں کو کون دیکھے گا

کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

---

[1] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی صفحہ ۱۴۴، ۲۰۰۴ء

اس کے علاوہ اُکائی اُور اُمیج میں بے شمار ایسے اشعار مل جائیں گے جہاں لفظوں کی جدیدیت یا خیال کی جدیدیت طنز و مزاح کی شمولیت کے بعد انٹی غزل ہو گئی ہے المیہ یہ ہوا ہے کہ انٹی غزل کو اس نئے پیرہن کی وجہ سے کوئی نیا کارنامہ سمجھا گیا جب کہ انشاء اللہ خاں انشا کی بے باک طنز نگاری سے اکبر الہ آبادی کی واضح طنز نگاری کے وسیلے سے اردو میں ہزل کی روایت خود مختار ہو گئی تھی اس طرح قدیم عہد میں واسوخت اور ریختی کی مصنوعیت بھی اپنا الگ مزاج اور شناخت رکھتی ہے۔

Anti Ghazal انہیں غیر غزلیہ روائیوں کی جدید توسیع ہے۔

بشیر بدر جنہوں نے رسالہ "سویرا" لاہور، "سات رنگ" لاہور "ادب لطیف" لاہور میں ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۷ء میں اپنی اس طرح کی غزلوں سے چونکا دیا تھا۔

بیچ بازار میں گا رہا تھا کوئی آد نا میری جان چاندنی چوک میں
آج بھی شاخ یاد پر بیٹھے کچے امرود کھا رہے ہیں ہم
زیست کی ایک برقی لڑکی کو نور نامہ پڑھا رہے ہیں ہم
ٹیڑی غزلیں ٹیڑی فکر و نظر ٹیڑی غزلیں سنا رہے ہیں ہم

بشیر بدر کو اپنے اس تجربے کا احساس ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کے اعتراف سے لگایا جا سکتا ہے۔

"دراصل ۱۹۶۲ء میں ......ایک سچ کی طرح میں نے اس مطالعہ کو اپنی شخصیت کے وسیلے سے جنم دیا...... میں مطمئن ہوں کہ جب میں اینٹی غزل Anti Ghazal خود بھی لکھ رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی اور اسے ادبی ہزل سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا" [1]

بشیر بدر غزل اور ہزل (جدید اصطلاح اینٹی غزل) کے فرق کو جلد سمجھنے میں اس لئے کامیاب نظر آتے ہیں کیونکہ بنیادی طور پر ان کے مزاج میں تغزل ہے اور ان کی خود تربیتی میں قدیم و عظیم غزل کے زندہ سرمائے کا بڑا ہاتھ ہے، وہ روایت زدگی سے بہت جلد منحرف ہوئے لیکن وہ

---

[1] آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ صفحہ ۱۳

روحِ غزل جسے تغزل کہتے ہیں ان کی ان غزلوں کے ایک دو شعروں میں بھی دبائے نہیں دبتی مثلاً ابھی جن غزلوں کے Anti Ghazal نمونے دیئے گئے ہیں ان میں یہ دو اچھے شعر بھی شامل ہیں۔

زندگی اب تو سادگی سے مل ٭ بعد صدیوں کے آ رہے ہیں ہم
میری آنکھ میں ایک چاندنی چوک ہے ٭ گزری عمر رواں چاندنی چوک میں

پروفیسر عزیز اندوری اپنے مضمون "اکائی" اور "آہنگ" کا بشیر بدر میں لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ بشیر بدر نے اردو غزل میں مستعمل الفاظ کی محدودیت سے بالکل اسی طرح گریز کیا ہے جس طرح ان کے عہد کے بعض جدت پسند ذہن غزل کے کینوس کو وسیع کرنے اور اس پر مختلف رنگوں کی آمیزش سے نئی نئی تصاویر بنانے کی جانب متوجہ تھے۔ اس طرح بشیر بدر نے اپنے اس ذہنی عمل کا اظہار کر کے جہاں ایک طرف اپنی جدت طبع کا اظہار کیا ہے۔ وہیں اپنے عہد کے شعری تقاضوں پر لبیک کہتے ہوئے ان کی تکمیل کی طرف ذکاوت جس کے سہارے توجہ دی ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ٹرک، مشین، ڈبے، صندوق، ٹرین، پٹریاں، اسٹیشن، سائرن برک، موٹر، بسیں، ٹریفک، چاقو، مچھلی، چوہے، بلیاں، کتے، گلہری، خرگوش، گائے، مکھی، بکرے، دیمک، ڈنٹھل، شاور، کلینڈر، چیتھڑے، مونچھیں، بلب، پول، (کھمبا) پھنکار، کوٹ، بیل باٹم، پینٹ، لنگی، بلیڈ، کوٹھے، ڈونگا، کٹورا، چھاگل، ٹافی، بارک، انڈا، شیڈ، چھپر، اسٹیج، ٹاول، کافی ہاؤس، ٹیڈی، بیوی، عورت، مادہ، نر، اینٹ، حقہ، کپاس، لیمپ، ران، بلغم، جھپٹا، فاحشہ وغیرہ بے تکلفانہ استعمال کر کے غزل میں تبدیلیوں کے امکان کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح اپنی غزلوں کو نئی علامتوں اور مانوس سے الفاظ کا پیکر بنا کر پیش کر کے بشیر بدر نے ایک جدید لہجہ کو اپنانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ نیز داخلی کیفیتوں کے اظہار کے لئے انہوں نے اپنی جدید تر غزل کو ایک وسیلہ بنانے کا حوصلہ بھی کیا ہے۔" [1]

---

[1] شاعر بمبئی جلد ۵۴ شمارہ ۴ ۱۹۸۳ء صفحہ ۲۴

شریف ارشد نے بعنوان "بشیر بدر ایک مطالعہ" میں بشیر بدر کے کچھ مخصوص سمبل مثلاً "مچھلی" کے ان گنت Shades کا جو مطالعہ کیا ہے اس کے بعض نتائج سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن یہ بات تو ماننا پڑے گی کہ اردو غزل میں "مچھلی" کو ایک نیا Symbol بنا کر جس تواتر سے بشیر بدر نے شعری پیکر نگاری کی ہے وہ اردو غزل میں ان کا ہی اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے اس Symbol اور اس طرح Symbols کو بشیر بدر کے بے شمار شعروں کے بعد بہت سے لوگوں نے اپنایا ہے۔ بشیر بدر کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ کیجیے:

حقیقت سُرخ مچھلی جانتی ہے ؎ سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

بشیر بدر کے اس شعری رویے کے بارے میں شریف ارشد لکھتے ہیں:

"آج کا ہر بالغ نظر فرد، دنیا کی تاریخی، سماجی و سیاسی حالات سے باخبر ہے اگر وہ یہ فرمائیں کہ سرخ رنگ مخصوص افراد کی انفرادیت کو واضح تر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے تو بھی بات نہیں بنتی کیونکہ سُرخ تو کمیونزم کا سمبل بن چکا ہے، سُرخ مچھلی سے یا کارل مارکس مراد ہوگا یا پھر کوئی اشتراکی مفکر۔ یہ رنگ ایسا نہیں ہے کہ صرف پردۂ بصارت پر جھلملا کر رہ جائے بلکہ یہ رنگ تو پردہ ساز سماعت پہ رباب کی طرح بجتا ہے۔ بشیر بدر نے اگر یہ کہا ہوتا کہ "سُرخ مچھلی" ہی سماجی حقیقت کا صحیح عرفان ہے تو یہ صحیح ہو سکتا تھا واقعی مارکس نے انسانی سوسائٹی کا سائنٹیفک اور منظم مطالعہ کیا ہے لیکن "مطلق حقیقت" کا عرفان و ادراک تو "سمندر کی تمام" بالغ نظر مچھلیوں کو ہے اور آئندہ بھی یہ عرفان، رنگوں کی اسیری قبول نہ کرے گا۔

بات جب سمندر اور مچھلیوں کی چل نکلی تو زندگی کے اداس قصے میں چند لڑکیوں (مچھلیوں) کا نام اور سہی۔ بشیر کے یہاں صنفِ نازک کا خارجی داخلی مطالعہ بہت گہرا ہے "امیج" میں ان کی ایک پوری غزل ہے جہاں مصرعوں کے قدِ آدم شیشوں کے پیچھے مختلف اقسام رنگ و روغن جدا جدا کیریکٹر مختلف سائز و قامت کی عورتیں لڑکیاں کھڑی ہیں اور بشیر ان میں ہر ایک خصوصیات و خوبی، دُکھ درد، فوائد، ذائقہ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ صبح کا جھرنا ہیں یہ جھٹپٹے کی ندیاں ہیں
یہ سرد موسم کا مزاج کر دیتی ہیں یہ کھٹی میٹھی لڑکیاں ہیں

یہ صبح کا جھرنا ہمیشہ ہنسنے والی عورتیں
جھٹپٹے کی ندیاں خاموش گہری عورتیں

معتدل کر دیتی ہیں یہ سرد موسم کا مزاج
برف کے ٹیلوں پہ چڑھتی دھوپ جیسی عورتیں

سبز نارنجی، سنہری کھٹی میٹھی لڑکیاں
بھاری جسموں والی ٹپکے آم جیسی عورتیں

سڑکوں بازاروں مکانوں دفتروں میں رات دن
لال، پیلی، سبز، نیلی، جلتی بجھتی عورتیں

شہر میں اک باغ ہے اور باغ میں تالاب ہے
تیرتی ہیں اس میں ساتوں رنگ والی عورتیں

منجمد ہیں برف میں کچھ آگ کے پیکر ابھی
مقبروں کی چادریں ہیں پھول جیسی عورتیں

ان کے اندر پک رہا ہے وقت کا آتش فشاں
کن پہاڑوں کو ڈھکے ہیں برف جیسی عورتیں

فاختائیں، تتلیاں، مچھلی، گلہری، بلیاں
زندگی میں آئیں اپنی کیسی کیسی عورتیں

مچھلیاں چل رہی ہیں پنجوں پر
جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے

ذیل کے شعر میں مچھلی اور اسکوٹر لڑکیوں کے سمبل ہیں، گھوڑے اور کاریں لڑکوں کے۔

مچھلیاں ٹوٹتی ہیں کاروں پر
گھوڑے اسکوٹروں کے دیوانے

رات سے بھی انہوں نے عورت کو Symbolies کیا ہے۔

رات بالکل برہنہ لیٹی ہے
بکھرے ہیں چاند تاروں کے دانے

آم کے باغوں میں جائیے تو مختلف رنگ، سائز اور ذائقے کے پکے ہوئے آموں کی خوشبو سے مشامِ جان معطر ہو جائے گا، ہر آم جیسے یہ کہہ رہا ہو کہ مجھے کھائیے، سمندروں میں مچھلیاں ہیں تو یونیورسٹیوں میں لڑکیاں، "پکے آموں کی چیختی خوشبوئیں"۔ بشیر یا کسی بھی شاعر کا ٹیکنیکل وجود کچھ بھی ہو سکتا ہے، وہ ریسرچ اسکالر ہو، کلرک ہو، لائبریرین ہو، ہڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہو، ڈین ہو، لیکن اس کا حقیقی وجود ایک ہی ہے۔ اس نے بھی آرٹ فیکلٹی، سائنس فیکلٹی، کینڈی ہال، مولانا آزاد لائبریری، کامن روم، سمینار، لائبریری میں بے شمار ایسی مچھلیوں کو اپنے پنجوں پہ چلتے ہوئے دیکھا ہے۔ جن کے چہرے لڑکیوں جیسے ہیں۔ ان سے گفتگو کی ہے ان کے ساتھ بیٹھے ہیں کبھی کبھی نیلا سفید سوٹ۔ زمین پر بچھا دیا ہے اور دونوں دُور آسمانوں میں کھو گئے ہیں اور کبھی یوں بھی ہوا ہے۔

میں نیچے زرد گھاس کے بستر پہ سو گیا ؎ وہ اپنی سُرخ کار کے اوپر چلی گئی

بشیر بدر نے ان اشعار میں اپنے وجود کو جنس زار و گل زار کا ایک ایک پتہ ایک پھول بکھیر کر رکھ دیا ہے کیوں کہ وہ بہت ہی سنجیدہ متین شخصیت کے مالک ہیں ورنہ تحریر و گفتگو میں جو لوگ

متین نظر آتے ہیں وہ لوگ اپنی حقیقی زندگی میں اتنے متین اور سنجیدہ نہیں ہوتے اکثر ان کے تکیے کے نیچے سے تصویر کی کتاب نکلی ہے پھر Mask کا اظہار تو زندگی کا اظہار ہے۔" [1]

بشیر بدر کی جدید غزل میں اس تغزل کا بڑا ہاتھ ہے۔ جس کی سرشت روحانی اور جسمانی محبت کی ارضیت و ماورائیت کا امتزاج ہے ایسے خوبصورت عشقیہ اشعار جس کی تشریح کرنا ان شعروں کے حُسن کو مجروح کرنا ہے۔ ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں احساسات کی صداقت اور اظہار کی پختہ کار معصومیت ہے۔

آہٹیں چلمنوں سے پوچھتی ہیں ؛ قید کب تک رہیں گے ہم بابا

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں خاموشی بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

جس پر ہماری آنکھ نے آنسو بہائے رات بھر بھیجا وہی کاغذ اسے ہم نے لکھا کچھ بھی نہیں

سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

انہیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے مجھے روک روک پوچھا تیرا ہمسفر کہاں ہے

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

ان کی تشبیہات اپنے حسنُ اور گرد و پیش کے ماحول کی قربت کی وجہ سے نامانوس نہیں لگتیں۔ بہت سوچنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ شاید غزل کی تشبیہات میں اضافے ہیں۔ مثلاً

اُداس آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے ہیں یہ موتیوں کی طرح سیپیوں میں پلتے ہیں

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیئے نہ رکھو کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

انگریزی کے شاعر شکسپئیر سے لے کر اردو کے غالب جیسے عظیم شاعر تک سب نے شاعری میں تخیل کے انوکھے پن پر زور دیا ہے جو گنجینۂ معنی کا طلسم بن جائے اور نیا نیا سا لگے۔ بشیر بدر کے یہ شعر ان کے انوکھے تخیل کا مظہر ہیں۔

میں اسے ڈھونڈتا تھا آنکھوں میں پھول بن کر وہ شاخ پر نکلا

---

[1] کتاب لکھنؤ ۱۹۷۴ء، بشیر بدر ایک مطالعہ از شریف ارشد

وہ جو رنگ چمکتا ہے اس ٹہنی پر　　ہاتھ آئے تو پھول نہیں تو تتلی ہے
میں اپنی راہ میں دیوار بن کے بیٹھا ہوں　　اگر وہ آیا تو کس راستے سے آئے گا

بشیر بدر کے فکر و فن (اسلوب) کی بنیاد میں زندہ قدامت اور جاوداں جدت کی شعری سرزمین تلاش کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ غزل کی عظیم تہذیب کا ہاتھ ان کے سر پر ہمیشہ رہا۔

بشیر بدر نے غزل کو جدید حیثیت اور آنے والی صدیوں سے آنکھ ملانے کی قوت عطا کی ہے۔

بشیر بدر آج کے انسان کے جذباتی رشتوں کی جتنی تہوں کو غزل بنانے میں کامیاب ہیں اس کی مثال دوسرے غزل کے شاعر کے یہاں ملنا دشوار ہے۔

پہلے ہندوستان اور پاکستان کے ان دیہاتوں اور قصبوں میں جہاں زندگی کی وضع داریوں کو سست روی کہا جاتا تھا، جہاں رشتوں کے جال آج تک بڑی گہرائی سے بنتے ہیں، بشیر بدر نے ان دیہاتی اور قصباتی ماحول اور اس ماحول کی ذہنی حالتوں اور دلی رشتوں کی جذبوں سے بھرپور مرقع نگاری کی ہے۔

سنسان راستوں کی سواری نہ آئے گی　　اب دھول سے اٹی ہوئی لاری نہ آئے گی
چھپر کے چائے خانے بھی اب اونگھنے لگے　　پیدل چلو کہ کوئی سواری نہ آئے گی

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مندرجہ بالا اشعار کے حوالے سے کہا۔

بشیر بدر نے پوٹری میں نئی بستیاں آباد کی ہیں۔ یہ بات سچ ہے اور یہی ان کا Popular Image ہے لیکن امیج پورے بشیر بدر کی نمائندگی نہیں کرتا۔ . . . . . یہ وہی خوشبو ہے جو ہمارا رشتہ آریائی، ہماری دھرتی نے گنگ وجمن کی وادی سے ہندی، برج اودھی بلکہ تمام مقامی بولیوں سے جوڑتی ہے۔"[1]

بشیر بدر بعض دوسرے جدید شعراء کی طرح شہر کے مطالبات، جد وجہد، نبرد آزمائیوں اور آزمائشوں سے نہیں گھبراتے ہیں اس سلسلہ میں جب ہم ان شعروں کا مطالعہ کریں گے جن میں شہری زندگی کی منظر نگاری سے شہر کے حسن اور اس کے جبر و خود غرضی کے ساتھ انصاف

---

[1] فکر و آگہی دہلی، بشیر بدر نمبر ۱۹۸۸ء، صفحہ ۲۶۴، دوسرا ایڈیشن

کیا گیا ہے وہ دیہات کی ان معصوم رشتوں کا بھی احترام اس لئے کرتے ہیں کہ اس میں ہمارے لاشعور اور کسی حد تک تہذیبی یاد داشت کا سکون مضمر ہے۔ وہ دیہات سے شہر کا رشتہ منقطع نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ دیہات کی پر خلوص فضا اور شہر کی خود غرض فضا کی دوری پر نا مطمئن ہیں، وہ دیہاتی فضا میں بھاگ کر روپوش ہونا اور تارک الدنیا ہونے کا مشورہ بھی نہیں دیتے، ان کے اسی رویے کے متعلق قمر رئیس نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بشیر بدر کی غزل سے پہلے اردو غزل میں گاؤں داخل نہیں ہوا تھا، بشیر بدر نے اپنی غزل میں گاؤں کی سیدھی سادی حیات پرور تصویریں دکھائی ہیں یہ ان کی خاص دین ہے، وہ بعض جدید شعراء کی طرح شہروں کی صنعتی زندگی کے آشوب سے گھبرا کر گاؤں اور جنگل میں پناہ نہیں لیتے کہ یہ بھی ایک منفی رویہ ہے، گاؤں کے گرد پھیلی فطرت کے نرم آغوش میں معصوم اور جیالے انسانوں کی سادگی اور خوبصورتی کے دلکش مناظر انہیں یاد آتے ہیں اور ان کے قلب و نظر کو آسودگی بخشتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے جو انسان کو زندگی گزارنے کا حوصلہ دیتا ہے۔"[1]

جب کوئی گاؤں کی جیالی ہنسی دھوپ میں کھیت گنگنانے لگے

سرمئی اشجار کی پوشاک دھانی ہو گئی دھوپ کھیتوں میں اتر کر زعفرانی ہو گئی

گاؤں کی کوئی گوری توڑ کر اک ناطہ دور دیس جاتی ہے

ان گھنے درختوں میں دف نہیں بجتے کھیت سر جھکاتے ہیں

اس پہاڑی علاقے میں اک گاؤں کے موڑ پر آتی جاتی بسوں کتنے

دو درختوں کی مشفق گھنی چھاؤں میں گرم چائے کی مانوس خوشبو بھی ہے

ایک گاؤں میں دو بار آئیں شاید دو لھا بدل گیا ؎ میری آنکھ میں تیرا آنسو تیری آنکھ میں میرا آنسو

گھر کتنے ہی چھوٹے ہوں بڑے پیڑ ملیں گے ؎ شہروں سے الگ ہوتی ہے قصبات کی خوشبو

قصبات اور دیہاتوں کے مہذب و منظم روپ میں پرانی زمینداریاں بجا طور پر اب کہاں!

---

[1] ایضاً۔۔۔۔ ص ۱۱

لیکن رشتوں کی زمینداریاں ابھی موجود ہیں وہ نجیب الطرفین خاندان ثقہ بزرگ، مدرسوں اور اسکولوں کے ریٹائرڈ ماسٹر محلے اور علاقوں کے رشتہ دار بزرگ موجود ہیں جو نوجوانوں کی بغیر سرزنش کئے نگہداری کرتے ہیں۔ بشیر بدر کی ایک غزل جسے اردو کی منفرد غزل کہا جا سکتا ہے۔ اس غزل کا محرک وہی تقسیماتی ماحول ہے، جواب شہر گزیدہ معمر لوگوں کا خواب ہوتا جا رہا ہے:

بھٹک رہی ہیں پرانی دلائیاں اوڑھے ⁂ حویلیوں میں میرے خاندان کی خوشبو
سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی ⁂ دعاؤں جیسے بڑے پاندان کی خوشبو
دبا تھا پھول کوئی میز پوش کے نیچے ⁂ گرج رہی تھی بہت اچوان کی خوشبو
وہ عطر دان سا لہجہ میرے بزرگوں کا ⁂ رچی بسی ہوئی اُردو زبان کی خوشبو
گلوں پہ لکھتی ہوئی لا الٰہ الا اللہ ⁂ پہاڑیوں سے اترتی اذان کی خوشبو

شہروں کی برق رفتار آبادکاری، جدید صنعتیں سب جدید زندگی کی برکات ہیں ان کے خلاف مرثیہ لکھنے والے زندگی سے مقابلہ نہ کر پانے والے لوگ ہیں لیکن اس کے معنی یہ کہاں کہ ہم اس عظیم و قدیم معاشرے کو بھول جائیں جہاں شرافتوں نجابتوں کی حویلیاں تھیں اس حویلی کا مالک ایک سورج ہوتا تھا جس کے حکم کی تعمیل ہوتی تھی (میں اس نظام زندگی کو اچھا نظام نہیں مانتی) لیکن حویلی کا سورج اسے ضرور کہتی ہوں جس میں اعلیٰ مردانہ صفات ہوتی تھیں مثلاً بہادری، مہذب ترین وضع داری، شرافت و نجابت، اپنے گاؤں اور محلے کے ضرورت مند لوگوں کی مدد (اس فرسودہ نظام میں بُرے کردار زیادہ ہوتے تھے انہیں ہم راتوں کا شیطان لکھتے تھے اور لکھیں گے، لیکن اس قدیم نظام میں مثبت اور انسانی ہمدردیوں کا کردار پیکر ہوتے تھے۔ جدید معاشرے نے انہیں بھی شکست خوردہ پیکر کس طرح بنا دیا اس کی پیکر نگاری بشیر بدر نے اس شعر میں کی ہے۔

حویلی کا سورج جھکائے تھا سر ⁂ اداسی کی بیلیں تھیں دالان میں

اس حویلی کی مالکہ دادی ماں رہتی تھیں جن سے رات میں کہانیاں سنے بغیر حویلی کے چاند نہیں سوتے تھے۔ آج وہ حویلی ویران ہے، سناٹے وہاں دلائیاں اوڑھے بھٹک رہے ہیں اور کسی

اجڑے ہوئے خاندان کی خوشبو ماضی کی داستانیں سنا رہی ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے اس غزل کے متعلق لکھا ہے:

"محسوس ہوتا ہے جیسے گاؤں کی بد تر فضا میں چونے سے لپی پُتی حویلی کے سامنے تین سو برس پرانے نیم کے بوڑھے اور گھنیرے درختوں کے نیچے ہریانہ کے بیلوں کی جوڑیاں اس طرح بندھے ہیں کہ ان کے سینگوں میں کڑوا تیل چمک رہا ہے، سفید دودھ جیسی پیٹھ پر ہرے اور سرخ رنگ کے کپڑوں کی جھالر جھول رہی ہے اور گردن میں مراد آبادی گھنٹیوں کی مالائیں سر کی جنبش پر بول اٹھتی ہیں، بائیں طرف گوبر اور بھورے لپے ہوئے چبوترے"[1]

اس غزل میں قصباتی مٹی ہوئی تہذیب کے منظر کی شاعر نے عکاسی کی ہے۔ اس منظر کی سفاکی پر نہ قصیدہ لکھا ہے نہ ہجو کی ہے۔ میرا خیال ہے یادوں پر ہر وقت معاشی اور سماجی تبصرہ ہی ادب کو تعصب بنا دیتا ہے۔

گلوں پہ لکھتی ہوئی لا الہٰ الا اللہ ؛ پہاڑیوں سے اُترتی اذان کی خوشبو
وہ درودں کے سلاموں کے نگر یاد آئے ؛ نعتیں پڑھتے ہوئے قصبات کے گھر یاد آئے

اس سلسلہ میں ایک غیر رومانی شعر کی حقیقت بھی قابل دید ہے۔

شام کے بعد کچہری کا گھنا سناٹا ؛ بے گناہی کو عدالت کے ہنر یاد آئے

قصبوں کی بھولی بھالی زندگی ان کے شعور میں پنہاں ہے اور بڑے شہروں کی ریاکاری اور مصنوعی زندگی سے بیزاری بھی ان کے یہاں نمایاں ہے۔ شہر مجرموں اور مجرموں کے خریدے ہوئے قانون کا شہر بنتا جا رہا ہے۔ آج شہر میں راہ زنی، قتل، لوٹ مار اور کوئی حادثہ ہو جائے تو شہر کا تجربہ کار آدمی منہ پھیر کر چل دیتا ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ انسان خود غرض ہونے پر مجبور ہوتا جا رہا ہے۔ اس المیہ پر غزل کا ایسا شعر پہلے شاید ہی کہا گیا ہو۔

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو ؛ رُک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

شہر میں مصنوعی انا میں گرفتاری نظر آتی ہے۔

---

[1] خوشبو سی ایک غزل۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، سہ ماہی فکر و آگہی بشیر بدر نمبر ص ۲۰۵

بات کیا ہے کہ مشہور لوگوں کے گھر ؛ موت کا سوگ ہوتا ہے تیوہار سا

بشیر بدر کے اس موضوع پر چند اشعار اور پیش کئے جا رہے ہیں جن میں شہروں کے تمام زاویوں سے مرقع نگاری کی گئی ہے شہر کے جگمگاتے ہیرے بھی ہیں قصبوں کی وضعداری اور رشتوں کی یادیں بھی ہیں دنیا کو خوبصورت بنانے کا خواب بھی ہے۔

روز تار کٹنے سے رات کے سمندر میں شہر ڈوب جاتا ہے

اس لئے ضروری ہے اک دیا جلا کر تم دل کے طاق پر رکھ دو

رات بھیگی تو تھکے شہر یاد آنے لگے ؛ نیند کے گاؤں جو آباد ہیں پلکوں کے تلے

دنیا کے بدصورت حصے ڈھک جاتے ؛ اپنے پاس کوئی ایسی چادر ہوتی

قدیم قصبوں میں کیسا سکون ہوتا ہے ؛ تھکے تھکائے ہمارے بزرگ سوتے ہیں

ان چند شعروں میں شہری بڑھتی ہوئی آبادی عام انسانوں کی چوہے بلیوں کی طرح رہنے کی بے بسی و مجبوری اور ان سے پیدا ہونے والی اداسی کے کیا کیا رخ پیش کئے گئے ہیں۔

بلڈنگیں لوگ نہیں ہیں جو کہیں بھاگ سکیں ؛ روز انسانوں کا سیلاب بڑھا آتا ہے

غبارہ پھٹ رہا ہے ہواؤں کے زور سے ؛ دنیا کو اپنی موت کا اب انتظار ہے

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمین ؛ پاؤں پھیلائے تو دیوار میں سر لگتا ہے

شہروں کی دوڑتی بھاگتی زندگی ؛ کاریں اسکوٹر رکشائیں آٹو رکشائیں

سامان سے بھرے ہوئے ٹرک وہ ٹھیلے جنہیں ہاتھ کھینچ رہے ہیں ان کے درمیان عام آدمی کے احساسات کیا ہیں:۔

تھکے تھکے پیدل کے بیچ چلے سورج ؛ گھر کی طرف لوٹی دفتر کی شام

سفاک آنکھیں تیز ٹرک کی مجھے لگا ؛ اک موت کا فرشتہ تھا ہنس کر گذر گیا

تحریر و گفتگو میں کسے ڈھونڈتے ہیں لوگ ؛ تصویر میں بھی شکل ہماری نہ آئے گی

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں ؛ مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے

بزم و بازار میں ہر جا ٹھہرا ؛ دل اکیلا تھا اکیلا ٹھہرا

ان اشعار میں آج کا فرد کتنا تنہا اور اداس لگتا ہے، بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں اور شہری زندگی

کے ہنگاموں کی وجہ سے فرد کی زندگی میں تشنگی کا احساس، شدت انتشار، خوف و حزن کا احساس بڑھ رہا ہے۔

دماغ بھی کوئی مصروف چھاپہ خانہ ہے ؛ وہ شور جیسے کہ اخبار چھپتا رہتا ہے

شہر میں انسان صبح سے شام تک جس طرح زندگی کا پرزہ بن کر جی رہا ہے اس کے پاس کچھ خوبصورت خواب ہیں یہ وہ خواب ہیں جن تک اس کی رسائی نہیں ہو سکی لیکن وہ انہیں اپنے بچوں کے مستقبل سے سرکنا دیکھتا ہے تو اداس ہو جاتا ہے۔

سرخ نیلے چاند تارے دوڑتے ہیں برف پر ؛ کل ہماری طرح یہ بھی دھند میں کھو جائیں گے

مجبوریوں اور خوابوں کی یہ کہانیاں گھر گھر کی کہانیاں ہیں۔ جو مصروف ہیں وہ مشین کی طرح بے تعلق ہونے پر مجبور ہیں، جو بیکار ہیں وہ مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ مستقبل اور حال کی چھوٹی اور خوبصورت کہانیوں سے خود کو اور گھر والوں کو بہلاتے ہیں۔ ان کیفیات سے ملتی جلتی انسانی جذبوں کی یہ تصویریں ہیں۔

شام کے بعد بچوں سے کیسے ملوں اب میرے پاس کوئی کہانی نہیں

کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

خوبصورت اداس خوف زدہ وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موج صبا

آج، دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

بشیر بدر کی غزلوں کے اشعار میں اگر گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ دور تک اتر کر دیکھا جائے تو ایسے "شیریں کرب" کا احساس ہوتا ہے، جس میں عورت، مرد کے درمیان کی نفسیاتی کشمکش اور محبت فطرت کے سادہ و معصوم مظاہر، ماضی کی اساطیری فضا، حال کی کھردری اور مشینی زندگی اور لفظ و معنی کے بڑے علامتی اور تمثیلی کینوس کا کسی انوکھے خیال کی جانب مرکزیت حاصل کرنے کا فن نمایاں ہے۔

اس شعر میں شاعر نے سب سے پہلے ہمیں "سمندر" اور "صبا" کے ذریعہ فطرت اور اساطیر کے بیکراں پھیلاؤ کا احساس دلاتے ہوئے ماضی کی معصوم اور ہمہ گیر صداقتوں کو سمجھانا چاہا ہے

جس کے ساتھ "کنارے" "پیاسے" اور "موج" کے استعارے "ہم" یعنی عورت، مرد کے جذباتی، جسمانی، روحانی اور اٹوٹ جنسی رشتوں کو واضح کرتے ہیں۔ یہ رشتے دوری اور قربت کی دھوپ چھاؤں سے لپٹے ہوئے ہیں۔ لامحدود فاصلوں کے کنارے سمندر سے مواصلت رکھنے کے باوجود "پیاسے" رہتے ہیں، لیکن ان کے درمیان "صبا" کا عمل جاری ہے جو اپنے تحرک سے جسموں کی بے پناہ جدائی کو ان کے دلی پیغام سے ہم آمیز کردیتی ہے۔

لیکن آج کے مشینی دور میں سمندر جیسے بیکراں "کناروں" کی قربت اور ہم آغوشی بھی ریل کی بے جان دو لوہے کی پٹریوں کی مانند ہو گئی ہے جو انتہائی قریب چلنے کے باوصف لوہے کی میخوں سے اس طرح جکڑ دی گئی ہیں کہ ان کے درمیان کوئی بھی "وصل" ممکن نہیں۔ موجودہ میکانکی عہد دو محبت کرنے والے مرد اور عورت کے وجود کو قربت بخشنے کے بعد بھی روحانی اور جسمانی سطح پر ہم آغوش نہیں ہونے دیتے۔ وہ بے روح اور بے زبان ہو کر "آہنی زندگی" گذارنے پر مجبور ہیں۔ شاعر نے "ریل کی پٹری" "ساتھ چلنا" اور "نہ بولنا" وغیرہ اشاروں میں یہی علامتی مفہوم پیش کیا ہے، جو آج کی مادی اور مشینی زندگی کا استعارہ ہے اس میں فطرت سے دوری کا احساس بھی شامل ہے۔

بشیر بدر کے اشعار میں عصری حسیت کی جستجو اور بازیافت ہے، مشینی نقل و حرکت رستوں کی بے حسی دکھاوے کی زندگی داخلی بے چہرگی شہروں کی ریاکاری اور انسانوں میں انسانیت کی تلاش شہروں کے نئے مزاج کی عکاسی میں طنز کے نشتر بھی ہیں:

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو
یہ نئے مزاج کا شہر ہے یہاں فاصلے سے ملا کرو

سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

سمندر سوکھ جائیں گے اور ایک فاختہ مچھلی
ہمارے ساحلوں اور جنگلوں کی حکمراں ہوگی

اب روئے کہاں ساون لب　　　　　آنگن نہ بغیچہ ہے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے

بشیر بدر ہندوستان کے دیہاتوں قصبوں اور شہروں کی مرقع نگاری کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کا تخیل اور ان کا مشاہدہ عالمی مغربی منظر ناموں سے بھی مدد لیتا ہے مثلاً

اونچے گرجا گھروں میں گھرے نوجوان راہبوں کے دلوں میں دبی خواہشیں
جیسے بیروت کی ساحلی ریت پر دھوپ کھاتی ہوئی لڑکیوں کے بدن

یا

خواہشیں جیسے افریقہ کی بیٹیاں　　　جنگ آزادی میں سر سے باندھے کفن

اواخر اکتوبر میں ٹورنٹو امریکہ شکاگو نیویارک میں خزاں بڑی پر وقار ہوتی ہے۔ سبز پتے جھڑنے سے قبل لال پیلے اودے زعفرانی رنگ کے ہو جاتے ہیں، برف گرتی ہے اور سب کچھ برف کا منظر ہو جاتا ہے۔ بشیر بدر نے اس خزاں کی آمد کو غزل کا روپ اس طرح دیا۔

میں سنہرے پتوں کا پیڑ ہوں میں خزاں کا حسن و قرار ہوں
مرے بال چاندی کے ہو گئے مرے سر پہ دھوپ ٹھہر گئی

برف کی پاکیزگی کی عکاسی انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے

برف سی اجلی پوشاک پہنے ہوئے پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہوں
وادیاں پاک مریم کی آنچل ہوئیں آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

آزادی کے بعد ہندوستان پر سب سے بڑی لعنت فسادات ہیں جو مذہب کی بنیاد پر مذہب دشمن لوگ کرتے ہیں ان بدترین جرائم کی یہاں کوئی سزا نہیں شاید اسی لئے فسادات پیشہ، شوق اور جابروں کا دلچسپ مشغلہ بن گئے اسی بے رحمی کی منظر کشی انہوں نے اس طرح کی ہے۔

یہاں ایک بچّے کے خون سے جو لکھا ہوا ہے اسے پڑھیں
ابھی کیرتن تیرا پاپ ہے ابھی میرا سجدہ حرام ہے

ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی پرسکون جمہوریت کہا جاتا ہے، سیاست کے بازی گر ۹۹ فیصد دنیا کے بدترین جرائم پیشہ جابر زمینداروں سے زیادہ ظالم ہیں۔ ریڈیو۔ ٹی وی۔ اخبارات صحافی مصنف، شاعر، ادیب کسی نہ کسی طرح بک جانے پر مجبور ہیں۔ یہاں اپنی تباہی پر مسکرانے کا

حکم ہے یہ گھٹن بھی شعری پیکروں میں ابل پڑی ہے۔

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں ۔۔۔ کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا
بڑے شوق سے میرے گھر جلا کوئی آنچ تجھ پہ نہ آئے گی ۔۔۔ یہ زباں کسی نے خرید لی یہ قلم کسی کا غلام ہے
ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے ۔۔۔ اپنے ہی دل سے اٹھے اپنے ہی دل پر برسے

اور کبھی کبھی اس گھٹن سے نکل کر سیاست سے نبرد آمائی کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔

مجھ سے کیا بات لکھانی ہے کہ اب میرے لئے ۔۔۔ کبھی سونے کبھی چاندی کے قلم آتے ہیں

فسادات کی لعنت سے ہندوستان جس طرح دوچار ہے اس کا اظہار یہ چند شعر ہیں:

قدم قدم پہ لہو کے نشان کیسے ہیں ۔۔۔ یہ سرزمین تو مرے آنسوؤں نے دھوئی ہے
جس کاغذ پر میں لکھوں گا وہ کاغذ جل جائے گا ۔۔۔ تتلی پر تیزاب چھڑکنا پھولوں پر خنجر رکھنا
جلی ہوئی ٹوٹی دیواریں میرے زخمی کاندھے ہیں ۔۔۔ چاندنی رات میں چھپ کر آنا ان پر اپنا سر رکھنا
خود اس کے باپ نے پہچان کر نہ پہچانا ۔۔۔ وہ ایک لڑکی فسادات میں جو کھوئی تھی
عظیم دشمنو چاقو چلاؤ موقع ہے ۔۔۔ ہمارے ہاتھ ہماری کمر کے پیچھے ہیں

جدید شعراء پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے حصار میں دنیا کی طبقاتی کشمکش پر نظر نہیں ڈالتے۔ بشیر بدر کے یہاں طبقاتی کشمکش غریبوں کا استحصال سرمایہ داروں کی عیاریوں کے غزلیہ اشارے ملیں گے۔

میں تمام تارے اٹھا اٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دیں میرے ہاتھ میں

بڑے تاجروں کی ستائی ہوئی ۔۔۔ یہ دنیا دلہن ہے جلائی ہوئی

بشیر بدر کے یہاں اشتراکی واقعیت بھی نظر آتی ہے۔ مارکسی عناصر کو انھوں نے اس سلیقے سے شعری پیکر عطا کیا ہے کہ شعر کی نغمگی آہنگ واسلوب مجروح نہیں ہو پاتے۔

سویرے ان آنکھوں نے دیکھا ۔۔۔ خدا چاروں طرف بکھرا پڑا ہے

اس دن بچائے اوس کے ٹپکے گا سرخ خون
تلوار لے کے جب میں خلاؤں میں جاؤں گا

بدن کے پیڑ کو خود اس کی شاخ کاٹے گی
یہی تراشش زمین کو نیا شجر دے گی

بشیر بدر کو عام طور پر خوابوں، یادوں، آرزوؤں کا خوبصورت رومانی شاعر سمجھنا غلط ہے۔ وہ بعض وقت بڑی سفاکی سے عقلیت کو تغزل سے ہمکنار کرتے ہیں مثلاً ان کے یہاں شہر کے ایسے اشخاص کا کردار ابھرتا ہے جو عیاری چالاکی کا مقابلہ باآسانی کرتا ہے۔

میری نگاہ مخاطب سے بات کرتے ہوئے — تمام جسم کے کپڑے اتار لیتی ہے
عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے — میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے
محبت عداوت وفا بے رُخی — کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے
اسے کسی کی محبت کا اعتبار نہیں — اسے زمانے نے شاید بہت ستایا ہے

آنکھیں کھول کے باہیں ڈالو یوں کھو جانا ٹھیک نہیں
ناگ بھی لپٹے رہتے ہیں پیپل کی نرم جٹاؤں میں

بشیر بدر جذبے کو امیجری کے اسلوب میں ادا کرنے میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں لیکن کبھی کبھی بیانیہ اسلوب سے بھی کام لیتے ہیں۔

کوئی فیصلہ اتنی جلدی نہ کر — ذرا دیر کی جان پہچان میں

اور یہ شعر جذبہ عقل کی کشمکش کا خوبصورت ترین اظہار ہے۔

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیئے نہ رکھو — کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

بشیر بدر کی ایک خوبی ان کا حوصلہ اور امید ہے انھوں نے جدید غزل میں فعالیت اور جولانی کی فضا پیدا کی، ان کے یہاں درد ہے مایوسی نہیں، گداز ہے ناکامی نہیں، ناسازگاری ہے بے بسی نہیں جدید غزل پر جس غیر فطری مایوسی رشتوں کی شکست و ریخت اور بے تکلفی کو بار بار دہرایا گیا اس سے بڑی حد تک بشیر بدر کی غزل پاک ہے۔ وہ زندگی سے بیزار کبھی نہیں ہوئے زندگی اپنی تمام بے رحمیوں کے ساتھ ان کے نزدیک حسین شے ہے۔

زندگی اور میں دو الگ تو نہیں — میں نے سب پھول کانٹے اسی سے لئے

زندگی کے تلخ حقائق بھی ان کی غزل میں نظر آتے ہیں:

زندگی اک فقیر کی چادر جب ڈھکے پاؤں ہم نے، سر نکلا

سبز پتّے دھوپ کی یہ آگ جب پی جائیں گے
اجلے فر کے کوٹ پہنے ہلکے جاڑے آئیں گے

ان کے یہاں حیات و کائنات کے تمام مظاہر انسانی احساسات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان اور اس کے احساسات اور جذبات مناظر فطرت میں جاری و ساری ہیں۔ پیڑ، دریا، پہاڑ، جھیل، کھیت، وادی، برف، مکان، کھڑکیاں، پردے، شیشے، گھاس، کمرے، دروازے، دریچے سب انسان کے جسم اور جان کی طرح دھڑکتے ہوئے لگتے ہیں۔ دل اور روح کی اداسیوں کو مظاہر کائنات میں سمو کر اس طرح پیش کیا ہے کہ دریا، پہاڑ، سورج، چاند، ستارے، صبح، شام، دھوپ، سائے، گھر، مکان، پیڑ، پھول، سڑک اور کھیت میں انسان کی روح تحلیل ملتی ہے۔ دھوپ میں جلتے ہوئے پیڑوں میں شاعر کو اپنا وجود سلگتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

میں نے دریا سے سیکھی ہے پانی کی پردہ داری
اوپر اوپر ہنستے رہنا گہرائی میں رو لینا

میرے بچپن کے مندر کی وہ مورتی دھوپ کے آسماں پہ کھڑی تھی مگر
اک دن جب میرا قد مکمل ہوا اس کا سارا بدن برف میں دھنس گیا

کہہ دینا سمندر سے ہم اوس کے موتی ہیں
دریا کی طرح تجھ سے ملنے نہیں آئیں گے

کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دھوپ ہوں کبھی دھول ہوں
میں تمام کپڑے بدل چکا تیرے موسموں کی برات میں

شام تک کتنے ہاتھوں سے گزروں گا میں چائے خانے میں اردو کے اخبار سا

کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا

بشیر بدر کے کلام میں زندگی سے نبرد آزمائی خندہ پیشانی کے ساتھ کی گئی ہے، وہ منزل کو جانتے اور اس تک پہنچنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، وقتی مسائل و مصائب سے گھبراتے نہیں بلکہ مصائب و مسائل میں جد وجہد کرتا انسان انہیں خوبصورت و پُر وقار نظر آتا ہے۔

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے　　آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

جب کبھی بادلوں میں گھرتا ہے　　چاند لگتا ہے آدمی کی طرح

مجھے حادثوں نے سجا سجا کے بہت حسین بنا دیا

میرا دل بھی جیسے دلہن کا ہاتھ ہو مہندیوں سے رچا ہوا

پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے　　خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

بشیر بدر کی جد وجہد عزم و حوصلہ میں جمالیاتی مسرت کا احساس بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

میں دن ہوں میری جبیں پہ دکھوں کا سورج ہے　　دیے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

خوشبو کو تتلیوں کے پروں میں چھپاؤں گا　　پھر نیلے نیلے بادلوں میں لوٹ جاؤں گا

تمام نامساعد حالات میں بشیر بدر کی جد وجہد کے دو سہارے ہیں پہلا سہارا زندگی سے ان کا وہ مثبت تربیت یافتہ منصف اور مہذب رویہ ہے ان کی خاندانی تربیت کا ثمرہ اور ان کی خود احتسابی کو ان کی عقلی اور خود احتسابی شرافت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے　　جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

ابھی اپنے اشارے پہ ہمیں چلنا نہیں آتا　　سڑک کی لال پیلی بتیوں کو کون دیکھے گا

دوسرا رویہ جو ان کے ساتھ رہتا ہے وہ ماضی کی غیر عشقیہ خوبصورت یادیں ہیں جن کا رومان جو ان کی سرمستیوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ بشیر بدر ماضی کی اور بالخصوص بچپن اور ابتدائی زندگی کی یادوں کو جس خوبصورت اسلوب میں پیش کرتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔

سناٹے آئے درجوں میں جھانکا چلے گئے　　گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

جس میں اپنی پرندوں سے تشبیہ تھی　　تم کو اسکول کی وہ دعا یاد ہے

بشیر بدر کی عشقیہ شاعری میں عاشق و معشوق اور رقیب کا مثلث نہیں بلکہ رقیب تحلیل ہو کر

انہیں عاشق و معشوق میں شامل ہوگیا۔ بشیر بدر کا ۱۹۵۵ء کا ایک شعر ہے:

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی ؛ یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

اس میں "مجبوریاں رہی ہوں گی" کہہ کر غزل کی شاعری کے محبوب کی روایت کو بدل دیا گیا ہے۔

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے ؛ انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

اس شعر کی اہمیت وانفرادیت کو پہلی بار خلیل الرحمٰن اعظمی نے اُجاگر کیا ہے جس کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا خیال ہے:

"تہذیبوں کے ساتھ حقیقتیں بدلتی رہتی ہیں۔ رشتے بدلتے رہتے ہیں اور اس عمل کے بعد جو رویّہ پیدا ہوتا ہے وہ جدید ہوتا ہے۔ میں مثال کے ذریعے اپنی بات واضح کروں گا مثلاً آپ نے ابھی عشق و محبت کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کی مثال لی جا سکتی ہے کہ عشق و محبت کے سلسلہ میں پرانے رویّہ میں رقیب کا تصور تھا، دربان کا خطرہ تھا محبوب کے نہ ملنے کا تصور تھا وغیرہ، مگر اب سماج میں تبدیلی آ گئی ہے۔ اب پابندیاں نہیں ہیں رقیب اور دربان کا تصور ختم ہوگیا۔ اس لحاظ سے آج کے دور کے اعتبار سے نئی حقیقتوں کے پیش نظر جو رویّہ ہوگا وہ جدید ہے مثلاً بشیر بدر کا شعر ہے ؎

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے ؛ انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

یہ بالکل نیا رویّہ ہے۔ پرانا عاشق یہ کبھی نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایک نئے دور کا عاشق ہی کہہ سکتا ہے جسے اپنی محبت سے غرض نہیں پرانے عاشق کو صرف محبت سے غرض ہوتی تھی اور اس کی محبت کے درمیان آنے والے آدمیوں کو اپنا دشمن سمجھتا تھا اور شوہر و بیوی کے رشتے ٹوٹنے کی یا کسی کے مرنے کی دعا کرتا ہے لیکن نئے عاشق کے لئے یہ ناانصافی ہے۔ کہ اس طرح سماجی انتشار پھیل جائے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ اگلے جنم تک انتظار کیا جائے یہ ایک نیا رویّہ ہے [1]

عشق میں جس سماجی ذمہ داری کا ذکر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم نے کیا ہے اس کی ایک کیفیت اس شعر میں بھی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے ایک انٹرویو کا اقتباس بحوالہ علی گڑھ میگزین علی گڑھ

میرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی ؎ میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

اس شعر میں بھی محبت کا مثلث ہے لیکن قدیم غزل کی طرح عاشق معشوق اور رقیب نہیں بلکہ تینوں کردار زندگی کے کردار ہیں، ان میں کوئی رقیب نہیں یہ شعر اردو میں ایک نئے رویہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس برگ گل پہ لفظوں کے پھول تھرتھرائے ؎ شبنم ہوا کے رخ پر یا بولتا چمن ہے

اس شعر میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی یونیورسٹی یا کالج میں کوئی غزل کیٹس، کولرج بائرن، میر، میرا، مجاز، یا بشیر بدر کو پڑھا رہی ہے۔ عورت اور مرد زندگی کے مسائل کی اکائی زن و شوہر ہیں دنیا میں ہمیشہ کی طرح بلکہ ماضی سے زیادہ ازدواجی زندگی میں ناچاقیاں عام ہو رہی ہیں، کہیں مزاجوں کا تفاوت ہے۔ کوئی پیشہ کا غلام ہے، کہیں مرد لالچی ہے عورت کو حصول زر کا وسیلہ سمجھتا ہے کبھی عورت مرد کو مادی زندگی میں امتیازی شان سے دیکھنا چاہتی ہے۔ بشیر بدر کے یہاں ایسے لالچی دنیا دار مرد و عورت کی کردار نگاری نہیں۔ وہ عورتوں پر ایسے مظالم سے جو امیجری بناتے ہیں ان کا شریک زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔

بڑے تاجروں کی ستائی ہوئی ؎ یہ دنیا دلہن ہے جلائی ہوئی

ان کے یہاں عورت مرد شریک زندگی ایک ہو کر زندگی کا دکھ سکھ اٹھاتے ہیں۔ عورت کی اداسی مرد کی ناکامی ہے۔ ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت کی محبت و ریاضت ہے۔

کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا ؎ میرے پاؤں شعلوں پہ جلتے رہے

انسان محبت کا بھوکا ہے اور غزل میں انسانی عشق و محبت کی داستان کی جاتی رہی ہے غزل میں عشقیہ شاعری کو زندگی کے دوسرے مسائل سے کم اہمیت حاصل نہیں کیونکہ زندگی کی ساری دوڑ دھوپ، محنت، دولت، عزت کے پیچھے جو جذبہ کام کرتا ہے ان میں روح و دل کی آسودگی کے ساتھ محبت کی چاشنی بھی ہے۔

بشیر بدر نے انسان کی چاہے جانے کی فطرت کی بڑے خوبصورت پیرائے میں ترجمانی کی ہے

میں گھر سے جب چلا تو کواڑوں کی اوٹ سے ؎ نرگس کے پھول چاند کی باہوں میں چھپ گئے

بشیر بدر کے کلام میں عشقیہ جذبات و احساسات اور واردات کی ترجمانی نئے ماحول

نئے انداز اور تصورات کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ ان کے اکثر اشعار پوری زندگی اور وقت کے سیاق و سباق میں معنویت کا خوبصورت اظہار ہیں۔

وہ چہرہ کتابی رہا سامنے
بڑی خوبصورت پڑھائی ہوئی

آنکھ موندے اس گلابی دھوپ میں
دیر تک بیٹھے اسے سوچا کریں

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو میرا محبوب سمجھتے ہوں گے

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایہ ہے
بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

سوئے کہاں تھے آنکھوں نے تکیے بھگوئے تھے
ہم بھی کبھی کسی کے لئے خوب روئے تھے

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

خوش رہے یا بہت اداس رہے
زندگی تیرے آس پاس رہے

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

بشیر بدر نے محبت کی ٹریجڈی کے طلسم کو توڑ کر حسن کو خود آگہی کی کیفیت سے دوچار کیا، لیکن عام طور پر ان کے یہاں وہی عورت اور مرد غزل کے مرکزی کردار نظر آتے ہیں جن کے وجود تحلیل ہو کر اکائی بن گئے ہیں۔ وہ عورت کی ہر خوبی کو اس کے مرد کا حسن مرد کی ہر کامیابی کو عورت کی کامیابی سمجھتے ہیں۔ ان کے شعر ازدواجی زندگی کے عکاس ہیں۔

کبھی دن کی دھوپ میں جھوم کے کبھی شب کے پھول کو چوم کے
یونہی ساتھ ساتھ رہیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

مرے راستے میں اجالا رہا
دیئے اس کی آنکھوں میں جلتے رہے

کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا
میرے پاؤں شعلوں پہ جلتے رہے

یہ خزاں کی زرد سی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

بشیر بدر کے عشقیہ اشعار اپنے اسلوب امیجری تشبیہات، استعارات سے ایسے نئے منظر ناموں میں ہجر و وصال کی کیفیات بیان کرتے ہیں جو تمام روایات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی انوکھی آواز ہیں۔

نثری غزل

بشیر بدر نے نثری غزل بھی لکھی اور نظمیں بھی کہیں۔ رسائل میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آنے والی نظموں کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

۱.	ماضی و حال (نظم)	شاعر ستمبر سنہ ۱۹۵۱ء صفحہ نمبر ۳۳
۲.	جگر کا مرثیہ	چمن زار کانپور ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء جلد ۱ شمارہ ۱
۳.	سپردِ شام فنا آفتاب شعر ہوا	نیا دور کراچی ۲۴، ۲۳، ۲۲ صفحہ ۱۲۴
۴.	غالب سے شکایت	نئی قدریں حیدرآباد (پاک)، جلد ۳ شمارہ ۶ صفحہ ۹۸
		سہیل گیا فروری سنہ ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۱
۵.	جزیرے	نئی قدریں حیدرآباد (پاک) جلد ۲ شمارہ ۱ صفحہ ۱۲۱

بشیر بدر نے غزل میں جو تجربے کیے اس کا نمونہ ان کی نثری غزل ہے۔ ہفتہ وار "مورچہ" گیا سنہ ۱۹۷۲ء شمارہ ۲۷ جلد ۱ میں ان کی ایک تحریر کے ساتھ چار نثری غزلیں۔ ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے نثری نظم اور آزاد غزل نمبر ۱۹۸۳ء میں بھی شائع ہوئیں۔ بشیر بدر کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بیس نثری غزلوں کے ایک سیٹ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جو تادمِ تحریر منظرِ عام پر نہیں آیا۔

اپنی نثری غزل کے بارے میں انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا:

"جہاں تک نثری غزل کا تعلق ہے اس کا موجد میں ہی ہوں . . . . . لیکن میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نثری غزل اصل میں غزل ہو ہی نہیں سکتی۔" اس کوشش میں میں نے جذبے کی صداقت تخیل کی ندرت اور شاعرانہ برجستگی جیسے عناصر جمع کئے اور سوچا کہ

شاید ان سب کو بحر نقصان پہنچا رہی ہو لہٰذا میں نے انہیں نثری غزل میں سمویا۔
بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ دریا کا حسن پھیلنے میں نہیں پاٹ بنا کر چلنے میں ہے، غزل کا داخلی حسن اس کے اپنے فارم میں ہی ہے، غزل کو نثری غزل بنا کر میں نے غزل کے ساتھ جو زیادتی کی تھی وہ میری غلطی تھی[1]

بشیر بدر نے نثری غزلوں میں جارحانہ اور بے باکانہ انداز اپنایا تھا۔ بہت کم عرصے میں ان کی شعری Poitics پوئٹکس نے انہیں اس بے باکی سے روک دیا اور انہوں نے نظم اور نثری غزل کے میدان کو یکسر خیر آباد کہہ کر صرف غزل میں طبع آزمائی کا سلسلہ جاری رکھا، یہاں تک نثری غزلوں اور نظموں کو اپنے کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں کیا۔

ابتدا سے لے کر فیضؔ و فراقؔ تک غزل انفرادی لب و لہجہ رکھتی ہے۔ روایتی کلاسیکل استعارات تشبیہات سے ہر شاعر اپنی شخصیت اور اپنے عہد کے اظہار کے لئے کوشاں رہا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو غزل کے میدان میں تنوع بھی نظر آتا ہے اور توانائی کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ غزل میں داخلی و خارجی سطح پر مستحکم تجربے اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ بشیر بدر کی تخلیقی کاوشوں نے بھی نئی غزل کے تناظرات کو بدلنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ لیکن ابھی تک اردو غزل کے اہم شاعر کی غزل گوئی کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ سنجیدہ مصنف اور اہل نظر نقادوں کو اس کا زیادہ نوٹس نہیں لینا چاہیے کہ بشیر بدر کو ہندوستان، پاکستان اور کسی حد تک مغربی دنیا کے غزل پسند عوام نے ہیرو کا درجہ دے رکھا ہے۔ ان کے سفر و حضر میں شریک افراد اور ان کے صحبت نشینوں کے بقول ان کی مقبولیت اور محبوبیت کسی اسٹار سے کم نہیں۔ پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر عقیل رضوی کا خیال درست ہے کہ "ان کی وقتی شہرت سے سنجیدہ ادبی نقاد کو نہ مرعوب ہونا چاہیے اور نہ احساس کمتری کا شکار"۔ بشیر بدر کی ہیرو شناسی مقبولیت سے پیدا ہونے والی زبردست خود اعتمادی بلکہ وقتی خود سری کو نظر انداز کیے بغیر ان کا ادبی تعین نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] سہ ماہی انتخاب ٹونک راجستھان اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء ص۲۲

اکیسویں صدی آتے آتے بشیر بدؔر کے فکر وفن میں اور وسعتیں پیدا ہوئیں ان کے نظریہ فکر وفن کو وقت نے اعتبار دیا ان کی شاعری اور نظریہ شاعری میں مزید وسعتیں نہ صرف پورے اعتماد سے ابھریں بلکہ ان کا نظریہ شاعر ایک واضح حقیقت بن کر سامنے آنے لگا ہے۔

بشیر بدؔر کی تخلیق جہتوں کی معنویت کو تیز رفتار تبدیلیوں نے استحکام دیا۔ مثلاً ہندی غزل نے عصری جہتوں کو شدت سے اپنایا اور بشیر بدر ہندی غزل کا مرکز فکر ونظر بن کر ابھرنے لگے۔ ہندی تنقید نے انھیں عصری ہندی غزل کا امام قرار دیا۔

غزل کی عربی و فارسی زدہ کلیدی زبان محدود ہونے لگی۔ غزل کے مرکزی استعارے صرف نصابی غزل گو شعراء کے یہاں مخصوص رہ گئے۔ بشیر بدر کی بے پناہ مقبولیت فیصلہ کن نظر آنے لگی۔ انھوں نے بار بار واضح ترلفظوں میں کہا کہ "میرا، کبیر سے لے کر میر و غالب آتش و ناسخ کے وہ سارے غزلیہ معجزے لافانی مقبروں کا تاج محل کہلائیں گے' جو سو فیصدی قدیم فارسی لفظیات کا صدیوں سے دہرایا جانے والا نغمہ تھے۔ بشیر بدر نے 2035 کے پڑھنے والوں کے نام جو خط آمد کے دیباچے میں 1985 میں لکھا تھا وہ شاعرانہ خواب نہ رہ کر نمو پزیر حقیقت نظر آنے لگا۔

انتساب کا بشیر بدر نمبر جو اگست 2001 میں شائع ہوا ہے اور کتابی صورت میں نئے موسموں کا پتہ کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے اس میں اردو کے ہر مکتبہ فکر کے قلم کاروں نے ان کے فکر وفن کا تجزیہ کیا ہے۔ اس خاص نمبر میں پروفیسر آل احمد سرور، اسلوب احمد انصاری، اظہر جاوید، حامدی کاشمیری، محمد حسن، حیات اللہ انصاری، خالد حسین، شارب ردولوی، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، قتیل شفائی، مُغنی تبسم، وارث کرمانی، ظہیر احمد صدیقی، وزیر آغا، انور جلال پوری، ابوالقیس سحر، ارشد عبدالحمید، بسنت پرتاپ سنگھ، پرکاش فکری، چندر شرما، کرشن ادیب، عنوانِ چشتی، لطیف احمد سبحانی، مصور سبزواری نوبہار صابر، وغیرہ یعنی پچاس سے زیادہ ہندوستان اور پاکستان کے لکھنے والوں نے ان کے فکر وفن کا جائزہ لیا ہے۔

بشیر بدؔر کی کامیابی کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ہندی کے سب سے معتبر ادارے وانی پرکاش دہلی نے بشیر بدؔر کے فکر وفن پر 300 صفحات کا تجزیاتی مطالعہ ستمبر 2000 میں نے شائع کیا ہے۔ ہندی کے اس تنقیدی مطالعہ میں نئے مضامین ہندی کے مفکروں عالموں اور نقادوں نے لکھے ہیں۔

پردیپ ساحل کے ایڈٹ کئے اس انتخاب میں ہندی کے عالمگیر شہرت کے مالک

ڈاکٹر نامور سنگھ کے اس قول کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

''آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اور مقبول غزل کے شاعر بشیر بدر ہی ہیں۔''

کلچر یکساں کے مرتب ڈاکٹر بسنت پرتاپ سنگھ آئی.اے.ایس، وجے واتے، راجیند رشکل انچل، فیروز کمال، جانکی پرشاد شرما چندر ترکھا، مادھو شکل منوج، گیان پرکاش وویک سے لے کر جدید تر ہندی نقادوں نے غزل کی عالمی قسمت کا پہلا باب بشیر بدر کے نام منسوب کیا ہے۔

انتساب کے بشیر بدر نمبر اور نئے موسموں کا پتہ کی اشاعت کے بعد بھی اردو کے تنقید نگاروں نے ان کے فکروفن کا تجرباتی مطالعہ بدستور جاری رکھا ہے۔ خود میرے پاس غیر مطبوعہ ایسے مضامین آئے ہیں اور کچھ ذرا دیر سے انتساب کے مدیروں کو ملے تھے۔

ان طویل مضامین سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

''بشیر بدر کی غزلیہ شاعری'' عنوان کے تحت شمیم انجم وارثی لکھتے ہیں :۔

''بشیر بدر کو نہ صرف فنِ غزل پر فنکارانہ دسترس ہے بلکہ نادر امیجری کو جس طرح انھوں نے برتا ہے وہ بہتوں میں مفقود ہے، پھول، خوشبو، تتلی، جگنو، چاند، آنسو، ریت، چراغ وغیرہ ان کی شاعری کے مخصوص الفاظ ہیں اور ان کی فکر تراش میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ان کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے کبھی زندگی جیتی جاگتی کروٹیں بدلتی نظر آتی ہے تو کبھی ماضی کے کھنڈر میں یادوں کے چراغ جھلملاتے ہیں، کبھی عصری محبت کے جھونکے ماحول کی تپتی ہوئی ریت کو اڑانے میں مصروف نظر آتے ہیں تو کبھی تاریک راہوں میں سپنوں کے جگنو جلتے بجھتے دکھائی پڑتے ہیں ہر شعر دل کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے، فکر تصویر کی صورت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے جو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔''

ناصر الدین انصاری اپنے مضمون ''ڈاکٹر بشیر بدر اور غزل کی روایت'' میں تحریر فرماتے ہیں:۔

بشیر بدر عصری غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھیں جدید غزل کا امام بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن جب بھی انھوں نے اپنی غزل میں عہد حاضر کے سماج کو پیش کیا ہے تو اس کے لئے غزل کی روایت ہی کو ذریعہ بنایا ہے۔ عصر حاضر کے انسان کی موقع پرستی، خود غرضی اور بے حسی، روحانی اقدار کا فقدان،

رہنماؤں اور علم و آتشی کے نام نہاد ٹھیکیداروں کی ظاہر فریبی اور تہی دامنی کو انھوں نے غزل کے پیرائے میں اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ان کی شاعری قارئین و سامعین کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ ان کے اندر ایک اضطراب بھی پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے عہد حاضر کی بدصورتی کو غزل کی خوبصورتی میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔"

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

شکیل گوالیاری اپنے مضمون "غزل کی آبرو ڈاکٹر بشیر بدر" میں اقلم طراز ہیں:۔

"بشیر بدر نے غزل کے مزاج کے کردار غزل کی نزاکت معصومیت اور تقدس کو مجروح کئے بغیر نئی سوچ نئے لہجہ کے ساتھ عصری حسیت کو اس طرح گرفت میں لیا ہے کہ شعر کے ادبی متن کو پس منظر میں جانے نہیں دیا۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد تعقل کے بجائے وجدان پر رکھی اس لیے ان کی غزل کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔ دل کی مٹی کو نرم کرنے کے لیے آنسوؤں کا بہاؤ الٹی طرف ہوتا ہے۔ شعر

اب کے آنسو آنکھوں سے دل میں اتریں
رخ بدلا دریا نے کیسا بہنے کا

بشیر بدر نے نئی غزل کو لفظی اور معنی سطح پر بہت کچھ دیا ہے۔ بشیر بدر کے یہاں لفظوں کے استعمال کا ایک خاص سلیقہ ہے ان کے یہاں کچھ الفاظ بار بار استعمال ہوتے ہیں ، اگر ہم بشیر بدر کے شعری کردار تک غزل کے حوالے سے پہونچنے کی زحمت کریں تو ان مخصوص الفاظ کے بار بار استعمال کی وجہ بھی معلوم ہوسکتی ہے۔ لطافت نزاکت شگفتگی سادگی اشاریت اور غنائیت غزل کے ایسے لوازمات ہیں جو مخصوص لسانی ڈھانچہ خود بخود تیار کرتے ہیں۔"

شمس الرحمن فاروقی نے بشیر بدر کی ایک عشقیہ غزل کو عالمی ادب کی عشقیہ شاعری کے مقابل قرار دیا تھا[1] اس سلسلے میں چند اشعار بطور مثال پیش ہیں۔

گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہ تھی جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا

اَن گنت کالے کالے پرندوں کے پر ٹوٹ کر زرد پانی کو ڈھکنے لگے
فاختہ دھوپ کے پل پہ بیٹھی رہی رات کا ہاتھ چپ چاپ بڑھتا گیا

اس اسلوب کا ابتدائیہ ایسے شعر سے ہوتا ہے

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انھیں کچھ ہنسی آگئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

بشیر بدر اس عہد کے اہم با صلاحیت اور خوبصورت غزل کے خالق ہیں۔ نئی غزل میں ان کی منفرد آواز ہے۔ ہم عصر غزل کے نمائندہ شاعر ہی نہیں اس کی مقبولیت اور رفعت کے اہم معمار بھی ہیں۔ جدید تر غزل میں ان کی آواز اپنے گوناگوں محاسن کے لحاظ سے ایک پہچان رکھتی ہے انھوں نے مؤثر اور جدید امیجری کے وسیلے سے غزل میں جو مرقع نگاری کی ہے۔ وہ بے مثال ہے۔ ان کا عشقیہ خوبصورت ترین اسلوب کم نظر نقادوں کو دھوکا دے سکتا ہے کہ وہ عشقیہ شاعر ہیں۔ ان کیلئے یہ دوٹوک بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ زندگی کے شاعر ہیں۔

---

[1] رسالہ آہنگ۔ گیا۔

اہل نقد و نظر کی آراء

محمد حسنؔ

''غزل گو کی حیثیت سے بشیر بدرؔ کی صلاحیتوں پر ایمان نہ لانا کفر ہے۔''

آل احمد سرورؔ

''نئی غزل میں ہندوستان اور پاکستان میں جو نام بہر حال آئیں گے ان میں بشیر بدرؔ کا نام بھی ہوگا۔''

خلیلؔ الرحمن اعظمی

''جب الفاظ ان کے تجربے سے کلی طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں تو ان کا ہر شعر کھرے سونے کی طرح چمک جاتا ہے۔''

اُسلوب احمد انصاری

''بشیر بدر اردو کے جدید ترین شعراء میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، انھوں نے مرّوجہ رسمیات میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے یہاں جذبات نگاری، عمومی مشاہدات کے اَن دیکھے پہلوؤں کی عکاسی اور ایسی نادر پیکر نگاری ہے جو ہمیں چونکاتی بھی ہے اور دعوتِ فکر بھی دیتی ہے اور اپنے اندر طنز و غایت بھی رکھتی ہے۔''

سلامتؔ اللہ خاں

''جدید غزل گو شعراء میں بشیر بدر صاحب بھی ہیں جو میرے خیال میں کئی اعتبار سے اپنے

۱۔ شاعر بمبئی جلد ۵۴ شمارہ ۳ ۱۹۸۳ء صفحہ ۳۷

۲۔ سہ ماہی لمحے لمحے بدایوں۔ جلد ۲ شمارہ ۳۔۴ ۱۹۸۴ء

ہم عصروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے صرف غزل ہی کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اس لئے ان کا کلام ایک طرح سے جدید غزل کی نمائندگی بھی کرتا ہے اور اس سمت کی طرف اشارہ بھی جس سمت میں جدید غزل کو اپنی بقا کے لئے جانا ہے۔ ان کی غزلوں میں جدیدیت کی نکتہ رسی اور بذلہ سنجی ہے لیکن انھوں نے فن اور شائستگی کے حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ ان کی شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس میں انھوں نے نئے مضامین اور نئے طرز بیان سے غزل کے دامن کو وسیع نہ کیا ہو۔ ان کے بیان کی خوبی ان کے نادر برمحل تشبیہات اور استعارے ہیں جو لطف بیان کو دوبالا کر دیتے ہیں۔"[1]

وحید اختر

غزل کا سرمایہ اتنا وسیع جاندار اور متنوع ہے اور اساتذہ سلف اس میں اتنا کچھ کہہ گئے ہیں کہ اس میں نئی بات پیدا کرنا ہما شما کا کام نہیں چنانچہ جدید غزلوں کو اٹھا کر پڑھئے تو عام طور سے چند اہم غزل گویوں کے مضامین کی جگالی ان کے ردیفوں کی تقلید ان کے انداز کی نقل اور ان کے لہجے کا چربہ اڑانے کا رجحان عام نظر آنے لگا۔ ناصر کاظمی، ظفر اقبال، شکیب جلالی، شہزاد احمد، خلیل الرحمٰن اعظمی یہی چند شعراء ہیں جن کی غزلوں کو سامنے رکھ کر عام طور سے غزلیں لکھی جاتی ہیں۔ گنتی کے چند شاعر ہندوستان میں ہیں جو ان کے بعد اپنی آواز بنا سکتے ہیں۔ جیسے بشیر بدر اب جدید تر غزل گو ان کی تقلید کر رہے ہیں۔[2]

نظام صدیقی

بشیر بدر کی منفرد سحر کار آواز اور نئی علامتی صورت گری کا سرچشمہ اس کی نادر روزگار تصویر کاری اور اچھوتی نازک بینی ہے جس نے اردو غزل کے ماضی کو صوری، معنوی اور صوتی سطح پر آج کی فضا اور آئندہ کے خوابوں سے منسلک کر کے ایک تہذیبی اکائی کی درخشاں علامت بنا دیا ہے اس کی پوری غزلیہ شاعری ایک حسین طلسماتی ڈرامہ کے مسحور کن منظر اور معانی

---

[1] اردو ادب آزادی کے بعد مطبوعہ شعبۂ اردو علی گڑھ ۱۹۷۳ء اردو جدید اردو غزل، ۱۹۴۷ء کے بعد ص ۱۳۲،۱۳۳

[2] شب خون ۱۹۷۱ء

کا پوری شدت اور توانائی کے ساتھ بھرپور انکشاف کرتی ہے۔ اس کے الفاظ ڈرامے کے کرداروں کی مانند مختلف غزلیہ اشعار کے اسٹیج پر رہنگ و آہنگ میں نمودار ہوتے ہیں اور اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مختلف جذبات و حسیات کی روشنیوں اور رنگوں کے ساتھ بشیر بدر کے اختراع اور استعمال کردہ الفاظ کے صوتی اور معنوی ہیئت عجیب عجیب ہیولے تخلیق کرتی ہے۔ لفظوں کی ڈرامائی کیفیت، صوت و غنا کی بھرپور جامعیت، تخیل کی براقی بلکہ نابکاری کی انتہائی واقعیت، اچھوتا آہنگ، کیف و کم اردو غزل کو ایک نیا مزاج نیا نظام اور نئی طرح عطا کرتے ہیں[1]

ارشد عبدالحمید

ڈاکٹر بشیر بدر ہمارے عہد کے ان شعراء میں سے ہیں جنہوں نے نئی غزلیہ لفظیات کو اپنے اسلوب کی کلیدی اساس بنایا اور ان کا اسلوب اتنا چمکا کہ ایک مستقل اسلوبیاتی رجحان بن گیا۔ آج جدید غزل کا لسانیاتی مطالعہ بشیر بدر کی غزلیہ لفظیات کے ذکر کئے بغیر پورا نہیں ہو سکتا نئی لفظیات کا تخلیقی استعمال ان کے اسلوب کا بنیادی وصف ہے[2]

مخمور سعیدی

"بشیر بدر کی غزلیں آج کی ذہنی زندگی اور تہذیبی فضا کی جیتی جاگتی اور متحرک تصویریں پیش کرتی ہیں۔ . . . . . ان کی غزلوں کا آہنگ کسی آہستہ خرام میدانی ندی کی ترنم ریزی سے ملتا جلتا ہے۔"[3]

کمار پاشی

"بشیر بدر کی غزل پڑھتے ہوئے میں ہر لفظ کا منفرد ذائقہ محسوس کیا ہے، کھردرے سے کھردرے اور غزل کے باہر کے الفاظ بھی ان کے اشعار میں نرم میٹھے اور سچے لگتے ہیں۔"[4]

---

[1] آج کے نقاد کا نیا ادبی رول اور اس کے بنیادی مسائل مطبوعہ ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۷۵ء

[2] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی صفحہ ۱۱۶

[3] تحریک اکتوبر ۱۹۷۰ء

[4] شاعر بمبئی ۱۹۸۳ء صفحہ ۲۸

کرامت علی کرامت

"بشیر بدر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تقریباً ہر شعر میں نئے انداز میں کچھ نئی بات کہنے کی کوشش کی ہے چاہے اس شعر کا تعلق جدیدیت سے ہو یا انسان کے لافانی تجربات سے جدید غزل کی تاریخ میں اس کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہے۔" [1]

راج نرائن راز

"بشیر بدر ہمارے ان معدودے چند شعرا میں ہیں جنھوں نے اردو غزل کو حسن سے روشناس کرانے اور اسے نیا رنگ و آہنگ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔" [2]

ڈاکٹر قمر رئیس

"بشیر بدر نے فارسی ترکیبوں سے عاری بول چال کی سادہ رواں اور عام فہم زبان میں غزل کہی ہے اور یہ ان کے منفرد اسلوب کا روشن پہلو ہے.... بشیر بدر ہم عصر غزل کے نمائندہ شاعر ہی نہیں اس کی مقبولیت اور رفعت کے اہم معمار بھی ہیں۔ جدید تر غزل میں ان کی آواز اپنے گوناگوں شعری محاسن کے لحاظ سے ایک پہچان رکھتی ہے۔" [3]

نظام صدیقی

"میر، غالب، اقبال، فراق، فیض اور ناصر کاظمی کے بعد سب سے اہم نئی غزلیہ تخلیقیت افروز شخصیت فی زمانہ بشیر بدر کی غزل ہے۔" [4]

پروفیسر شمیم حنفی

"بشیر بدر ہمارے ان شاعروں میں ہیں جن کا سخن الگ سے پہچانا جاتا ہے۔" [5]

---

[1] شاہکار ۱۹۷۲ء شمارہ ۳ صفحہ ۳۹

[2] آج کل جولائی ۱۹۷۰ء

[3] سہ ماہی فکر و آگہی بشیر بدر نمبر صفحہ ۵ تا ۶

[4] لاریب لکھنؤ ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۱

[5] سہ ماہی فکر و آگہی دہلی بشیر بدر نمبر ۸۹-۱۹۸۸ء

منصور سبزواری

''بشیر بدر کی خطرناک حد تک شہرت و مقبولیت ہے جس کی وجہ ان کی مجلسی شہنشائیت نہیں ہے بلکہ ان کی غزلوں میں اپنا جیسا ہی گوشت پوست کا وہ عام آدمی نظر آتا ہے جو ہماری ہی طرح دکھوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہے''[1]

نو بہار صابر

جدید غزل کو نئی جہت، نیا آہنگ اور نیا ذائقہ عطا کرنے والوں میں بشیر بدر ایک درخشندہ نام ہے جن کی کاوش فکر کو نہایت آب و تاب سے سنوارا سجایا ہے مجھے جدید شاعروں میں بشیر بدر سب سے زیادہ عزیز ہیں بلاشبہ وہ جدید غزل کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

جدید غزل پر ان کی تنقیدی کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ شعر کے بہت اچھے جوہری ہیں اور دوسرے شاعروں کی شعریت، جدت اور ندرت کا وہ جھوم کر اعتراف کرتے ہیں۔[2]

ڈاکٹر چندر ترکھا

جدید غزل کو جو خوبصورت اظہار بشیر بدر نے دیا ہے وہ اب تک کسی شاعر نے نہیں دیا ہے۔

غزل کے اس دور کو بڑی آسانی سے بشیر بدر کا عہد کہا جا سکتا ہے۔

پروفیسر مغنی تبسم

بشیر بدر کا شمار جدید اردو غزل کے معماروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا لہجہ اور وقار عطا کیا ہے۔ عصری مسائل اور زندگی کے پیچیدہ تجربوں کو سادگی اور پرکاری کے ساتھ شعر کا روپ دینے میں انھیں کمال حاصل ہے۔

---

1. ماہنامہ شاعر بمبئی ۱۹۸۳ء
2. نوازن۔ ص ۵۱

بشیر بدر کی نثری خدمات

ڈاکٹر بشیر بدر کا شمار ہند و پاک کے نامور جدید شعراء میں ہوتا ہے وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں ان کی اصلی شہرت اور مقبولیت کا سبب ان کی غزلیہ شاعری ہے۔ لیکن انھوں نے نثر میں بھی بعض قابلِ ذکر تحقیقی و تنقیدی کام انجام دے کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ خوبصورت شعر لکھنے کے ساتھ بہترین نثر لکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

بشیر بدر کے ۳۰ سے زیادہ تحقیقی تنقیدی تاثراتی مضامین سو سے زیادہ کتابوں پر تبصرے کئی مقدمے، تعارف اور پیش لفظ رپورتاژ ادبی رسائل میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اردو نثر میں ان کا اہم اور نمایاں کام پی۔ایچ۔ڈی کی سند کے لئے لکھا گیا، ان کا تحقیقی مقالہ "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ" ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک تنقیدی کتاب "بیسویں صدی میں غزل" کے عنوان سے لکھی ہے۔

بشیر بدر کی مذکورہ نثری مضامین اور تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی طرح اردو نثر میں بھی ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کی نثری خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جارہا ہے

آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ

یہ ڈاکٹر بشیر بدر کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے جو پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں لکھا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں اس تحقیقی مقالے پر ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری

تفویض کی ہے۔

یہ مطبوعہ مقالہ کتابیات کی فہرست کو چھوڑ کر ۱۷۲ صفحات پر محیط ہے: "آزادی کے بعد غزل کے تنقیدی مطالعے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک، دوسرا حصہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۰ء تک، تیسرا حصہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۰ء تک چوتھے حصے میں جدید غزل کے حال پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مستقبل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ہمارے پیش نظر کتاب کا وہ مسودہ ہے جو انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا تھا۔ اردو اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۸۲ء میں اس کتاب پر انعام دیا۔

کتاب کا انتساب مصنف نے اپنی شریک حیات قمر جہاں شہناز کے نام کیا ہے اور اپنا ایک شعر لکھا ہے ؎

کبھی دن کی دھوپ میں جھوم کے کبھی شب کے پھول کو چوم کے
یوں ہی ساتھ ساتھ چلیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

ابتدا میں کتاب پر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند کا تحریر کردہ پیش لفظ شامل ہے۔ اس کے بعد مصنف کا لکھا ہوا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"میر تقی میر نے ہی بتایا کہ کسی عہد کی غزل کی تنقیدی کتاب اس عہد کا شاعر ہی لکھ سکتا ہے"[1]

بیسویں صدی میں مختلف ادبی تحریکات منظر عام پر آئیں۔ اس صدی کی غزل کی نوعیت اپنے ماضی سے قدرے مختلف ہے۔ مختلف تحریکات و رجحانات نے غزل کو سنوارنے اور بگاڑنے کا کام کیا، غزل مختلف حالات سے نبرد آزما رہی۔ غزل کی اسی داستان کو بشیر بدر نے اشعار کے حوالے سے پیش کیا ہے اور آزادی کے بعد غزل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی۔

اردو غزل کو ہر دور میں دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں امتیازی مقام حاصل رہا ہے اگر بیسویں صدی میں اردو غزل کو نقادوں نے "گردن زدنی" اور "نیم وحشی صنف سخن" قرار دیا ہے۔ لیکن غزل ان الزامات اور اعتراضات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی رہی اور غزل نے زمانہ

---

[1] آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ، بشیر بدر

کے ساتھ اپنے اندر تبدیلیوں کے رجحان کو قائم اور متحرک رکھا جس کے نتیجہ میں غزل کا رنگ و روپ نکھر سنور کر دلوں کو چھوتا رہا۔

۱۹۴۷ء کے بعد غزل کو تقسیم وطن کے خوں ریز واقعات سیاسی افراتفری فرقہ وارانہ فسادات، ترقی پسندی کے عروج و زوال جدیدیت کے تجربات کو دیکھنا اور پرکھنا نصیب ہوا۔ اردو غزل ان حالات و کوائف سے متاثر بھی ہوئی اور مختلف رجحانات و نظریات والے شعری و تخلیقی تجربوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی رہی۔

بشیر بدر نے اپنی تصنیف "آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ" میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک غزل کے سفر کی روداد غزل اشعار کے حوالے سے مرتب کی ہے، انھوں نے وضاحت سے لکھا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے شعراء نے کیا کہا اور کیسے کہا؟ اور کیوں کہا؟ آزادی کے بعد غزل روبہ ترقی ہے یا روبہ تنزل؟ جدید غزل کو زمانے کا ساتھ دینے کی ہمت ہے؟ غزل کا مستقبل کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات بشیر بدر کی زیر بحث تصنیف کی زینت ہیں۔

بشیر بدر نے اپنی تخلیقی بصیرت اور تنقیدی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے عہد کی غزل کو تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور اپنے عہد پر تبصرہ کرنے کے مشکل ترین فن کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے رسائل سے ہر مزاج کی غزل کے اشعار منتخب کئے اور ان کی روشنی میں نتائج اخذ کئے وہ لکھتے ہیں "رسائل سے جو اشعار منتخب کرنے میں سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آیا کہ بعض شعری تجربات جو چند برسوں بعد عمومی تجربات ہو جاتے ہیں ان کے بارے میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نیا شعری رویہ کس وقت اور کن شاعروں کے وسیلے سے وجود میں آیا۔ آپ دیکھیں گے کہ اشعار اپنے مواد اور اظہار کی وجہ سے حد درجہ مماثلت رکھتے ہیں، ایسے اشعار میں کون پیش رو ہے کس کا اجتہادی درجہ ہے کون سا شاعر متاثر ہونے کے بعد اپنا الگ وجود رکھتا ہے اور کون تقلید محض ہے۔ اس طرح کے نتائج اخذ کرنے میں پڑھنے والے کو بڑی مدد ملے گی۔"[1]

---

[1] آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ، صفحہ ۱۲،۱۳

کے ساتھ اپنے اندر تبدیلیوں کے رجحان کو قائم اور متحرک رکھا جس کے نتیجے میں غزل کا رنگ و روپ نکھر سنور کر دلوں کو چھوتا رہا۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد غزل کو تقسیم وطن کے خوں ریز واقعات، سیاسی افراتفری، فرقہ وارانہ فسادات، ترقی پسندی کے عروج و زوال، جدیدیت کے تجربات کو دیکھنا اور پرکھنا نصیب ہوا۔ اردو غزل ان حالات و کوائف سے متاثر بھی ہوئی اور مختلف رجحانات و نظریات والے شعری و تخلیقی تجربوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی رہی۔

بشیر بدر نے اپنی تصنیف "آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ" میں سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۷۱ء کے غزل کے سفر کی روداد غزل کے اشعار کے حوالے سے مرتب کی ہے، انھوں نے وضاحت سے لکھا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے شعرا نے کیا کہا اور کیسے کہا؟ اور کیوں کہا؟ آزادی کے بعد غزل روبہ ترقی ہے یا روبہ تنزل، جدید غزل کو زمانے کا ساتھ دینے کی ہمت ہے؟ غزل کا مستقبل کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات بشیر بدر کی زیر بحث تصنیف کی زینت ہیں۔

بشیر بدر نے اپنی تخلیقی بصیرت اور تنقیدی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے عہد کی غزل کو تحقیق جدیدیت کیا ہے اور سنہ ۱۹۶۱ء سے سنہ ۱۹۷۰ء تک جدید غزل میں کس قسم کے رجحانات داخل ہوئے ہیں اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بشیر بدر لکھتے ہیں:

"آپ کا خیال تھا کہ غزل کلاسیکی اور آسان صنف سخن ہے۔ مقررہ اسلوب اور انداز میں کوئی بھی اس کے چند اشعار نظم کر سکتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ غزل کی چربہ سازی بہت آسان ہے لیکن اس روایتی اور جاندار صنف میں نیا رنگ و آہنگ پیدا کرنا آسان نہیں۔ اس دہائی میں غزل کی لفظیات رموز و علائم، ڈکشن، خارجیت اور داخلیت کے تناسب میں ایسی رمزیت تہداری اور مختلف العباد پیچیدگی آئی ہے کہ غزل کا نیا اور دلکش اسلوب سامنے آیا ہے۔ غزل کے تفصیلی مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ اس دور میں بھی ہر طرح کی غزلیں کہی گئی ہیں لیکن عصری زندگی کی بیشتر تبدیلیوں، اس کی نازک دھڑکنوں، تہذیب انسان کی داخلی پیچیدگیوں اور تہہ داریوں کو علامتی اور اشاراتی انداز میں مختلف لہجوں میں غزل نے اس طرح پیش کیا ہے کہ جدید تقلیدی

سرمائے سے قطع نظر جو بچ رہتا ہے وہ غزل کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہوسکتا ہے۔"[1]

جدید غزل کے بارے میں وضاحت سے اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں :

" جدید غزل میں لاشعور کی باز آفرینی پیکر تراشی استعارے کی طرف جھکاؤ، خود میں اترنے کی وجہ سے ایک خود کلامی کا متفکرانہ احساس زیادہ نمایاں ہے۔"[2]

آزادی کے بعد کی غزل کے تنقیدی مطالعہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ

"اس عہد میں نئے تجربات کے نئے اظہار کی روش چند افراد سے بڑھ کر عام رویہ ہونے کے قریب ہے۔ نئے لکھنے والے پرانی لفظیات کے بجائے جدید شعری لفظیات کو اپناتے ہیں .... مناظر فطرت سے رموز و علائم اور غیر واضح جذبوں کے لئے تجریدی پیکر تراشی کے نمونے ملتے ہیں ...... نئے اظہار اور نئے احساس کے لئے راہ ہموار کرنے میں اس طریقۂ کار نے بہت مدد کی ہے جسے کچھ لوگ توڑ پھوڑ کی غزل منفی غزل انٹی غزل کہتے ہیں۔ .... میں ..... اسے نئے معنوں میں ہزل کہنا چاہوں گا یہ غزل نہیں ہے ..... غزل کی فضا کو وسیع اور متنوع کرنے کے لئے سبھی پرانے حربوں کو نئے طور پر برتنے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔"[3]

غزل کے سلسلہ میں بشیر بدر کا انداز متوازن اور غیر جانب دار ہے۔ مثال کے طور پر تقلید میر کی بحث کے سلسلہ میں بشیر بدر کا خیال ہے

"اس امر کا اعتراف ضروری تھا کہ میر سے نئی نسل کے اچھے شاعروں نے اپنی انفرادیت کی تشکیل کرنا سیکھا ہے اور ان کی لفظیات کی تقلید ان شاعروں نے کی ہے جن کا بذات خود ادب میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔"[4]

---

[1] آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر بشیر بدر صفحہ ۲۲۵

[2] آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۴۱

[3] آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۶۹

[4] آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۵۹

لیکن بعض جگہ نظریات کی بحث میں بشیر بدر اپنے دامن کو بچا نہیں سکے۔ مثلاً ترقی پسندی پر الزامات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں اور ان کے اخذ کردہ نتائج میں صداقت ہے، ایک عہد کو متاثر کرنے والی اس تحریک پر تبصرے کے دوران وہ نقطۂ نظر سے اختلاف کی وجہ سے غیر جانب دار نہیں رہ سکے۔ لیکن ترقی پسند تحریک کا جائزہ ان کی بصیرت و بصارت کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

بشیر بدر زندگی اور ادب میں حس غیر معمولی اور کبھی کبھی بے دردی و بے باکی سے نتائج اخذ کرتے ہیں یہ کتاب اس کا کامیاب نمونہ ہے ان کے فن اور شخصیت کو سمجھنے میں بھی یہ کتاب معاون ہے اس میں وہ خود اعتمادی جھلکتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی سچی خوبیوں کا از خود اعلان کرتے ہیں جو ادب، اخلاق اور تہذیب کی وضع داریوں کے لئے الجھن کا سبب بن جاتی ہے۔

اُردو غزل کو قدیم تذکروں سے لے کر آج تک بہت کچھ لکھا گیا ہے یہ کتاب بشیر بدر کی خوبصورت تجزیاتی انداز میں اپنے عہد کی غزل کا تحقیقی مطالعہ اور اس کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

یہ کتاب ایک طالب علم کی اپنی نظر سے اپنے عہد کو سمجھنے کی پہلی مربوط کوشش ہے جس کو اس کے تحقیقی کام کو جانچنے والوں نے بھی سراہا ہے۔

اس مقالے کے ممتحن ڈاکٹر گیان چند جین کی رپورٹ میں یہ بھی اعتراف ہے۔

"The Thesis is one of the last thesis that have examined sofar."

اور پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے لکھا

"In collecting material his angitical skill has surpassed every thing. It is contribution to the criticism of modern urdu ghazal." [1]

اس کتاب کی اشاعت کے وقت انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے

ایک مبسوط مقدمہ لکھا ان کا قول ہے۔

"ڈاکٹر بشیر بدر نے پہلی بار ان اہم اشعار کی روشنی میں غزل کو سمجھنے کی کوشش کی جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک لکھے گئے ہیں۔ انہیں اس مطالعے میں بہت زیادہ کامیابی اس لئے حاصل ہوئی کہ وہ خود جدید اردو غزل کے بہت اچھے شاعر ہیں اور تخلیق کے کرب سے گزرتے رہے ہیں۔ خدا نے انہیں بہت نکھرا ہوا تنقیدی شعور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس عہد کے ادبی رجحانات اور تخلیقی رویوں کی روشنی میں غزل کا فطری اور فنی تجزیہ کیا ہے۔ ایک ایماندار نقاد کی طرح وہ کسی مخصوص نظریے اور ازم کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کا مطالعہ غیر جانب دار اور منصفانہ ہے۔"[1]

بیسویں صدی میں اردو غزل

چھوٹی تقطیع کی ۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب، مارچ ۱۹۸۱ء میں مکتبہ دین و ادب امین الدولہ پارک لکھنؤ سے شائع ہوئی بطور ناشر ڈاکٹر بشیر بدر کا نام اور میرٹھ کا پتہ بھی درج ہے۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ کتاب اردو اکادمی اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے مختصر ابواب کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

سر سید کا نظریہ ادب، حالی کا نظریہ غزل ان کی مقصدی غزلیں مقدمہ شعر و شاعری کے اثرات، غزل کا مختلف سمتوں میں احیاء

مقصدی غزل . . . . مقصدی غزل کے اہم شعرا، اکبر، چکبست، اقبال، سہیل اعظمی، علامہ اقبال، داغ، امیر مینائی کی روایتوں کے نمائندے ریاض خیرآبادی، جلیل مانک پوری، شعرائے لکھنؤ، صفی لکھنوی، عزیز، ثاقب، اثر، آرزو اور یگانہ

لکھنوی غزل میں تبدیلیاں۔ دہلوی شاعری کا اتباع، غالب کی تقلید، میر کے اثرات، غالب کی پرجوش تقلید کا خاموش ردعمل، خالص اردو، غالب شکنی، آتش پرستی۔

---

[1] آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۲-۱۱

غزل کا احیا، شاد عظیم آبادی، حسرت، فانی، اصغر، جگر، فراق کا تفصیلی مطالعہ۔

۱۹۳۰ء کے آس پاس ابھرنے والے شعراء مثلاً مجاز، جذبی، سرور، فیض، نشور، خمار وغیرہ کے ان ابتدائی کارناموں کا تذکرہ جو ۱۹۴۷ء تک وجود میں آچکا تھا۔ اس کے بعد ترقی پسند غزل کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں بشیر بدر نے حالی کے نظریۂ غزل پر تبصرہ کیا ہے اور ان کے مقدمہ شعر و شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے غزل پر اس کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

مقصدی غزل جس کا نقطۂ عروج علامہ اقبال ہیں اس کا آغاز وہ حالی سے بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ٹڈیوں، بھیڑوں، بھوکے شیروں . . . کے استعارے پہلی بار اردو غزل میں اس معنویت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔" [1]

اور ثبوت میں حالی کے یہ شعر پیش کرتے ہیں:

ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری	تو گئی بھول ہم کو خاکِ حجاز
ٹڈیوں کا ہے کھیتوں پہ ہجوم	بھیڑیوں کے ہیں خون میں ترلب ناز
تشنہ خوں ہیں بھوکے شیروں کے	حیلہ گر روبہوں کے عشوہ ناز

بشیر بدر سے قبل شاید کسی نقاد نے یہ بات نہیں کہی کہ اپنے تصورات عشق رسول اسلامی نظریات دشمنانِ اسلام اور مغربی فاتحوں کی حیلہ گری کے اس اسلوب کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے، جسے اقبال نے حیات و کائنات کی وسعت دی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ حالی کے مذکورہ بالا اشعار کی لفظیات وہی ہیں جو عام طور پر اقبال کا خالص کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ لکھنؤ والوں نے حالی کی مخالفت ضرور کی لیکن حالی کے ہی اثر نے اپنی

---

[1] بیسویں صدی میں غزل ص ۱۲

غزل خیالات و اسلوب کے اعتبار سے تبدیلیاں کی ہیں اور غالب پرستی بشیر بدر نے اس کا تجربہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا۔

"اگر اس کا مثبت پہلو ہے تو صرف یہ ہے کہ رعایت لفظی، محاورہ بندی، رکاکت اور ابتذال لکھنؤ کے اچھے شعراء کے یہاں بار نہ پا سکے۔" [1]

بشیر بدر کا خیال ہے کہ

"تبدیلیاں داخلی طور پر افکار و شعری تجربات میں ہوتی ہیں اور یہ عمل کسی شاعر کے ذہن و دل کا اضطراب نہیں بن پاتا ہے تو تقلید محض سے اس کی اپنی چھوٹی سی انفرادیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور تقلید کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔" [2]

اپنی اس کتاب میں وہ عزیز، صفی، ثاقب، کے اس تقلیدی حصے کی مذمت کرتے ہیں جو غالب کی فارسی زدہ اسلوب کی چربہ سازی ہے اور ان کے انفرادی تجربات کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہیں غزل کے احیاء کے سلسلے میں حسرت کے بڑے قائل ہیں۔ حسرت، حالی، سر سید کی پرزور اصلاحی تحریک سے حد درجہ مرعوب نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے دور کی سماجی اور عصری حسیت کو حسن و عشق کے سیاق و سباق میں دیکھا غزل کے فن کو سمجھا ماضی کی حیثیت اور زندہ روایات کی بازیافت کی اور اپنے عہد کی ترجمانی کی یہی وجہ ہے کہ بشیر بدر کا خیال ہے

"حسرت کے وسیلے سے نئی نسل کے ذہن میں قدماتی اہمیت بڑھی، اس طرح بیسویں صدی کی غزل کہنے والوں نے غزل کی عظیم روایات سے اپنا رشتہ جوڑ لیا حسرت سے ان کے بیشتر معاصرین متاثر ہوئے ان کے نظریۂ شعر و غزل سے آج بھی اختلاف ممکن نہیں اس لئے حسرت بیسویں صدی کی غزل میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ غزل کے عظیم شاعر نہیں ہیں۔" [3]

بشیر بدر فراق و یگانہ کے کارناموں کے معترف نظر آتے ہیں، لیکن ان کی ابتدائی تقلیدی

---

[1] بیسویں صدی میں غزل صفحہ ۱۴

[2] ایک خط بنام رفعت، مورخہ ۲ر جنوری ۱۹۷۰ء

[3] بیسویں صدی میں غزل صفحہ ۹۲

شاعری پر بڑی بے باکی سے لکھتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ان کے یہاں بہت مصرعے اور کچھ اشعار دوسرے شعراء کی صدائے بازگشت بھی ہیں. لیکن محنت اور مطالعہ سے بالآخران کے یہاں تازگی اور انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ یگانہ کی غالب شکنی کی انتہا پسندی میں یگانہ کا نقصان بھی دیکھتے ہیں اور ان کی انفرادیت کی تعریف بھی کرتے ہیں. وہ یگانہ کو غزل کا عظیم شاعر اس لئے نہیں مانتے کہ یگانہ کے یہاں افکار میں "جدید حسیت کے باوجود غزل کی تہذیبی شرافت اور انسانی ہمدردی کی لطافتوں کی کمی ہے"

بشیر بدر کی اس مختصر سی کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ کن بات کہنے میں نڈر، بے باک ہیں ان کی اس تنقیدی صفت میں تہذیبی متانت بھی ہوتی ہے لیکن جب کبھی اس متانت کو انھوں نے چھوڑ دیا وہ جملے یا فقرے ان کی سلامت روی اور اعلیٰ تہذیبی قدروں پر داغ بن گئے ہیں۔

بشیر بدر کی تنقید تاثراتی، جمالیاتی اور سائنسی تنقید کا امتزاج ہے۔ وہ ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی تبدیلیوں پر نظر رکھتے ہوئے شاعر کی انفرادی فکر اور اس کے اسلوب پر تنقیدی تبصرہ کرتے ہیں۔

علی گڑھ میگزین (غالب نمبر)

علی گڑھ میگزین طلبائے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ادبی رسالہ ہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۵ مئی ۱۸۹۱ء کے ضمیمہ کی حیثیت سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کا اجراء ہوا۔ اس وقت انگریزی اور اردو حصے مشترک شائع ہوتے تھے .... پروفیسر شبلی نعمانی اردو سیکشن کے ایڈیٹر تھے۔ ۸ مئی ۱۸۹۴ء کی اشاعت کے بعد ۱۸۹۴ء میں اس نے مستقل رسالے کی صورت اختیار کرلی۔

بشیر بدر ۱۹۶۹ء علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر منتخب کئے گئے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں بشیر بدر نے میگزین کا غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں ترتیب دیا۔ اپنے اداریے میں غالب نمبر کی انفرادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دوسری یونیورسٹیز اور خود ہمارے یہاں ایسے خاص نمبر شائع ہوئے ہیں جن میں کسی شاعر کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے (لیکن) اس شمارے میں لکھنے والے حضرات اسلامیات، انگریزی فارسی نفسیات، سائنس، قانون لائبریری انجینیرنگ سے متعلق ہیں"[1]

اس نمبر میں انہیں اساتذہ وطلباء کے مضامین شاملِ اشاعت کئے گئے جو اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ یہ نمبر کتابی سائز میں ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

علی گڑھ میگزین کی اشاعت کا ۷۵واں سال تھا اس رعایت سے بشیر بدر نے علی گڑھ میگزین کے مدیر کے عنوان سے سنہ ۱۸۹۶ء سے سنہ ۱۹۶۹ء تک انتالیس ۳۹ ایڈیٹروں کی فہرست شامل کی جس میں شبلی نعمانی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر خواجہ منظور حسین، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، جاں نثار اختر، پروفیسر ابو اللیث صدیقی، پروفیسر مختار الدین آرزو، پروفیسر شبیہ الحسن، نسیم قریشی، قمر رئیس وغیرہ شامل ہیں۔

بشیر بدر نے غالب کا استفہامیہ ذہن، علی گڑھ میگزین اور غالب، علی گڑھ میگزین کے مدیر، علی گڑھ کے مخصوص شمارے کے عنوانات سے مضامین لکھے۔ ان مضامین کے علاوہ چوبیس مضامین نگار حضرات کے مضامین شامل ہیں۔

بشیر بدر کے مرتبہ غالب نمبر کی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لئے صرف یہ بات کافی ہے کہ یونیورسٹی نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا اور ان اشاعتی کتب میں شامل کیا جو فروخت بھی کی جاتی ہیں۔ اس سے قبل علی گڑھ میگزین ادبی بازار میں کسی تالیف کی طرح فروخت نہیں کیا گیا۔

بشیر بدر ایک شاعر کی حیثیت سے شہرۂ آفاق ہوئے ہیں اور اس حیثیت سے ان کی شہرت وعظمت کے سامنے ان کی ادیبانہ اور تنقیدی حیثیت گم ہوگئی اگر چہ وہ جمالیاتی نثر اور جمالیاتی اور سائنٹفک تنقید کا بہترین سلیقہ رکھتے ہیں۔ تنقیدی تصانیف کے علاوہ اردو زبان وادب سے متعلق جو

---

[1] علی گڑھ میگزین غالب نمبر سنہ ۱۹۶۹ء مرتبہ بشیر بدر ص ۲۶

مضامین و مقالات لکھے ہیں، شاعروں، ادیبوں، کی کتابوں پر جو مقدمات سپرد قلم کیئے ہیں ان سے ان کے تنقیدی نظریات وخیالات اور طرز واسلوب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

بشیر بدر کے مزاج میں شاعری کا رنگ رچا بسا ہوا ہے اور اس لیئے وہ نثر میں بھی شاعرانہ فضا قائم کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں شعریت ورنگینی ہے۔ اس میں غزل کی ایمائیت، شیرینی، دلکش الفاظ، اور رموز و علائم سے ایک خاص موسیقیت کا احساس ہوتا ہے۔ سادگی، برجستگی، اختصار وجامعیت، صنائع چُستی وشائستگی ان کے طرزِ تحریر کی قابلِ ذکر صفات ہیں، ثقیل اور نامانوس الفاظ سے وہ نثر میں بھی اجتناب کرتے ہیں۔ مناظر فطرت سے خوبصورت استعارات لے کر اپنی تحریر کو دلکشی اور رعنائی عطا کرنے کے فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ مدلل اور منطقی نثر بہت کم تخلیقی ذہن لکھ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے بشیر بدر ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ معلومات کی وسعت اور اس پر دلائل کی منطقی ترتیب، قدرت بیان، معتدل اور متوازن تنقیدی نظر، منصفانہ رویئے نے ان کی تنقیدی نگارشات کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔

بشیر بدر تنقیدی نثر کو ''واضح خیالات کا واضح اظہار'' تصور کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں سادہ مختصر اور جامع تنقیدی جملے، خوبصورت اور جمالیاتی اسلوب سے بھرپور ہوتے ہیں۔ نثر میں بیبا کی، صاف گوئی اور عقلی وضاحت سے کام لیتے ہیں۔ ان کی تنقیدی تصانیف میں تاثراتی جمالیاتی اور سائنٹفک تنقید کا امتزاج نظر آتا ہے۔ یہی چیز ان کو جدید غزل کے نقادوں میں شمار کراتی ہے۔

بشیر بدر نے خوبصورت نثر لکھنے کی بھرپور صلاحیت کا استعمال نہیں کیا۔ لیکن ان کے قلم سے نکلا ہوا جتنا اور جو کچھ نثری سرمایہ منظر عام پر آچکا ہے، اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جمالیاتی نثر اور جمالیاتی تنقید پر بشیر بدر توجہ دیں تو ان کے قلم سے غزل اور متعلقات غزل پر مزید قابل ذکر کام منظر عام پر آسکتے ہیں۔ ان کے نثری مضامین وتصانیف میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ میرے نزدیک وہ ایک کامیاب شاعر اور اچھے نقاد ہیں۔ یہ بات علٰیحدہ ہے کہ ان کی شاعرانہ مقبولیت اس قدر غالب آ گئی ہے کہ ان کی تنقیدی حیثیت اس کے آگے ماند پڑ گئی ہے۔ ورنہ بحیثیت ناقد بھی ان کا مقام کچھ کم نہیں ہے۔

غزل کی نئی آواز

بشیر بدر کے شعری سفر کا آغاز بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ غزل کی تاریخ بتاتی ہے کہ بیسویں صدی میں اردو غزل کی نوعیت اپنے ماضی سے نمایاں طور پر مختلف ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس عہد میں مختلف تحریکات اور رجحانات نے تیزی سے کروٹ بدلی اور ۱۹۴۷ء کے بعد اردو غزل نے جس نئے رخ کو پیش کیا وہ تقسیم ہند کے خوں ریز واقعات پر مبنی تھا' ترقی پسند تحریک کا عروج و زوال اور جدیدیت کے نئے تجربات سے غزل دوچار ہو رہی تھی۔ پاکستان کے وجود کے بعد ہندوستان میں غزل کی شناخت قائم رکھنے کی کوششوں کا سلسلہ جاری تھا۔

بشیر بدر جن کا شعری ذوق آزاد ہندوستان میں پروان چڑھا وہ ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی، تہذیبی، اور شعری شعور میں غزل کے آدمی بن کر آنا چاہتے تھے۔ ان کے چاروں طرف حصار تھے۔ غزل کے عظیم و قدیم اور جاوداں روایتوں کے، ترقی پسند کی گرم گفتاری کے حلقۂ ارباب ذوق کی مخصوص استعاراتی و علامتی شاعری کے ان حصاروں کے درمیان بشیر بدر کی فطری اپج رکھنے والی ذات تھی اس وقت غزل اور نظم نئے تجربات سے دوچار تھی۔ علی گڑھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور پروفیسر آل احمد سرور جدیدیت کے میر کارواں تھے۔ اظہار ایک نیا اسلوب اختیار کر رہا تھا۔ نئی تشبیہات، استعارات، علامتیں سامنے آ رہی تھیں' پرانے قواعد سے اجتناب کا زور تھا۔ قواعد اور زبان کے اصولوں سے انحراف فیشن بن رہا تھا۔ مخصوص لفظیات کا استعمال کیا جا رہا تھا۔ مایوسی، ناکامی، شکست، اور تنہائی کی فضا کی تکرار جدیدیت کی شناخت تھی۔

بشیر بدر غزل جیسی نازک صنفِ سخن کو اپنے فکری اور فنی نیز جمالیاتی شعور کو تخلیقیت بخشنے کے لئے منتخب کر چکے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ بشیر بدر نے شعر و سخن سے وابستگی کے ابتدائی دور میں ہی اپنا اسلوب

اپنا لہجہ اور اپنی زبان طے کر لی تھی اور غزل کے پورے سرمائے کو سامنے رکھ کر اپنی منفرد آواز بنانے کی منصوبہ بند کوششوں میں مصروف ہوئے تھے کیونکہ غزل کے علاوہ بشیر بدر نے نثری غزل کے عنوان سے چند نظمیں بھی لکھیں لیکن بہت جلد انھوں نے نثری غزلوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور نظم کے میدان کو بھی دوسروں کے لئے چھوڑ دیا۔ اردو غزل کو اپنی صلاحیتوں کا مرکز بنا کر اپنی تخلیقی کاوشوں کا بھر پور استعمال کیا۔ ان کا شعری سفر جاری ہے ادبی رسائل اور شعری محفلوں میں ان کو انفرادی مرتبہ و مقام حاصل ہے۔

بشیر بدر کے شعری سرمائے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دورِ جدید کے ان شعراء میں شامل ہیں جن کے ذریعہ اردو غزل نئے نئے تجربات کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے اکیسویں صدی کی طرف گامزن ہے اور اس میں فکری، موضوعاتی، لفظی، اسلوبیاتی غرض کہ ہر قسم کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ بشیر بدر کی غزلوں میں ان کی شخصیت اور حیات کے پنہاں گوشوں کی عکاسی بھی ہے باطن کا درد و کرب بھی اور تہذیبی بحران کا انعکاس بھی۔ وہ ہر واقعہ اور ہر منظر کو اور اپنے اطراف کے حالات کو ایک خاص نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بشیر بدر نے روایتی رموز و علائم میں نئی ایمائیت اور نئے مفاہیم کی تلاش کا کام بڑی فنی چابکدستی سے کیا ہے۔ بنے بنائے شعری سانچوں میں شعریت محسوس کرنے والوں نے ہر نئی ترکیب یا نئی لفظیات کی مخالفت کی لیکن بشیر بدر نے ایسے۔ بے شمار رموز و علائم تشبیہات و استعارات اور علامتی پیکر تراشے جو اس سے قبل غزل میں اعتبار حاصل نہیں کر سکے تھے۔ ایسے علامتی پیکر جدید تشبیہات و استعارات اردو غزل کو بشیر بدر کی خاص دین کہے جا سکتے ہیں۔

بشیر بدر کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ روایت سے ان کا رشتہ مضبوط ہے، عصری تقاضوں کا اُنھیں احساس ہے اور نئی تبدیلیوں پر گہری نظر ہے۔ طرزِ احساس، انداز نظر، انتخاب موضوع اور انتخاب الفاظ ہر جگہ بشیر بدر اپنی انفرادی شان کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے۔ کسی جگہ وہ اپنے عمل میں کلی

طور پر کامیاب نظر آتے ہیں اور بعض اوقات تجربہ ہی محض تجربہ ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

بشیر بدر کے کلام میں طنز و تضاد بھی ہے، تغزل اور موسیقیت بھی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی حسیت کی جھلکیاں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے لہجے کو مثنوی اور مرثیوں میں شامل گھریلو فضاؤں سے مزین کر کے اردو غزل کو نئے احساس نئے رویے سے روشناس کیا ہے۔ ہماری غزل کا ایک حصہ قبائلی کشادگیوں سے آراستہ ضرور ہے لیکن غزل کا کردار اس میں اپنی تہذیبی روشنیوں اور پاکیزگیوں کے زیادہ قریب نہیں رہا۔ بشیر بدر نے قصباتی سیدھی سادی اور حیات پرور زندگی کی تصویر کو غزل میں شامل کیا۔ بشیر بدر کی غزلوں کے عاشق اور معشوق جیتے جاگتے معاشرے کے افراد ہیں۔ ان کا گھر ہے، رشتے ہیں، وہ حالات سے نبرد آزما ہیں اس طرز احساس نے ان کی غزل کو عظیم روایت کا حصہ بناتے ہوئے زمین و آسمان سے آشنا کیا ہے۔ انھوں نے روایتی مضامین کو بھی نئے انداز اور نئے مفاہیم سے برتا، انسانی روح کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے صنعتی زندگی کے مسائل کو جدید حسیت کے ساتھ پیش کیا۔ اور آج کے انسان کے نفسیاتی مزاج کی ترجمانی عالمی اردو کے غزلیہ اسلوب میں کی ہے۔

بشیر بدر شعری زبان کا ازسر نو جائزہ لینے کا مشورہ دیتے ہیں اور غزل کی زبان کو شہر کی زبان ہونے کا خیال میر سے مستعار لیتے ہوئے غیر غزلیہ لفظوں کا اردو غزل میں تہذیبی شائستگی اور نغمگی کے ساتھ برتنے کی سعی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نئی غزل کے تناظرات کو بدلنے میں بشیر بدر کی تخلیقی کاوشوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کا اپنا منفرد اسلوب اور آہنگ ہے جو لفظی پیکر تراشی نئی تخلیقی لفظیات کے استعمال، علامتی صورت گری، جدید و نادر تشبیہات و استعارات سے مل کر بنتا ہے۔

انتخاب کلام

چند غزلیں اور اشعار

حمد

دھڑکن دھڑکن، دھڑک رہا ہے اللہ تیرو نام
غنچہ غنچہ چٹک رہا ہے، اللہ تیرو نام
پت جھڑ بھیگے، چاند نہائے پہلی پہلی بارش
آنسو آنسو، ڈھلک رہا ہے اللہ تیرو نام
امبر سونا، دھرتی چاندی، ماٹی ہیرا موتی
باہر بھیتر چمک رہا ہے اللہ تیرو نام
ہر سردی گرمی کی شدت میں رحمت کی شال
موسم موسم مہک رہا ہے اللہ تیرو نام
بچوں کی بھولی باتوں میں اُجلے اُجلے پھول
پنچھی پنچھی چہک رہا ہے اللہ تیرو نام
جمنا جی کے تٹ پر گونجے تیرے نام کی مُرلی
گنگا جی میں جھلک رہا ہے اللہ تیرو نام
مندر، مسجد بنتے ہیں بنتے بنتے مٹ جاتے ہیں
چمک رہا تھا چمک رہا ہے اللہ تیرو نام

☆

دھوپ کے پار ستاروں کا نگر لگتا ہے
اس پہاڑی پہ مجھے چاند کا گھر لگتا ہے

چاند محراب پہ سوئی ہوئی اک آیت ہے
بے وضو آنکھیں ہیں پڑھتے ہوئے ڈر لگتا ہے

یہ بھی سوئے ہوئے بچّے کی طرح ہنستا ہے
آگ میں پھول فرشتوں کا ہنر لگتا ہے

میں ترے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں
کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے

بے خبر رات کی بانہوں میں سمٹ کر سونا
خوبصورت مجھے سورج کا سفر لگتا ہے

زندگی تونے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

ایسا لگتا ہے کوئی سانپ چھپا بیٹھا ہے،
پھول سے ہاتھ ملاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

نوٹ: پچھلے 20 برسوں میں بار باراس غزل میں ترمیم اور اضافے ہوتے رہے۔ یہ بشیر بدر کی Creative Theory ہے کہ غزل برسوں Grow ہو کر اپنی شکل پاتی ہے۔

(رفعت سلطان)

☆

تری جنت سے ہجرت کر رہے ہیں
فرشتے کیا بغاوت کر رہے ہیں
ہم اپنے جرم کا اقرار کرلیں
بہت دن سے یہ ہمت کر رہے ہیں
وہ خود ہارے ہوئے ہیں زندگی سے
جو دنیا پر حکومت کر رہے ہیں
زمیں بھیگی ہوئی ہے آنسوؤں سے
یہاں بادل عبادت کر رہے ہیں
فضا میں آیتیں مہکی ہوئی ہیں
کہیں بچے، تلاوت کر رہے ہیں
پرندوں کے زمین و آسماں کیا
وطن میں رہ کے ہجرت کر رہے ہیں
میں اپنے بھائیوں سے مختلف ہوں
وہ موسم کی شکایت کر رہے ہیں
ہماری بے بسی کی انتہا ہے
کہ ظالم کی حمایت کر رہے ہیں
غزل کی آگ میں پلکوں کے سائے
محبت کی حفاظت کر رہے ہیں
ہمارے محترم تنقید والے
امانت میں خیانت کر رہے ہیں

☆

سر سر ہوا میں سرکے ہے، صندل کی اوڑھنی
جھک جھک پلک کو چومے ہے کاجل کی اوڑھنی

مدت کے بعد دھوپ کی کھیتی ہری ہوئی
اب کے برس، برس گئی بادل کی اوڑھنی

موسم سے ملتا جلتا تمھارا مزاج ہے
بھاری کبھی دُلائی، کبھی ہلکی اوڑھنی

کہرے کی وادیوں میں اترنے لگی ہے رات
پھر سردیوں نے اوڑھ لی کمبل کی اوڑھنی

ریشم کی چادروں سی وہ چکنی پہاڑیاں
کیا دھوپ کی ڈھلان سے کل ڈھلکی اوڑھنی

یہ آج ہے تو آج کی چادر تلاش کر
اچھے دنوں کے واسطے رکھ کل کی اوڑھنی

کتنے لباس، شہر بدلتا ہے شام تک
ہر رات جھلملاتی ہے جنگل کی اوڑھنی

کاروں سے جھانکتے ہوئے خوشبو کے پیرہن
پیدل کے واسطے وہی ڈیزل کی اوڑھنی

شاعر کو تاج و تخت، خدا نے عطا کیے
خواجہ سرانے اوڑھی جھلا جھل کی اوڑھنی

پاگل سی ایک لڑکی نے شاعر بنا دیا
یہ شاعری بھی ہے اسی پاگل کی اوڑھنی

☆

چل چل کے رکے، رک رک کے چلے، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا
سب کی مانی پر شام ڈھلے، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

پھل پھول رکھیں، ان قدموں پر، جو سورج کے گھر جاتے ہیں
یہ بات کبھی اتری نہ گلے، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

موسم کے دین و مذہب کو ہم نے اپنا مذہب جانا
پھولوں کے بدن پلکوں سے ملے، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

روشن روشن شانوں پہ کھلے، جب شام ڈھلی طاقوں میں جلے
موتی چمکے، پلکوں کے تلے، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

مٹکی، ماکھن، گاگر، چھن چھن، رم جھم رم جھم برسے ساون
سندر سندر گودوں میں پلے، جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

☆

غزالاں دیکھنا دلدار تاروں کی اٹاری میں
مرے نیناں کے دونوں پٹ کھلے ہیں انتظاری میں
ہمن کو عاشقی کی آگ پھولوں میں بساتی ہے
فرشتے خاک ہو جاتے ہیں سورج کی سواری میں
کبھی کہتے ہو اب آئے، کبھی کہتے ہو تب آئے
ہماری جان جائے گی تمھاری انتظاری میں
پرندوں کے شکاراں سے خدا ناراض ہووے ہے
میاں جی۔ چاند کو زخمی کروگے چاند ماری میں
مرا لہجہ چمکتا ہے ترا مکھڑا دمکتا ہے
کبھی بادِ خزانی میں کبھی ابرِ بہاری میں
تمھارے ہاتھ میں مشرق تمھارے پاؤں پر مغرب
دوپٹہ اور کنگن کیا جے جاناں سفاری میں
تمھارے غم کے بیماراں مزہ لیتے ہیں موسم کا
بخاراں کا بخاری میں، بہاراں کا بہاری میں
خزاں کی گھاس پر چھلکاٹ کی چادر بچھادی ہے
بٹن سونے کا چمکا ہے تمھاری چھولداری میں
غسل خانے کی چلمن میں پڑے کم خواب کے پردے
نئے نوٹوں کی کھڑ کھڑ ہے پرانی ریزگاری میں
کبھی سورج، کبھی بادل، کبھی دونوں ستاتے ہیں
پیا گھر بار ہم نے بیچ ڈالا تیری یاری میں

☆

رات آنکھوں میں ڈھلی پلکوں پہ جگنو آئے
ہم ہواؤں کی طرح جا کے اسے چھو آئے

میرا آئینہ بھی اب میری طرح پاگل ہے
آئینہ دیکھنے جاؤں تو نظر تو آئے

اُن فقیروں کو غزل اپنی سناتے رہیو
جن کی آواز میں درگاہوں کی خوشبو آئے

بس گئی ہے مرے احساس میں یہ کیسی مہک
کوئی خوشبو میں لگاؤں تری خوشبو آئے

اُسکی آنکھیں مجھے میرا کا بھجن لگتی ہیں
پلکیں جھپکائیں تو لوبان کی خوشبو آئے

اُس نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا
مدتوں بعد مری آنکھوں میں آنسو آئے

کس تکلف سے گلے ملنے کا موسم آیا
پھول کاغذ کے کھلے، کانچ کے بازو آئے

☆

اداس، چاند ستاروں کو ہم نے چھوڑ دیا
ہوا کے ساتھ چلے اور ہوا کو موڑ دیا

اس آسمان کو ہم نے زمین بخشی ہے
زمین سخت تھی، دل کا لہو نچوڑ دیا

وہ جانتا ہے، اکیلا کہاں میں جاؤں گا
اسی لیے تو مرا ہاتھ اس نے چھوڑ دیا

ذرا اداس ہے دنیا، بہت خراب ہے دل
تمھاری یاد نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا

ہزار سال کا قصہ تمام کرڈالا
زمیں کا ایک ورق آسماں نے جوڑ دیا

تمام زندگی ہم نے غزل کے نام لکھی
ہر ایک فیصلہ ہم نے خدا پہ چھوڑ دیا

☆

Thirty Five ہے بہت بھرپور عورت سی لگی
اس سے مل کر زندگی کچھ خوبصورت سی لگی
چاند چاہت سا لگا دھرتی محبت سی لگی
رات کی تنہا پہاڑی خوبصورت سی لگی
دھوپ کے سادھو کو کس نے پیار سے پانی دیا
صبح کی پوجا مجھے شب کی عبادت سی لگی
پھول سی بچی نے میرے ہاتھ سے چھینا گلاس
آج امی کی طرح وہ پوری عورت سی لگی
آخری بیٹی کی شادی کر کے سوئی رات بھر
صبح بچوں کی طرح وہ خوبصورت سی لگی
تم نے گھر آکر در و دیوار روشن کر دیئے
گود میں چہکا فرشتہ دھوپ جنت سی لگی
کچھ دنوں کے بعد اس نے بھی ضرورت اوڑھ لی
جب کوئی لڑکی نئی آئی قیامت سی لگی
لان کی ناراضگی ، یہ شام کی پرچھائیاں
آج آنگن کی خموشی بھی شکایت سی لگی

چاند کے ماتھے پہ بل پلکوں تلے جھلمل چراغ

اس کی نفرت بھی مجھے کل شب محبت سی لگی

سب مغل دربار کی پوشاک پہنے ہیں فقیر
شعر کی تنقید قبروں کی تجارت سی لگی

باوضو شاخوں پہ سوئی تھی پرندوں کی اذاں
پہلی بارش بھی مجھے صبح عبادت سی لگی

کچے پکے گھر اداسی کی ردا اوڑھے ہوئے
دل کی بستی بے وفا تیری ریاست سی لگی

وہ بڑی سی کار سے اتری سیاست کی طرح
اک طوائف آج مجھ کو اپنی شہرت سی لگی

دھوپ کی شاخوں پہ روشن پتیاں آنے لگیں
اب ذہانت میرے بچوں کی شرافت سی لگی

میر صاحب کی پرانی جوتیاں سر پر رکھیں
یہ قدامت آج کے لوگوں کو جدّت سی لگی

روٹیاں کچی پکیں کپڑے بہت گندے دُھلے
مجھ کو پاکستان کی اس میں شرارت سی لگی

☆

آنکھوں کو آنسوؤں نے کبھی یوں سجادیا
پلکوں کو جگنوؤں کا جھروکہ بنا دیا

لہروں میں ایک دن تری تصویر آئے گی
کاغذ کو آج ہم نے ندی میں بہادیا

میں شاخ پر مہکتا ہوا اک گلاب تھا
یہ کس کی بد دعاؤں نے پتھر بنا دیا

میں طاق کا دیا نہیں جنگل کی آگ ہوں
جا، پت جھڑوں کا نام و نشاں تک مٹا دیا

میں چاند کا خیال تھا تاروں کا خواب تھا
کس نے مجھے چراغ بنا کر بجھا دیا

اب صبح کی اذان مرا منہ دھلائے گی
بے خواب سسکیوں نے تھپک کر سلا دیا

☆

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

☆

دشمنی کا سفر اک قدم، دو قدم
تم بھی تھک جاؤ گے، ہم بھی تھک جائیں گے

☆

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

☆

ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اُٹھے اپنے ہی دل پر برسے

☆

دنیا میں کہیں ان کی تعلیم نہیں ہوتی
دو چار کتابوں کو گھر میں پڑھا جاتا ہے

☆

اس طرح ساتھ نبھانا ہے دشوار سا
میں بھی تلوار سا، تو بھی تلوار سا

☆

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشا ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

☆

مسافر ہیں ہم بھی، مسافر ہو تم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

☆

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

☆

کہہ دینا سمندر سے ہم اوس کے موتی ہیں
دریا کی طرح تجھ سے ملنے نہیں آئیں گے

☆

ہم بھی دریا ہیں ہمیں اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف کو چل پڑیں گے راستہ ہو جائے گا

☆

غزلوں کا ہنر اپنی آنکھوں کو سکھائیں گے
روئیں گے بہت لیکن آنسو نہیں آئیں گے

☆

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست بن جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

☆

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے میرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

☆

اُسے کسی کی محبت کا اعتبار نہیں
اُسے زمانے نے شاید بہت ستایا ہے

☆

میرے ساتھ جگنو ہے ہم سفر مگر اِس شرر کی بساط کیا
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

☆

پتھر کے جگر والوں غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنالے گا بہتا ہوا پانی ہے

☆

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا
بڑی دور تک رات ہی رات ہوگی

☆

کوئی کاغذ نہ تھا لفافے میں
صرف تتلی کا ایک پر نکلا

☆

مجھے معلوم ہے اس کا ٹھکانہ پھر کہاں ہوگا
پرندہ آسماں چھونے میں جب ناکام ہوجائے

میرے سامنے جو پہاڑ تھے سبھی سر جھکا کے چلے گئے
جسے چاہے تو یہ عروج دے جسے چاہے تو یہ زوال دے

☆

بڑے شوق سے انہیں پتھروں کو شکم سے باندھ کے سو رہوں
مجھے مالِ مفت حرام ہے مجھے دے تو رزقِ حلال دے

☆

دنیا بھر کے شہروں کا کلچر یکساں
آبادی تنہائی بنتی جاتی ہے

☆

کیوں حویلی کے اُجڑنے کا مجھے افسوس ہو
سیکڑوں بے گھر پرندوں کے ٹھکانے ہو گئے

☆

ملک تقسیم ہوئے دل تو سلامت ہے ابھی
کھڑکیاں ہم نے کھلی رکھی ہیں دیواروں میں

☆

مختصر باتیں کرو بیجا وضاحت مت کرو
یہ نئی دنیا ہے بچوں میں ذہانت ہے بہت

☆

یوں ہی روز ملنے کی آرزو بڑی رکھ رکھاؤ کی گفتگو
یہ شرافتیں نہیں بے غرض اسے آپ سے کوئی کام ہے

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلے نہیں ملتا، ہاتھ بھی نہ ملا

☆

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

☆

بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
جہاں دریا سمندر میں ملا دریا نہیں رہتا

☆

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

☆

دالانوں کی دھوپ چھتوں کی شام کہاں
گھر سے باہر گھر جیسا آرام کہاں

☆

مرے دل میں درد کے پیڑ ہیں یہاں کوئی خوف خزاں نہیں
یہ درخت کتنے عجیب تھے سبھی موسموں میں ہرے رہے

☆

جب ساتھ نہ دے کوئی آواز ہمیں دینا
ہم پھول سہی لیکن پتھر بھی اٹھائیں گے

انگنائی میں کھڑے ہوئے بیری کے پیڑ سے
وہ لوگ چلتے وقت گلے مل کے روئے تھے

☆

کس نے جلائیں بستیاں بازار کیوں لٹے
میں چاند پر گیا تھا مجھے کچھ پتہ نہیں

☆

چندا کے بستے میں سوکھی روٹی ہے
کاجو، کشمش، پستے اور بادام کہاں

☆

کبھی کبھی تو چھلک پڑتی ہیں یونہی آنکھیں
اُداس ہونے کا کوئی سبب نہیں ہوتا

☆

ہم پہلے نرم پتوں کی اک شاخ تھے مگر
کاٹے گئے ہیں اتنے کہ تلوار ہو گئے

☆

لپٹ کر چراغوں سے وہ سو گئے
جو پھولوں پہ کروٹ بدلتے رہے

☆

چاند محراب پہ سوئی ہوئی اک آیت ہے
بے وضو آنکھیں ہیں پڑھتے ہوئے ڈر لگتا ہے

☆

سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا
آہستہ چلنے والے کی باری نہ آئے گی

☆

میں شاہراہ نہیں راستے کا پتھر ہوں
یہاں سوار بھی پیدل اُتر کے چلتے ہیں!

☆

گھر کتنے ہی چھوٹے ہوں گھنے پیڑ ملیں گے
شہروں سے الگ ہوتی ہے قصبات کی خوشبو

☆

قدیم قصبوں میں کیسا سکون ہوتا ہے
تھکے تھکائے ہمارے بزرگ سوتے ہیں

☆

مجھ سے بچھڑ کے خوش رہتے ہو
میری طرح تم بھی جھوٹے ہو

☆

وہ زعفرانی 'پلوور' اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

☆

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے، ذرا فاصلے سے ملا کرو

☆

ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

☆

امیر لوگوں کی محرومیاں نہ پوچھ کہ بس
غریب ہونے کا احساس اب نہیں ہوتا

☆

مکاں سے کیا مجھے لینا مکاں تم کو مبارک ہو
مگر یہ گھاس والا ریشمی قالین میرا ہے

☆

گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عُہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

☆

پلکیں بھی چمک اٹھتی ہیں سوتے میں ہماری
آنکھوں کو ابھی خواب چھپانے نہیں آتے

☆

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے

☆

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

ڈاکٹر بشیر بدر ایم اے، پی۔ایچ ڈی (علیگ) (پ۔۱۵ فروری ۱۹۳۸ء)

جدید اردو غزل کا محترم نام ہیں۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں استاد کی حیثیت سے ابتدائی چند سال گزارنے کے بعد میرٹھ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو رہے۔مدھیہ پردیش، اُتر پردیش، دہلی، بہار، اور کشمیر کے متعدد انعاموں کے ساتھ انہیں ساہتیہ اکیڈمی کا کل ہند انعام بھی ملا ہے۔"پدم شری" (حکومت ہند) کے اعزاز یافتہ بھی ہیں۔۲۰۰۰ء میں عالمی انعام جشن بشیر بدر قطر اور دبئ (متحدہ عرب امارات) سے بھی سرفراز ہوئے ہیں۔یہ اعزاز ایک سال ہندوستان اور ایک سال پاکستان کے لیے وقف ہے۔بشیر بدر سے قبل فیض، مجروح اور سردار جعفری کو بھی یہ اعزاز مل چکا ہے۔

بشیر بدر ہندی اور اردو غزل میں مشترکہ طور پر سب سے محبوب نام ہیں۔دونوں زبانوں کے تنقید نگاروں نے انھیں نئی غزل کا سب سے اہم نام قرار دیا ہے۔ہندی ادب کی محترم شخصیت ڈاکٹر نامور سنگھ کا یہ فرمان ہے" آج غزل کی دنیا میں سب سے محبوب اور مقبول شاعر بشیر بدر ہیں"۔

ڈاکٹر رفعت سلطان، اردو و عربی میں ایم.اے ہیں۔عربی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری برکت اللہ یونیورسٹی سے حاصل کرنے کے بعد وہ آل سینٹس کالج بھوپال میں اردو کی استاد ہیں۔ڈاکٹر رفعت سلطان جدید اردو تنقید کا نیا اور معتبر نام ہیں۔اردو اور عربی پر انہیں یکساں قدرت حاصل ہے جدید اردو غزل پر ان کے مضامین اردو تنقید میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ان کی مرتبہ کتاب 'بشیر بدر فن و شخصیت' ہندو پاک کی جدید تنقیدی کتابوں میں ایک قابل ذکر کارنامہ مانی جاتی ہے۔اس تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ میں انھوں نے اردو، انگریزی اور ہندی کے جدید تنقیدی و تحقیقی رویوں کے توازن سے اپنا منفرد اسلوب نکالا ہے۔

امید ہے کہ بشیر بدر کے فن و فکر پر اور جدید غزل شناسی کے سلسلے میں ایک نیا باب ہوگی۔

بشیر بدر
فن و شخصیت
مُرتّبین
رفعت سُلطان
ڈاکٹر رضیہ حامد

بشیر بدر
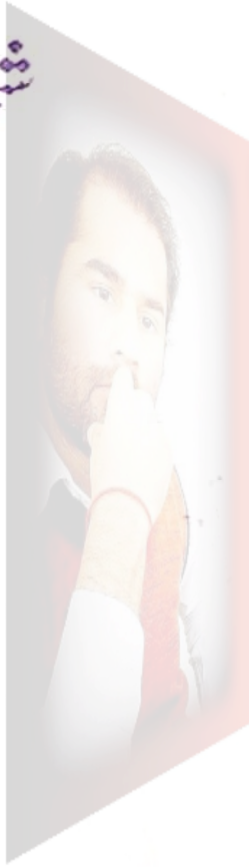
فن و شخصیت

مُرتبین

رفعت سُلطان

ڈاکٹر رضیہ حامد

وَخَیرُ جَلِیسٍ فِی الزَّمَانِ کِتَابٌ

دنیا میں سب سے بہترین ساتھی کتاب ہے۔
(متنبی)

بار اول	۶۰۰
سنہ اشاعت	۱۹۸۸ء
قیمت	۶۰ روپے
سرورق	محمد خلیق ٹونکی
کتابت وتزئین	سید عبدالحنان بھوپالی
پریس	اورنٹیل پرنٹنگ پریس نوئیڈا

ملنے کا پتہ

بابُ العلم پبلیکیشنز ایچ ۶۵ بی۔ سیکٹر ۲۲۔ نوائڈا۔ یوپی ۲۰۱۳۰۱

بھوپال بک ہاوس، بدھوارہ بھوپال ۴۶۲۰۰۱

انتساب

والدین

سیدہ بیگم صاحبہ اور سید فتح علی صاحب

کے نام
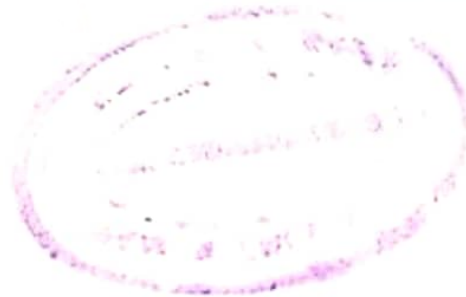
ترتیب

تراشے

پروفیسر آل احمد سرور - ڈاکٹر جمیل جالبی - سلامت اللہ خاں - پروفیسر اسلوب احمد انصاری - پروفیسر گوپی چند نارنگ - پروفیسر خلیل الرحمن اعظمی (مرحوم) پروفیسر محمد حسن - وارث کرمانی - شہریار - پرکاش فکری - صلاح الدین پرویز -

تنقیدی مضامین

جدید تشریحات (عملی تنقید)

شخصیت

ایک نظر

تراشے

مخمور سعیدی، ندا فاضلی، کمار پاشی، پروفیسر وہاب اشرفی، راج نرائن راز، کرامت علی کرامت، ڈاکٹر چندر کھا، پروفیسر محمد عقیل رضوی

تنقیدی مضامین

انتظاریہ

اقتباسات
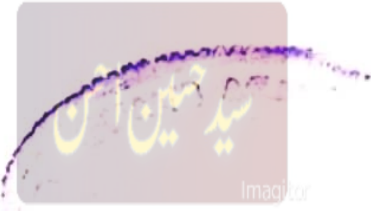
BASHIR BADR FAN-O-SHAQSIYAT

EDITED BY

Rafat Sultan & Dr.Razia Hamid

آغاز

ڈاکٹر بشیر بدر جدید غزل کے عہد ساز شاعر اور غزل کے منفرد نقاد ہیں ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسائل میں ان کا کلام بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا رہتا ہے۔ کئی ادبی رسائل نے ان کے فکروفن پر گوشے نکالے ایسے گوشے شبنم کی طرح پیاسوں کی تشنگی میں اضافہ کرتے تھے۔ کئی یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ ان میں شعروں میں دل میں اتر جانے کی بے مثال تاثیر ہے۔ ٹی۔ وی اور دیگر زبانوں کے اخباروں اور رسائل نے انہیں صرف اردو کا شاعر ہی نہیں بلکہ ہندوستان جیسے عظیم اور رنگا رنگ تہذیبی ملک کا محبوب اور مقبول شاعر بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ادبی شہرت کے ساتھ خوبصورت روایتیں اور مخالفانہ افواہیں ہر بڑے فنکار کا مقدر ہوتی ہیں۔ اس لیے بشیر بدر ایک زندہ LEGEND کہے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر کی شخصیت ان کا جادو جگاتا کلام ان کی معرکہ آرائیاں ان کی ذات سے وابستہ ہنگامے محفلیں اور رونقیں سب کچھ ان صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہم نے ایسے نقادوں اور ادیبوں سے شمولیت کی درخواست کی تھی جو تنقید کو منصفی کی حرمت سمجھتے ہیں۔ پھر ہمارے پاس اتنے وسائل بھی کہاں تھے جو ہزاروں صفحات کی تحریروں کو یکجا کر سکتے۔

بشیر بدر کے فکروفن پر پوری ادبی دیانتداری سے جن لوگوں نے لکھا ان کے محاسن کو پرکھا اور ان کے کمزور پہلوؤں کی ادبی اسلوب سے نشاندہی کی انہیں ادبی نگارشات سے ہم نے بشیر بدر کی ادبی تصویر ایک تجزیاتی اسلوب میں پیش کی ہے یہاں انہیں کا ایک شعر یاد آیا

سب مرے ہاتھ پاؤں لفظوں کے　　اور آنکھیں بھی روشنائی کی

ڈاکٹر بشیر بدر کی شخصیت سے متعلق کئی مضامین ابھی حرف آغاز اور تحقیقی مقالے کا ابتدائی مواد میں ان کے فکروفن پر سلجھے ہوئے نقادوں نے ایسے متوازن انداز میں لکھا ہے۔ جو بشیر بدر ان کے عہد کی غزل کیساتھ بڑی حد تک انصاف کرتے ہیں۔ ہماری یہ پرخلوص کاوش آپکی نذر ہے

رفعت سلطان

پروفیسر قمر رئیس

گزشتہ ربع صدی میں اردو غزل کے میدان میں جس تنوع اور توانائی کے آثار پیدا ہوئے ہیں اور 'آزاد غزل' کے عجوبہ سے قطع نظر غزل کی شاعری میں داخلی اور خارجی سطح پر جو مستحکم تجربے ہوئے ہیں ان کے سنجیدہ مطالعہ کی طرف ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی ہے۔ نئی غزل کے تناظرات کو بدلنے میں اس مدت میں بشیر بدر کی تخلیقی کاوشوں نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ تاہم یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بشیر بدر کی غزل گوئی پر چند تاثراتی اور تحسینی مضامین تو ضرور لکھے گئے لیکن کسی اہم نقاد نے علمی ڈھنگ سے ان کی غزل کا مطالعہ نہیں کیا۔ دوسری جانب ان کے بارے میں معاندانہ تنقید کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جس کا تازہ ترین نمونہ 'انداز' الہ آباد کے شمارہ ۲ میں 'آمد' پر تبصرہ ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ بشیر بدر کی صحیح قدرشناسی میں خود بشیر بدر کے ادعائی بیانات اور رویے بھی دخیل رہے ہیں۔ اردو کے قاری اور شاید ناقد بھی مقطع میں شاعر کی تعلی آمیز سخن گسترانہ باتوں کو جس خوش دلی سے گوارا کر لیتے ہیں۔ نثر میں شاعر کی خودستائی انھیں اتنی ہی ناگوار خاطر ہوتی ہے اور وہ اسے شاعر کی عامیانہ رعونت سمجھ کر بدک جاتے ہیں (حالانکہ اس صورتِ حال کا مطالعہ بھی ہمدردی اور معروضیت سے کیا جانا چاہیے) اتفاق سے ڈاکٹر بشیر بدر جدید شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید غزل کے نقاد بھی ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں جب انھوں نے آزادی کے بعد کی غزل پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تو ان کے دو شعری مجموعے 'اکائی' اور 'امیج' مکمل ہو چکے تھے۔ لیکن اپنی چار سو صفحات کی اس کتاب میں انھوں نے چار جملے بھی اپنی مدح میں تحریر نہیں کیے۔ البتہ مثالوں میں اپنے اشعار ضرور نقل کیے ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں۔

"دراصل ۱۹۷۲ء میں .... ایک بیج کی طرح میں نے اس مطالعہ کو اپنی شخصیت کے وسیلے سے جنم دیا تھا.... میں مطمئن ہوں کہ جب میں اینٹی غزل خود بھی لکھ رہا تھا اس وقت بھی اس کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی اور اسے ادبی ہزل سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا" ص۱۳

ان کا تیسرا مجموعہ 'آمد' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ جس میں اپنے ۲۰۳۵ء کے قارئین کے نام انھوں نے ایک خط شائع کیا ہے۔ اس خط میں بلاشبہ انھوں نے اپنی شاعری اور اپنی مقبولیت وشہرت کا ذکر مبالغہ کے ساتھ کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"آج ۱۹۸۵ء کی غزل میں مجھ سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقید حیات نہیں۔ ہندوستان کی ۷۵ کروڑ آبادی پاکستان کے ادبی مراکز، مغرب میں ٹورنٹو، شکاگو، نیویارک اور لندن کے ادبی حلقوں میں کتنے لوگ مجھے پسند کرتے ہیں اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔"

پھر وہ اس غیر معمولی مقبولیت کا سبب بھی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

"یہ مقبولیت میری نہیں بلکہ جدید وسائل ریڈیو۔ ٹی وی وغیرہ کی ہے۔"

یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن ان کے اندر بیٹھا غزل کا نقاد خود انکی غزل گوئی اور اس کے حلقۂ اثر کا جائزہ بھی لینے لگتا ہے اور اپنی نگاہِ تخیل سے یہ دیکھ لیتا ہے کہ نصف صدی بعد برصغیر میں جو غزل لکھی جائے گی وہ اسی کے اسلوب اور لہجہ کی آئینہ دار ہوگی۔ لکھتے ہیں۔

"آج غزل کے کروڑوں عاشقوں کا یہ خیال ہے کہ میری ناچیز غزل اردو غزل کے کئی سو سالہ سفر میں نیا موڑ ہے۔"

"میرا اسلوب آج کی غزل کا اسلوب بن چکا ہے۔ تنقید کی بد دیانتی اور نافہمی کے اکثر حربے اپنے آپ میں محدود ہو گئے ہیں۔ آج میرا اسلوب غزل کا محبوب اسلوب بن گیا ہے۔"

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کے عہد میں (یعنی ۲۰۳۵ء میں) جو غزل رواں دواں ہے اس کا آغاز مجھ ناچیز کے چراغوں سے ہوا۔"

آخر بیان تو مستقبل کی پیش گوئی ہے۔ جسے نظر انداز کیا جانا چاہیے کہ ہر شاعر

غالب نہیں ہوتا۔ جہاں تک پہلے بیان کا تعلق ہے اگر واقعی یہ شاعر کی نہیں بلکہ کروڑوں عاشقوں کی رائے ہے تو اس سے ہر اردو داں کو آشنا ہونا چاہیے۔ خواہ مخواہ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دراصل دوسرا بیان اس غیر ضروری خودستائی کے پیچھے کارفرما شاعر کی مجروح انا جھنجھلاہٹ اور تلخی کی غمازی کرتا ہے۔ اسے اصل شکایت اپنے لاکھوں قدر شناسوں سے نہیں بلکہ چند نقادوں سے ہے جو اس کے پرستاروں کے ہم خیال ہو کر اس کے اسلوب شعری کی داد نہیں دے رہے ہیں اور نہ ہی شاعر کے اس مقبول عام اسلوب کو اس عہد کی غزل کا اسلوب قرار دے رہے ہیں۔

یہ سوال الگ ہے کہ یہ شاعر کا زعم باطل ہے یا اس میں سچائی بھی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ بشیر بدر جیسا شائستہ منکسر المزاج اور مشرقی تہذیب کا پروردہ شخص جو بارہ پندرہ برس پہلے تک اپنی شاعری کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا اور اپنے تجربات کو انتہی ہزل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، اچانک ایسی جارحانہ خودستائی پر کیوں اتر آیا؟ اس کا جواب گزشتہ پندرہ سال میں مشاعرہ میں ان کی بے پناہ ڈرامائی مقبولیت میں ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

مشاعروں میں اپنی روز افزوں مقبولیت سے وہ کس درجہ متاثر ہوئے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس اثر پذیری نے ان کی شاعری کی زبان اسلوب اور لہجہ کو بدل کر رکھ دیا۔ 'آمد' اور بڑی حد تک 'امیج' کی غزلیں فارسی ترکیبوں، اضافتوں اور اظہارات سے پاک ہیں۔ میری دانست میں یہ مشاعروں میں (جن کے سامعین کی غالب اکثریت غیر اردو داں حضرات پر مشتمل ہوتی ہے) ان کی غیر مشروط پذیرائی کا سبب کم نتیجہ زیادہ ہے۔ ورنہ ۱۹۷۰ء سے قبل کی ان کی غزلوں کے پہلے مجموعہ 'اکائی' بے شمار اشعار فارسی ترکیبوں سے بوجھل نظر آتے ہیں۔ بشیر بدر 'آمد' میں لکھتے ہیں۔

> "اب غزل کا عالمی اور جدید منظر نامہ فارسی زدہ اردو غزل کے طریقۂ کار اور منظر نامہ سے مختلف ہو چلا ہے۔ یہ کارنامہ میرا ہے کہ میری غزل اس سفر کا آغاز تھی۔"
>
> "آج غزل کا مسئلہ کیا ہے؟ غزل کروڑوں دلوں پر راج کر رہی ہے۔ پڑھنے والے سوا لاکھ ہیں تو غزل کے سننے والے مختلف وسیلوں سے

کروڑوں میں ہیں۔ یہ کروڑوں عاشقانِ غزل ہمارے ذہین نقادوں کی نگاہ میں اس لیے نامعتبر ہیں کہ یہ فارسی غزل کی اترن لفظیات اور استعارات سے ناواقف ہیں اُن کے مقابلہ میں میرا خیال ہے کہ یہ زندگی کے ذہین لوگ ہیں جو ان الفاظ اور مردہ تراکیب سے بے خبر ہیں جن سے انھیں ناواقف ہونا چاہیے"۔

بشیر بدؔر کا یہ دعویٰ تو صحیح ہے کہ انھوں نے اپنی دوسرے دور کی شاعری میں فارسی ترکیبوں سے عاری، بول چال کی سادہ رواں اور عام فہم زبان میں غزل کہی ہے اور یہ ان کے منفرد اسلوب کا روشن پہلو ہے لیکن ان کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ یہی اس عہد کا 'طرزِ بیاں' ٹھہرا۔ شاید اس نتیجہ تک وہ اس لیے پہنچے کہ پچھلے پندرہ سال میں وہ مشاعروں مین ایسی غزلیں کثرت سے سنتے آئے ہیں جو لفظیات کے اعتبار سے ان کی غزل سے مشابہ ہوتی ہیں اور جن کی تفہیم کم خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کے لیے آسان ہوتی ہے۔ اسی طرح غزل کی فارسی آمیز زبان اور غزل کے روایتی رموز و علائم کے تئیں ان کا تحقیر آمیز رویہ بھی کسی مغالطہ پر مشتمل ہے۔

ہم عصر غزل میں تخلیقی اظہار کسی ایک اسلوب کا پابند نہیں اور نہ ہی نئی غزل، غزل کے روایتی علامتی اظہارات سے عاری ہے۔ فراؔق اور فیضؔ کے بعد کی غزل میں بھی مجروحؔ حسن نعیمؔ، احمد فرازؔ، بانیؔ، پروین شاکرؔ، شہریارؔ سب ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ ایسے نوجوان شاعر تو ہیں جو مشاعروں میں بشیر بدر کی بے پناہ مقبولیت سے رشک و حسد کرتے ہیں اور ان کی نقل کرتے ہیں۔ لیکن شاید ایسا کوئی اہم شاعر نہیں جو بشیر بدر کا پیرو ہو۔ ان کے رنگِ سخن سے متاثر ہو۔ ملے

بشیر بدر جیسی تخلیقی صلاحیت کے شاعر نے اپنی شاعری کی قدر و قیمت کو مشاعروں کی پُرفریب شہرت سے وابستہ کر کے یقیناً غلطی کی ہے۔ اس حقیقت کا احساس انھیں اس وقت ہوگا جب وہ مشاعروں کے محبوب شاعر نہیں رہیں گے اور انکی جگہ دوسرے لے لیں گے۔ لیکن جدید شاعری کے ناقدین بھی ان کی شاعری کو نظر انداز کر کے کچھ ایسی ہی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ بشیر بدؔر کی غزل سے تعصب اور تفریق کا سلوک کرنا نئی غزل کے ساتھ صریحاً بے انصافی کرنا ہے۔ بشیر بدؔر ہم عصر غزل کے نمائندہ شاعر

ہی نہیں اس کی مقبولیت اور رفعت کے ایک اہم معمار بھی ہیں ۔ جدید تر غزل میں انکی آواز اپنے گوناگوں شعری محاسن کے لحاظ سے ایک پہچان رکھتی ہے۔

ساتویں دہے میں جدیدیت کے پہلے بڑے حملے میں اردو کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی اکثریت ایسی تھی جو مقاومت نہ کرسکی۔ کچھ تو شہید ہو گئے کچھ مجروحین کی صف میں دیکھے گئے۔ بشیر بدر کی اس دور کی شاعری میں جراحتوں کے نشانات گنے جا سکتے ہیں یوں بھی اس خیال سے کچھ حیرت ہوتی ہے کہ یوپی کے چھوٹے اور نیم پسماندہ شہروں میں زندگی بسر کرنے والا شاعر اتنا "جدید" کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ نظم نہیں غزل کے روایت گزیدہ فارم میں چونکا دینے والے تجربے کرنے پر قادر ہو جائے۔ لیکن جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان جرأت آزما تجربوں کے باوجود انھوں نے نہ تو کبھی غزل کی صنفی حرمت پر آنچ آنے دی۔ نہ اس کے آداب سے کھلواڑ کیا (دوچار ٹیڈی یا ٹیڑھی غزلیں استثنائی ہیں) نہ ہی فیشن زدہ تنہائی ' بے چہرگی اور بے گانگی جیسے مجہول تصورات سے اسے داغدار بنایا تو یقین ہوجاتا ہے کہ' جدیدیت' کی شکست وریخت نے انھیں فائدہ ہی پہنچایا۔ کم از کم روایتی غزل کے بندھے ٹکے روپ اور تخئیلی سانچوں سے انھیں آزاد اور منحرف کردیا۔ آگے کا سفر انھوں نے اپنے تخلیقی وجدان' اعتماد اور خود آگہی کے سہارے طے کیا۔ یوں بھی ۱۹۶۹ء کے اکائی کے نوٹس میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ "جو لوگ جدیدیت کو طے شدہ اجتماعی نظریات کی تحریک سمجھتے ہیں اس (جدیدیت) سے میری اور میری شاعری کی واقفیت تک نہیں"۔ یہیں انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ "عملی طور پر میرا نظریۂ زندگی اور نظریۂ شاعری ذرا بھی طے شدہ نہیں ..... میرے یہاں ہر شعر اپنا نظریۂ شعری اپنے ساتھ لیکر وجود میں آتا ہے"۔

آخر کے دونوں بیان بے حد مبالغہ آمیز ہیں ۔ فکر و نظر رکھنے والے ہر تخلیق کار کا ایک نظریۂ زندگی اور نظریۂ فن ضرور ہوتا ہے جو نمو پذیر رہتا ہے اور جس کی روشنی میں اس کی فنکارانہ شخصیت نمو پاتی ہے۔ لیکن اپنے اس تصور پر اعتقاد نے بشیر بدر کی شاعری کو متاثر ضرور کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنے ہر سچے شعری تجربہ کو وہ بہ تمام و کمال ایک تخلیقی وحدت بنانے پر زور دیتے ہیں۔ اس تخلیقی رویے نے بشیر بدر سے تیر و نشتر جیسے خوبصورت شعر کہلوائے ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ بشیر بدر کی شناخت ان خوبصورت اور مفرد

شعروں سے زیادہ ہونے لگی اور ان کی شاعری سے کم ۔ دوسرے یہ کہ ان کی شاعری میں فکری ارتقا کے نقوش کم نمایاں ہیں (اس کے اسباب دوسرے بھی ہیں) اس کے نتیجہ میں وہ منفرد آب و رنگ جو ان کی تہ دار شخصیت کی آبیاری میں ان کی غزل میں رچ رہا تھا زیادہ روشن نہ ہوسکا۔ تاہم قریب سے دیکھنے پر اس کے عناصر کا سراغ لگانا مشکل نہیں ہے ۔

بشیر بدر کی غزل میں ابتدا سے جو نیا پن ملتا ہے اسے کوئی نام دینا آسان نہیں ہے ۔ البتہ ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی غزل آپ بیتی سے عبارت ہے انھوں نے روایتی مضامین یا 'عظیم موضوعات' کا مستعار لبادہ اپنی غزل کو نہیں پہنایا ۔ اسی طرح جدیدیت اور وجودیت کے مروجہ تصورات سے بھی دامن بچایا ہے ۔ اپنے جذبہ اور احساس کی آہٹوں کو انھوں نے تخیل کی نگہداری میں اس طرح سمیٹا ہے کہ ان کی غزل میں پیکروں کا جلترنگ سا سنائی دیتا ہے ۔

پیکر آفرینی یوں بھی مشکل آرٹ ہے ۔ جو ہر ایک کو ودیعت نہیں ہوتا ۔ بعض اچھے شاعر بھی کوشش کے باوجود پیکر تراشی کے فن سے بہرہ ور نہیں ہو پاتے ۔ پھر نازک ہونٹوں جیسے غزل کے دو مصرعوں میں کسی منظر کا متحرک نقش اس طرح ابھارنا کہ اس کے فطری رنگ قائم رہیں اور وہ ایک جمالیاتی تجربہ بن جائے بے حد دشوار عمل ہے ۔ اس لیے بھی کہ اس نوع کی تصویر کشی میں الفاظ صرف رنگوں اور لکیروں کا کام انجام نہیں دیتے وہ اسے استعارہ یا تمثیل بنا کر معنوی تلازمات کے لیئے دائرے بھی بناتے ہیں ۔ وہ شاعر کے ایک سے زیادہ یا مخلوط مشاہدات اور تجربات کو [illegible] شکل میں ادا کرنے کی قوت جگاتے ہیں اور اپنے صوتی آہنگ سے بھی ایک ایسی فضا خلق کرتے ہیں جو قاری کو شعری تجربہ کی اسراریت یا ندرت کا ادراک بخشتی ہے ۔

شعر میں لفظی پیکروں کو اہمیت دینے والی جدید شاعری میں دو رویے واضح نظر آتے ہیں ۔ ایک وہ جو شاعر کی نجی داخلی کائنات کو نجی علامتوں کے ذریعہ پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے اور دوسرا وہ جو شاعر کے داخلی تجربات اور حسیات کو خارجی حقائق کا عکس جانتا اور شعر میں ان کا اظہار خارجی حوالوں سے کرتا ہے ۔ بلاشبہ دوسرے رویے میں شعر کی معنوی ترسیل کا امکان زیادہ قوی ہوتا ہے ۔ یہ رویہ اردو غزل کی روایت سے میل بھی کھاتا ہے ۔ بشیر بدر کی غزل میں بھی اسی رویے کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے اس

نازک رشتہ سے ان کی غزل کلاسیکی غزل کی روایت سے جڑجاتی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ استعاراتی اور تمثیلی اظہار سے مناسبت کے باوجود وہ تشبیہہ سے منحرف نہیں ہوتے۔ اور اس سے پیکر آفرینی کا کام لیتے ہیں۔ لیکن ان کے اشعار میں محسوس ہوتا ہے کہ تجربہ کی تازگی نے ازخود موزوں تشبیہات تلاش کرلی ہیں۔ ایسی تشبیہات جو دوسرے شعراء کے یہاں نایاب ہیں۔

باتیں کہ جیسے پانی میں جلتے ہوئے دیے
کمرے میں نرم نرم اجالا سا بھر گیا

دکھ بھرا پیار، سمندر کی طرح لامحدود
غمزدہ حُسن رواں پانی میں گھلتا سونا

رات کی بھیگی بھیگی چھتوں کی طرح
میری پلکوں پہ تھوڑی نمی رہ گئی

روایت سے اس تعلق کے باوجود، جس کا ذکر آیا، بشیر بدر کی غزل کا مجموعی آہنگ UNCONVENTIONAL ہے۔ اس طرح کہ محبوب کا حسن ہو یا دوسرے مظاہر کائنات ان کا احساس و ادراک PERCEPTION ماقبل کے شاعروں اور معاصرین ــــ دونوں سے جدا، دونوں سے الگ ہے۔ حقائق حیات تو ایک ہی ہوتے ہیں لیکن ان کا احساس و ادراک .. PERCEPTION ہر ایک کے یہاں جداگانہ ہوتا ہے۔ تخلیقی فنکار کے یہاں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس نے حقیقتوں کا ادراک کیسے، کس سطح سے اور کس لمحے میں کیا ہے۔ اس کی ORGINALITY ... اپج اور خلّاقی کی آزمائش اس میں ہوتی ہے کہ اس نے فطرت، انسانی سماج اور فرد کے باہمی رشتوں اور رموز کا عرفان کیونکر حاصل کیا ہے۔ فطرت اور انسانیت کی کن اداؤں میں اس نے شیوۂ حسن تلاش کیا ہے اور انسانی تجربہ کو جمالیاتی تجربہ میں ڈھالا ہے۔

بشیر بدر کے یہاں تخلیقی عمل کا یہ رویّہ آزاد اور غیر رسمی بھی ہے اور منفرد بھی۔ اسکی انفرادیت کے کئی پہلو ہیں لیکن اس کی شناخت ان کے پیکروں کے تنوع اور ترجیحات

میں زیادہ آسانی سے کی جاسکتی ہے ۔ اسی میں ان کی شخصیت اور شعور حیات کے پنہاں گوشوں کا انعکاس بھی دیکھا جاسکتا ہے ۔مثال کے طور پر ان کی غزل میں رات کا پیکر بے حد نمایاں ہوکر بہ تکرار سامنے آتا ہے ۔لگتا ہے کہ شاعر کی باطنی اداسی اور محزونی سے رات کا گہرا رشتہ ہے ۔اس کے تخیل میں رات کی پراسرار ادائیں مستقل جگہ رکھتی ہیں ۔لیکن یہ رات اکثر اپنے جلو میں خنک چاندنی اور جھلملاتے تارے بھی لے کر آتی ہے ۔ یہ رات نیند کے ایسے گاؤں بساتی ہے جو خوابوں سے معمور ہیں ۔ یہ رات اپنی حزن آگیں لیکن رومان انگیز فضا سے جذبات کی لہریں اٹھاتی ہے ۔

رات بھیگی تو تھکے شہر کو یاد آنے لگے
نیند کے گاؤں جو آباد ہیں پلکوں کے تلے

بوجھل اداس رات تھی دونوں دلوں کے بیچ
ہم مسکرا دیے تو اُجالے برس پڑے

برف کے پھولوں سے روشن ہوئی تاریک زمیں
رات کی شاخ سے جیسے مہ و اختر برسے

پیچھے پیچھے رات تھی تاروں کا اِک لشکر لیے
ریل کی پٹری پہ سورج چل رہا تھا رات کو

جب رات کے سپرد مجھے کرنے آؤ گے
رومال روشنی کا ہوا میں اڑاؤں گا

سُرخ سنہرا صافہ باندھے شہزادہ گھوڑے سے اُترا
کالے غار سے کمبل اوڑھے جوگی نکلا رات ہوئی

یاد جب گھر کی کبھی آتی ہے تو لگتا ہے
رات کی راہ میں شیشے کا مکاں روشن ہے

تھوڑی دیر میں ایک چراغوں کی تھالی
کالی بلی سر پر رکھ کر آئے گی

ان لفظی پیکروں میں رات کی پر اسرار تاریکی ایک سخت اور سنگین حقیقت ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو چاند تاروں کے لشکر بھی ہیں۔ آرزو اور امید کی کرنیں، اداسی اور اندھیرے کا سینہ چیر دیتی ہیں۔ شاعر کو اس سچائی پر اعتماد ہے کہ ؂

شام کے پیڑ کی اُبھری شاخ پہ پتیوں میں چھپا کوئی جگنو بھی ہے

ایک حقیر کیڑا صرف اس لیے جگنو بن جاتا ہے کہ وہ روشنی کا پیغامبر ہے۔ یہ رجائی رویہ بھی بشیر بدر کو دوسرے جدید شعراء سے متمائز کرتا ہے۔ روشنی کی یہی جستجو انھیں اجلی دھوپ کے روشن پیکروں کے قریب لے آتی ہے۔ دھوپ کے پیکر بڑی کثرت سے ان کی غزل میں ڈوبتے اور اُبھرتے ہیں۔ یہ دھوپ روشنی اور زندگی کی بشارت ہے۔ تابناکی، روئیدگی اور شادابی کی علامت ہے۔ جبکہ دوسرے جدید شعراء کے یہاں دھوپ اکثر زندگی کی سختیوں کی علامت بن جاتی ہے۔

صبح بستر سے اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی
دھوپ کی آہٹ پہ چونک اٹھے ہیں مندر کے کلس

آنکھوں میں مسکرائی ہوئی نرم دھوپ سے
کس طرح سرد برف کے پتھر پگھل گئے

میں یہ سمجھا کہ لوٹ آئے تم
دھوپ کل اتنی اجلی اجلی تھی

دھوپ کا ہرا بھرا آگ کے سمندر میں چل پڑا ہمیں لینے
نرم و گرم ہونٹوں سے بند ہوتی پلکوں پر تتلیوں کے پر رکھ دو

دھوپ آتی ہے مجھ کو پھیلانے
شامیانہ مرا ہوا تانے

یوں تو بشیر بدر کی غزل میں محاکاتی حسن رکھنے والے بے شمار پیکر اُبھرتے ہیں۔ لیکن ایسے لفظی پیکر جو بار بار آتے ہیں اور اپنی رمزیت سے معنویت کے نئے دائرے بناتے اور قاری کو متاثر کرتے ہیں وہ برف، ہوا، دریا سبز رنگ، صبح و شام، گھریلو زندگی اور گاؤں کے پیکر ہیں۔ میں ان کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ یہ کام دوسرے جدید ناقدین مجھ سے بہتر انجام دیں گے۔ تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ بشیر بدر کی غزل سے پہلے اردو غزل میں گاؤں داخل نہیں ہوا تھا۔ بشیر بدر نے اپنی غزل میں گاؤں کی معصوم سیدھی سادی اور حیات پرور زندگی کی تصویریں دکھائی ہیں۔ یہ ان کی خاص دین ہے۔ وہ بعض دوسرے جدید شعراء کی طرح شہروں کی صنعتی زندگی کے آشوب سے گھبرا کر گاؤں اور جنگل میں پناہ نہیں لیتے کہ یہ بھی ایک منفی رویہ ہے۔ گاؤں کے گرد پھیلی فطرت کے نرم آغوش میں معصوم اور جیالے انسانوں کی سادگی اور خوبصورتی کے دلکشا منظر انھیں یاد آتے ہیں اور ان کے قلب و نظر کو آسودگی بخشتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے جو انسان کو زندگی کرنے کی قوت دیتا ہے۔

دھوپ میں کھیت گنگنانے لگے
جب کوئی گاؤں کی جیالی ہنسی

دھوپ کھیتوں میں اتر کر زعفرانی ہوگئی
سُرمئی اشجار کی پوشاک دھانی ہوگئی

سردیوں کی راتوں میں اپنے گاؤں میں گرد الاؤ کے بیٹھے
ہم سے کتنے دیوانے، تیرے میرے قصّوں میں اپنا غم سناتے ہیں

گاؤں کی کوئی گوری توڑ کر ہر اِک ناطہ دور دیس جاتی ہے
ان گھنے درختوں میں آج دف نہیں بجتے کھیت سر جھکائے ہیں

اس پہاڑی علاقہ میں اِک گاؤں کے موڑ پر آتی جاتی بسوں کے لیے
دو درختوں کی مشفق گھنی چھاؤں میں گرم چائے کی مانوس خوشبو بھی ہے

آخر شعر کی طویل مترنم بحر بشیر بدر کی پسندیدہ بحر ہے۔ فاعلن کے سولہ ارکان پر مشتمل یہ متدارک بحر جزئیات نگاری کا امکان بھی رکھتی ہے۔ بشیر بدر نے بے شمار غزلوں میں اس کی موسیقی اور وسعت سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن بعد میں اس بحر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

بشیر بدر کی غزل کا ایک اور پہلو اس کی نازک ڈرامائی کیفیت ہے۔ جو طویل بحر کے علاوہ دوسرے اشعار میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے اکثر اشعار محض ایک واردات نہیں۔ ایک کہانی کا انکشاف کرتے ہیں۔ شاعر شعر کے در و بست میں چپکے سے کوئی سرگزشت کوئی حکایت سُنا کر الگ ہو جاتا ہے کہیں کہیں ڈرامائی کشمکش بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اکثر اس پر استعارے یا علامت کی باریک نقاب پڑی رہتی ہے۔ واقعاتی فضا رکھنے والے اس طرح کے متحرک شعری پیکر بشیر بدر کی غزل کا خاص اسلوب بن گئے ہیں۔

پھول سی قبر سے اکثر یہ صدا آتی ہے
کوئی کہتا ہے بچالو۔ میں ابھی زندہ ہوں

سُنا ہے اس پہ چہکنے لگے پرندے بھی
وہ ایک پودا جو ہم نے کبھی لگایا تھا

بکھرے شیشوں پہ گھر کے ٹوٹے گئے
نیند میں ننگے پاؤں چلتے خواب

کل شام عجب ہوا تھی بجھتے دیئے کی لَو میں
وہ آنسوؤں کا کاغذ ہم نے جلا دیا ہے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ' ترا ہم سفر کہاں ہے

مزید اشعار نقل کیے جا سکتے ہیں۔ اس نوع کے اشعار میں جو حزن و درد ہے وہ ذاتی بھی ہے اور اس کا رشتہ اس عہد کے آشوب و ابتلاء سے بھی گہرا ہے۔ ذاتی محرومیاں جب تک اجتماعی دکھ درد کے احساس سے ہم آہنگ ہو کر انسان محرومیوں کے کرب میں نہ ڈھلیں تاثر آفریں شعر کا قالب اختیار نہیں کرتیں۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ بشیر بدر زندگی کے اہم پاکستان موضوعات یا جلتے ہوئے مسائل پر قلم نہیں اٹھاتے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ مسائل ان کی روح میں ہلچل نہ مچاتے ہوں۔ ظالمانہ اونچ نیچ، ہمہ گیر تشدد، عالمی جنگ کے مہیب بادل اور صنعتی زندگی کے بھاری قدموں تلے انسانی جذبوں کی پامالی ایسے حقائق ہیں جو ان کا دل بھی لہو کرتے ہیں۔ اس دردمندانہ احساس کی گواہی بہت سے اشعار میں ملتی ہے۔

غبارہ پھٹ رہا ہے ہواؤں کے زور سے
دنیا کو اپنی موت کا اب انتظار ہے

سر پر کھڑے ہیں چاند ستارے بہت مگر
انسان کا جو بوجھ اٹھا لے زمین ہے

دنیا کے بدصورت جتنے ڈھک جاتے
اپنے پاس کوئی ایسی چادر ہوتی

میں تمام تارے اٹھا اٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دیں مرے ہات میں

مرا کیا کہیں بھی چلا جاؤں گا
مگر راستہ تو بنا جاؤں گا

بشیر بدر کی دردمندی اور انسان دوستی کی طرف اشارہ میں نے اس لیے کیا کہ عام طور پر انھیں رومانی احساس و تخیل کا شاعر سمجھا جاتا ہے اور اس میں خاصی صداقت بھی ہے وہ جن رموز و اشارات سے کام لیتے ہیں وہ نازک اور لطیف ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتی دھند میں لپٹے ہوتے ہیں۔ اس کے باوصف یہ بات حیرت کا باعث ہے کہ بشیر بدر نے گذشتہ دو دہوں میں نئی غزل کو جو ڈکشن دیا ہے وہ عام بول چال کی مانوس زبان سے ماخوذ ہے۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب ان کے تجربات روزمرہ کی گھر باہر کی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں اور وہ عام انسانوں کی سطح پر جینے کا ہنر جانتے ہوں۔ اس سلسلہ میں بشیر بدر کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے غزل کے پیکر میں ایسے بے شمار الفاظ تخلیقی حسن کے ساتھ داخل کر دیئے جن کو غزل نے اس سے قبل شرف قبولیت نہیں بخشا تھا۔ آرزو لکھنوی نے 'سریلی بانسری' میں اضافتوں کی سادہ اور سلیس زبان کے استعمال کا جو تجربہ کیا تھا وہ بے حد شعوری تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ کلاسیکی غزل کی مانوس فضا سے بہت کم انحراف کر سکے۔ اس لیے ان کی ٹھیٹھ زبان تخیل اور حقیقت کے ان امکانات کا سراغ نہیں لگا سکی جہاں بشیر بدر نے رسائی حاصل کی۔

بدلتی ہوئی ہم عصر زندگی اور حسیت کی ترجمانی کرنے والے نئے الفاظ کا استعمال نئی غزل کا ایک رجحان رہا ہے۔ اس کا اعتراف بشیر بدر نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ غزل میں نئے الفاظ کو برتنے کا کام کسی تخلیقی بصیرت کا تقاضہ کرتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"مسئلہ یہ بھی ہے کہ کسی زبان میں جو لفظ شاعرانہ سیاق و سباق میں استعمال نہ ہوا ہو اس کا پہلی بار شاعرانہ اور تخلیقی استعمال معمولی کام نہیں ہے۔ ورنہ وہ الفاظ جو نئی زندگی کا چلن ہوتے ہیں ان میں نئی زندگی کی تہ داریوں اور رمزیت کو پیش کرنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں نئے الفاظ کے نئے مزاج کو پہچاننا اور ان سے پورا کام لے لینا شاعرانہ قوت اور فنکاری کی دلیل ہے۔ لیکن اس میں شاعری کے ناشاعری اور منظوم نثر

ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے اور یہ کام کمزور تخیل اور انفرادیت سے عاری تقلیدی شعراء کے بس کا نہیں ہے ۔"

آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ ص۲۰۲

یہاں بشیر بدر نے جو باتیں اٹھائی ہیں ان میں سچائی ہے ۔ خود انھوں نے نئے الفاظ کے استعمال میں احتیاط اور تخلیقی بصیرت سے کام لیا ہے ۔ دوسرے جدید شعراء مثلاً ظفر اقبال کے مقابلہ میں ان کی کوششیں زیادہ کامیاب اور قابلِ داد ہیں ۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے بول چال کی ٹھیٹھ اردو کو اپنایا ہے ۔ روز مرّہ یا بول چال کی شعری زبان میں نئے الفاظ کسی شعوری کوشش کے بغیر وزن کے ارکان میں اپنے لیے موزوں جگہ بنا لیتے ہیں ۔

ایسے صرف چند اشعار دیکھئے ۔

گزارے ہم نے کئی سال ایسے دفتر میں
کنواری لڑکی رہے جیسے غیر کے گھر میں

آجاتا ہے خود کھینچ کر دل سینہ سے پٹری پر
جب رات کی سرحد سے اک ریل گزرتی ہے

بلڈنگیں لوگ نہیں ہیں جو کہیں بھاگ سکیں
روز انسانوں کا سیلاب بڑھا جاتا ہے

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رک جائے
سڑک پہ چلنے لگے تو ہمارا جیسا لگے

سنسان راستوں سے سواری نہ آئے گی
اب دھول سے اَٹی ہوئی لاری نہ آئے گی

بہت سنبھال کے رکھا تھا نیک بیوی نے
ہوا چلی تو برادہ بکھر گیا گھر میں

یہاں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ اشعار کی معنویت اور الفاظ کے صوتی آہنگ میں یہ ذرا بھی اجنبی نہیں لگتے۔ اس میں شاعر کی خلاقی اور اپج کا بھی بڑا دخل ہے۔

ـلہ اب جدید غزل گوان کی (بشیر بدر) کی تقلید کر رہے ہیں (وحید اختر شب خوں)

فی زمانہ جدید تر غزل گوان کی تقلید کر رہے ہیں۔ ہندو پاک کے جدید تر غزلیہ شاعری پر ان کے جلی اور خفی اثرات واضح تر نظر آتے ہیں۔ لوگ باگ ان سے نئی غزلیہ فیض و عرفان حاصل کر رہے ہیں۔ آج ان کا دلاویز اسلوب غزل کا محبوب اسلوب بن گیا ہے۔ نظام صدیقی۔

ایک محتاط اور ذمہ دار سروے کے مطابق بشیر بدر کی صرف ایک غزل جس کی ردیف 'بابا' ہے اس سے متاثر ہو کر رسالے اور مشاعرے کے اہم شعراء نے ڈھائی ہزار غزلیں کہیں۔ ان شاعروں نے اپنی غزلیں شائع کراتے وقت ایسی غزلوں کو بشیر بدر کے نام معنون و منسوب کیا۔ (رضیہ حامد)

------*---*---*---*---*---*---*---*

پروفیسر گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر بشیر بدر پیارے شاعر ہیں اور اتنے پیارے انسان بھی ہیں۔ جب انہیں مشاعرے لوٹتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر دل عزیزی میں جو عوامی جہت شامل ہے ہمارے دور میں اس کا رشتہ بین لسانی نوعیت کا بھی ہے۔ یعنی کہ اردو کو دوسری علاقائی زبانوں سے جوڑتا ہے، اور اس کی بڑی ضرورت ہے۔ بشیر بدر کی غزل کی داد ادب کے بڑے بڑے پارکھوں نے دی ہے، میں تو کسی شمار قطار میں نہیں بس ایک ادنیٰ مداح ہوں۔

جو خوش رنگ تتلی کو دیکھتا ہے، تتلی ہوا میں اڑ جاتی ہے، لیکن فضا میں رنگ بکھر جاتا ہے۔ جیسے کسی کے بالوں میں کوئی خوبصورت فیتہ چمک جائے، یا کاندھے پر گلابی شال لہرا اٹھے۔ زندگی کی اس خوبصورتی کو حواس میں بسا لینا اور دوسروں تک منتقل کرنا ایک عبادت بھی ہے اور سماجی خدمت بھی۔

------*---*---*---*---*---*---*---*

نئی غزلیہ تخلیقیت

کا

بشیر بدر

نظام صدیقی

ڈاکٹر بشیر بدر نہایت فطری طور پر اپنے جسم کے ہر بن مو تک، اپنے مشام جاں تک، اپنے خون کے ہر قطرہ کی گہرائی تک، اپنے شعور سے لاشعور اور اجتماعی لاشعور تک ہی نہیں بلکہ اپنے آفاقی[1] لاشعور کے سیاہ سمندر سے رفیع تر شعور، رفیع تر اجتماعی شعور بلکہ رفیع ترین منور آفاقی شعور تک ایک تخلیقیت پسند تخلیقیت بہ روز تخلیقیت افروز اور تخلیقیت کشا غزل گو ہیں۔ ان کی نئی غزلیہ تخلیقیت ہر نوعیت کی فکری اور فنی فرقہ واریت کا ارتفاع کر حقیقی تخلیقی بصیرت CREATIVE AWARENESS اور تخلیقی حسیت سے ہم آہنگ ہے CREATIVE SENSIBILITY اور بشیر کسی بھی نوعیت کے جذباتی شور و شر اور ژولیدہ خیالی سے گریزاں ہے اس نئی غزلیہ تخلیقیت کی جست وجود کی تحت الثریٰ سے اکثر فکر و نظر کے ساتویں آسمان تک محیط ہے در حقیقت گہرائی اور اونچائی دائروی سطح پر ایک ہے۔ ان کا غزلیہ لفظ و معانی بیشتر بے مثال تاثیر آفریں اور کیف انگیز ہے اور حسب توفیق بصیرت افروز بھی جو در حقیقت ڈاکٹر بشیر بدر کی نئی اور انوکھی موزونیت طبع کے ساتھ نئی اور انوکھی موزونیتِ شعر کے نہایت والہانہ طور پر باہم گیر ایک ہونے کا بیساختہ معجزہ ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر ایک غیر معمولی تخلیقی اور زنانہ ذہن (ANDROGYOUS) کے مالک ہیں۔ جس میں دھرتی کے نمک اور آسمان کی روشنی کا ایک عجیب سا دلاویز اور حیرت ناک امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کا دل کلی عشق اور ان کا ذہن کل آگہی کا سرچشمہ ہے۔ صرف ایسی ہی ایک غیر منقسم، متوازن اور ہم آہنگ شخصیت ہی حقیقی تخلیقیت کی حامل ہو سکتی ہے جو اپنے دور اور حالات کی رستخیزی اور اپنی چھیلی اور بھوگی ہوئی سچائی کو

---

[1] اس ضمن میں مزید تفصیل و تنویر کے لئے میرا آرٹیکل "اردو تنقید میں تخلیقیت کا میلان" ملاحظہ فرمائیں (نظام)

جذب کرکے غزلیہ تجربہ بنانے پر قادر ہوتی ہے اور روایتی غزلیہ زبان و بیان کی حد درجہ رسمی اور فرسودہ لسانی اور اسلوبی عادت کے برخلاف یکسر منفرد تازہ، شاداب اور روح آگیں زبان و بیان کے طلساتی پیکر عطا کرتی ہے۔ درحقیقت تخلیقی بصیرت بیک وقت وجدان سلیم اور عقل سلیم سے بہرہ ور بلند پایہ خلاق کی ذات سے واصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کا تخلیقی عرفان (CREATIVE VISION) ہی ان کا تخلیقی مافیہہ اور تخلیقی پیکر ہے۔ ان کی زندہ اور بیدار ہستی (BEING) ہی ان کا غزلیہ آفاق BECOMING ہے۔ وہ حقیقی جمالیاتی آہنگ کی برقی توانائی کے نہ صرف تجربہ کش (EXPERIENCER) بلکہ ایک غیر معمولی شاہدانہ شعور (WITNESSING AWARENESS) کے (بیک وقت) حامل غزل گو ہیں جو تمام کائنات میں رواں دواں ہے اور ان کی ذات کے اندر پوشیدہ غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کو بیدار کرتی ہے۔ یہ حقیقی تخلیقیت نہایت فطری طور پر ان کو فی زمانہ فیشن زدہ جدیدیت پسندانہ تقلیدیت اور ادارہ گزیدہ ترقی پسندانہ تلقینیت سے بھی روگرداں کر ان کی نئی منفرد (بشیر بدری) غزل کو یکسر نئی اقداری معنویت اور جمالیاتی جاذبیت کا امین بناتی ہے۔

ان کی غزل کی کنایوں "اکائی"، "امیج" اور "آمد" میں بشیر بدر کے شہرآشوب اور عہد آشوب بھی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بشیر بدر بنیادی طور پر دل آشوب کے شاعر ہیں تاہم اب ان کی ذات، فکر اور فن میں زندگی کی مکمل قبولیت کی تخلیقی بصیرت اور تخلیقی حسیت بھرپور طور پر پیدا ہوگئی ہے۔ موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی ہشیاری اور بیداری ہے۔ حقیقی محبت اور حقیقی بصیرت کا خوب صورت آمیزہ اب بشیر بدر کی غزل کا جگمگاتا ہوا نیا اور انوکھا غزلیہ نشانِ امتیاز ہے۔ جبکہ ان کے دوسرے معاصرین جزوی محبت اور جزوی عقل کے قتیل ہیں۔ ان کی عاشقہ بیوی کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کی غزلوں میں المیہ کی گہرائی اونچائی پیدا ہو رہی ہے جس کے امکانات کی غزلیہ تکمیل خوش آئند ہوگی۔ ان الم آلود غزلیہ اشعار کی جدت فکر، حسیاتی اور جذباتی خلوص اور ندرت اظہار خاطر نشیں ہو۔

اداسی کا یہ پتھر آنسوؤں سے نم نہیں ہوتا	ہزار جگنوؤں سے بھی اندھیرا کم نہیں ہوتا
کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں	ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا
میں نے دریا سے سیکھی ہے پانی کی پردہ داری	اوپر اوپر ہنستے رہنا، گہرائی میں رو لینا
سب لوگ سمجھتے ہیں کہ تم لوٹ گئے ہو	تم ساتھ تھے، تم ساتھ ہو، تم ساتھ رہو گے

لے مرحومہ قمر جہاں شبنم

گلابوں کی طرح دل اپنا شبنم میں بھگوتے ہیں
محبت کرنے والے خوبصورت لوگ ہوتے ہیں

یہی انداز ہے میرا سمندر فتح کرنے کا
میری کاغذ کی کشتی میں کئی جگنو بھی ہوتے ہیں

کاغذ اور قلم شاہد ہیں لفظوں کی اُمت جھوٹی ہے
آدھی رات کا تنہا آنسو پاک نبی ہے آنکھوں میں

ساحل پہ کتنے لوگ مرے ساتھ ساتھ تھے
طوفاں کے زد میں آیا تو تنکا نہیں ملا

کیسے کٹے گی تنہا تنہا
اتنی ساری عمر پڑی ہے

جس طرح واپس کوئی لے جائے اپنی چٹھیاں
جانے والا آج کتنا کر گیا تنہا مجھے

تم نے دیکھا ہے کسی میرا کو مندر میں کبھی
ایک دن اس نے خدا سے اس طرح مانگا مجھے

میری مٹھی میں سلگتی ریت رکھ کر چل دیا
کتنی آوازیں دیا کرتا تھا یہ دریا مجھے

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیئے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

دل، محبت، دین، دُنیا، شاعری
ہر دریچے سے تجھے دیکھا کریں

گھر نیا، برتن نئے، کپڑے نئے
ان پرانے کاغذوں کا کیا کریں

یہ چراغ بے نظر ہے، یہ ستارہ بے زباں ہے
ابھی تجھ سے ملتا جلتا کوئی دوسرا کہاں ہے

میرے ساتھ چلنے والے تجھے کیا ملا سفر میں
وہی دکھ بھری زمیں ہے وہی غم کا آسماں ہے

کبھی پا کے تجھ کو کھونا، کبھی کھو کے تجھ کو پانا
یہ جنم جنم کا رشتہ تیرے میرے درمیاں ہے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا، ترا ہمسفر کہاں ہے

پاس سے دیکھو جگنو آنسو، دور سے دیکھو تارہ آنسو
میں پھولوں کی سیج پر بیٹھا آدھی رات کا تنہا آنسو

میری ان آنکھوں نے اکثر غم کے دونوں پہلو دیکھے
ٹھہر گیا تو پتھر آنسو، بہہ نکلا تو دریا آنسو!!

اپنے بچپن کا قصہ ہے اک تصویر بنائی اس نے
مہندی والے ہاتھ رچے تھے بیچ ہتھیلی ٹپکا آنسو

موسم کی خوشبو میں اکثر غم کی خوشبو مل جاتی ہے
آموں کے باغوں میں کیسے ساون ساون برسا آنسو

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

ریت بھری ہے ان آنکھوں میں آنسو سے تم دھو لینا
کوئی سوکھا پیڑ ملے تو اس سے لپٹ کے رو لینا

اس کے بعد بہت تنہا ہو جیسے جنگل کا رستہ
جو بھی تم سے پیار سے بولے ساتھ اسی کے ہو لینا

کچھ تو ریت کی پیاس بجھاؤ جنم جنم کی پیاسی ہے
ساحل پر چلنے سے پہلے اپنے پاؤں بھگو لینا

کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دھوپ ہوں کبھی دھول ہوں
میں تمام کپڑے بدل چکا ترے موسموں کی برات میں

ان کی دل و دماغ پر منڈلانے والی خوشنما اور دل ربا غزلیں اردو غزل کی تواریخ میں ایک نیا اور انوکھا موڑ ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری، مزاج، موضوع، زبان، اسلوب اور آہنگ غرضکہ ہر اعتبار سے اردو شاعری میں ایک خوشگوار اضافہ ہے اور غزل کے روایتی مزاج کو بدلنے میں بھرپور طور پر کامیاب ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر نہ صرف اپنے ہم عصروں پر اثر انداز ہوئے ہیں بلکہ نئی نسل کے جدید تر غزل گو ان کی تقلید کر رہے ہیں۔ ہند و پاک کی جدید تر غزلیہ شاعری پر ان کے جلی اور خفی اثرات واضح تر نظر آتے ہیں۔ لوگ باگ ان سے نئی غزلیہ فیض و عرفان حاصل کر رہے ہیں۔ آج ان کا دلآویز اسلوب غزل کا محبوب اسلوب بن گیا ہے۔

بشیر بدر ہند و پاک کی نئی غزلیہ شاعری کے درخشاں ہفت سیارہ (ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، شکیب جلالی، بشیر بدر، شہزاد احمد، بانی اور ساقی فاروقی) میں ایک بیحد خوشنما اور خوش اسلوب شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی غزل اپنے دور کی روح میں گھومتا ہوا آئینہ ہے جس میں ان کی باطنیت کی وسعت اور ہمہ گیری اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ انہوں نے عظیم غزلیہ ادب کے زندہ تابندہ اور پائندہ روایات سے انتخابی رویئے کے ساتھ روحانی فیضان حاصل کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تمام تہذیبی، سیاسی، سماجی اور فکری تبدیلیوں کے اثرات قبول کئے اور نئے دور کے نئے موضوعات، مسائل، افکار و تناظر سے اپنی گہری حسی، وجدانی، جذباتی اور فکری وابستگی کو ایک ایسا انوکھا اور دلکش شعری پیکر عطا کیا جو خود اپنی خوبیوں، خامیوں اور ان کے مقلدین کی بدترین ذہنی تناسخی گردشوں کے باوجود اردو کی غزلیہ ادب کی تواریخ کا ایک نیا اور منفرد باب ہے اور اپنی پیش رو غزل کا اگلا قدم بھی۔ اُن کی غزل اُن کے اپنے باطن کے کرب و درد میں ڈوبی ہوئی نہایت شائستہ آواز ہے۔ جو خود نگر اور خود گر ہونے کے ساتھ ہمہ گیر مقصدی کردار کی حامل ہے اور بیک وقت ادبی اشرافیہ اور پرولتاریہ کے ذہنوں میں صدیوں تک گونجتے رہنے کی غنائی کیفیت سے مملو ہے۔ انہوں نے غیر بالیدہ اور روایتی، مقصد بردار ترقی پسند اور فیشن گزیدہ جدیدیت پرست غزلیہ فکر، خیال اور احساس کو برسوں کی فرسودہ عادت، بیجا تکرار، منصوبہ بند موضوعات، مُقررہ لفظیات، بنے بنائے راستوں، گھسے پٹے محاورات، استعارے، علامت اور پیکر کی گہری کھائیوں سے نکال کر لمحہ بہ لمحہ سائنسی عہد کی مشینی زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں، مُتضاد کیفیتوں، خوش رنگ امیدوں، شدید محرومیوں، خدشوں اور نئے تقاضوں سے عُہدہ برآ ہونے کا غیر محسوس طور پر حوصلہ بخشا اور ہوا میں معلق ہونے

کے احساس کو یکسر ختم کیا ہے

کتنی صدیوں کی قسمتوں کا امین   کوئی سمجھے بساطِ لمحہ کیا

لمحہ (PRESENT MOMENT OF ETERNITY) ان کے وجود کا اعلامیہ ہے جس کا سلسلہ ازل سے ابد تک دراز ہے اور بشیر بدر کے طرزِ احساس اور اظہار کا غماز ہے۔ دوسرے مصرع کی صوتی، نحوی، لسانی اور اسلوبی فضا اور بساطِ لمحہ کی شاعرانہ ترکیب "گنجینۂ معنی" کا طلسم ہے اس کا معنوی بُعد ایک اور پہلو سے مزید غور و طلب ہے۔ حکمائے ہند موت اور وقت دونوں کو کال (काल) موسوم کرتے ہیں کیونکہ وقت ہی موت ہے جو وقت میں جی رہا ہے۔ وہ موت کے آہنی گرفت میں جی رہا ہے اور جو وقت کے باہر ہو گیا۔ وہ موت کے باہر ہو گیا۔ صرف ہندوستان میں ایسا ہوتا ہے کہ جو دن گزر گیا۔ اسے ہم "کل" کہتے ہیں اور جو دن آنے والا ہے۔ اس کو بھی "کل" کہتے ہیں۔ ساری دنیا کی زبانوں میں دونوں کے لئے الگ الگ لفظ ہیں۔ مغربی لسانیات کے ماہرین و فلسفی اس ضمن میں تھوڑا چونکتے ہیں کہ دونوں کے لئے ایک ہی لفظ مستعمل ہے تو پتہ کیسے چلتا ہوگا کہ ہم کس کی بات کر رہے ہیں۔ ہم جو بیت گیا۔ اس کو بھی کل کہتے ہیں۔ وہ بھی موت کے ہاتھ میں چلا گیا۔ کال (وقت) کا لقمہ ہو گیا اور جو ابھی آیا نہیں۔ وہ بھی ابھی موت کے ہی منہ میں ہے تو ابھی جو لمحہ موجود ہے یہی صرف موت کے باہر ہے۔ کل بھی موت کے منہ میں چلا گیا اور آنے والا کل بھی موت کے منہ میں چھپا ہوا ہے۔ ماضی بھی موت، مستقبل بھی موت، صرف لمحہ میں موت نہیں ہے۔ یہ جو لمحہ ہے ابھی اسی وقت، صرف یہ بساطِ لمحہ موت کے باہر ہے۔ اسی لمحہ کا اگر کوئی ٹھیک سے استعمال کرے تو یہ لمحہ کنجی ہے۔ اس سے اگر دروازہ کھول لے تو ابدیت میں داخل ہو جائے۔ لمحہ موجود وقت کا حصہ نہیں ہے۔ عموماً وقت کو سہولت کے طور پر ماضی، حال اور مستقبل کے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یہ غلط ہے۔ درحقیقت وقت کے حصے ماضی اور مستقبل ہیں لمحہ موجود ابدیت کا حصہ ہے ماورائے زماں و مکاں ہے۔ آدمی کو اپنے ہونے (ETRE) کا عرفان لمحہ موجود میں ہوتا ہے جب انسانی ذہن ماضی اور مستقبل میں منتشر نہیں ہوتا بلکہ بساطِ لمحہ میں مرکوز ہوتا ہے۔ ماضی صرف یاد ہے اور مستقبل صرف خواب و خیال یا یہ نیستی (NEAN) کے مترادف ہیں۔ جو انسانی انرجی (ENERGY) ماضی اور مستقبل میں پھیل کر بکھر جاتی ہے لمحہ موجود میں جب مرتکز ہو جاتی ہے تو اسی نشدت میں نشاطِ روح کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لمحہ میں روحِ حقیقت کا کشف ہوتا ہے اسی کو عارف صداقت کہتے ہیں۔ عالم خدا، سائنس داں اور فلسفی (LIFE FORCE) ہندو وجود میں

"سچدانند، مذہب پرست نجات، بدھ نروان، حدیث قدسی میں خدا کہتا ہے" زمانہ کو برا مت کہو زمانہ میں خود ہوں جس میں سب سمایا ہوا ہے" بشیر بدر کا محولا بالا شعر وجدانی طور پر سچائیوں کی سچائی کا وجودی مکاشفہ ہے۔

بشیر بدر کے نئے انوکھے منفرد غزلیہ لہجہ کی فریب دہ سادگی بہت معنویتوں کی حامل ہے ان کی تخلیقیت افروز غزل کی خارجی آرائشی ساخت (SURFACIAL STRUCTURE) اس قدر اہم نہیں ہے جس قدر اس کی داخلی کیفیت پرور ایٹمی ساخت (DEEP HELICAL STRUCTURE) صداقت، خیر اور حُسن آگیں ہے۔

چمک رہی ہے پروں میں اڑان کی خوشبو | بلا رہی ہے بہت آسمان کی خوشبو
گلوں پہ لکھی ہوئی لا الہ الا اللہ | پہاڑیوں سے اترتی اذان کی خوشبو

محولا بالا اشعار کے سادہ بیان "خلا دار" ہیں۔ ان میں چند ایسے "خلا" ہیں جو ذہن قاری کو "لذت خلا پری" عطا کرتے ہیں۔ انسانی ہستی اپنی اولیں سطح پر لاروا (LARVA) کے مانند ہوتی ہے وہ افقی سطح پر ساکن ہوتی ہے۔ دوسری سطح پر کیٹر پلر (CATTERPILLAR) کے مانند متحرک ہوتی ہے لیکن وہ افقی سطح پر ہی متحرک ہوتی ہے۔ لیکن شاذونادر وہ تیسری سطح پر بٹر فلائی (BUTTERFLY) بن جاتی ہے اور صعودی کردار کی حامل ہو جاتی ہے۔ اس میں بیک وقت یکسوں سی گمشدگی، معصومیت زندگی کی مکمل قبولیت اور معراجی ہوشمندی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تقسیم، صاف و شفاف اور آئینہ آسا وسیع اور رفیع تر شعور و آگہی یا حقیقی تخلیقی بصیرت ہے جو زماں و مکاں کے رمز کو چیر کر ان کی سرحد کا ارتفاع سب کچھ ایک ساتھ دیکھتی ہے۔ تخلیقی ویژن صرف مختلف حقائق کو ایک ساتھ دیکھنے کی وسیع تر آگہی ہے۔ یہ تخلیقی بصیرت ہر نظام کی محدود اخلاقیات سے ماورا آدمی کو آدھی ادھوری نہیں بلکہ پوری سچائی سے جوڑتی ہے۔ زندگی بیج ہے۔ محبت پھول ہے دردمندی یا روحانیت خوشبو ہے۔ یہ نو غزلیہ حُسن پارہ نہ صرف رَس (کیفیت) کا گاگر ہے بلکہ آفاقی سچائی اچھائی اور بھلائی کا امرت ساگر ہے۔ محولا بالا اشعار میں "خوشبو" نشان، اشارہ، عَلَم (SIGNITRACE) ہے جو اساسی تصور، جذبہ یا فکر ہے۔ ہر ملفوظی یا مکتوبی پیکر فکری رویہ اور سانچہ کا امین ہوتا ہے۔ کوئی شعری اظہاریہ فنکار کے فنطاسیہ، فکریہ، جذبہ اور واردہ سے ماورا نہیں ہوتا۔ شعری ساخت کی بنیادی اکائی اشاریہ یا نشان (SIGNE) ہے۔ اشاریہ میں اشاریہ کنندہ (SIGNIFEIR) اور اشاریہ کناں (SIGNIFIED) ہم آہنگ رہتے ہیں۔ درحقیقت اشاریہ کنندہ، صوتی پیکر [SOUND IMAGE]

ہے اور اشاریہ کناں تصور، خیال، جذبہ اور فکر ہے۔ محولا بالا اشعار پوری غزلیہ تشکیل دائرے کے مانند خوشبو کے چاروں طرف گھومتی ہے اور اکبری تحریر (ARCH WRITING) یا حقیقی مافیہ کی تلاش کے لئے غیر معمولی حساس تخیل شناس اور بیدار مغز قاری کو متحرک کرتی ہے جو دراصل ناموجود یا عمیق تر ساخت (DEEP HELICAL STRUCTURE) کی جستجو ہے۔ مابعد وضعیات کے علمبردار فرانسیسی مفکر اور ناقد ژاک دیریدا کے لفظوں میں یہ تلاش خاص سیاق میں انسانی احساس و ادراک کے عمیق تر وجود اور معنوی عظمت کی طرف گامزن کرتی ہے اور تہہ در تہہ استعاراتی اور علامتی بُعد کی معنیاتی اعتبار سے متشکل کشا ہوتی ہے"۔ اذان کی خوشبو" آسمان کی خوشبو" اذان کی خوشبو" کی نئی قافیہ اور ردیف جوئی کی ترکیبی معنویت اور کیفیت آفرینی بیکراں علامتی تہہ داری کی حامل ہے۔ ان کے علاوہ" چمک رہی ہے پروں میں" بلا رہی ہے بہت" اور" رگوں پہ لکھتی ہوئی لا الہ الا اللہ" پہاڑیوں سے اترتی" کا صوتی زیر و بم ایک عجیب حسن پرور اور معنویت انگیز طور پر یوں چشم بصیرت کو وا کرتا ہے کہ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک عظیم تر دائرۂ نور میں آگئے ہیں۔ ہم کچھ زیادہ دیکھ رہے ہیں۔ محسوس کر رہے ہیں۔ ایک فلیش میں پورا پیٹرن دکھائی دے جاتا ہے جو لاعلمی اور نافہمی کے سیاہ پردہ کے پیچھے پوشیدہ رہتا ہے (درحقیقت اندر کا اور باہر کا آسمان" ایک ہوتا ہے۔ MOST SIGNIFICANT) زندگی کے حسن اور عظمت سے مملو محولا بالا اشعار جمال، کمال اور جلال کا منبع نور ہے۔ جو ہری بھری جھاڑی کی معیت میں ہے جب کہ یہ بیشتر فیشن گزیدہ غزلیہ تجربات میں یکسر معدوم ہوتی ہے۔ اس ہری بھری جھاڑی کے" جمالیاتی مونا لیے" میں مستغرق ہونا صواب" دیدہ (PHILOSIA) ہے جو حقیقی بصیرت اور رفیع مسرت عطا کرتا ہے۔ یہ خالی خالی فلسفہ آرائی (PHILOSOPHIA) سے ممکن نہیں ہے۔ بغیر حقیقی تجربہ کے لمس کے صدفِ فکر بے گوہر ہوتا ہے۔

میں نے تری آنکھوں میں پڑھا اللہ ہی اللہ	سب بھول گیا یاد رہا اللہ ہی اللہ
ہم دونوں اسی پاک سمندر کی ہیں لہریں	لا، ہاتھ میرے ہاتھ میں لا" اللہ ہی اللہ
اک نام کی تختی کا مجھے شوق ہوا تھا	پانی پہ ہواؤں نے لکھا اللہ ہی اللہ

قومی اور عالمی شہرت، مقبولیت اور محبوبیت کے حصول کے بعد اس کی لاحاصلی، ناپائیداری اور فنا پذیری سے پیدا عرفانِ نفس خاطر نشیں ہو جو آفاق شناس بھی ہے

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشہ ہے	جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

MONAD ۵۔ لے

لاشیئت (NO-THINGNESS) شدید حسیت اور بصیرت ہی معموری FEALLNESS ہے۔
عطیۂ ربانی GRACE ہے۔

بشیر بدر جس گیت کو گانے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ وہ گیت پھوٹ پڑا جس خوشبو کو وہ لے کر آئے تھے۔ وہ خوشبو ہواؤں میں اڑ چلی خوشبو کا یہ سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔ وہ وہی ہو گئے جو ان کا مقدر تھا۔ اس بار امانت میں انہوں نے خیانت نہ کی۔ اس تقدیر کی تکمیل میں نشاط روح بھی کارفرما ہوئی ہے جس سے فطرتاً بشیر بدر کی غزلیہ شاعری میں آہستہ آہستہ اداسی کی رجائیت پیدا ہوئی۔ درحقیقت بیج جس وقت تک بیج ہے۔ اس وقت تک وہ دکھی اور دلگیر ہے۔ بیج ہونے میں ہی دکھ ہے۔ بیج ہونے کا مطلب ہے کھلنا ہے اور کھلے نہیں، پھیلنا ہے اور پھیلے نہیں اور ہونا ہے اور ابھی ہوئے نہیں۔ بشیر بدر وہی ہو گئے جو ہونے کو تھے۔ انہوں نے جس کے لئے برسوں فکر و فن کی عبادت کی تھی اور اپنی شعری شخصیت کی پوری کھلاوٹ (TOTAL FLOWERING) کے لئے لگی لگائی نوکری کو ٹھوکر مار کر اور بیوی بچوں کی ساری ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے آزادانہ طور پر علی گڈھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے امتحان میں آج تک سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کا ریکارڈ ان ہی کا ہے۔ پھر ڈاکٹریٹ اور اب پروفیسر ہیں۔ بند دروازے کو پار کرنے کے لئے اس وجودی چھلانگ (QUANTUM LEEP) سے ان کو آزادی اور پابندی کے بیکراں کرب و نشاط کا عرفان ہوا۔ انسانی تقدیر کی جبریت اور انسانی ارادہ، انتخاب اور عمل کی حیرت کا شعور نصیب ہوا۔ وہ اب دھرتی کی گود میں پناہ گزیں بیج نہیں۔ وہ زندگی اور زمانے کی سخت دھوپ چھاؤں کو جھیلے، پورے کھلے ہوئے پھول، گلشن شعر و ادب کے اپنے ڈھنگ کے سب سے انوکھے، منفرد اور نادر روزگار لافانی پھول ہیں جس میں غزلیہ بہار کی پوری روح جلوہ گر ہے۔ اس لئے شخص ان کی غزلیہ شاعری کا مرکزی نقطہ ہے وہ اپنے قومی مقدر کو بھی شخص کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے کسی دور میں بھی انسانی وجود کے مطلق ہونے کو فراموش نہیں کیا۔ اس کی نوعیت عالمگیر ہے۔ وہ فطری طور پر دیکارت کے اس نظریہ سے متفق نہیں ہیں "میں سوچتا ہوں اس لئے ہوں COGITOERGOSUM۔ اس کے برخلاف اپنے باطنی وجود کی توثیق کے ضمن میں اس بات پر مُصر ہیں"۔ میں ہوں اس لئے سوچتا ہوں"۔ لہٰذا انہوں نے حتی الامکان موجودہ حوصلہ شکن حالات، سماجی رشتوں کی ابتری اور قدروں کی شکست و ریخت کی مسموم فضا میں بھی فرد کی شدید آرزومندی کو فنی طور پر منکشف کرنے کے ساتھ ساتھ فرد کو ایک اکائی کے طور پر اپنے غزلیہ آئینہ خانہ میں ابھارنے کی پوری کوشش کی۔ نیز اپنی ناقابل تسخیر

قوتِ ارادی سے خود کو شعور اور لاشعور، داخلیت اور آفاقیت اور ماضی اور مستقبل سے جوڑ کر تہذیبی اکائی GASTALT کی علامت بنا کر فطری دردمندی سے نمایاں کیا۔

شاید میرے آنسو سے اس کا کوئی رشتہ ہے   تپتے ہوئے صحرا میں جو پھول اکیلا ہے

جس کے درد و غم کا رشتہ آج کے بے امن اور پر انتشار زندگی کے کسمپرس و بے پناہ فرد سے غیر مرئی طور سے استوار ہے۔ وہ اس کو اپنا معلوم پڑتا ہے۔ اس اپنائیت اور قلبی وسعت سے اس کی اپنی زندگی میں معنی نظر آنے لگتے ہیں۔ اس معنویت کے بغیر اس کی ذات کی تکمیل نہیں ہوتی جو آفاق اور ماوراء کے اسرار کی امین ہے۔ درحقیقت بشیر بدر آدمی سے انسان اور انسان سے از سر نو آدمی بننے کی کیمیا ساز منزل سے گزرے ہیں اور اپنے آپ کو اپنے اندر کے آدمی اور باہر کے عام آدمیوں سے بے محابا جوڑا ہے اور ٹھیٹ ہندوستانیت کی انسانیت پرور روح کے امین ہو گئے ہیں اور ہندوستانی اجتماعی لاشعور کا زندہ اور دھڑکتا ہوا حصہ ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری معنی آگیں انقطاع سے زیادہ گہرے وسیع تر انضمام بلکہ ارتفاع کی شاعری ہے جو ہنگامی اور سیاسی نوعیت کے مقررہ حصار سے بلند ہو کر زندگی کی وحدت کو اس کی تمام تر وسعتوں کے ساتھ دیکھنے سمجھنے، برتنے اور ہونے کی متمنی ہے۔ ان کے یہاں وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے بظاہر متضاد رویے (ٹیڈی غزل، اینٹی غزل، بے تکلف غزل جس کو وہ ہزل، واسوخت اور ریختی کی روایت سے منسلک کرتے ہیں) ایک دوسرے کے زاویے تکملہ ہیں اور باطن اپنے دور کے آرکسٹریائی ہم آہنگی (ARCHESTRAL HARMONS) کے زندہ اور بیدار حصہ ہیں۔ وہ ان کی غیر معمولی شعری حسیت کے باعث ان کے یہاں شاعرانہ تجربہ میں ڈھل گئے ہیں اور پوری غزل کی بنیادی روایت، اس کے مخصوص رمزیاتی اور علامتی انداز اور اس کی تہہ داری، پہلوداری کے موثر اور کارگر وسیلہ سے ان کے نئے اور انوکھے غزلیہ منظر نامہ کی تشکیل میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ غزلیہ اپنائیت ان کے دائرۂ اثر کو وسیع کرتی ہے اور اس کو کسی مخصوص مسلک یا نصب العین سے وابستہ کرنے کے بجائے عالمگیر انسانی جذبات و محسوسات سے منسلک رکھتی ہے۔ جو ایک شدید بحران سے دوچار ہے ے

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں   خاموشی بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

"سناٹے کی شاخ" "زخمی پرندے" اور "آواز کا صحرا" جیسے پر تضاد اور پیچیدگی سے حامل بصری اور سماعی پیکروں کے فنی در و بست سے آج کے آدمی کے داخلی اور خارجی احوال کے "حشر آگیں کرب سکوت کا بیک وقت انفرادی اور اجتماعی تصور ذہن میں ابھرتا ہے جو ایک تہذیبی بحران کا علامیہ ہے۔

آج کا پورا تہذیبی خرابہ اس مکمل اور بھرپور شعر میں "فلم بند" ہے۔ اس محشر بدوش خاموشی کی آتنی تخیلی طرفگی اور جمالیاتی نادرہ کاری سے تصویر آفرینی انتہائی دلنشیں، جاذب نظر اور فکر انگیز ہے جو ان کے غیر معمولی احساس اور شعلہ آسا تخیل، گدازِ قلب، شعورِ عصر اور ریاضِ فن کا ترجمان ہے جس کی وجہ سے یہ روحانی زلزلہ پیما خاموشی، سناٹا لازوال آرٹ میں ڈھل گیا جہاں آواز کی سسکی سسکی سرگوشی اور چپ چپ سناٹا باہمہ گر جمالیاتی استغراق کی کیفیت میں ہم آغوش ہیں۔ یہ جمالیاتی محویت اور کیفیت باقر مہدی کے مندرجہ ذیل تلقینی، تبلیغی اور توضیحی شعر میں دوسرے مصرعہ کے ہدایتی رویہ کی وجہ سے یکسر نابود ہو گئی ہے۔ "آج" کی بلند آہنگی اور تاکیدی درشتی دوسرے مصرعے کو ایک اچھی کہاوت بننے میں بھی مانع ہے۔ اس میں وہ غزلیہ ایمائیت نہیں جس کے بغیر غزلیہ شعر اپنے مرکز سے ہٹ جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے کا نثریہ اور بیانیہ پہلے مصرعے کے حسن کا قاتل ہے ؎

آوازوں کی سسکی سسکی سرگوشی چپ چپ سناٹا

خاموشی کو آرٹ بنا آج بڑی فنکاری ہے

انسانی تجربہ بیک وقت داخلی اور خارجی دونوں سطح پر ہوتا ہے۔ غزل کا ایک خود کفیل شعر شعور، لاشعور اور قوت ارادی کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ وہ بذاتِ خود اپنی انفرادی حیثیت سے مکمل ہوتا ہے اور اس میں حسب توفیق زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس کی جمالیاتی تکمیل میں روایت جدت، انفرادیت، آفاقیت، شعور اور لاشعور کا حسب ضرورت شعری حصہ ہوتا ہے۔ حافظ و غالب نے اکثر و بیشتر اپنے اشعار میں سروش (فرشتہ) کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ درحقیقت لاشعور ہے۔ اس کی کرشمہ سازی اس شعر میں آج کے انسان کی شکست خوردگی اور فریب شکستگی کی کربناک کیفیت کے ضمن میں جاذب توجہ ہے جس میں غزلیہ اخفا، ایما، اعجاز اور ارتکاز اپنی معراج پر ہے۔ یہ شعری پیکر خواب خرامی سے ماخوذ ہے۔ اس بلا کی تاثیر انگیزی، نئی پیکر تراشی اور بالواسطگی سے یہ شعر روحانی درد و داغ کا ایک مرقع بن گیا ہے ؎

بکھرے شیشوں پہ گر کے ٹوٹ گئے　　　نیند میں ننگے پاؤں چلتے خواب

انسان مجموعۂ اضداد ہے۔ اس کا وجود "خاموش درختوں" پر سہمے ہوئے "نغمہ" کے مانند ہے موت ہر وقت انسان کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ ہم اپنے ہم جنسوں کی رفاقت کا سہارا لینے کے خوگر ہیں۔ لیکن وہ بھی ہماری طرح شکستہ حال اور مجبور ہیں۔ وہ ہماری ذرا بھی مدد نہ کر سکیں گے۔ ہر ایک کو تنہا مرنا ہے۔ زندگی کے مصائب اور کلفتوں کی انتہا موت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی ایک

پھونک زندگی کے چراغ کو ہمیشہ کے لیے بجھا دیتی ہے۔ جس طرح ہوا بہتے ہوئے نغمے کو فضاؤں میں منتشر کر کے تحلیل کر دے۔ بے تصویریت کو تصویریت عطا کرنا بشیر بدر کا غیر معمولی فنی شیوہ ہے۔ جس کا حسن کام کر جاتا ہے لیکن نظر نہیں آتا۔ ؎

کب جانے ہوا اس کو بکھرا دے فضاؤں میں — خاموش درختوں پر سہما ہوا نغمہ ہے

زندگی کے ہجوم گزراں میں یہ شدید احساس مرگ۔ بیکراں وجودی کرب، بے معنویت، بے ثباتی اور ازلی اور ابدی "اداسی" "تنہائی اور نارسائی کے" "بند دروازوں" پر لا کر آدمی کو تڑپتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ جہاں کسی انتخاب کی آزادی مفقود ہے۔ نتیجتاً قید حیات اور بند غم کی وحدانیت کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور داخلی تشکیک اور خوف ہراس پیدا ہوتا ہے۔ ؎

آہٹیں چلمنوں سے پوچھتی ہیں — قید کب تک رہیں گے ہم بابا

تاہم بے اختیار مگر خودشناس آدمی کو اپنے وجود پر پرچھائیوں کا گمان ہونے کے باوجود اپنے اختیار و انتخاب کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے جو اس کے ہاں وجود میں حرکت و حرارت اور تب و تاب پیدا کر بغاوت اور مقاومت کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں تاکہ زندگی کی بے معنویت میں اپنے طور پر معنویت پیدا کیا جا سکے۔ یہ علامت یہاں فرد کی نمائندہ نہیں بلکہ اجتماعی انسان کی علامت ہے بشیر بدر کے یہاں وجودیت کی اندھی گلی ALTERNATIVELESSNESS یا ہر نوعیت کے بند دروازہ کو پار کر کے کے لیے آخری جرأت آگیں چھلانگ کا مقاومتی رویہ فکر انگیز ہے جو موت کو قبول کرتا ہے اور جس میں وجودی نجات پوشیدہ ہے۔

آ، پہاڑوں کی طرح سامنے آ — ان دنوں میں بھی ہوں روانی میں

پاؤں میں دم ہے دیار بہت — ہاتھ چلتے ہوں روزگار بہت

یہی انداز ہے میرا سمندر فتح کرنے کا — مری کاغذ کی کشتی میں کئی جگنو بھی ہوتے ہیں

ایک سواری آئے گی، اک جائے گی — باری باری سب کی باری آئے گی

ہمراہ چلو میرے یا راہ سے ہٹ جاؤ — دیوار کے روکے سے دریا کہیں رکتا ہے

لفظ کی حیثیت استعارہ کی ہوتی ہے۔ مختلف صنائع مل کر ایک نئی فنی کائنات کی تشکیل کرتے ہیں۔ بشیر بدر محولا بالا تمثیل کے مانند الفاظ کو رمز، استعارہ اور پیکر بنا سکنے میں اکثر و بیشتر کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ ان کو وجودی اور تجربی سیاق و سباق میں استعمال کرتے ہیں جس کے باعث ان میں نیا فکری اور جمالیاتی بعد پیدا ہو جاتا ہے اور واقعہ مزید تہہ دار اور پہلو دار ہو جاتا ہے جس کی روح میں

ان کی نئی حسیت اور فکر کا لہو رواں دواں ہوتا ہے۔ وہ نئی غزلیہ لسانی تشکیل اور فضا کے نئے آفاق کی نشاندہی کرتے ہیں جو مستقبل کی غزل کا بہت حد تک مقسوم اور مقدر بھی ہیں۔

خواب آئینے ہیں آنکھوں میں لئے پھرتے ہو — دھوپ میں چمکیں گے ٹوٹیں گے تو چبھ جائیں گے

سیاہ برف میں ٹھہری ہے کائنات مری — کوئی ستارہ اٹھے، ٹوٹ کر خلا سے گرے

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر — غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

عظیم دشمنوں، چاقو چلاؤ موقع ہے — ہمارے ہاتھ ہماری کمر کے پیچھے ہیں

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موج رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح، ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

تنہا طے کرنا ہے سب کو رات کا سارا سفر — جھاڑیوں میں جگنوؤں کے قافلے کھو جائیں گے

مرے مزاج کی یہ مادرانہ فطرت ہے — کہ سویرے ساری اذیت میں بھول جاؤں گا

تم ایک پیڑ سے وابستہ ہو مگر میں تو — ہوا کے ساتھ بہت دور دور جاؤں گا

سبھی حادثوں کے نشان بھی ہوا مٹا کے چلی گئی! — مرا دل وہ ریت کا دشت ہے جو کسی بھنور سے گزر نہ ہو

ان میں روشن ہیں ابھی تک بوسوں کے چراغ — اس لئے ہم اپنی آنکھیں خود بجھانے آئے ہیں

بارہا اس گھر کا بٹوارہ ہوا اور آج تک — اپنے حصے میں سدا دکھ کے خزانے آئے ہیں

دل کی بستی بھی شہر دلی ہے — جو بھی گزرا ہے اس نے لوٹا ہے

جھانکا حقیر قطرے نے نیزے کی نوک سے — نیچے سیاہ رات کا بے انت غار ہے

سجھائی کچھ نہیں دیتا شکستہ یادوں نے — کسی کا چہرہ کسی کے بدن میں جوڑ دیا

زمین نے مانگ لیا، آسمان نے چھین لیا — ہمارے پاس نہ اب جسم ہے نہ سایہ ہے

کوئی لباس نہیں دل کی بے لباسی کا — اگرچہ روز نئی چادریں چڑھاتے ہیں

بشیر بدر کی مزید جرأت آگیں غزلیہ لفظیات کے ترکیبی نظام اور تشکیلی وضع میں غیر معمولی انحراف پسند رویہ اور اجتہادی جذبہ کے پس پشت وجودی بحران اور جدید آشوب گزیدہ ذہن کا محولا بالا نفسیاتی پس منظر ہے جو کامیو کی زبان میں ایک "اندوہناک" حشر کو ہضم کرنے کی فکر میں ہے۔ وہ عصری زندگی اور اس کے ماحول کے رشتوں اور رابطوں کی گہرائیوں اور سچائیوں کو بالکل نئے انداز میں دیکھتے ہیں اور حتی الامکان جدید حسیت کو مشعل راہ بنا کر یکسر نئے رنگ و آہنگ میں بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے پاس وہ شاعرانہ عرفان VISION موجود ہے جو آج کی بے رحم، کریہہ اور

سفاک سچائیوں کو بھی اپنے باطن یا سائیکی سطح پر نئی صورتوں میں محسوس کرتا ہے۔ یہ نئی صورتیں ان کا حقیقی تجربہ اور تخلیقی پیکر ہیں جو نئے غزلیہ ادب میں نت نئی داخلی اور وجدانی تبدیلی کی وحدانیت کی پیداوار ہیں اور اکثر بیشتر عصری دور کی صنعتی اور مشینی تہذیب کی بدصورتی، بے حسی آدمی کی بے توقیری، انکی کیڑوں مکوڑوں کی زندگی میں قلب ماہیئت زندگی کی مہملیت بے تہی، بے چہرگی، خود غرضی اور مصلحت بانگی کے کیفیات زبوں کی بھرپور ترجمان ہیں۔ اس المیاتی احساس کی شدت کے باعث ان کی غزلیہ فضا اکثر نیم کے رس میں ڈوبی تلخی سے بھی مملو ہو گئی ہے اور غزل کی بنیادی روایت کی امین ہوتے ہوئے بھی نئی غزل کی جمالیات سے اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ منسلک ہو گئی ہے جو جدید دور اور معاشرہ کی بدصورتیوں کی جمالیات ہے۔ یہ معمورہ نہیں بیشتر خرابہ ہے۔ اگر صوتی، صرفی، نحوی، لسانی، اسلوبی اور وضعیاتی نقطہ نظر سے ان کی غزلیہ لفظیات اور شعری مرکبات کے شناس نامہ کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک طرف نئی غزلیہ بغاوت یا رد عمل کے نمائندہ شعرا ناصر کاظمی، شہزاد احمد اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی تہہ داری اور دوسری طرف اور علی الخصوص ظفر اقبال، شکیب جلالی اور بانی کے شعری رویہ اور فنی برتاؤ سے قطعی مختلف اور ممتاز ہے جو اپنے ذوق شعری زبان کے صوتی، نحوی اور لسانی تار و پود میں انقلابی تبدیلی لانے کی کوشش میں اکثر زبان، صرف و نحو، لغات اور عروض کی بیجا شکست و ریخت کا لاشعوری اور غیر ادبی تخریبی رویہ مسلک اختیار کر لیتے ہیں جو اکثر اردو زبان کے کے منافی ہے یہ انتہاپسندی بیشتر بشیر بدر کی غزلیہ شاعری کے زندہ اور بیدار ضمیر سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ گو انہوں نے بھی صوتی، لسانی، اسلوبی اور ساختیاتی لحاظ سے نئی زمینیں کھوجیں اور اس کو زرخیز بنایا۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی حسی وجدانی تخیلی اور فکری زبان کے تحت حسب ضرورت توڑ جوڑ اور نیک نیت پیوند کاری بھی کی۔ لفظوں کی تراش خراش، نئے استعاروں، پیکروں اور علامتوں کی تخلیق کی پرانی گم شدہ اور عاق کی ہوئی علامتوں کو نئے مفاہیم عطا کر کے گویا غزلیہ زبان کو از سر نو خلق کرنے کی کوشش کی۔ ان کے پیکر تراشی کے عوامل نئے ہیں۔ تشبیہات کی دنیا نئی ہے۔ الفاظ کے تلازمے نئے ہیں۔ یہ الفاظ و علائم ہمیں ہر جگہ زندہ اور محسوس شکل میں نظر آتے ہیں جو ایک طرف ان کی غزل کے معنوی آفاق کو روشن کرتے ہیں اور دوسری طرف بیان میں سحر کاری کی شان پیدا کرتے ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری قطعًا اسٹاک کی شاعری نہیں ہے وہ شعوری طور پر فرسودہ اور از کار رفتہ محاوروں کی" وردی پوش صف" سے بے تعلق رہنا چاہتی ہے۔ یہ بات بھی قدرے ان کے حسین اور بلیغ ابہام کا راز ہے۔ جس سے اکثر نیم روشنی اور خواب کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ان خارجی اور داخلی شعری خوبیوں کے باعث ان کی

غزلوں میں ایک عجیب سی تازگی، توانائی، نادرہ کاری اور برنائی کا شدت سے احساس ہوتا ہے جس کا نئی غزل کے منظر نامہ کی تشکیل میں ایک بے حد زندہ، نامیاتی، متحرک اور معتبر رول ہے ؂

غزلیں اب تک شراب پیتی تھیں
نیم کا رس پلا رہے ہیں ہم

پتھروں کی زمیں، پتھروں کے شجر، پتھروں کے مکاں، پتھروں کے بشر
کب سویرا ہوا، ہم کدھر کو چلے، کس گلی شام آئی، کہاں سو گئے

لکڑیوں سے تراشی ہوئی لڑکیاں، انجمن کے نوجواں مختلف رنگ میں
دوست ہیں دوستی سے مگر بے خبر، دشمن جاں ہیں لیکن خفا تک نہیں

مشینیں چل رہی ہیں کوٹ پینٹ پہنے ہوئے
کسی کا نام محبت، کسی کا نام وفا

ہاں کبھی دو بے تکلف دوستوں کے بیچ بھی
خامشی اتنی اذیت ناک ہوتی ہے کہ بس!

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو
رک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

کہاں سے ذہن میں اک دم مرے خیال آیا
گلاس خالی ہے اس میں کوئی لہو بھر دے

حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

شاخ پہ جتنے پھول کھلے ہیں اکثر پیغمبر سے لگتے ہیں
لیکن میں اس کی مانوں جو ہنس دے انگاروں میں

مجروح بہت ہے دل پھر بھی شگفتاں ہے
یہ برگِ خزاں دیدہ، ہم رازِ بہاراں ہے

خون پتوں پہ جما ہو جیسے
پھول کا رنگ ہرا ہو جیسے

گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا

الفاظ پل صراط پہ جیسے گناہ گار
تلوار سے بھی تیز پہ چمکتی ہوئی صدا

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے

کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی
دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو

دبا تھا پھول کوئی میز پوش کے نیچے
گرج رہی تھی بہت پیچوان کی خوشبو

عجب وقار تھا سوکھے سنہرے بالوں میں   اداسیوں کی چمک، زرد لان کی خوشبو
وہ عطر دان ساب مرے بزرگوں کا   رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو
خدا کا شکر ہے، میرے جوان بیٹے کے   بدن سے آنے لگی زعفران کی خوشبو
عمارتوں کی بلندی پہ کوئی موسم کیا   کہاں سے آگئی کچے مکان کی خوشبو

یوں ہی بے سبب نہ پھرا کرو، کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو
ابھی راہ میں کئی موڑ ہیں کوئی آئے گا کوئی جائے گا
تمہیں جس نے دل سے بھلا دیا اسے بھولنے کی دعا کرو
یہ خزاں کی زرد سی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

اچھی اور سچی شاعری اکثر ماورائے شعریت بھی ہوتی ہے۔ وہ محض لفظ نہیں ہوتی۔ ماورائے لفظ بھی ہوتی ہے۔ انضباطِ فن کی چٹان اکثر تخلیق کے سوتے پھوٹنے میں مانع ہوتی ہے۔ لیکن غیر معمولی تخلیقی رو اکثر چٹان کو بھی پانی بنا دیتی ہے اور قانون قاعدے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ تبدیلیاں یوں بھی رو پذیر ہوتی ہیں۔ زندگی کے تحرک کے بغیر شاعری ممکن نہیں ہے۔ صرف بحری سانچوں سے شاعری کی شناخت نہیں کی جا سکتی۔ معنوی طاقت اکثر انحراف میں بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ نئے مافیہ کے لئے نئی حسیت اور نئی فکر کے ساتھ ایک حد تک فنی دیدہ دلیری بھی درکار ہے۔ جس میں بشرطیکہ عمیق جمالیاتی حس کارفرما ہو اور وہ زبان کے مزید تخلیقی عناصر اور امکانات کو اجاگر کرے۔ مندرجہ ذیل غزلیہ اشعار کے نئے صوتی، صرفی، نحوی، لسانی اور اسلوبی مزاج میں صنعتی تہذیب، ریاستی تہذیب اور جامعاتی تہذیب کے خلاف شدید باغیانہ احتجاج پرور اور سرکش رویہ اور برتاؤ ملتا ہے۔ جو بڑے شہری آشوب کی تصویر آفرینی میں موثر اور کارگر ہے۔ اس جدید غزلیہ اسلوب میں آپ رتن ناتھ سرشار کے خوجی کے مانند تُم تُم نہیں چلا سکتے۔ نیوکلیرزم کے زمانے میں قرولی کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ یہ جامعاتی سردخانہ کی زبان نہیں جہاں نعش محفوظ رہتی ہے۔ روح پہلے ہی پرواز کر چکی ہے۔ نئی راہیں نئے تجرباتی جوکھم سے کھلتی ہیں۔ پیر رپٹنے سے سفر کا حوصلہ ختم

نہیں ہوپاتا بشیر بدر نئی غزلیہ زبان کی طریقت کے مجدد ہیں۔ وہ پکاسو کے مانند سیدھی لکیر اور ٹیڑھی لکیر دونوں میں قادر ہیں۔ وہ اپنی نفسیاتی اور جمالیاتی ضرورت کے تحت انتخابی حسیت کے ساتھ شعری صداقت افروزی اور تصویر آفرینی میں دونوں سے بے محابا کام لیتے ہیں۔ اس ضمن میں شعری کلیشے سے جان چھڑانا اور اپنی الگ پہچان بنانا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لئے سچائیوں کی سچائیوں کو دیکھنے اور سوچنے والی نگاہ چاہئے تو ہی فنی صداقت تک رسائی ہو سکتی ہے ؎

یہ پتھروں کا ہے جنگل چلو یہاں سے چلیں　　ہمارے پاس تو گیلی زمیں کے پودے ہیں

عرق نچوڑنے والی مشین پیاسی ہے　　ابھی ہمارے بدن سبز کچے کچے ہیں

عجیب شہر ہے یہ اس کے آسماں پہ بھی　　لہو میں ڈوبے ہوئے سرخ سرخ کپڑے ہیں

عظیم ! دشمنو! چاقو چلاؤ موقع ہے　　ہمارے ہاتھ ہماری کمر کے پیچھے ہیں

دھند کی بند پلکیں کترتے ہوئے سائیکل پر چلیں دھوپ کی قینچیاں

رنگ والی ہواؤں کے کرتے اڑے صبح کا سائرن دے رہا ہے صدا

ہر سمت موٹر کی آنکھوں کے تیر ہے　　جیسے مشینوں میں بیچ ہاتھ آ جائے

تھکے تھکے پیڈل کے بیچ چلے سورج　　گھر کی طرف لوٹ دفتر کی شام

میرے پاؤں اسٹیل، سینٹ، ٹرک، مارٹر، لکڑی کے جنگلے گزرتے ہیں جن پر سڑک، پل، ہیوی ٹرانسپورٹ، ریل گاڑی

مگر اب یہ محسوس ہوتا ہے مجھ کو کہ کچھ دن سے پانی مجھے کاٹتا ہے زمیں اپنے اندر ہی دھنستی چلی جا رہی ہے

شہر و صحرا کی تقسیم ممکن نہیں، ایک قوت ہے جس کے بہت روپ ہیں

ان پہاڑوں میں بھی پیار کا ظلم ہے ان مشینوں میں بھی ظلم کا پیار ہے

یہ فکری اور فنی آزادی بشیر بدر کے شعری مزاج کا خاصہ ہے جو ان کے اس شاعرانہ ایقان کا رہین منت ہے کہ انسان بلا روک ٹوک ہر قسم کے تجربوں کا خیر مقدم کرے لیکن ان تجربوں کو مطلق اقدار نہ سمجھے یہ خیال کرے کہ ان سے وجود کی نشو و نما میں مدد ملتی ہے (اپنی نثری غزلوں کے ضمن میں ان کی سرد مہری اور خود احتسابی ان کے اہم تنقیدی احتساب نامہ" آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ" میں غور طلب ہے صفحہ ۳۴۱۔۳۴۲) ؎

آہن جیسی دیواریں ہوں یا انساں کا جسم خاکی　　مٹی کی فطرت آزادی ہے قید نہیں رہ سکتی مٹی

تاہم وہ اس کی کرب آگیں وجودی ذمہ داری کے عارف بھی ہیں۔

میں دن ہوں میرے جبیں پر دکھوں کا سورج ہے　　دیئے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

اس وجودی شعری مکاشفہ میں انسانی حریت اور جبریت کی پرتضاد پیچیدگی کو بڑی شاعرانہ ایمائیت کے ساتھ منکشف کیا ہے۔ یہاں دن کا حرکی پیکر KINETIC IMAGE انسانی ارادہ، عمل اور انتخاب کی آزادی کا علامیہ ہے جس سے زندگی میں معنی پیدا ہوتے ہیں اور سورج کا تمثال حرارت THERMAL IMAGE پیکراں کرب آگیں ذمہ داری اور پابندی کی وسیع علامتی معنویت کا امین ہے جو بنیادی طور پر اپنے سیاق و سباق میں زندگی بار ہے۔ نئے سویرے کا پروردگار ہے اور امید کا سرچشمہ ہے۔ امید انسانی روح کی ساخت میں سموئی ہوئی ہے۔ اس لئے حقیقی وجود امید کی حالت میں ملتا ہے نا کہ محرومی اور نا امیدی میں۔ امید کی حیثیت روح کے لئے وہی ہے جو جسمانی زندگی کے لئے سانس کی ہے۔ اس لئے بشیر بدر زندگی کے امکانات کی طرف کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ جبکہ رات کی پلکوں پہ جھلملاتے دیئے ان کی داخلی تشکیک کو بڑھاتے ہیں جو ہمہ گیر اداسی اور مایوسی کی گہری تاریکی میں اور اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقیقت کی صداقت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ وہ غموں اور پریشانیوں سے گھبراتے نہیں۔ وہ ہر نوعیت کے مقاومت کو مقدر سمجھتے ہیں ؎

جب کبھی بادلوں میں گھرتا ہے چاند لگتا ہے آدمی کی طرح

اس مقاومتی رویہ کی وجہ سے ان کی غزلیہ شاعری میں اداسی کی رجائیت پیدا ہوتی ہے جو زندگی کی پرتضاد پیچیدگی، گہرائی اور گیرائی کی حامل ہے اور زندگی کو ہمہ جہت پہلو سے لطف اندوز ہونے اور ہر حالت میں جد و جہد کرنے کی قائل ہے کہ آدمی اپنی قوت ارادی، آزادی عمل اور تعمیرات ذات کے ذریعہ، اپنے کو ماحول کے گھٹاٹوپ اندھیرے سے نکال لانے کی غیر معمولی صلاحیت اپنی ذات میں پوشیدہ رکھتا ہے۔ بشیر بدر کے دل کے اندر عصری غیر محفوظیت، خوف، تردد، تشویش اور انتشار کے عالم میں زندہ رہنے اور زندگی کے آخری لمحوں تک جمالیاتی اور انسانی قدروں کو برقرار رکھنے کی شدید تڑپ موجود ہے۔ دو علامتی انداز بیان کے حامل اشعار ملاحظہ ہوں جو حسن اور معنویت کے پروردگار ہیں ؎

خوشبو کو تتلیوں کے پروں میں چھپاؤں گا پھر نیلے نیلے بادلوں میں لوٹ جاؤں گا
یہ لکڑیاں جو خشک ہیں بے برگ و بار ہیں ان کو میں اپنی آگ میں جلنا سکھاؤں گا

یہ شدید تڑپ نئی وجودیت یا مظہری وجودیت کے مثبت اقداری پہلو اور تعمیر نو کے ہزار رنگ و آہنگ کی امین ہے جو بڑی جمالیاتی جاذبیت اور تخلیقی معنویت رکھتی ہے ۔

غزلیں کمہلا گئیں نظمیں مرجھا گئیں گیت سنولا گئے ساز چپ ہو گئے
پھر بھی اہلِ چمن کتنے خوش طبع تھے نغمۂ فصلِ گل گنگناتے رہے

اس تعبیر نو اور ان کے مثبت کردار کی تشکیل میں رنگ و نور کی گڑیوں کی رفاقت بھی شامل ہے اور اس کے لئے وہ تہہ دل سے ممنون ہیں ؎

رنگ و نور کی گڑیو' زندگی کی تصویر و تم نے رنج و غم میں بھی
اپنی مسکراہٹ سے' ہم سے دل شکستوں کے حوصلے بڑھائے ہیں

خوبصورتی اور خوب سیرتی کے اس جذباتی شراکت کے باعث اکثر ان کے ذوق تجسس اور اولوالعزمی کی تصاویر اپنی تمام جمال آرائیوں کے ساتھ ابھرتی نظر آتی ہیں ؎

اڑتی کرنوں کی رفتار سے تیز تر' نیلے بادل کے اک گاؤں میں جائیں گے
دھوپ ماتھے پہ اپنے سجالائیں گے' سائے پلکوں کے پیچھے چھپا لائیں گے

تمام تاروں کو چھوتا ہوا گذر جاؤں گا   کمان بن کے مجھے تیر سا رواں کر دے

بشیر بدر کی حسین وزریں غزل کی رنگولی گردش کے دنوں کے ہلکے دھندلے، دھیمے اداس اور بھورے رنگوں سے لے کر یونیورسٹی کیمپس کے شوخ و شنگ رنگوں سے لالہ کار ہے جہاں ان کی ذاتی شعری زبان' سماجی زبان اور تاریخی زبان کے جدلیاتی عمل سے گزر کر ارتفاع پذیر ہوئی ہے اور آج کی زندہ، نامیاتی اور متحرک زبان سے ہم آہنگ ہے جو پیچیدہ' بے ساختہ' تر و تازہ اور اصلیت سے رچی بسی ہے۔ درحقیقت ڈاکٹر بشیر بدر کے سماعی اور بصری تخیل AUDITORY AND VISUAL IMAGIN نے غزلیہ زبان کو وسعت ہی نہیں دی۔ اس کو ایک نیا صوتی منظریہ بھی عطا کیا ہے جس میں لسانی استبداد نہیں بلکہ شانِ اجتہاد نمایاں ہے۔ ان کی اَن گنت نئی اور انوکھی غزلیہ تراکیب کی تشکیل میں، غزل باہر الفاظ کے استعمال اور نئے الفاظ کے اختراع میں ان کی فکر کی معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ ان کے لسانی اور لفظی تخیل VERBAL IMAGINATION نے بڑا زبردست رول ادا کیا ہے۔ جس کا دائرہ یاد داشت تمام سنے ہوئے اور پڑھے ہوئے الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ بشیر بدر کے شاعرانہ تخیل میں بصری یادوں (VISUAL MEMORIES) اور صوتی یادوں SOUND MEMORIES کا تخم خانہ ہے جس کی بدولت ان کا گوشۂ تخیل پرانی اور نئی آوازوں کی گونج سنتا ہے۔ اسی صوتی تخیل کی کارکردگی سے بشیر بدر کے یہاں خاص قسم کے صوتی پیمانے SOUND PATTERNS پیدا ہوئے ہیں جن سے ان کی غزلیہ شاعری کو انفرادی آہنگ نصیب ہوا ہے۔

یہ نیا غزلیہ ریختہ نئی فکر و نظر کا جگمگاتا ہوا نشان و پہچان ہے۔ نیا غزلیہ ریختہ اب اردو سے معلی تو نہیں ہو سکتا۔ اس تخلیقی آواں گا روایت میں ان کی انفرادی تخلیقی بصیرت کی لے بہت تیز ہے ہر دور میں شعری زبان کا ماڈل بدل جاتا ہے۔ وہ غزلیہ زبان کے قیدخانہ کے قیدی نہیں۔ وہ ایک حد تک اس شیشے کی دیوار کو توڑنے کے قائل ہیں جس سے ان کی نئی غزلیہ ریختہ گوئی وجود پذیر ہوتی نئی غزلیہ لسانی تجدد خاطر نشین ہو۔ وہ جس غیر غزلیہ لفظ کو چھوتے گئے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر غزل بنتے ہیں

وہ زعفرانی پلوور اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رک جائے
سڑک پر چلنے لگے تو ہمارا جیسا ہے

تھرکتی مچھلی نکل کر سرکتے کپڑوں سے
تمام رات کو اب بے لباس کر دے گی

تکیہ کے نیچے رکھتا ہے تصویر کی کتاب
تحریر و گفتگو میں جو اتنا متین ہے

سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا
کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی

یہاں کوئی دوسرا بستر نہیں!
تو کیا میں نہیں کوئی کھا جاؤں گا

اکثر شراب پی کر پڑھتی تھی وہ دعائیں
ہم ایک ایسی لڑکی کے ساتھ رہتے تھے

خانقاہوں میں خاک اڑتی ہے
اردو والوں کے کیمپس کی طرح

نصاب دل کا کہاں رکھ دیا کلاسوں میں
غزل کی آگ ہے یہ کاغذوں کی بس کی نہیں

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایہ ہے
بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

اتر بھی آؤ کبھی آسماں کے زینے سے
تمہیں خدا نے ہمارے لئے بنایا ہے

ننگے پاؤں فرشتوں کا اک طائفہ آسماں سے زمین پر اترنے لگا۔
سر برہنہ فلک زادیاں عرش سے آنسوؤں کے ستارے گراتی رہیں

بشیر بدر الفاظ کے فطری اوصاف کو ابھارنے، نکھارنے اور سنوارنے میں غیر معمولی جذباتی انہماک کا ثبوت دیتے ہیں تاہم ان کی جدت، ندرت اور قوت کا سارا جادو ان کی ذہنی زرخیزی، تخیلی طرفگی اور حسی ادراک عطیہ ہے۔ یہ طلسم ان کے فنی وسائل سے زیادہ ان کے مخصوص طرز نظر اور لطافت دید کا مرہون منت ہے جو ہر خارجی منظر کو ایک ذاتی اور باطنی منظر بنا دیتی ہے۔ ان کے یہاں مادی تجربہ تخیئلی تجربہ بنکر فنی اور جمالیاتی تجربہ میں رو پذیر ہوتا ہے۔ ان کی لفظی، تشبیہی استعاراتی، علامتی اور پیکری مرکبات۔ عصری تہذیبی دنیا اور مظاہر دنیا کے کیف و کم کے امین ہیں

ان میں انسانی بدن اور متحرک اشیاء کی لچک اور زندگی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ سب لفظی حسن کاری یا معنوی بیان سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہیں۔ ان سے کسی جگمگاتے بدن کے مانند ہر طرف ایمائی کرنیں ہی کرنیں پھٹتی پھیلتی اور بکھرتی ہیں اور صوتی و دیگر سیمیائی اشارے نشر ہوتے ہیں جو تخلیقی توانائی اور برنائی کا انتہا درجہ ہے۔

خود اپنی ہی آہٹ پہ چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

اس برگ گل پہ لفظوں کے پھول تھرتھرائے
شبنم ہوا کے رخ پہ یا بولتا چمن ہے

آنسو کبھی پلکوں پر تا دیر نہیں رکتے
اڑ جاتے ہیں یہ پنچھی جب شاخ لچکتی ہے

انہیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہمسفر کہاں ہے

ایک ٹہنی دھند کی یلغار کو سہتی ہوئی
شاخ کی باہوں میں گر کر جاودانی ہوگئی

ایک لڑکی، اک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی
میں اجلی دھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا

لپٹ کر چراغوں سے وہ سو گئے
جو پھولوں پہ کروٹ بدلتے رہے

ہمارا بدن دھوپ کا باغ ہے
یہاں چاندنی اور شبنم کہاں

بہت اچھا سا کوئی سوٹ پہنو تنگ دستی میں
اجالے میں چھپی ان بدلیوں کو کون دیکھے گا

رات، پریاں فرشتے ہمارے بدن مانگ کر برف پر چل رہے تھے مگر
کچھ شبیہیں کتابوں کے بجھتے دیے، کاغذی مقبروں میں جلاتی رہیں
اونچے گرجا گھروں میں گھرے نوجواں راہبوں کے دلوں میں دبی خواہشیں
جیسے بیروت کی ساحلی ریت پر دھوپ کھاتی ہوئی لڑکیوں کے بدن
آنکھیں کھولنے کے باہیں ڈالو یوں کھو جانا ٹھیک نہیں
ناگ بھی لپٹے رہتے ہیں پیپل کی نرم چٹانوں میں
بلا کے رات کا رس راکشش بناتی تھی
سمندروں سے لوگوں سے کہتی تھی دیوتا مجھے
دو کالے ہونٹ جام سمجھ کر چڑھا گئے
وہ آب جس سے میں نے وضو تک کیا نہ تھا
سناٹے آئے درجوں میں جھانکا چلے گئے
گرمیوں کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی نہ تھا

یونیورسٹی کیمپس سے آگے زندگی کے میدان میں سچائیوں کے پیچھے سچائیوں کو ٹٹولتا ہوا ذہنی تجسّس ان کے شعری مزاج کا خاصہ ہے جو لفظوں، اداؤں اور رویوں کے پیچھے دیکھنے کا خوگر ہے۔ یہ ذہنی تشکیک اور اس کی بخشی ہوئی آگہی روحانی آدرشوں اور کھوکھلے انقلابی رویوں کی بے معنویت اور لغویت کو دیکھ لیتی ہے۔

مری نگاہ مخاطب سے بات کرتے ہوئے

تمام جسم کے کپڑے اتار لیتی ہے

انجام کار ایسا دنیا ساز، مصلحت پرور اور سفاک حقیقت آمیز رویہ ابھرتا ہے جو جدید عہد کے صنعتی اور مشینی تہذیب کا مرخ استفہامیہ نشان ہے اور غزل کو ایک نئی ذہنی فضا سے آشنا کرتا ہے جو مکروہ حقائق کا غماز ہے۔

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے ۔۔۔ میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

محبت، عداوت، وفا، بے رخی ۔۔۔ کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

دن تو نکلا [illegible] ہوا ہو آدمی ۔۔۔ اے خدا رات کبھی سب کی عورت نہ ہو

چھپروں پر دے رکھ گئی ہے ہوا ۔۔۔ تاکہ پھر روشنی کی شکایت نہ ہو

عظیم دشمنو، چاقو چلاؤ موقع ہے ۔۔۔ ہمارے ہاتھ ہماری کمر کے پیچھے ہیں

تم میری زندگی ہو یہ سچ ہے ۔۔۔ زندگی کا مگر بھروسہ کیا

تحریر و گفتگو میں کسے ڈھونڈتے ہیں لوگ ۔۔۔ تصویر میں بھی شکل ہماری نہ آئے گی

پہچان اپنی ہم نے مٹائی ہے اس طرح ۔۔۔ بچوں میں کوئی بات ہماری نہ آئے گی

مری شہرت سیاست سے محفوظ ہے ۔۔۔ یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا ۔۔۔ کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں ۔۔۔ تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

بانسوں کے جنگلوں میں وہی تیز بو ملی ۔۔۔ جن کا ہماری بستیوں میں کاروبار ہے

پھر اس کے بعد مرے زخمِ دل گنے گا کوئی ۔۔۔ ابھی تو چاند ستاروں کا ہو رہا ہے شمار

اسے کسی کی محبت کا اعتبار نہیں ۔۔۔ اسے زمانے نے شاید بہت ستایا ہے

سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا ۔۔۔ آہستہ چلنے والوں کی باری نہ آئے گی

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے ۔۔۔ آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے　　اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

ایسا لگتا ہے ہر امتحاں کے لئے　　زندگی کو ہمارا پتہ یاد ہے

میکدہ رات غم کا گھر نکلا!　　دل حویلی تلے کھنڈر نکلا

کس کے سائے میں سر چھپاؤں گا　　وہ شجر دھوپ کا شجر نکلا!

اس کا آنچل بھی کوئی بادل تھا　　وہ ہواؤں کا ہم سفر نکلا!

زندگی اک فقیر کی چادر　　جب ڈھکے پاؤں ہم نے سر نکلا!

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی　　بڑی آرزو تھی ملاقات کی

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے　　جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

پیسہ ہاتھوں کا میل ہے بابا　　زندگی چار دن کا میلہ ہے

مجھ کو ان سچی باتوں سے اپنے جھوٹ بہت پیارے ہیں
جن سچی باتوں سے صدیوں انسانوں کا خون بہا ہے

آؤ اک دوسرے کا غم بانٹیں　　کچھ ہماری سنو کچھ اپنی کہو!

جس میں اپنی پرندوں سے تشبیہ تھی!　　تم کو اسکول کی وہ دعا یاد ہے

زندگی کے سنگین حقائق اور داخلی تفکر، کرب و اضطراب سے جھوجھتے ہوئے بھی اس پرخلوص، حساس، رفاقت آگیں اور دردمندانہ کردار کے باعث ان کی غزل کا یہ بلوغت آگیں موثر بڑا ہی جاذب نظر اور زندگی آمیز ہے جو غزلیہ شاعری میں گھر آنگن کے دھوپ چھاؤں کو کہیں شوخ اور کہیں مدھم خطوط و الوان میں منقش اور منور کر دیتا ہے اور نئی غزل میں ایک مانوس بُعد کا اضافہ کرتا ہے جو غزل کے جمالیاتی اقدار اور ان کے انفرادی احساس و اظہار کا امین ہے۔

کوئی عشق ہے کہ اکیلا ریت کی شال اوڑھ کے چل دیا
کبھی بال بچوں کے ساتھ آ یہ پڑاؤ لگتا ہے رات میں

سر درد جیسے بلند کے سینہ پہ سو گیا　　ان پھول جیسے ہاتھوں نے ماتھا جو نہی چھوا

میں گھر سے جب چلا تو کواڑوں کی اوٹ سے　　نرگس کے پھول چاند کی بانہوں میں چھپ گئے

اجالا سا دل میں ہمیشہ رہا　　کوئی شئے یہاں جلنے والی رہی

میرے سینے پہ خوشبو نے سر رکھ دیا　　میری بانہوں میں پھولوں کی ڈالی رہی

اک پرسکوں پہاڑ کے بنگلے میں رات ہم　　شبنم کی طرح پھول کی آنکھوں میں سوئے تھے

قدم چاند سے میرے دل پر رکھو — اسے بھی کبھی گھر کا آنگن کہو

جیسے صدیاں بیت چکی ہوں — پھر بھی آدھی رات ابھی ہے

سوچا نہیں اچھا برا، دیکھا سنا کچھ بھی نہیں — مانگا خدا سے رات دن تیرے سوا کچھ بھی نہیں

سوچا تجھے، دیکھا تجھے، چاہا تجھے، پوجا تجھے — میری خطا میری وفا، تیری خطا کچھ بھی نہیں

انہیں میں سنورتے رہو عمر بھر — سدا میری آنکھوں کو درپن کہو

میرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی — میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

یہ کہیں شہرِ آرزو تو نہیں — چلتے چلتے ٹھہر گئے تارے

جس بادل کی آس میں جوڑے کھول لیے ہیں سہاگن نے

وہ پربت سے ٹکرا کر برس چکا صحراؤں میں

وہ چاہے خوشبوؤں کا بدن چوم آئیں گے — رنگوں کے وہ فرشتے ہوا میں اڑاؤں گا

آنگن میں ننھے ننھے فرشتے لڑیں گے جب — بھوری شفیق آنکھوں میں مسکراؤں گا

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا — میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

سرخ نیلے چاند تارے دوڑتے ہیں برف پر — کل ہماری طرح یہ بھی دھند میں کھو جائینگے

انھیں میں کھیلنے آئی ہیں بے ریا روحیں — یہ گھر جو لال ہری دفتیوں کے ہوتے ہیں

شام کے بعد بچوں سے کیسے ملوں — اب میرے پاس کوئی کہانی نہیں

شام گہری ہوئی اور گھر دور ہے — پھول سو جائیں گے راستہ دیکھ کر

ہر جذبۂ نشاط میں جذبۂ کرب اور ہر جذبۂ کرب میں جذبۂ نشاط کی پُر تضاد پیچیدگی و آگہی کس قدر خیال انگیز تجربہ میں ڈھل گئی ہے

شعلۂ گل، گلابِ شعلہ کیا — آگ اور پھول کا یہ رشتہ کیا

یہ جمالیاتی تکمیل کا حامل شعر زندگی کے سرد و گرم کو جھیلے اور بھوگے ہوئے ایک غیر معمولی پختہ کار مہذب اور ترا شیدہ شعور و وجدان کے مالک شعری شخصیت کے حقیقت شناس اور زندگی پرور رویہ اور برتاؤ کا شاہد ہے جو جیون ساتھی کے "جادو نگر" میں بے حس و حرکت نہیں رہتا بلکہ اپنی فکری بیداری اور کردار کی انفرادیت سے اس کو بھی متحرک کرتا ہے اور زندگی کے کڑے کوس میں جذباتی تسکین کے ساتھ ایک دوسرے کے وجود کی روشنی میں جشن مناتا ہوا سفر مدام سفر کا قائل ہے جو قدرے روحانی پرتو کا امین ہے اور آہستہ آہستہ مائل بہ فراز!

کبھی دن کی دھوپ میں جھوم کے کبھی شب کے پھول کو چوم کے
یوں ہی ساتھ ساتھ چلیں سدا، کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

اگر تلاش کروں کوئی مل ہی جائے گا — مگر تمہاری طرح کون مجھ کو چاہے گا
تمہیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا — مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا
تمہارے ساتھ یہ موسم فرشتوں جیسا ہے — تمہارے بعد یہ موسم بہت ستائے گا

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
کبھی حسن پردہ نشیں بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں میرے ساتھ تم بھی چلا کرو
نہیں بے حجاب وہ چاند سا کہ نظر کا کوئی اثر نہ ہو
اسے اتنی گرمیِ شوق سے بڑی دیر تک نہ تکا کرو
یہ خزاں کی زرد سی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

مطلع میں دمک اٹھتا ہے اس ماتھے کا مطلع
اشعار میں آجاتی ہے رخسار کی خوشبو

جہاں نہ پہنچے روی (سورج)، وہاں پہنچے (کوی) کے مصداق بشیر بدر کے شاعرانہ ویژن کی کرشمہ سازی دیکھئے۔ ان کا غزل سا خوبصورت مکان میرٹھ کے فرقہ دارانہ فساد کے نذر ہوگیا۔ تاہم ان کے اخباری بیانات بہت انسانیت نواز کردار کے حامل ہیں۔ پیش ہیں خاطر نشیں ہو۔

اب اگلے برس یہ درو دیوار نہ ہوں گے — اس گھر سے بہت آتی ہے اشعار کی خوشبو
آہستہ غزل پڑھنا، یہ شبنمی لہجہ ہے — خوشبو کی کہانی ہے، تتلی کی زبانی ہے

ان کے یہاں روایتی معنوں میں ازدواج اور گھر پریوار کا غیر جشن آگیں تصور منعکس نہیں ہوا ہے۔ وہ جذبہ کی بوجھل (نا آسودگی) کیفیت اور نا آسودگی کے بجائے ایک انوکھی طمانیت لطافت، رفعت، سکون اور قدرے روحانی کیفیت سے مملو ہے۔ انھوں نے بیاہ نہیں کسی کے "ساتھ" کی آرزو کی تکمیل کا خواب دیکھا ہے جو حقیقت پذیر ہے ؎

کبھی دن کی دھوپ میں جھوم کے کبھی شب کے پھول کو چوم کے یوں ہی ساتھ ساتھ چلیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

ممکن ہے بیاہ ہندوستانی سیاق کے مختلف اسلامی اور ہندوی تہذیبی تناظر میں چار یا سات پھیروں اور چند مقدس آیتوں کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہو۔ لیکن "ساتھ نہیں" سے "ساتھ" روز طلوع ہوتے ہوتے سورج کے ساتھ نئے پھیرے لیتا ہے۔ چار پہر چار پھیرے بن جاتے ہیں اور روح کی گہرائیوں سے اگنے والے لافانی غزلیہ بولوں کے پروردگار! جن میں ایک عجیب سی مردانہ نرمی، ملائمیت اور گھلاوٹ کے ساتھ کہیں روح کی ساری کسک، کہیں روح کی ساری طمانیت غزلیہ طور پر رو پذیر ہو گئی ہے۔ اکثر ان میں جسم اور جنس کا ایک انوکھا روحانی ارتقا بھی نظر آتا ہے۔ یہاں جسم اور جذبہ کی بوجھل فضا کسی غیر مرئی نغمے کے زیر اثر، سبک، لطیف اور ملائم کیفیات میں ڈھل گئی ہے اور روح کے پرتو سے جگمگا اٹھی ہے۔ بشیر بدر کے غزلیہ آئینہ خانہ میں بیاہ ایک لطیف اور رفیع پینٹنگ کے مترادف ہے جو مرد اور عورت زندگی کے سرد و گرم کو جھیلتے ہوئے ایک دوسرے کے دل و دماغ کے کینوس پر بناتے ہیں۔ ہر روز ہر وقت اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، بولتے سنتے اور سوچتے سمجھتے ہر سانس کے زیر و بم کے ساتھ چیت کے پہلے دن سے لیکر پھاگن کے آخری دنوں تک کے سارے موسموں کے ساتھ اور موسموں کے سارے رنگوں کے ساتھ پینٹنگ بنتی ہے۔ متواتر بنتی ہے۔ ہر برس مختلف رنگوں کے ساتھ ساتھ اس بن رہی پینٹنگ کو ہر روز نئے سویرے کا، نئی دوپہر کا نئی شام کا اور نئی چاندنی کی نرم روشنی بھی چاہئے اور ان سویروں، ان دوپہروں، ان شاموں اور ان راتوں کی فطری فضا بھی ——— یہ بیک وقت خواب آشنا اور حقیقت شعار پینٹنگ عمر کی وہ فصل ہے جس کے پھلنے پھولنے کے لئے اپنی قدروں کی کھاد اور دل دریا کا پانی چاہئے۔ یہ دنیا کی واحد فصل ہے جس کے تیار ہونے کے لئے عمر کے سارے مسرت بار، سوز و گداز آگیں، جہد آزما اور زندگی پرور موسم چاہئے۔ سارے خوشگوار اور ناخوشگوار موسم اور ان کا بھرپور، ہمہ رنگ، متناقض شعور (PARADOXICAL CONCIOSNESS) اور مکمل قبولیت کا والہانہ (TOTAL ACCEPTABILITY) جذبہ! بشیر بدر کے بیشتر اس نوع کے غزلیہ اشعار عمر کے بدلتے موسموں کی دھوپ چھاؤں اور ان کی تیور (तीव्र) اور کومل سانسوں کے زندہ، تابندہ اور پائندہ غنائی تراجم اور خوش آہنگ تفاسیر ہیں۔ انسانی جسم کے اندر باون وائب ریشنس (VIBRATIONS) ہیں۔ ان سے صرف دیو بانی سنسکرت کے ہی الفاظ نہیں بنے ہیں۔ ان وائب ریشنس کے جو وائرے ہیں۔ جو قوس ہیں۔ جو خدوخال ہیں۔ جو خطوط ہیں۔ جو نوکیں اور دھاریں ہیں۔ ان کی آنچ، دھڑکن اور گونج سے ہی بشیر بدر کی شاعرانہ

ایمیجری کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ اس کا غزلیہ کارگہ شیشہ گری کا کام بہت نازک اور مینا کار ہے جو ایک انوکھی روشنی میں بھیگا نظر آتا ہے۔ اس کی حساس تفہیم کے لئے ایک فطری احتسابی یک آہنگی EMPATHY کی ضرورت ہے۔ خودساختہ نت نئے چوبی WOODEN غیر تنقیدی فارمولوں کی ان کی روح کی گہرائیوں تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ وہ ان کی غنائی عضوی ہیئت کی جادوگری کو بھی شدید طور پر مجروح کرتے ہیں۔

اس تصوراتی بوقلمونی اور صوتی، لسانی اور اُسلوبی تبدیلی کا ایک امین بشیر بدر کا غزلیہ آفاق آج کے ایک سچے اور پورے آدمی کی زندہ اور بیدار حسیت و آگہی کی صورت گری اور پیکر آفرینی کا محافظ ہے جو ہزار بہ شکستِ خواب کے باوجود ایک اور خواب دیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے جو ٹوٹ بکھر کر زمین پر گرتا اور پھر لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہو کر آسمان کو اپنی باہوں میں شدت سے کھینچ لینے کا متمنی ہے۔ اس کے اندر ہونے، جینے اور ارتفاع کرنے کی ناقابل تسخیر آرزومندی پوشیدہ ہے۔ بشیر بدر خود اپنے طوفان وجود سے لڑنے کے باوجود زندگی کے تمام ابعاد سے منسلک نازک اور لطیف "رشتہ جاں" کے مانند ہیں جو ہمیشہ مرتعش رہا۔

دے تسلی کوئی تو آنکھ چھلک اٹھتی ہے
کوئی سمجھائے تو دل اور بھی بھر آتا ہے

میری آنکھوں میں ہے اک ابر کا ٹکڑا شاید
کوئی موسم ہو سرِ شام برس جاتا ہے

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنالے گا بہتا ہوا پانی ہے

میری آنکھوں میں کسی کے آنسو ہیں
ورنہ ان پتھروں میں آب کہاں

ہم سے مجبور کا غصّہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اٹھے اپنے ہی دل پر برسے

اداس آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے ہیں
یہ موتیوں کی طرح سیپیوں میں پلتے ہیں

رو دئے سنگ دل دل میرا دیکھ کر
آئینہ ہو گئے آئینہ دیکھ کر

بھر دئے رکھ گئیں تیری پرچھائیاں
آج دروازہ دل کا کھلا دیکھ کر

تم جنہیں پھول سمجھتے ہو آنکھیں نہ ہوں
پاؤں رکھنا زمیں پر ذرا دیکھ کر

اس کی آنکھوں کا ساون برسنے لگا
بادلوں میں پرندہ گھرا دیکھ کر

یہ ہوا نہ جانے کہاں کہاں بھری دوپہر میں لیے پھرے
مرے برگِ دل ذرا ٹھہر جا تجھے آنسوؤں سے میں سینچ لوں

آنکھیں آنسو، دل بھی آنسو، شاید ہم سرتاپا آنسو
تھوڑی مٹی اور ملا دے، ابھی بہت گیلی ہے مٹی

تاہم ان کی رفتار پر [illegible] مختلف [illegible] اور فنی [illegible] ہمیشہ [illegible] اپنے شعری [illegible] دوران ارتقا [illegible] روایت کی [illegible] اپنی تخلیق تو تنوع و جدید رنگ [illegible] اہم اور معتبر تنقیدی کتابیں ہیں "اردو غزل حالی سے جگر تک ۱۹۴۷ تک" اور "آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ" مختلف حلقۂ ارباب ذوق میں آج کل گفتگو کا خصوصی موضوع بنی ہوئی ہیں۔ جو ان کی شخصیت کے رگ و پے میں موجزن تھی اور کیچڑ اور مواد کے بجائے آنکھ سے ہو کر ٹپکی ہے اور ان کی زندگی بھر کی فکر وفن کی پرستش و پرورش، عبادت و ریاضت اور سادھنا اور تپسیا کا نتیجہ ہے اور ان کے شعور و احساس کے مانند منفرد اور اُن کے وجدان و تخیل کے مانند ممتاز ہے۔

فن اگر روح و دل کی ریاضت نہ ہو ایسی مسجد ہے جس میں عبادت نہ ہو
تیری آنکھوں میں ایسا سمندر بناؤں نہیں کہ پھر آئینوں کی ضرورت نہ ہو

یہ بیکراں ریاضت، انفرادیت اور محبت ان کے غزلیہ اشعار میں غیر معمولی حسن اور اثر آفرینی کا راز ہے۔ ان کے یہاں احساس، تجربہ، صوتی آہنگ، پیکر تراشی اور شعری لب و لہجہ کا عجیب سادہ اور دلپذیر امتزاج ملتا ہے جو تمام شعری اوصاف کے مکمل آہنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ؎

وہ ماتھے کا مطلع ہو کہ ہونٹوں کے دو مصرعے
بچپن سے غزل ہی مری محبوب رہی ہے

وہ غزل والوں کا اسلوب سمجھتے ہوں گے چاند کہتے ہیں کسے خوب سمجھتے ہوں گے
اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری لوگ تجھکو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

یہ غزل کہ جیسے ہرن کی آنکھ میں پچھلی رات کی چاندنی
نہ بجھا خرابے کی روشنی، کبھی بے چراغ یہ گھر نہ تھا

ابھی اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کی پلکیں سنوار لوں
مرا لفظ لفظ ہو آئینہ تجھے آئینے میں اتار لوں

اُن کو اپنی منفرد غزل کی رعنائی اور برنائی کا خود بھی شدت سے احساس ہے۔ ذرا تخیل کا جادو، انوکھا پن، احساس کا نیا پن ملاحظہ ہو جو بڑے ریاض کا ثمر اور نئی غزلیہ جہت اور رویہ کا کاشف ہے ؎

تمہیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا

ـــــ گیا ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

مجھے حادثوں نے سجا سجا کے بہت حسین بنا دیا
مرا دل بھی جیسے دلہن کا ہاتھ ہو مہندیوں سے رچا ہوا

کبھی نیل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انہیں کچھ ہنسی آ گئی، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

تمام آگ ہے دل، راہ خار و خس کی نہیں
یہی گلی ہے جہاں سلطنت ہوس کی نہیں

بس ایک شام کی لذت غنیمت جان
عظیم پاک محبت کسی کے بس کی نہیں

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

خوب صورت، اداس، خوفزدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

کبھی یوں بھی آ مری آنکھ میں کہ مری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے مگر اس کے بعد سحر نہ ہو

مرے بازوؤں میں تھکی تھکی ابھی محوخواب ہے چاندنی
نہ اٹھے ستاروں کی پالکی ابھی آہٹوں کا گزر نہ ہو

وہ بڑا رحیم و کریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
تجھے بھولنے کی دعا کروں تو مری دعا میں اثر نہ ہو

صبح سے ڈھونڈھ رہے تھے کہ کہاں ہے سورج
اب نظر آئے ہو تو سارا جہاں روشن ہے

قدم سے آگے آگے چل رہی ہے
مسافر کو گلی پہچانتی ہے

دل کی خاموشی پہ نہ جاؤ
راکھ کے نیچے آگ دبی ہے

یہ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں
ستاروں کے لبوں پر کپکپی ہے

گھڑی دو گھڑی مجھ کو پلکوں پہ رکھو
یہاں آتے آتے زمانے لگے

اب روئے کہاں ساون اب تڑپے کہاں بادل
آنگن نہ بغیچہ ہے اک چھوٹا سا کمرا ہے

اس کا بھی کچھ حق ہے آخر
اس نے مجھ سے نفرت کی ہے

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں　　کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

خاک جب خاکسار لگتی ہے　　کس قدر باوقار لگتی ہے

صبر کر صبر کرنے والوں کی　　بے بسی شاندار لگتی ہے

دشمنوں کی طرح اس سے لڑتے رہے　　اپنی چاہت بھی کتنی نرالی ہے

مجھ سے بچھڑ کے خوش رہتے ہو　　میری طرح تم بھی جھوٹے ہو

اک دیوار پہ چاند ٹکا تھا　　میں یہ سمجھا تم بیٹھے ہو

اُجلے اُجلے پھول کھلے تھے　　بالکل جیسے تم ہنستے ہو

تم تنہا دنیا سے لڑوگے　　بچوں سی باتیں کرتے ہو

دل کا حال پڑھا چہرے سے　　ساحل سے لہریں گنتے ہو

پھول شاخوں کے ہوں کہ آنکھوں کے　　راستے راستے بچھنا کرنا

انھیں کبھی نہ بتانا ہیں ان کی آنکھیں ہوں　　وہ لوگ پھول سمجھ کے مجھے مسلتے ہیں

ہونٹوں کے پاس چاند کی قاشیں لرز گئیں　　آنکھوں پہ کالی رات کے گیسو بکھر گئے

چاہا تھا میں نے چاند کی پلکوں کو چوم لوں　　ہونٹوں پہ میرے صبح کے تارے بکھر گئے

اب ہوئی داستاں رقم بابا　　انگلیاں ہو گئیں قلم بابا

آہٹیں چلمنوں سے پوچھتی ہیں　　قید کب تک رہیں گے ہم بابا

کاغذی جوئے شیر لاتے ہیں　　اپنا تیشہ یہی قلم بابا

چراغوں کی آنکھوں میں محفوظ رکھنا　　بڑی دور تک رات ہی رات ہوگی

چراغوں کی لو سے ستاروں کی ضو تک　　تمہیں میں ملوں گا جہاں رات ہوگی

مسافر کے رستے بدلتے رہے　　مقدر میں چلنا تھا چلتے رہے

کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا　　مرے پاؤں شعلوں پہ چلتے رہے

مرے راستے میں اُجالا رہا　　دیئے اُس کی آنکھوں کے جلتے رہے

محبت، عداوت، وفا، بے رخی　　کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

ابر کے کھیت میں بجلی کی چمکتی ہوئی راہ　　جانے والوں کے لئے راستہ بن جاتا ہے

اردو غزل کا یہ مسافر اپنے زندگی بداماں تجربات سے اب دوسروں کے لئے مشعل راہ بن گیا ہے جس کے دل میں آتشِ ربانی اور گلے میں راگوں کا نشیمن ہے۔ بشیر بدر کا فکری

اور نئی سفر، مدام سفر جاری ہے۔ ان کی غزلیہ کائنات جزی صداقتوں ہیں کامل صداقتوں کی متلاشی روح کی کائنات ہے۔ وہ آدمی، زندگی، زمانہ، تہذیب، فطرت، کائنات اور خدا کی حسین کیفیت کی حسن و معنویت کی آگہی پیدا کرتی ہے اور خود اپنے تمام حسن اور معنویت کو بھرپور طور پر اجاگر کرتی ہے۔ وہ زندگی کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی متحرک اور تغیر پذیر حقیقت کی تمام پُر تضاد پیچیدگیوں اور نیرنگیوں کی مکمل نمویت، اور انجذاب کے باوجود اکثر بہت ہی حسین، ناقابل گرفت، پُر اسرار، خوابناک اور کثیر الابعاد غنائی کردار کا حامل ہے۔ اور بے معنویت اور انتشار میں بھی زندگی کے حسن، اسرار آگیں معنویت اور عظیم تخلیقی وروداتی امکانات کا استعارہ بھی ہے۔ ے

کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دھوپ ہوں کبھی دھول ہوں

میں تمام کپڑے بدل چکا ترے موسموں کی برات میں

یہ منفرد غزلیہ تازہ کاری اور نادرہ کاری اب اکثر افقی سطح HORIZONTAL PLAINE سے ارتفاع کر کے عمودی کیفیت VERTICAL PLAINE سے بھی ہمکنار ہوتی ہے اور شاعرانہ مرنو معصوم حیرت زدہ بچہ RECHILD کے مانند استفسار کرتا ہے جو تشکیک و تنکیر کی انتہائی شدت کے بعد پیدا ہونے والی وجدانی اثبات و استعجاب کی منزل ہے جو بقول نیتشے زندگی کے ریگزار سے گزرتے ہوئے اونٹ (CAMEL) کی روایت برداری اور زندگی کے اوہام واقدار سے نبرد آزما شیر (بغاوت پسند شاعر) سے آگے نئے عارفانہ دیژن کی منزل ہے جو نئے جمالیاتی صورو پیکر میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور کیفیت ذہنی کی انتہاؤں اور منتہاؤں کو زمانہ کی گردشوں سے محفوظ کر دیتی ہے اور ہر نوعیت کے زماں و مکاں کے بند دروازوں ALTERNATIVE LESSNESS کو نہ صرف فکر و فن کے مدارج سے ارتفاع کرتی بلکہ لاشیئیت NOTHINGNESS کو معموری FULLNESS سے ہم آغوش بھی کر دیتی ہے۔ یہ شاعرانہ خواب عرفاں VISION اپنی ذات کے اندر غواصی کرنے اور اپنے زماں و مکاں کے اندر ہر نوعیت کی سیاحی کرنے سے پیدا ہوتا ہے جہاں ذات و کائنات الگ الگ ہو کر بھی ایک ہیں اور آدمی MYOPIC VISION COSMICVISION میں تبدیل ہو جاتا ہے اور انسانی روح کی "جلتی جھاڑی" میں آدمی، زمانہ، فطرت اور خدا کے بنیادی اسرار و حقائق تک آئینہ ہونے لگتے ہیں۔ انسانی وجود تیرہ و تار مکیں نہیں جس میں داخل ہونے کے بعد آدمی محبوس ہو کر فنا پذیر ہی ہو بلکہ یہ ایک ایسا آفاقی نمائش ہے جس سے دوسرے انسان کے وجود اور کائنات کے تمام مظاہر کے جلوے وجدانی سطح پر بھرپور طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔

کس نے مجھکو صدا دی بتا کون ہے　　اے ہوا تیرے گھر میں چھپا کون ہے

بارشوں میں کسی پیڑ کو دیکھنا　　شال اوڑھے ہوئے بھیگتا کون ہے

خوشبوؤں میں نہاتی ہوئی شاخ پر　　پھول سا مسکراتا ہوا کون ہے

دل کو پتھر ہوئے اک زمانہ ہوا　　اس مکاں میں مگر بولتا کون ہے

خط نہیں ہوں جس پہ تم راہوں کی تفصیلیں لکھو　　ان کے گھر جاؤں گا میں جس کا پتہ کوئی نہیں

خدا ایسے احساس کا نام ہے　　رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

میں اسے ڈھونڈتا تھا آنکھوں میں　　پھول بن کر وہ شاخ پر نکلا!

وہ ہوا ہے اسے کہاں ڈھونڈوں　　آگ میں خاک میں کہ پانی میں!!

میں اپنی راہ میں دیوار بن کے بیٹھا ہوں　　اگر وہ آیا تو کس راستے سے آئے گا

"انا" کی دیوار چین ہے جس کی قید موت ہے۔ رہنا ہی بڑی زندگی ہے وہ روح کا نشیمن ہے۔ دل روح کی بالائی سطح ہے۔ اس کا کھلنا "عید نظارہ" ہے۔ "تن دید" ہے۔

دل اک مندر ہے میرا اس میں تو ہی تو دھڑکتا اگر　　تو ہی میرا بھگوان ہے گیا روٹھ تو باقی ہے

نئی غزل میں شعوری تہہ داریت کے لہجہ کو سمونے کے علاوہ اجتماعی لاشعور سے آگے آفاقی لاشعور[1] سے قدیم ترین اساطیری اور دیو مالائی تصویروں PRIMODIAL IMAGES؛ آفرینی کے ساتھ انتہائی سادہ اور عام پیکر سازی کی بے ساختگی اور قربت کی جاذبیت فکر و نظر ہے جہاں زندگی اور موت کی سرحدیں باہم مدغم ہو کر ایک ہونے لگتی ہیں۔ اگر لاشعوری طور پر دل کے ہر قطرہ میں سمندر انا الحق کی گونج سنائی پڑتی ہے اور آفاقی شعور (سیدگی کا دائرہ کوئی چشم زدن میں محیط ہو جاتا ہے۔ ایک فلیش میں پورا پیٹرن دکھائی دے جاتا ہے جو لاعلمی اور نافہمی کے سیاہ پردہ کے پیچھے پوشیدہ رہتا ہے۔ بالاوقیانوسی حسیت اور بصیرت[2] OCEANIC SENSITIVITY AWARENESS خاطر نشیں ہو۔

پانی سب کا رستہ روکے اپنے ساجن بھی اس پار　　سارا ساگر طے کرنا ہے کاغذ کی اک کشتی سے

۱۔ آفاقی شعور و آگہی کے ضمن میں مزید تفصیل میرے آرٹیکل "اردو تنقید میں تخلیقیت کا میلان" میں ملاحظہ فرمایئے۔ یہ ینگ کے اجتماعی لاشعور سے آگے کی منزل ہے۔ مذکورہ گاہی (۱) آفاقی نگاہی یا آفاقی بصیرت (۲) عہد نامہ عتیق "خروج" (۴) رضائے الٰہی (۵) ینگ سے آگے۔

بشیر بدر اپنی تلاش میں وجود کے باہری دائرہ سے آہستہ آہستہ مرکزی نقطہ کی طرف جھک رہے ہیں جس کی "موسیقی سے لبریز ہوا" (رشیلے) ان کو کسی لمحہ تازہ دم کر دیتی ہے۔ تاہم ابھی ذرہ سے آفتاب تک جگمگاتا ہوا زندگی کا کارواں ان کے قدموں کو پکڑ رہا ہے۔ اس کا آئینہ ان کا دل ہے جس کو دیکھنے کا معجزہ ان کی غزلیہ شاعری ہے جس کی وسیلہ سے اپنے عہد کی روح کو انہوں نے آج کی عنصری اور گفتاری زبان میں فنی دوام عطا کیا ہے۔ ان کی منفرد سحر کار آواز اور نئی علامتی صورت گری کا سرچشمہ ان کی نادر روزگار رشدی تصویر کاری اور اچھوتی نازک بینی ہے جس نے مجموعی طور پر اردو غزل کے ماضی کو صوری، معنوی اور صوتی سطح پر "آج" کی فضا اور آئندہ کے خوابوں سے منسلک کر کے ایک تہذیبی اکائی کی درخشاں علامت بنا دیا ہے۔ ان کی پوری غزلیہ شاعری ایک حسین طلسماتی داخلی دنیا کے مسحور کن مناظر اور معانی کا پوری شدت اور توانائی کے ساتھ بھرپور انکشاف کرتی ہے۔ ان کے الفاظ ڈرامہ کے کرداروں کے مانند مختلف غزلیہ اشعار کے اسٹیج پر مختلف رنگ و آہنگ میں نمودار ہوتے ہیں اور اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مختلف جذبات واردات اور حسیات کی روشنیوں اور رنگوں کے ساتھ بشیر بدر کے اختراع اور استعمال الفاظ کی صوتی اور معنوی ہیئت عجیب عجیب ہیولے تخلیق کرتی ہے جس کی ڈرامائی کیفیت، صوت و غنا کی بھرپور جامعیت، تخیل کی براقی بلکہ تابکاری کی انتہائی واقفیت، اچھوتا آہنگ، کیف وکم اردو غزل کو ایک نیا مزاج، نیا نظام اور نئی طرح عطا کرتے ہیں اور ہماری غیر آسودہ ذہنی، روحانی اور فاقہ زدہ جذباتی زندگی کو بھرپور طور پر آسودگی اور آگہی بخشتے ہیں۔ میر، غالب، اقبال، فراق، فیض، ناصر کاظمی کے بعد سب سے اہم نئی غزلیہ تخلیقیت افروز شخصیت فی زمانہ ڈاکٹر بشیر بدر کی ہے۔ ان کا منفرد غزلیہ اسلوب اور غزلیہ ادب کے ساخت اکبر (MACRO STRUCTURE) میں بذات خود مختلف ساخت اصغر MACRO STRUCTURE ہے بنا ان کے نفس نفس کی سیاحت کرانے پر قادر ہے اور نئے غزلیہ لسانی مستقبل کا جگمگاتا ہوا نشان و پہچان بھی ہے۔

سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہو جائے گا
اتنا مت چاہو اسے وہ بے وفا ہو جائے گا

بشیر بدر کا شعری سفر

ڈاکٹر شارب ردولوی

بشیر بدر کا تیس سال سے زائد کا شعری سفر ہماری نگاہ کے سامنے ہے جس میں وہ بہت سے نشیب و فراز سے گذرے ہیں۔ یہ نشیب و فراز ان کی زندگی اور اقتصادی حالت سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور ان کے ذہن و فکر سے بھی۔ وہ اپنے اس وقت کے حالات اور ملازمت سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ زود حس انسان ہیں۔ حالات کا ردعمل ان پر کچھ زیادہ ہی شدید ہوتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ارادے کی پختگی بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے جب پولیس کی ملازمت ترک کی اور دوبارہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو ہم لوگوں کا خیال تھا کہ گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ اس گاڑی کو چلانا مشکل ہوگا۔ لیکن انھوں نے ہم سب کے شبہات کو غلط ثابت کر دیا۔

علیگڈھ بشیر بدر کی ذہنی و فکری بالیدگی کے لئے بہت راس آیا۔ علیگڈھ کی فضا ہمیشہ ہی تخلیقی فنکاروں کے لئے فکر انگیز رہی ہے۔ مجاز، سردار جعفری، جاں نثار اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی، حیات اللہ انصاری عصمت چغتائی، قاضی عبدالستار سب کا کسی نہ کسی طرح تعلق علیگڈھ سے رہا ہے۔ علیگڈھ نے بشیر بدر کی فکر پر بھی جلا کی۔ یہ زمانہ جدیدیت کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ غزل اور نظم نئے تجربات سے دوچار تھی علیگڈھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور پروفیسر آل احمد سرور جدیدیت کے میر کارواں تھے۔ اظہار ایک نیا اسلوب اختیار کر رہا تھا۔ نئی تراکیب، تشبیہات، استعارات اور علامتیں سامنے آ رہی تھیں۔ پرانی قواعد اور زبان کے اصولوں سے انحراف فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔ بشیر بدر کے یہاں جبلی طور پر ایک نئی اونچ تھی۔ فراق سے ذہنی قربت اور روپ کی رباعیات کے تاثر نے انھیں اپنی زمین سے قریب تر کر دیا تھا۔ پیچیدہ تراکیب اور مفرس الفاظ سے ان کو کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے اس نئی ادبی فضا اور رجحانات کا حصہ بننے میں انھیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

جدیدیت بیشتر لوگوں کے یہاں ADOPTED رجحان تھا۔ زبان کے مروجہ اصولوں سے انحراف اور مخصوص لفظیات کا استعمال مایوسی، ناکامی، شکست اور تنہائی کی فضا کی تکرار اس کی شناخت تھی۔ بشیر بدر بھی اسی کارواں میں شامل تھے لیکن قدرے مختلف تھے۔ ان کے یہاں خیال و اظہار میں جو تازگی اور نیاپن تھا اس نے انھیں وہاں بھی نمایاں رکھا اور شاید یہیں سے ان کی شاعری کا ایک نیا سفر شروع ہوا۔

تیس سال کے اس سفر میں بشیر بدر کی شاعری تین نمایاں موڑ سے گذری ہے۔ ایک ان کی شاعری کا وہ زمانہ ہے جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے جس زمانے کی ساری چیزیں مطبوعہ شکل میں نہیں آئیں لیکن اس کے نشانات 'اکائی' میں کہیں کہیں ضرور دیکھے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ 'اکائی' کی اشاعت کے وقت تک ان پر جدیدیت کے اثرات غالب ہو چکے تھے۔ دوسرا موڑ 'امیج' میں نظر آتا ہے۔ جہاں وہ جدیدیت کے نمائندہ شاعروں میں شمار ہونے لگے تھے اور خود ساختہ علامتوں اور استعاروں میں بات کرنے کو ہنر سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری کا تیسرا موڑ 'آمد' ہے جہاں وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان تینوں مجموعوں سے ان کے ذہنی سفر اور نشیب و فراز کا آسانی سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

بشیر بدر کی شاعری میں مجموعی حیثیت سے جو خصوصیت بہت واضح طور پر نظر آتی ہے وہ ان کے یہاں زبان کا مخصوص استعمال ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ غزل کی ایک تہذیب اور مخصوص طرح کا ڈھانچہ ہے اور وہ بہت زیادہ آزادی کا متحمل نہیں ہو سکتا انھوں نے زبان، لفظیات اور خیال تینوں میں اچھی خاصی آزادی لی ہے۔ زبان کے سلسلے میں اردو شاعری میں تین روایتیں نظر آتی ہیں یوں تو روایتیں اور بھی ہو سکتی ہیں لیکن کسی نہ کسی جگہ ان کا سلسلہ انھیں تین روایتوں سے مل جاتا ہے۔ جس میں ایک روایت اردو معلیٰ کی ہے۔ دوسری نظیر کی عوامی زبان کی ہے اور تیسری آرزو کی سریلی بانسری کی۔ ان میں نظیر کو چھوڑ کر موضوع کے اعتبار سے دوسری دونوں روایتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بشیر بدر کا رشتہ نظیر کی روایت سے ملتا ہے۔ انھوں نے شاعری کو 'جزویست پیغمبری' کی سطح سے اتار کر عام زبان میں عام زندگی اور اس عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا حصہ بنا دیا ہے۔ جس سے اس طرح اردو غزل آشنا نہیں تھی مثلاً ان کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

وہی شہر وہی راستے وہی گھر ہے وہی لان بھی
مگر اس دریچے سے پوچھنا وہ درخت انار کا کیا ہوا

بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے	حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

ہنسی معصوم سی بچوں کی کاپی میں عبارت سی — ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت سی

گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا

بے مروتی واقعی لیکن گھنے کہرے کی یورش میں — پہاڑوں سے اترتی ان بسوں کو کون دیکھے گا

ابھی اپنے اشاروں پر ہمیں چلنا نہیں آیا — سڑک کی لال پیلی بتیوں کو کون دیکھے گا

بڑے تاجروں کی ستائی ہوئی — یہ دنیا دلہن ہے جلائی ہوئی

حویلی کا سورج جھکائے تھا سر — اداسی کی بیلیں تھیں دالان میں

چرواہا بھیڑوں کو لے کر گھر آیا رات ہوئی — تو پنچھی دل تیرا پنجرا، پنجرے میں جا رات ہوئی

سر پہ سایہ سا دستِ دعا، یاد ہے — اپنے آنگن میں اک پیڑ تھا، یاد ہے

سناٹے آئے درجوں میں جھانکا چلے گئے — گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

بارشوں میں کسی پیڑ کو دیکھنا — شال اوڑھے ہوئے بھیگتا کون ہے

یہاں پر میں نے ان کی صرف چند غزلوں کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں غزلوں کی فضا عام غزلوں سے مختلف ہے۔ وہ ایسی تشبیہات اور استعارے استعمال کرتے ہیں جو ان کی اپنی تخلیق ہیں اور جو غزل کی روایتی فضا سے عام طور پر تعلق نہیں رکھتے۔ خود ان اشعار میں لان، دریچے، انار کا درخت، پرانی دلانیاں، حویلیاں، بچوں کی کاپی، ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے، گرم کپڑوں کا صندوق، یادوں کی کافور جیسی مہک، جنگلی آم کی جان لیوا مہک، سڑک کی لال پیلی بتیاں، چرواہا، بھیڑ، پنچھی، پنجرا، شال اوڑھے ہوئے، بڑے تاجروں کی ستائی ہوئی وغیرہ کچھ گیت کی فضا سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ نظم کی فضا سے۔ بشیر بدر نے اس طرح کی بہت سی ترکیبیں اور تشبیہیں استعمال کی ہیں جن کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے انھوں نے اس طرح کے الفاظ سے اپنی غزل کو ایک نیا ڈکشن دینے کی کوشش ہے۔ اس کے علاوہ غزل کے روایتی موضوعات کو بھی انھوں نے تبدیل کیا ہے۔ اور خیال آرائی اور فلسفہ طرازی کے بجائے اسے زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور محرومیوں سے بالکل عام اور سادہ زبان میں جوڑنے کی کوشش کی ہے انھوں نے خود ایک شعر میں کہا ہے ؎

سنوار نوک و پلک ابروؤں میں خم کر دے　　گرے پڑے ہوئے لفظوں کو محترم کر دے

اور انہیں گرے پڑے لفظوں پر انھوں نے اپنی غزل کی بنیاد رکھی ہے۔ اردو غزل کے لئے یقیناً یہ نیا تجربہ ہے۔ یہ تجربہ کتنوں دنوں زندہ رہے گا اس کے بارے میں پیشن گوئی مشکل ہے۔ لیکن چونکہ مشاعرہ کا سامع خاص طور پر اور اردو کا قاری عام طور پر اس ذخیرۂ الفاظ سے نامانوس ہوتا جا رہا ہے اس لئے یہ تجربہ مخصوص حلقے میں مقبول بھی ہو سکتا ہے۔

بشیر بدر ایک حساس شاعر ہیں اس لئے اس تجربے سے الگ بھی بہت سے اچھے اشعار ان کے کلام میں مل جاتے ہیں جن میں آج کی زندگی اور اس کے پیچ در پیچ مسائل کی بہت اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ مثلاً یہ چند اشعار دیکھئے ؎

کہاں سے آئی یہ خوشبو یہ گھر کی خوشبو ہے
اس اجنبی کے اندھیرے میں کون آیا ہے

سب گناہوں کا اقرار کرنے لگیں
اس قدر خوبصورت سزائیں نہ دے

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیئے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

ہم کو بیکار لیے پھرتے ہو بازاروں میں
ہم نہ یوسف ہیں نہ یوسف کے خریداروں میں

آنسوؤں سے مری ہتھیلی پر
کون پڑھتا کہ اس نے لکھا کیا

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

یہ اشعار بشیر بدر کے محسوسات ہی کی کامیاب عکاسی نہیں کرتے بلکہ عصری مشیت کے بھی ترجمان ہیں۔ بشیر بدر کی کامیابی اور مقبولیت کا یہی راز بھی ہے کہ وہ عام جذبات کو عوامی زبان میں بڑی سادگی کے ساتھ ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں کسی طرح کا تصنع یا بناوٹ نہیں ہے۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر اپنے گاؤں اور قصبات کی سوندھی مٹی اور بھینی بھینی خوشبو کا احساس ہوتا ہے خدا کرے کہ یہ خوشبوئیں یوں ہی بڑھتی اور پھیلتی رہے۔

گیلے گیلے مندروں میں بال کھولے دیویاں
سوچتی ہیں ان کے سورج دیوتا کب آئیں گے

بشیر بدر

آزادی کے بعد کی غزل کا

تنقیدی مطالعہ

ایک جائزہ

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

اردو غزل کی سنت جانی کہئے یا اس کی مقبولیت کہ ہر دور میں اس کو دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں ایک امتیاز حاصل رہا ہے۔ جو لوگ زمانے کو خارجی عوامل سے جوڑتے ہیں ان کے نزدیک وہ ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم ہے۔ مگر ان زمانوں کے الگ الگ ہونے کے ساتھ ان میں ایک ایسا رشتہ بھی ہے جو قصہ جدید و قدیم کی بحث کو ایک وحدت میں پرو دیتا ہے۔ ماضی اپنے حال سے ملکر اور حال اپنے مستقبل سے اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں ایک دوسرے کے بغیر ان کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ یہ دھارے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں اور پھر کہیں کسی منزل پر آکر مل جاتے ہیں۔ یہ لین دین صرف زمانوں کے اتفاق و اختلاف کا نہیں ہوتا بلکہ ان میں سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور معاشی اثرات بھی اپنا عکس دکھاتے ہیں۔

بیسویں صدی کی غزل کی نوعیت اپنے ماضی سے نمایاں طور پر مختلف ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس عہد میں مختلف تحریکوں اور رجحانات نے اتنی تیزی سے کروٹیں لیں کہ غزل کے علاوہ شاید کوئی دوسری صنف سخن ساتھ نہیں دے سکتی تھی اس عہد میں غزل نام آور بھی ہوئی اور رسوا بھی۔ مختلف تجربات نے اس میں معنویت بھی پیدا کی اور اس کو بگاڑا بھی۔ خیر و شر کی اس کشمکش اور انفصال و افتراق سے غزل نے کس طرح اپنی انفرادیت قائم رکھی یہ تاریخ ادب کی دلچسپ کہانی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو غزل نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ اس دور میں غزل نے تقسیم ہند کا خوں ریز منظر بھی دیکھا۔ ترقی پسند تحریک کا عروج و زوال بھی سامنے آیا۔ جدیدیت کے نئے تجربات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ایک نئے ملک پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اس نے اپنی شناخت کے لئے اصرار بھی کیا۔ اگر ان دو ملکوں (ہندوستان اور پاکستان) کے رجحانات کا تجزیہ کریں تو

ایک طبقہ وہ ملے گا جو ان دونوں کو الگ الگ دبستان فکر کا نام دے گا۔ دوسرے طبقہ کا اصرار ہے کہ ہندوستان سے جانے والوں نے یا غیر منقسم ہندوستان کے پاکستانیوں نے جس شاعری کو فروغ دیا وہ صرف توسیع ہے کوئی الگ دبستان فکر نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ان دونوں کے درمیان مفاہمت کا راستہ بھی نکالنے کی کوشش کی مگر دونوں ملکوں کے سامنے ایک سوالیہ نشان ضرور رہا کہ آزادی کے بعد کیا اردو غزل کی ضرورت ہے؟ کیا اس میں یہ وسعت ہے کہ موجودہ دور کی تیز رفتاری کا ساتھ دے سکے اور دوسرا سوال تھا کہ اس عہد میں اردو غزل نے ترقی کی یا اس کا تنزل ہوا؟ ان تمام سوالات کی کہانی ہے بشیر بدر کا تحقیقی مقالہ یعنی "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ"۔ مجھے اس کتاب کا جائزہ لینا ہے سر دست بشیر بدر کی شاعری اور شخصیت سے بحث نہیں ہے اگر گفتگو کے دوران ان میں سے کسی بات کا ذکر آ جائے تو اس کو ضمنی سمجھا جائے۔

میری ذاتی رائے ہے کہ اپنے عہد پر تبصرہ کرنا سب سے مشکل ہے۔ بشیر بدر نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک ہندوستان اور پاکستان کی اردو غزل کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں ترقی پسند اور جدیدیت پسند شعراء کی نمائندگی ہے۔ آزادی کی داستان بھی ہے اور فسادات کی روح فرسا واقعات بھی۔ اصناف سخن میں غزل سب سے حساس صنف سخن ہے اس لئے ان واقعات کو غزل نے اس طرح پیش کیا کہ زبان سے نکلی ہوئی بات دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ غزل نے ہر دور میں عصری آگہی کا ثبوت دیا ہے اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ اس عہد کے مسائل اور مصائب سے چشم پوشی کرتی۔ بشیر بدر نے جس خوبی سے ان تمام حالات کا احاطہ کیا ہے اس کے لئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عام طور سے ان کا رویہ غیر جانبدارانہ ہے مگر بقول شخصے کہ "جب میں ملٹن پڑھتا ہوں تو میرے تحت الشعور میں یہ ہوتا ہے کہ میرا رشتہ ملٹن سے کیا ہے"۔ بشیر بدر بھی نظریات کی بحث میں اس سے دامن نہیں بچا سکے۔ مثلاً ترقی پسندی پر جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں ان کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا ہے اور ان میں بڑی حد تک صداقت بھی ہے۔ مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پورے عہد کو متاثر کرنے والی تحریک میں کوئی خوبی ضرور ہوگی جس نے مدتوں اپنا سحر قائم رکھا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے موازنہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندی کی تمام خامیوں کے باوجود یہ امر مصدقہ ہے کہ اس کے پیچھے ہمارے دانشوروں کا عمل بھی شامل تھا۔ ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے پاس صحت مند روایتیں بھی تھیں۔ ان کے بہت سے بڑے شاعروں نے اپنی ترقی پسندی کے باوجود کلاسیکیت سے رشتہ نہیں توڑا تھا۔ لیکن جس طرح ہر شخص کی عمر

ہوتی ہے اسی طرح تحریکوں کی بھی نمو ہوتی ہے اور جب وہ اپنا رول ختم کر دیتی ہیں تو ان کی ضرورت نہیں رہتی یہی سب کچھ ترقی پسندی کے ساتھ بھی ہوا۔ اب ترقی پسندی کے احیا کی کوشش محض باسی کڑھی میں ابال کی طرح ہے۔ پھر ذرا ہندوستان اور پاکستان کی ترقی پسندی کے رجحانات کا جائزہ لیجئے تو یہ حقیقت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آجائے گی۔ اس کا سبب بنیادی نظریہ نہیں تھا بلکہ بقول جذبی صاحب "جماعت کی پابندی یا "مصلحت پسندی" اور یہ دونوں باتیں غزل کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

بشیر بدر نے ایک جگہ محاورہ کی بحث میں کہا ہے: "ایک دور کا محاورہ دوسرے دور کے لئے اجنبی اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ محض محاورہ کے حسن اور برجستگی پر کوئی شعر اچھا نہیں ہو سکتا۔" یہ درست ہے کہ محاورہ اپنے عہد کی حالت اور مطالبات کا ترجمان ہوتے ہیں ان پر سماج کے اثرات کے علاوہ موسم اور جغرافیائی عناصر کا بھی اثر ہوتا ہے لیکن اچھے محاورہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ماحول میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے اس کا نہ اثر ختم ہوتا ہے اور نہ حسن۔ ذیل کے اشعار انیسویں صدی کے اور بیسویں صدی کے اوائل کے ہیں کیا ان کے حسن اور اثر میں کوئی کمی نظر آتی ہے۔؟

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں (درد)

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہنچی تری جوانی تک (فانی)

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں (انشا)

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر — ہے پیارے ہنوز دلی دور (میر)

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی — پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج (حالی)

غزل اور نظم کی بحث بہت پرانی ہے۔ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری اور ترقی پسند تحریک نے غزل پر جو ضرب لگائی اس نے کچھ عرصہ کے لئے ایوان غزل میں ہلچل پیدا کر دی۔ مگر یہ کیفیت عارضی تھی اور غزل کا پرچم بدستور لہراتا ہے۔ بشیر بدر نے سرور صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے۔

"پروفیسر آل احمد سرور نے غزل کی مقبولیت کی وجہ یہ بتائی کہ اس عہد میں یہی خیالات کے جذباتی ترسیل کا سب سے مقبول ذریعہ ہے لیکن اس کے باوجود نظم کی اہمیت زیادہ جگہ ہے۔"

اس بیان میں خود اپنی بات کا تضاد محسوس ہوتا ہے۔ غزل گو ترسیل کا سب سے مقبول ذریعہ"

بھی کہتے ہیں اور "نظم کی اہمیت زیادہ" بھی بتاتے ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر اصناف سخن پر نظر ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ اقبال اور جوشؔ کی نظموں میں سب سے اعلیٰ نظمیں وہی ہیں جن میں غزل کا آہنگ ہے۔ آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ فلاں غزل میں نظم کا لطف ہے۔ مثال یہی دی گئی کہ فلاں نظم یا قصیدہ کا حسن اس لئے ہے کہ اس میں غزل کا لب ولہجہ شامل ہے۔ غزل کے سلسلہ میں بشیر بدر کا انداز متوازن ہے۔ غزل ہی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بحث تقلید میر کی بھی ہے۔ دور حاضر میں سائنسی تجربات جدیدیت اور ترقی پسند شاعری کا واسطہ دے کر نئے تجربات کی کتنی ہی بات کی جائے مگر آج بھی اعلیٰ غزل کے لئے علامت میرؔ اور غالبؔ ہی قرار دیئے جاتے ہیں۔ اکثر شعراء اپنی شناخت کے لئے میر سے وابستگی کو فخر خیال کرتے ہیں۔ اس موقع پر سید عبد اللہ کا وہ لطیفہ شاید بے محل نہ ہو۔ ایک محفل میں کسی نے اپنی میرؔ سے بیزاری کا اظہار اس طرح کیا کہ "اگر میرے بس میں ہوتا تو میر کو شوٹ کر دیتا۔" سید عبد اللہ کسی دوسری طرف متوجہ تھے۔ چونک کر قریب کے ساتھی سے دریافت کیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان صاحب نے ان کے الفاظ دہرا دیئے۔ سید عبد اللہ کہنے لگے کہ "مگر ان سے یہ تو دریافت کرو کہ میرؔ کو شوٹ کرنے کے لئے اتنی بڑی بندوق کہاں سے لائیں گے۔" بہر نوع بات طرز میر اور تقلید میر کی ہو رہی تھی۔ غالب زندگی بھر "طرز بیدل" کو "مزاج بیدل" خیال کرتے رہے اور کبھی بیدل کی روح کو نہ پا سکے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو میرؔ کے لہجہ میں شعر کہہ کر میرؔ کی روح میں سما جانے کا اعلان کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی غلطی پر ہیں جو میر کو محض غم کا شاعر سمجھتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ وہ صفات لگا دیتے ہیں جو غم سے متعلق ہیں۔ لیکن بشیر بدر کا یہ خیال بڑی حد تک درست ہے۔

> "اس امر کا اعتراف ضروری تھا کہ میرے نئی نسل کے اچھے شاعروں نے اپنی انفرادیت کی تشکیل کرنا سیکھا ہے اور ان کی لفظیات کی تقلید ان شاعروں نے کی ہے جن کی بذات خود ادب میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔" (ص ۱۰۵)

کچھ عرصہ پہلے ادبی فضا پر جدیدیت کی گونج رہی۔ کچھ لوگوں نے اس کو تحریک سے منسوب کیا اور بعض لوگوں نے اس کو صرف رجحان کہا ہے۔ ایک طبقہ وہ بھی تھا جو اس کو ترقی پسندی کے خلاف ایک محاذ خیال کرتا تھا اور دوسرا گروہ ترقی پسندی کی توسیع کہتا تھا۔ غرض تاویلوں میں معنی گم ہو کر رہ گئے۔ دراصل جدیدیت ایک بحرانی دور کی پیش کش ہے۔ طبقاتی کشمکش، جنگ، ذہنی تناؤ، بے بسی، بے کیفی، بے اعتمادی غرض ان تمام باتوں نے انسانی ایقان کو متزلزل کر دیا اور ایک بھٹکے ہوئے انسان کی طرح کسی سایہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے

"راست تنے کی بات کہی ہے۔ بہر نوع یہ ایک طویل بحث ہے اس کو کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کرتے ہیں۔

دورِ جدید کا المیہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے فوٹو گرافی اور مصوری کے فرق کو کم سمجھا ہے انہوں نے عام طور سے ہر بیانیہ انداز کو مصوری سے تعبیر کیا ہے۔ شاعری یقیناً حقیقت کے اظہار کا دوسرا نام ہے مگر ہر حقیقت کا اظہار نہ شاعری کے لئے ضروری ہے اور نہ اس کی کوئی افادی قدر و قیمت ہے۔ مصوری دراصل انتخاب کا دوسرا نام ہے اور اس کے رشتے جا کر جمالیاتی احساس سے مل جاتے ہیں۔ شاعری میں رنگینی اور رعنائی اس وقت آتی ہے جب خود شاعر کی نظر میں رنگینی و رعنائی ہو۔ اسی لئے جہاں تخیل کی بلندی پر زور دیا گیا ہے وہاں اس کو بے لگام ہونے سے روکا گیا ہے۔ بشیر بدر نے اپنے اتنے اہم مقالہ میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ یہاں ہر چند معروضات کی طرف اشارہ کروں گا جن کو بشیر بدر صاحب نے اپنے مقالے میں تحریر کیا ہے

۱۔ "اس دور میں شاید پہلی بار چند شاعروں کے وسیلے سے یہ سلے عام ہوئی ہے کہ "تغزل" چند مقررہ رموز و علائم، تشبیہ و استعارے اور لفظیات کا نام نہیں ہے۔" (ص ۱۷۸)

حالانکہ ہر دور میں تغزل کا لب و لہجہ اور معنویت بدلتی رہی ہے۔ یہ سلسلہ ہر بڑے شاعر کے یہاں اپنی آفاقیت کے ساتھ موجود ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ وغیرہ۔

۲۔ "جدید غزل میں نئے انسان کی دریافت ہے۔ یہ انسان نظریوں اور سیاسی عقائد کا انسان نہیں ہے بلکہ پوری زندگی کا انسان ہے۔" (ص ۱۷۱)

روایتی شاعری سے قطع نظر انسان کی تلاش ہر دور میں ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں نے کی ہے۔ ع

کز دام و دد ملولم و انسانم آرزو ست

خدا ساز تھا آذر بت تراش | ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں (میرؔ)
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا | آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا (غالبؔ)
وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے | پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا (فانیؔ)
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے | وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا (دردؔ)
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے | وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ (اقبالؔ)

ایسے اشعار کی کمی نہیں جہاں انسان کی تلاش بھی ہے اور نئے انسان کی دریافت بھی مگر فطرتِ انسانی ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہتا ہے۔

اس مقالہ میں ایک بات برابر کھٹکتی رہی اور وہ یہ کہ بشیر بدر نے جا بجا اپنے دعوے کی دلیل میں

لگا۔ یہ سب اگرچہ زندگی کی حقیقتیں تھیں مگر صحت مند حقیقتیں نہیں تھیں۔ ان حالات میں پیدا ہونے والے بے اطمینانی اور بے یقینی نے انسان کو اس کے ماحول سے بیگانہ کر دیا۔ بات کو کہنے کے لئے علامتوں کی ضرورت ہوئی اور ان علامتوں کے تجربوں نے شعر کو الجھا کر رکھ دیا۔ ذیل کے اشعار میں بشیر بدر کو معنویت نظر آئی اور میں معنی کی تلاش میں ہوں۔

اب ٹوٹنے ہی والا ہے تنہائی کا حصار — اک شخص چیختا ہے سمندر کے آر پار (عادل منصوری)

مل گئے سارے عقائد خاک میں — پانیوں میں بہہ گیا سورج مرا (کمار پاشی)

سورج تو پتھروں کی آڑ سے نکلا — تم اب کس کا راستہ روکے بیٹھے ہو (خلیل مامون)

سورج کے ساتھ سرابوں کے دشت میں — دو گز چلی تھی اور زمیں ہانپنے لگی (لطف الرحمن)

غزل ہو یا نظم اس کا پہلا مقصد ابلاغ ہے۔ مگر یہاں ابلاغ نصیب دشمناں ہے۔ اس کے جواز میں اکثر لوگ کہتے ہیں کہ کلاسکی شاعری میں بھی تو آخر رمزیت ہے۔ اس پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔ لیکن ذیل کے اشعار پڑھئے اور بتایئے کہ اس رمزیت میں اور اشعار بالا کی رمزیت میں کوئی مناسبت ہے؟

کہاں کے لالہ و گل، کیا بہار توبہ شکن — کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن (جگر)

نہ میکدہ پر زوال آتا، نہ مے پرستوں میں پھوٹ پڑتی — صراحی تقسیم مے سے پہلے ہی دست ساقی سے چھوٹ پڑتی (شکیل بدایونی)

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر — وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں (فیض)

نہیں یاران چمن عیش کا ہنگامہ ابھی — کچھ گرفتار تڑپتے ہیں تہہ دام ابھی (جوہر بدایونی)

اسی طرح سورج، سایہ، ہوا، اندر، باہر، خورشید کی بیٹی، سمندر کی پیاس، لفظوں کے ہاتھوں، دریچے، کارونا وغیرہ یہ سب ژولیدگی کا پتہ دیتے ہیں۔ اسی کی توجیہ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہمارے ملک کو (خواہ ہندوستان ہو یا پاکستان) کسی انقلابی پروگرام سے سابقہ نہیں پڑا۔ اگر آزادی کے لئے ہماری جنگ انگریزوں سے ہوتی اور اس میں ہزاروں آدمی شہید ہو جاتے تو ہمارا سر بلند ہو جاتا۔ مگر ہزاروں کا خون فساد کی نذر ہوا اور انتشار کی لے تیز رہی۔ اس لئے شاعر کے ذہن میں اس انتشار کا ہونا ناگزیر تھا اور اس نے اپنی ذات میں واپس چلے جانے میں عافیت سمجھی اور شاید یہی سبب ہے کہ گیان چند جین نے جب یہ کہا کہ رابنسن کروسو کے جزیرہ میں تنہائی کی زندگی میں ساٹھ کی غزلوں کو ترجیح دوں گا اور وہ غزلیں ان کو راس آئیں گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات انہوں نے جدیدیت کی تائید میں کہی یا صرف امر واقعہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس تنہا جزیرہ میں جہاں جدوجہد اور عمل کے راستے بند ہوں وہاں صرف ذات کا سفر ہی ساتھ دے سکتا ہے۔ یہاں غالباً انہوں نے پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ

اپنے اشعار پیش کئے ہیں۔ ہمارے مشرقی آداب میں ویسے بھی واحد متکلم کے صیغہ کو استعمال کرنے میں احتیاط کی ہدایت ہے۔ یہی سبب ہے کہ رشید احمد صدیقی کے معترضین نے ان کے لفظ "میں" پر اعتراض کیا ہے بہرنوع رشید احمد صدیقی کے یہاں واحد متکلم کا صیغہ ان کے تخلیقی ادب کا ایک حصہ ہے۔ "شیخ" مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کی منزل کب آتی ہے اس سے اہل ادب بخوبی واقف ہیں۔

مجموعی طور پر بشیر بدر کی تصنیف قابل داد ہے۔ جس وضاحت اور خوبصورتی سے انہوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد کی غزل کا جائزہ لیا ہے اس نے اس عہد پر کام کرنے والوں کے لئے راستے کھول دیئے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا جس بصیرت اور بصارت کے ساتھ جائزہ لیا ہے وہ ان کے محسنات میں سے ہے۔ دور جدید کے مطالبات کو عہد حاضر کے شعراء نے کس طرح غزل کے واسطے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خوب صورت انضباط بشیر بدر کے یہاں موجود ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی اس کے بین السطور میں ہے۔ یعنی جن مسائل کو بشیر بدر نے جائزہ کے انداز میں پیش کیا ہے وہ دراصل ہمارے ناقدین کے لئے سوالیہ نشان بھی ہیں۔ ان سوالات کو حل کرنے کے لئے بشیر بدر کی تصنیف "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ" کے راستے سے گزرنا پڑے گا۔ یہ مختصر جائزہ ہے۔ کتاب کے ہر پہلو پر گفتگو ممکن نہ تھی۔ کچھ بکھرے خیالات کو یکجا کر دیا ہے اس لئے امید ہے کہ قارئین تفصیل کا مطالبہ نہیں کریں گے۔

مخمور سعیدی

بشیر بدر کی غزلیں آج کی ذہنی زندگی اور تہذیبی فضا کی جیتی جاگتی اور متحرک تصویریں پیش کرتی ہیں۔ ایسے ہلکے پھلکے لفظوں میں جو شکوہ سے دور لیکن سادگی کے حسن سے بہرہ ور ہیں غزلیں تازہ ہوا کے ایک نرم جھونکے کی طرح ذہن کو چھوتی ہوئی دل میں اتر جاتی ہے اور ان غزلوں کا آہنگ کسی آہستہ خرام میدانی ندی کی ترنم ریزی سے ملتا جلتا ہے جو پر شور انداز میں کسی ایک ہی سمت میں بہنے کے بجائے ادھر ادھر لہراتی بل کھاتی آگے بڑھتی ہے۔ (تحریک: اکتوبر ۱۹۷۰ء)

مرا یہ عہد ہے کہ آج سے میں کوئی منظر غلط نہ دیکھوں گا\
میری بیٹی نے میری پلکوں کو کتنی پاکیزگی سے چوما ہے

بشیر بدر

شام کے بعد بچوں سے کیسے ملوں

پروفیسر شمیم حنفی

بشیر بدر ہمارے ان شاعروں میں ہیں جن کا سخن الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ سو میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ غالب یا میر میں کس کی قبیل یا کون سے اسلوب کی وساطت سے پہچانے جائیں گے مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ان کی غزل کا خمیر اپنے حدود کے ساتھ مجھے اسی مٹی سے اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کی مہک میر کے کلام میں پھیلی ہوئی ہے شاید اسی لیے ان کی شاعری مجھے شروع سے پسند رہی ہے۔ اور علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں جب کبھی وہ اپنی ادھوری غزلیں یا اکا دکا شعر بھی سناتے تھے تو میں اس احساس کے ساتھ ان کا لطف اٹھاتا تھا کہ وہ خود پر بیتے ہوئے کسی واقعہ کا بے تکلف بیان کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں ہمارے زمانے میں بے تکلف شعر کہنے کی عادت ختم ہوتی جاتی ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بے تکلفی شعری تجربے میں عمومیت یا سہل پسندی کا جو فریب پیدا کرتی ہے۔ اس سے ہمارا شاعر ڈرتا ہے؟ دور از کار استعارے بہت سڈول اور ترشے ہوئے پیرایۂ اظہار کا حاصل کچھ اور ہو نہ ہو یہ ضرور ہوتا ہے کہ ان وسیلوں سے آراستہ ہونے کے بعد شعر بادی النظر میں خاصہ متین اور باعزت دکھائی دیتا ہے۔ یوں بھی ہمارے یہاں گہرے تجربوں اور نادر خیالوں کے پیچھے بھاگنے کی وبا بہت عام رہی ہے اور مجردات نے مظاہر کا بہت تیا پانچا کیا ہے لیکن تجربہ میں گہرائی تو اس میں ڈوبنے سے آتی ہے اور خیال کا معاملہ یہ ہے کہ نادر نہ ہو جب بھی اپنی سچی تخلیقی سطح پالے تو دل فریب ہو جاتا ہے۔

ہاں اے غمِ دنیا درِ مے خانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے

جیسے شعر نکتہ رس نقادوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے ہوں۔ مگر اس نوع کے شعروں سے عدم کا اپنا امتیاز بھی ابھرا۔ اور بے تکلف شعر کہنے کے گم ہوتے ہوتے چلن کی تھوڑی بہت تجدید بھی ہوئی۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا ایسا شعر کبھی کبھی آپ اپنا حجاب بن جاتا ہے۔ بہت زمانہ گذرا بشیر بدر نے ایک شعر کہا تھا۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

شہرت کے معاملے میں بشیر بدر کے اس شعر کا موازنہ کیا جائے تو شعر اپنے شاعر سے دو چار گز آگے ہی دکھائی دے گا۔ اس کا سبب کیا ہے۔ یہ شعر کے عام شائق کی سہل پسندی برتی مگر آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ بے تکلف شعر کا ردِ عمل بھی ذہن بند یا احساس کی سطح پر بے تکلف ہوتا ہے اور جس طرح ایک عام آدمی کبھی کبھار چلتے چلاتے کوئی ایسا فقرہ ایجاد کر جاتا ہے جو بہت سی نکتہ طرازیوں کا وزن کم کردے۔ اسی طرح بے تکلف اشعار بھی بظاہر روا داری میں اکثر وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جسے فکر کے ایک جاں گداز سفر کا حاصل پکارا جا سکے۔ اس نوع کی مثالیں بشیر بدر کی غزلوں میں ایک دو نہیں درجنوں کے حساب سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس وقت میرے سامنے ان کی چند غزلیں ہیں مگر یہ شرارے ان میں صاف روشن نظر آتے ہیں۔

دلوں کی جہاں پائمالی رہی — وہ بستی چراغوں سے خالی رہی
کبھی جب تمہارا خیال آگیا — کئی روز تک بے خیالی رہی
میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے — یہ طوائف بھی عصمت بچالے گی
خدا ایسے احساس کا نام ہے — رہے سامنے اور دکھائی نہ دے
جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں — کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا
کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی — یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا
تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو؟ — رک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر
شام کے بغیر بچوں سے کیسے ملوں؟ — اب مرے پاس کوئی کہانی نہیں
خواب جس دل میں رہا کرتے تھے کب کا مر چکا — کس کا دروازہ یہ بچے کھٹکھٹانے آئے ہیں

ایک غزل کے تین شعر بھی دیکھیے۔

تحریر و گفتگو میں کسے ڈھونڈتے ہیں لوگ — تصویر میں بھی شکل ہماری نہ آئے گی
سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا — آہستہ چلنے والے کی باری نہ آئے گی
پہچان ہم نے اپنی مٹائی ہے اس طرح — بچوں میں کوئی بات ہماری نہ آئے گی

شعر و ادب کے موجودہ منظر نامے پر نگاہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ اس ڈھب کے تجربوں پر کیا کیا مضامین باندھے گئے ہیں۔ ان تجربوں کی تعبیریں بھی اس طور پر کی گئی ہیں کہ بیسویں صدی کی دنیا کا ہر آشوب خیال اور فکر کا ہر دھارا، روحانی، جسمانی، جذباتی مسئلوں کی ہر جہت ایک مرکز پر سمٹ آئی ہے۔ بڑے تجربوں کی یہ ارزانی دیکھ کر ایسے شعروں کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے بھی کہ شاعر نے ایک خطرہ مول لینے کی قوت کا ثبوت دیا ہے۔ اس اندیشے میں مبتلا ہوئے بغیر کہ اس کے شعر کی سادگی اور بے ساختگی فکری یا جذباتی سہل پسندی کی تہمت بھی اس کے

سرلا سکتی ہے اس نے دقّت پسندی اور سہل پسندی کی حدیں ہی آپس میں گڈمڈ کر دی ہیں۔ ان شعروں میں حزن اور افسردگی کا دبا دبا سا احساس ان میں وہ ابدیت پیدا کرتا ہے جو در د بھرے تجربوں کی ہم کاب ہوتی ہے۔

کئی بار یہ خیال ذہن میں آیا ہے کہ اپنے تئیں ضرورت سے زیادہ چوکنا رہنے والا شاعر گرانڈیل تجربوں یا افکار کی خارجی پرت میں اکثر الجھ کر رہ جاتا ہے یہ ایک طرح کی ذات کی آسودگی ہے یا پیش بندی کی ایک سطح جس پر وہ خود کو محفوظ تصوّر کرتا ہے جہاں وہ اس وسوسے کا شکار نہیں ہوتا کہ اس کا فرمایا ہوا رواروی میں ٹال دیا جائے گا۔ مگر شاعری تو دراصل نام ہی اس عمل کا ہے جو تفصیلات کو حذف کرتا ہوا تجربے کے حشو و زوائد کو کاٹتا چھانٹتا ہوا افکار یا تجربوں کے مغز سے ایک سیدھا سچّا ربط قائم کرتا ہے اور اپنے بنیادی سروکار کو جزوی اور ضمنی ترغیبات کی گرفت میں آنے نہیں دیتا۔ بشیر بدؔر نے بالعموم اسی روّیے کی رفاقت کا ثبوت دیا ہے اور اس کی آزمائشوں سے سرخرو نکلے ہیں۔ یوں بھی ایک ٹھیٹ غزل گو ہونے کی حیثیت سے ان کا مزاج کسی ایک فکر کو بہت دیر تک سہارنے کا عادی نہیں ہے۔ اور ان کے تجربوں کی اساس ان کی جذباتی لہریں ہیں اور ان کا احساس۔ یہ لہریں ہر آن متحرک رہتی ہیں گردش کرتی رہتی ہیں اور ان کا رنگ تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے چنانچہ کسی معیّن تہذیبی یا سماجی یا فکری تناظر سے زیادہ وہ بہت مختلف النوع اور رنگارنگ تجربوں کے شاعر ہیں۔ ان کی قدر و قیمت ان کی شاعری کے مجموعی ماحول سے زیادہ ان کے الگ الگ شعروں کی کثرت آثار دنیا دار کے واسطے سے متعیّن ہوتی ہے۔ اس روّیئے سے بشیر بدؔر کو فائدہ یہ پہونچا کہ وہ شعریت کی تکمیل کے عنصر کی شناخت اور شمولیت دونوں کے ہنر سے واقف ہو گئے۔ جہاں یہ عنصر پوری طرح ان کی گرفت میں آ گیا ہے۔ ان کا شعر ایک خود مختار اور مکمل واردات کی تصویر بن گیا ہے۔ ناکامی کی صورت میں کبھی کبھی سب مفردات اور الفاظ کا ایک مجموعہ بشیر بدؔر کا تخیّل اپنی تصویر کے وسیلے گرد و پیش کی اس دنیا سے اخذ کرتا ہے جو واحدالمرکز ہونے کے باوجود بہت بے ترتیب اور کثیرالجہات ہے۔ چنانچہ تجربے کی مرکزی وحدت کبھی اس کے مظاہر کے باہمی رشتوں کی پہچان میں کامیاب ہوتی ہے اور کبھی ان کے امتیازات پر اچھی طرح حاوی نہیں ہونے پاتی۔ ایسا نہ ہوتا تو مجھے واقعی حیرانی ہوتی۔ کیونکہ کامیابی کے ساتھ ساتھ ناکامی کے اس ملے جلے مرقع سے بشیر بدؔر کے تخلیقی تفاعل کا ایک بہت نمایاں امتیاز سامنے آتا ہے۔ ہمارے زمانے کے کم شاعروں نے اشیاء اور مظاہر کی ایسی وسیع اور رنگارنگ کائنات کو اپنے جذبے اور احساس کی تجسیم کا وسیلہ بنایا ہے جس کی مثال بشیر بدؔر کے کلام میں ملتی ہے انہوں نے ایک سی توجہ کے ساتھ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ موجودات، منظر اور تماشوں کی حصار بندی کا عمل اختیار کیا ہے۔ نظم گویوں کے یہاں یہ کام بظاہر جتنا سہل ہے غزل کے شاعر کے لیے اتنا ہی حوصلہ طلب اور دشوار۔ یہاں اس کے اسباب کی نشاندہی کرنا غیر ضروری ہوگا کہ غزل کی روایت کے جبر اور اس کے خود ساختہ حدود کی پابندیوں سے سبھی واقف ہیں۔ ان مجبوریوں کے پس منظر

میں بشیر بدر کی غزلوں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ان کے تخیل کی جسارت اور طبیعت کی مہم پسندی کا اتر صاف ابھرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ بشیر بدر نے اپنے تجربوں کی ترتیب کے وسائل یا اس کے مرکبات کی تیاری میں غیر معمولی آزادی سے کام لیا ہے۔ اس باب میں انہوں نے شوخ اور متین سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کی حد بندیوں کو بھی قبول نہیں کیا۔ چنانچہ وہ گنتی کے ان چند غزل گویوں میں ہیں جن کے یہاں غزل صرف غزل نہیں رہتی اور اپنے بیان کے لیے نت نئی وسعتوں کا مطالبہ کرتی ہے۔

شاید اسی لیے بشیر بدر کے صدہا اشعار میں خود کلامی سے زیادہ کہانی سنانے کا انداز دکھائی دیتا ہے۔ قصہ گوئی خالی خولی مجردات کے سہارے نہ اپنے ساتھ انصاف کر سکتی ہے نہ دوسروں کو مطمئن کر سکتی ہے اپنے بنیادی موقف یا مرکزی خیال کی ڈور ہتھیلیوں میں دبائے ہوئے قصہ گو قسم قسم کی آبادیوں اور ویرانوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ اور خدا جانے کیسے کیسے عجیب و غریب تماشوں میں اپنے فنی مقاصد کا سراغ پاتا ہے۔ اس تماشے میں راہ کے روڑے یا خس و خاشاک اور سجے دھجے آراستہ منظر اور محلات سب کا سب یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ قصہ گو سے ان کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ جذبے اور نظر کی ایک سی مساوات کے ساتھ وہ انہیں برتنے کا سلیقہ اپنے آپ میں پیدا کرے کہ اس پورے تماشے کی توصیت اس کے سفر میں یکساں اور ناگزیر ہوتی ہے سا سے بالآخر جس در مقصود کی جستجو ہوتی ہے وہ اسی ہفت رنگ راستے سے ہو کر ہاتھ آتا ہے۔

بشیر بدر اس سفر سے کامیاب گزرے ہیں۔ مگر اس مسافر کا قصہ اس کی کامیابی پر ہی ختم نہیں ہوتا۔ یہیں اس کے سفر کی اصل حقیقت کا بھید ان مراحل اور منازل کے۔۔۔۔ پر پیچ رنگوں میں ملتا ہے۔ جن سے وہ دوران سفر قدم قدم پر دوچار ہوا۔ بشیر بدر کی غزل انہیں مرحلوں، منزلوں اور رنگوں کا آئینہ خانہ ہے۔

پھول شاخوں کے ہوں کہ آنکھوں کے
راستے راستے چُنا کرنا

صلاح الدین پرویز

بشیر بدر کا اپنا ایک خوبصورت سا لہجہ ہے۔ وہ زندگی کی رنگارنگی اور تہہ داریوں کو اپنے مخصوص تجرباتی انداز میں پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جدید غزل میں ان کی آواز آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے اور ان کے ہم عصر لکھنے والے ان سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔

زندگی کی دھوپ اور
احساس کے پھولوں کا شاعر
بشیر بدر

ابوالفیض سحر

اردو اور ہندی ادب کی دنیا میں ڈاکٹر بشیر بدر کو آج کون نہیں جانتا۔ سبھی ان کی سحر انگیز شخصیت اور مسحورکن شاعری سے متاثر ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک مسحور بھی معلوم ہوتے ہیں۔ میں بشیر بدر کو اکائی سے پہلے سے جانتا تھا مگر قدرے فاصلے سے، پھر دھیرے دھیرے یہ فاصلہ کم ہوتا گیا۔ اکائی، امیج اور پھر آمد تک بشیر بدر نے جو سفر طے کیا ہے۔ دراصل وہ نئی اردو غزل کا بھی سفر ہے۔ اس دوران ان کی فنکارانہ قامت نئی بلندیوں سے آشنا ہوئی تو مقبولیت اور شہرت نے بین الاقوامی حدوں کو چھو لیا۔

میں نے بشیر بدر کو بہت سنا ہے اور پڑھا بھی بہت ہے۔ کسی بھی اچھے شاعر کی شاعری پر گفتگو کرتے وقت ہمیں بھی یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ بنیادی طور پر اس شاعر کی شاعری ہی، اگر وہ اس پائے کی ہے تو اس کی شاعرانہ عظمت کا تعین کرتی ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے بشیر بدر اردو غزل کے مقامی اور عالمی افق پر ایک خوبصورت شفق سنجر کی صورت میں نمایاں ہوئے ہیں، جس کی فکری و فنی تابش نے ہندوستان، پاکستان، انگلینڈ، امریکہ، کناڈا اور مشرقِ وسطیٰ کے کئی ممالک کے اردو شعر و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے دلوں کی آنکھوں کو پوری کشش اور جاذبیت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کیا ہے حتیٰ کہ ہندی والے بھی اس سحر سے بچ نہیں سکے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ خود بھی ایک بہت بڑا کارنامہ اور ایک اہم خدمت بھی ہے۔ گو کہ اسے کوئی معجزہ یا کرشمہ نہ کہیں لیکن اسی حوالے سے یہ از خود

ایک بڑی بات ہے جو ہر کسی کا مقدر بن نہیں سکتی۔

بشیر بدر وہ نام ہے جو نئی غزل کے نئے سفر کے ساتھ طلوع ہوا ہے۔ نئی غزل نے ہر اعتبار سے حیات افروز اور زندگی نواز نوعیتوں کے ارتقائی منازل بھی طے کئے ہیں۔ فنی و فکری اساس پر بھی مسلسل نکھرتی رہی ہے۔ نئے چراغ روشن ہوئے ہیں۔ اس کی فضا اور تہذیب بھی ہر انداز سے سنورتی رہی ہے۔ نئے پیراہن پہنے ہیں اور نئی ردائیں اوڑھی ہیں۔ تشبیہات اور استعاروں نے بھی نیا رنگ و آہنگ اور نیا مزاج و معیار پایا جس نے عصر جدید کی ذہنی و دل کی جولانیوں کو آسودگی بخشی۔ اسلوب اور طرز ادا نے نئی روشیں اختیار کیں۔ رمزیت اور ایمائیت نے فکر و نظر کی وسعتوں اور گہرائیوں کو سمیٹ کر جامعیت کا وقار پایا۔ اس طرح بحیثیت مجموعی غزل نے ذہن کو دل کو چھونے والی بات کہنے کا وہ قرینہ اور سلیقہ بھی پایا جو کسی بھی کسوٹی پر کم رتبہ یا کم مایہ سرمایۂ سخن ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسی حوالے سے روشن روایات کے ساتھ ساتھ، کچھ اظہار کے عرضی ہنر اور لسانی اجتہاد کی بھی نئی قلمیں لگائیں جو نہ صرف یہ کہ زمانے کے گرم و سرد کو برداشت کر پائیں بلکہ آج ان میں برگ و بار کی نئی رونقیں اس کے جمال و حسن کے آنچل میں تارے ٹانک رہی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان سب میں نئی غزل کے نئے ناموں کے ساتھ بشیر بدر نے بھی اپنے انداز میں اپنا حق ادا کیا ہے جس کے عوض انہیں بجا طور پر ایک خاص رتبہ ملا ہے۔ آج کا یہ مقام انہیں یوں ہی حاصل نہیں ہوا ہے۔ انہیں خود بھی اس کا احساس ہے ؎

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

بشیر بدر نے زندگی کی دھوپ بھی دیکھی اور چاندنی بھی۔ ان کا دامن آگ سے بھی آشنا ہے اور پھولوں سے بھی۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کا اظہار ان کی غزلوں میں غیر معمولی شدت اور کثرت سے ملتا ہے۔ اس لیے بجا طور پر انہیں زندگی کی دھوپ اور احساسات کے پھولوں کا شاعر کہا جا سکتا ہے ؎

سلگتی دھوپ، گھنی چاندنی سی ہوتی ہے
تمہارے ساتھ یہ دنیا نئی سی ہوتی ہے

یہاں سورج ہنسیں گے آنسوؤں کو کون دیکھے گا
چمکتی دھوپ ہوگی جگنوؤں کو کون دیکھے گا

میں یہاں دھوپ میں تپ رہا ہوں مگر
وہ پسینے میں ڈوبا ہوا کون ہے

خون پانی بنا کے پیتی ہے دھوپ سرمایہ دار لگتی ہے

اسی طرح پھول بھی ان کے ہاں ایک علامت اور ایک استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔

پھولوں میں بسی چاندنی راتوں کی نمازیں
خوشبو ہی ستاروں کی دعا اللہ ہی اللہ

تلوار سے کاٹا ہے پھولوں بھری ڈالی کو
دنیا نے نہیں چاہا ہم چاہنے والوں کو

ہمارے بھی ہیں لوگ ایوان میں مگر پھول کاغذ کے گلدان میں

ہماری زندگی میں پھول بن کر کوئی آیا تھا
اسی کی یاد میں اب تک یہ تحریریں مہکتی ہیں

زندگی کی دھوپ، احساسات کے پھولوں، نئی غزل کے اسلوب و آہنگ اور اس کے حسن کی چاندنی کا یہ شاعر دراصل منفرد رنگ کا، یادوں کے اُجالوں کا بھی شاعر ہے ۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

بشیر بدر کے اس خوبصورت شعر نے مقبولیت اور پسندیدگی کا ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے ۔ دنیا کے گوشے گوشے تک اس اندازِ سخن اور لب و لہجے کی گونج پہنچی ہے

مہک رہی ہے زمیں چاندنی کے پھولوں سے
خدا کسی کی محبت پہ مسکرایا ہے

یوں کسی کی آنکھوں میں صبح تک ابھی تھے ہم
جس طرح رہے شبنم پھول کے پیالوں میں

اس اعترافِ حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ادب اور دیگر علوم وفنون کا ارتقا بھی زندگی کے ارتقاء کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ارتقاء کے اس ہیولے ہیں۔ جو پتہ نہیں کس وقت کیا صورت اختیار کر جائے، انسانی اقدار، آفاقی صداقتیں، تہذیب و تمدن، طرزِ معاشرت اور طریقِ زندگی کے عناصر بھی شامل ہیں۔ ادب کبھی ان کا سایہ بن جاتا ہے اور کبھی عکس۔ اس لیے اس میں ایجاد و اختراع کی جدتیں، ہیئت و اسلوب کے تجربے، اظہار و بیان کے سلیقے، زندگی کے حسن اس کی مسرتیں و انبساط کی لہروں کی تلاش و جستجو کے تواتر مسلسل کی صورت۔ انسانی فکر و احساس کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ ادب کے ارتقائے عوامل و عناصر بھی انہی فکری و ذہنی کاوشوں سے عبارت ہیں۔ وقت کے تقاضوں اور عصری رجحانات کے زیرِ اثر ادب نے بھی انقلابی کروٹیں بدلی ہیں جسے ہم تنقید کی زبان میں عصری آگہی اور تخلیقی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی تخلیقی عمل کا تناظر اور پس منظر بہت وسیع بھی ہوتا ہے اور پیچیدہ بھی جس میں تاریخ اور تہذیب کے شعور کے جانے اور انجانے محرکات کی پرچھائیں بھی متحرک نظر آتی ہے۔ کسی بھی زبان کے ادب کی طرح اردو ادب کو بھی اس تناظر میں دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے اور کسی بھی صنف ادب کی طرح شعری جمالیات اور نئی غزل کی معنویت کو زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے اور پھر اسی طرح بشیر بدر کی غزل کی جمالیات اور ان کی اسلوبیاتی قدروں کا نقد شعریات کی بصیرت کے ساتھ تجزیہ کرتے ہوئے ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم بشیر بدر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو اکائی سے 'آمد' تک ایک بات بہت واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ بشیر بدر نے بات کو نئے اور خوبصورت انداز سے کہنے کی مسلسل کوشش کی ہے اور بڑے کامیاب نقوش چھوڑے ہیں۔ انہوں نے حسنِ معنوی پر بھی نظر رکھی ہے اور حسنِ صوری پر بھی، مگر

اس طرح اچھوتے مضامین کو نئی غزل کے نئے لب و لہجے میں نئی لفظیات اور نئے ڈکشن کے ساتھ پیش کرنا بشیر بدر کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے ۔

میں زرد پتوں پہ شبنم سجا کے لایا ہوں
کسی نے مجھ سے کہا تھا حساب دے جاؤ

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

کسی کی راہ میں دہلیز پہ دیئے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

بھر دیئے رکھ گئیں تیری پرچھائیاں
آج دروازہ دل کا کھلا دیکھ کر

بشیر بدر نے غزل کی آبرو اور فن کی برگزیدگی کا ہمیشہ پاس و لحاظ رکھا ہے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے سخن شناسی کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے ہوئے جدتوں اور ندرتوں کو اپنی شاعری کے بام و در پر سجایا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے غزل کی فرسودہ روایات کو خیرباد کہتے ہوئے اس کے سینے میں نئی دھڑکنیں بھر دینے کی جسارت بھی کی ہے جو بظاہر غیر مانوس سی روش لگتی ہے مگر فن کے ارتقار کے لیے شاید اسی طرح کے تجربے بھی ناگزیر ہیں ۔

کدھر چلتی پھرتی دوکانیں گئیں نمائش لگائی تھی میدان میں

چھپر کے چائے خانے بھی اب اونگھنے لگے
پیدل چلو کہ کوئی سواری نہ آئے گی

تن ڈھکنے کو بس اتنا ہی کافی تھا پھولوں اور پتوں کی اک نیکر ہوتی

شام تک کتنے ہاتھوں سے گذروں گا میں
چائے خانے میں اردو کے اخبار سا

دن تو نکلا خریدا ہوا آدمی　　　اے خدا رات بھی سب کی عورت نہ ہو

بشیر بدر نے غزل کو مقبولیت کے نئے دائروں تک پہنچانے اور خود اس کے دامن کو کشادگیوں سے متصف کرنے کے لیے جہاں اور تجربے اور اجتہاد کیے ہیں وہیں یہ کوشش بھی کی ہے کہ اُسے ہندی اور انگریزی بلکہ انگریزی سے زیادہ ہندی الفاظ کے سروں کو تغزل کی مقبولیت سے جوڑا جائے ؎

پانی سب کا رستہ روکے اپنے ساجن بھی اُس پار
سارا ساگر کٹے کنارے کاغذ کی اس نشتی سے

آ میرے سینے پہ سر رکھ دا اپنے کان سے اُس پگلی
میرے بھگوان بول رہے ہیں من مندر کی گھنٹی ہیں

دنیا کی یہ مایا کنکر پتھر ہے　　　آنسو شبنم ہیرا موتی ہم دونوں

ان کے ہاں ہلکے پھلکے مگر دل موہ لینے والے اشعار کی بھی کمی نہیں بلکہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی زمرے میں آتا ہے جسے سہل اور طرحدار غزل سے موسوم کیا جاتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

کوئی فیصلہ اتنی جلدی نہ کر　　　ذرا دیر کی جان پہچان میں

کس نے مجھ کو صدا دی بتا کون ہے
اے ہوا تیرے گھر میں چھپا کون ہے

چند اور اچھی مثالیں بھی پیش ہیں ؎

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایا ہے
بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

لگتا ہے شعری علائم اور پیکر تراشی پر نسبتاً زیادہ زور دیا ہے ؎

گلوں پہ لکھی ہوئی لا الہ الا اللہ پہاڑیوں سے اُترتی اذان کی خوشبو

ہنسی معصوم سی بچوں کی کاپی میں عبارت سی
ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت سی

سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا
آہستہ چلنے والے کی باری نہ آئے گی

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

ابھی اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کی پلکیں سنوار لوں
مرا لفظ لفظ ہو آئینہ تجھے آئینے میں اُتار لوں

کہیں کہیں نئی تہذیب کے بالوں کے نئے تجربے اکثر متحیر کن بھی ہوتے ہیں اور تلخ بھی، ایسے ہیں کسی بھی فنکار یا شاعر کے احساسات، اظہار و بیان کے تیکھے انداز اور تیور لے کر قاری تک پہنچتے ہیں، اس قبیل کے چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو
مجھے اشتہار سی لگتی ہیں یہ محبتوں کی کہانیاں
جو کہا نہیں وہ سُنا کرو جو سُنا نہیں وہ کہا کرو

گرتی دیواروں سے لگ کر دیمکوں کے قافلے
کچھ صحیفے اپنی آنکھوں سے لگانے آئے ہیں

میں درختوں کی صف کا بھکاری نہیں بے وفا موسموں کی قبائیں نہ دے

اس شہر میں کئی سال سے مرے کچھ قریبی عزیز ہیں
انہیں میری کوئی خبر نہیں مجھے ان کا کوئی پتہ نہیں

ہر اچھا فن پارہ اپنا متعارف آپ ہوتا ہے، دعویٰ اور دلیلوں کی بیساکھیوں کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر معروضی مطالعہ ذاتی تاثرات اور شخصی نظریات و اعتقادات سے ماورا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مثالیں۔ قیاس اور حقائق کو استدلال کی کڑیوں سے جوڑ کر۔ جو بھی صورت حال ہو اسے بلا کم و کاشت شفاف ڈھنگ سے پیش کر دیتی ہیں۔ بشیر بدر کے ہاں مجھے بعض ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو سننے اور پڑھنے والوں کو فوراً متوجہ ہی نہیں کرتے بلکہ انہیں گہرائی سے سوچنے پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسی مثالیں بہت زیادہ نہیں مگر جو ہیں ان میں بھی ایک خاص طرح کی طرحداری اور بانکپن ہے جیسے ؎

سیاہیوں کے بنے حرف حرف دھوتے ہیں
یہ لوگ رات میں کاغذ کہاں بھگوتے ہیں

میری آنکھوں میں غم کی نشانی نہیں پتھروں کے پیالوں میں پانی نہیں

وہ محفلوں کی جان ہے دنیا کے واسطے
مجھ سے وہاں ملا تھا جہاں کوئی بھی نہ تھا

آسماں بھر گیا پرندوں سے پیڑ کوئی ہرا گرا ہوگا

آنسوؤں کی جہاں پائمالی رہی ایسی بستی چراغوں سے خالی رہی

ہر چھوٹے بڑے شاعر نے غزل اور پھر اپنی غزل کے بارے میں اپنے محسوسات اور اپنے رویّے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بشیر بدر نے بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں ؎

[illegible] لفظوں کی مینا کاری کو الہامی اشعار نہ جانو

ایک اور مقام پر بھی خیال یوں ظاہر ہوا ہے ؎

چمکتی ہے کہیں صدیوں میں آنسوؤں سے زمیں
غزل کے شعر کہاں روز روز ہوتے ہیں

بہرحال "آمد" کے مطالعے کے بعد بھی میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بشیر بدر کی غزل کے فن کی خوبی۔ جو انہیں اور شاعروں سے ممتاز بناتی ہے یہ ہے کہ ان کی شعری جمالیات حسین، لطیف اور دل آویز رعنائیوں سے مملو ہیں۔ نازک خیالی بھی ہے اور لفظوں کی مینا کاری بھی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ان کا علامتی اظہار اپنی اشاریت اور ایمائیت کے سیاق و سباق میں ایک بلیغ استعارہ بن گیا ہے۔ اشعار میں مختلف علامتوں کے درمیان کا فاصلہ بظاہر طویل ہونے کے باوجود جس انداز سے بشیر بدر ان میں تعلق پیدا کرتے ہیں اور رشتہ جوڑتے ہیں ایک موثر، مکمل اور دوررس استعارہ بن کر فن کی لطافت اور اس کے حسن کی صورت میں سننے والوں اور پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے مثلاً ؎

اُداسی پچھی ہے بڑی دور تک — بہاروں کی بیٹی پرائی ہوئی
خوشی ہم غریبوں کی جیسے میاں — مزاروں پہ چادر چڑھائی ہوئی

زینہ زینہ اُترتا ہوا آئینہ — اس کا لہجہ انوکھا کھنک دار سا

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا — بڑی دور تک رات ہی رات ہوگی

بشیر بدر اپنی ذات سے ایک دل نواز شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ خلوص محبت اور سادہ لوحی ان کے کردار کا حصہ ہیں مگر جہاں تک فنی مہارتوں کا تقاضہ ہے وہ ایک ذہین فنکار ہیں۔ ان کی اس قابلِ رشک شہرت اور مقبولیت کے تانے بانے میں ان کی اس ذہانت کے ریشمی دھاگوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جو بنیادی طور پر عوامی نفسیات کے تاروں کو اس طرح چھیڑتے ہیں کہ کسی جلترنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ؎

دیکھ کر پھول کے اوراق پہ شبنم کچھ لوگ
ترا اشکوں بھرا مکتوب سمجھتے ہوں گے

میرے سینے پہ خوشبو نے سر رکھ دیا　　میری بانہوں میں پھولوں کی ڈالی رہی

رات کا انتظار کون کرے　　آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

اسکی آنکھوں سا اس کے گیسو سا　　مرا سارا کلام خوشبو سا

کبھی یوں ملیں کوئی مصلحت کوئی خوف دل میں ذرا نہ ہو
مجھے اپنی کوئی خبر نہ ہو تجھے اپنا کوئی پتہ نہ ہو

اس طرح بشیر بدر کی شاعری کے کئی رُخ اور کئی ابعاد ہیں جن میں فکر کی تابش بھی ہے اور تازگی بھی، فن کی جدت بھی ہے اور ندرت بھی اور ایک بات یہاں یقیناً قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ بشیر بدر بات کو خوبصورتی سے اور نئے انداز سے کہنے کے عادی ہیں اس پر ان کا تجربہ، مشاہدہ اور احساس کا نیا پن دو آتشہ کا کام کرجاتا ہے، مثال کے طور پر

کسی کے آنسو چھپے ہیں پھولوں میں　　چومتا ہوں تو ہونٹ جلتے ہیں

لپٹ کر چراغوں سے وہ سو گئے　　جو پھولوں پہ کروٹ بدلتے رہے

لہو کا سمندر ہے پلکوں کے پیچھے　　یہ روشن جزیرے تو اڑتے رہیں گے

اسے پاک نظروں سے چومنا بھی عبادتوں میں شمار ہے
کوئی پھول لاکھ قریب ہو کبھی میں نے اس کو چھوا نہیں

میری مٹھی میں سلگتی ریت رکھ کر چل دیا
کتنی آوازیں دیا کرتا تھا یہ دریا مجھے

بہرحال بشیر بدر شعر کہنے کے قرینے اور شعر پڑھنے کے سلیقے دونوں سے خوب واقف ہیں، ان کے ہاں جدّت بھی ہے اور ندرت بھی، تازگی اور شادابی، ذہن کو سوچنے پر

آمادہ کرنے دل کو چھو لینے کے وصف کے علاوہ تیکھے انداز اور تیور نے بھی ان کی غزل کو نئے موسموں سے آشنا کردیا ہے ، اس بات کا بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ نئی غزل کے حوالے سے ان کا یہ ارتقائی نقطۂ نظر اور سلجھا ہوا تخلیقی عمل در اصل بالواسطہ طور پر ایک خوبصورت اور قابلِ قدر دین بھی ہے اردو ادب کو یہی زندگی کی دھوپ اور غزل کے پھولوں کے شاعر کا بانکپن بھی ہے اور پسندیدگی اور مقبولیت کا راز ہے ؎

کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دھوپ ہوں کبھی دھول ہوں
میں تمام کپڑے بدل چکا ترے موسموں کی برات میں

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

پروفیسر آل احمد سرور

بشیر بدر جب علی گڈھ آئے تو شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت شروع ہو چکی تھی یہاں کے ماحول سے ان کے فن کو اور جلا حاصل ہوئی ان کا پہلا مجموعہ "اکائی" ادبی حلقوں میں خاصہ مقبول ہوا تھا اس سے ان کی شاعری کی انفرادیت اور حسن کا احساس عام ہوا۔ اب وہ ہمارے خوش فکر اور خوش گو شعراء میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔

(ایک خط سے ۳ ستمبر ۱۹۸۷ء)

نئی غزل میں ہندوستان اور پاکستان میں جو نام بہرحال آئیں گے ان میں بشیر بدر کا نام بھی ہوگا "امیج" میں نیا احساس، نئی تشبیہوں، نئے استعاروں، نئی تصویروں اور نئے پیکروں سے کھیل رہے اور یہ کھیل بھی معنی خیز ہے۔ یہاں جسم کی آنچ اور روح کی پیاس بھی ہے اور بدلتی ہوئی زندگی اور جذبات و احساسات کے نئے مظاہر بھی۔ امیج ان کے کلام کی بنیادی خصوصیات کا بڑی اچھی نمائندگی کرتا ہے۔

(رسالہ شاعر جلد ۵۴ شمارہ ۴) ۱۹۸۳ء

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

بشیر بدر

اجتہاد سے اعتبار تک

مصور سبزواری

بشیر بدر کل ایک شعری اجتہاد کا نام تھا آج بشیر بدر برصغیر کی ایک معتبر اور موثر تہذیبی علامت کا نام ہے اجتہاد سے اعتبار تک کے اس تخلیقی سفر کی دریافت کے لیے میں نے بشیر بدر کو مشاعروں میں کبھی نہیں ڈھونڈا میں نے ہمیشہ بشیر بدر کو بشیر بدر کے اندر ہی تلاش کیا ہے کیونکہ مشاعروں نے بشیر بدر کو جنم نہیں دیا بلکہ خود بشیر بدر نے جدید طرز کے مشاعروں کو جنم دیا ہے لیکن مشاعرہ سازی بشیر بدر کا تخلیقی کارنامہ ہرگز نہیں ہے یہ کام دوسرے لوگ بھی کر سکتے تھے بشیر بدر نے جدید غزل کی مجرم شہزادی کو قدامت کے مہابلی کے ہاتھوں سے اس وقت کھینچا جب وہ دیواروں میں چنی جا رہی تھی۔ یہ وقت کا وہ المناک موڑ تھا جب روایتی غزل بوڑھی ہو کر اپنا جمالیاتی اور لسانی حسن کھو چکی تھی اور غزل کے بدلتے ہوئے تیور اور نئے تخلیقی سانچے اربابِ ادب و دانش کی نظر میں اس قدر مبہم تھے کہ اصلی اور غیر اصلی غزل جدید اور قدیم غزل کے کنفیوژن میں کوئی واضح لائحہ عمل سامنے نہیں تھا۔ نئی نسل ہجرت کے آشوب میں گرفتار تھی۔ وجود کی پہچان عدم شناخت تھی پیدا ہونے کی تمنا یا پیدائش کی بے معنویت جاری تھی اظہار اور ترسیل کے بنجر وسیلے تھے۔ الفاظ ختم ہو کر اپنی موروثی لغات میں دفن ہو گئے تھے پورا معاشرہ الگ الگ جزیروں میں بٹا ہوا تھا اور سمندر کی غیر منقسم لہروں کی یگانگت اور ارتکاز سے سماج محروم تھا۔ ایک دورِ بے شناخت میں فکر و فن کے سارے معیار اور اظہار کے پھیکے اور بے اثر چہرے روبرو تھے۔ اپنی شناخت کے لیے روحانی ہجرت کا کرب بھی اوڑھا گیا اندرون اور بیرون کے سکوت اور سقوط کو نغمگی میں چھپایا گیا مگر عریاں بے مانگی ایک بھیانک چیلنج تھی چند دوسرے جیالوں کے ساتھ بشیر بدر نے بھی اس سامنے کے چیلنج کو قبول کیا اور اس بدعہد اور منافق عہد میں

بشیر بدر نے وہ استعاراتی اور تمثیلی شاعری پیش کی جو نئی نسل کے بحران کی کشید ہے۔
بشیر بدر کی سب سے بڑی کوشش اور سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ انہوں نے عصری آشوب کو سیاست داں کے بجائے ایک دانشورانہ مگر مخلص شعور سے پہچانا ہے۔ اور اپنی ذات کے حوالے سے اپنے سماجی اجتماعی لسانی اور ثقافتی رشتوں کی بازیابی کے عمل کو تیز تر کیا ہے۔

بشیر بدر کی غزلیں حرب الکلمات یا لفظوں کا بے مغز رزمیہ نہیں ہے۔ مادی اور حقیقی نتائج کے ردِ عمل سے رائگاں ہوتی ہوئی سعی سے انہوں نے دانستہ گریز کیا ہے ان کی غزلوں میں ایک مثبت اور جرأت مندانہ درد احساس بڑی شدت سے قنوطیت اور خود سپردگی کی مانوس فضا کو خوش آئند بنانے کے لیے پہلے ہی ختم کر دیتا ہے۔ یہ حرکی رویہ شکست و ریخت کے سنگین مسائل سے نبرد آزما بھی ہوتا ہے اور ان سے عہدہ برآ بھی۔ لسانی تشکیل کی بے حد سادہ پرکاری بشیر بدر کی ایک محبوب صفت ہے وہ الفاظ کو ایک کاہن کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ایک مشاق ساحر کی انگلیوں سے چھوکر ان میں جان ڈالتے ہیں الفاظ کو تڑپاتے ہیں گدگداتے ہیں رُلاتے ہیں ہنساتے ہیں اور الفاظ کی حدود اور ماہیت کا تعین کر کے انہیں ان سمتوں کی طرف روانہ کرتے ہیں جو ایک قطعی تازہ جہانِ معنی سے عبارت ہیں۔ پرانی غزل کی طرح نئی غزل کے سامنے بھی وحدتِ تاثر کا جو بھیانک مسئلہ ہے۔ بشیر بدر اس سے جس طرح مبارزت کرتے ہیں وہ ساری شورش اور سرگرمی ان کے اشعار کا ہی نتیجہ ہوتی ہیں زبردست ترسیلی قوت خود کفالتی اور خود کفالتی اور خود آسودگی کے یہ نمونے اردو غزل میں اب بھی کمیابی کی حد تک ہی ہیں۔

کبھی حادثوں کے نشان بھی یہ ہوا مٹا کے چلی گئی
مرا دل وہ ریت کا دشت ہے جو کسی پھوار سے تر نہ ہو

کوئی لباس نہیں دل کی بے لباسی کا
اگرچہ روز نئی چادریں چڑھاتے ہیں

"

پھول شاخوں سے کے ہوں کہ آنکھوں کے
راستے راستے چُننا کرنا

مجھ سے کیا بات لکھانی ہے کہ اب میرے لیے
کبھی چاندی کبھی سونے کے قلم آتے ہیں

کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

ننگے پاؤں فرشتوں کا اک طائفہ آسماں سے زمیں پر اُترنے لگا
سربرہنہ فلک زادیاں عرش سے آنسوؤں کے ستارے گراتی رہیں

الفاظوں کی تخلیقی لذّت امیج اور حسّیاتی پیکروں کے خوبصورت جال اور انوکھے اشاروں کے ذریعہ مناظر کی وہ تشبیہ کہ عکاسی اصل سے زیادہ حقیقی اور بامعنی دکھائی دینے لگے بشیر بدر کی غزلوں کا امتیازی وصف ہے۔ یوں تو وہ ہر وادی کے سیّاح ہیں لیکن انسانی جرم وسزا کے بنیادی موضوع پر انھوں نے جس قدر موثر نفسیاتی ردّعمل کی عبرت انگیزی سے جدید غزل کو آشنا کرایا ہے اور وہ بھی صرف دو مصرعوں میں اس کی نظیر جدید غزل میں شاید ہی نظر آئے۔

تمام عمر مرا دم اسی دھوئیں میں گھٹا
وہ اک چراغ جو میں نے کبھی بجھایا تھا

بشیر بدر کے جو بہتیرے اشعار زباں زدِ عام ہیں میں ان سے گریز کر رہا ہوں۔ میں صرف وہ اشعار (وہ بھی قلیل تعداد میں) انتخاب کر رہا ہوں جن کی رفاقت میں بشیر بدر کو میں اپنے بہت قریب محسوس کرتا ہوں علاوہ ازیں ان کی شاعری کا گلدستہ پیش کرنا میرا مقصد قطعی نہیں کیونکہ یہ کام بہت ہو چکا ہے میں صرف ان کے اشعار کی بُو باس کو حواس کے حوالے کر رہا ہوں۔

ان کی غزل زندگی کی طرف کُھلنے والا ایک دروازہ ہے خوشیوں نامرادیوں کا!

ایک جزوِ لازم ہے ان کی غزلوں کے اندرونی جذبے لفظوں کے دریا سے اٹھتے ہوئے چھچھورے جھاگ نہیں ہیں بلکہ دریا کے وجود سے متصل وہ لہریں ہیں جنھیں خود دریا بھی ڈبونے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ فنی روایت کے احترام کے نام پر اسلاف کی ہڈیوں سے قطرۂ مے نچوڑنے کا کام ذرا بھی ان غزلوں کے خالق نے نہیں کیا ہے۔ نہ لسانی سطح پر نہ معنوی سطح پر تاہم ناسٹیلجیا کی حد تک اس نے بچھڑے ہوئے رنگ و بو کو ضرور یاد کیا ہے اور اکثر یادوں کے الاؤ پر ٹھٹھری ہوئی خاندانی پرچھائیوں کو متحرک کیا ہے اور کہیں کہیں وجدانی اکتساب بھی چاہا ہے خوشی کی بات یہ کہ بشیر بدر نے شاعری کو کتبوں اور مجسموں میں تحلیل نہیں کیا ہے بلکہ زندہ جذبوں کے تجسیمی عمل میں زندگی کے خونِ گرم کو رواں کیا ہے کہیں قصّہ گوئی کے دلچسپ فن سے ..... کہیں نامعلوم سے معلوم تک کہیں معلوم سے نامعلوم سمت تک کے سفر سے انھوں نے شاعری کو حیاتِ ہمہ جہت کی پائندہ تفسیر بنانے کی مثبت سعی کی ہے۔

میں شاہراہ نہیں راستے کا پتھر ہوں
یہاں سوار بھی پیدل اُتر کے چلتے ہیں

بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دھوپ ہوں کبھی دھول ہوں
میں تمام کپڑے بدل چکا ترے موسموں کی برات میں

مری ہنسی سے اداسی کے پھول کھلتے ہیں
میں سب کے ساتھ ہوں لیکن جدا سا لگتا ہوں

تمام رات چراغوں میں مسکراتی تھی
وہ اب نہیں ہے مگر اس کی روشنی میں ہوں

اک زباں جس کو غزل کہئے وہ مجرم ٹھہری
شاہزادی کو چنا جائے گا دیواروں میں

ان کی غزلوں میں سہل ممتنع کی روانی چھوٹی چھوٹی باتوں کے اندر بڑے بڑے جذبے اور اشیائے معلوم و محسوس کو ایک تازہ نگاہ سے دیکھنے کی بدولت ایک نئی معنوی یافت کا فن اس قدر حیرت انگیز اور اہم ہے کہ غزل کی قدر زوالی ایک قدر لازوالی بن جاتی ہے۔ اور غزل کی حدود لامحدودیت تک پھیلتی دکھائی دیتی ہیں۔

ایک غیر عامۃ الورود شاعری کی طرح بشیر بدر کی شاعری بھی دو متضاد رویوں کی آئینہ دار ہے ایک طرف تو کسی طفل معصوم کی سی ازلی معصومیت ہے اور دوسری طرف افکار و معیار کی بلیغ سطح ہے کبھی کبھی یہ دونوں رویے متصادم بھی ہوئے ہیں لیکن بشیر بدر نے اپنی فنکارانہ خلاقی سے یا معتدل شخص کی تعمیر کے لیے ان کو متصادم ہونے کے باوجود مجروح ہونے سے بچایا ہے جس سے خیر و شر سے مرکب انسانی فطرت کی وہ حقیقی تصویر کشی ہوئی ہے کہ جذباتیت اور عقلیت دونوں کے صحیح مقام اور وجود اعلیٰ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بچہ اختر الایمان کی 'یادیں' میں بھی ہے لیکن وہ سفر خواب سے خواب تک کا ہے بشیر بدر نے اس بچے کو تینوں زمانوں پر پھیلا کر جزو کو کُل کا مرتبہ دیا ہے۔ یہ کیفیت بہت ہی دلآویز اور غیر معنوی ہے۔

جس میں اپنی پرندوں سے تشبیہ تھی
تم کو اسکول کی وہ دعا یاد ہے
شام گہری ہوئی اور گھر دور ہے
پھول سو جائیں گے راستہ دیکھ کر

بشیر بدر کو یہ متعصب مشورہ ضرور دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی غزل کے گلستان مقبولیت میں اس شدت سے پھول نہ مہکایا کریں کہ مشام جاں اداسی کی خوشبوئیں بکھیرنے لگے انہیں اپنے اشعار کی فراوانی کو کلاسیکی انضباط کی طرح زیادہ منتخب بنانا ہوگا تاکہ ان کے اندر کا معیاری شاعر ہمہ اوقات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آئے انہوں نے گذشتہ ربع صدی میں کائنات کے کرب اور خوشی فتح اور کامرانی کو نادر امیجز استعاروں اور نادر تشبیہوں کے توسط سے جس طرح سمیٹنے کی کامیاب سعی کی ہے اس سے

ان کی آئندہ غزل سازی ہیں بھی اسی موثر عمل کی قوی امید ہے جو ہفت رنگ شاعری کا ایک وسیع دائرۂ کار ہے۔ 'سچا ادب' اور 'جھوٹا ادب' کے بیچ بشیر بدر نے جو دیوار اٹھائی ہے اس سے بشیر بدر کی غزلوں میں ایک وقیع احتساب بھی ہے اور غزل کی نئی میزان کی اہمیت کا تصور بھی۔

بشیر بدر کی خطرناک حد تک جو مقبولیت ہے اس کی وجہ ان کی 'مجلسی شہنشاہیت' یا تدریسی تجربہ نہیں ہے بلکہ ان کی غزلوں میں ہمیں اپنا جیسا ہی گوشت پوست کا وہ عام زمینی انسان نظر آتا ہے جو ہماری ہی طرح دکھوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہے امید و آرزو کے سرابوں کے پیچھے سرگرداں ہے اور ہمارا جیسا ہی تنہا تنہا بکھرا بکھرا اکیلا اور اندر سے ٹوٹا پھوٹا ہے۔ اس کی امنگیں آرزوئیں۔ بے تاب اندیشے۔ مایوسیوں سے بھری پڑی تنہائیاں سب کی سب ہمارے اپنے ہی وجود کی شناخت ہیں اس سچے انسان سے اسکی اپنی اصل شخصیت سے ہم جس طرح ایک لمحہ بھی جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتے۔ اسی طرح جدید شاعری بھی بشیر بدر کی غزلوں سے الگ اپنا مکمل وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔

خلیل الرحمان اعظمی مرحوم

بشیر بدر کی غزل اپنی لفظیات اور منظر نامہ کے اعتبار سے ایک نرالی شان رکھتی ہے۔ انہوں نے جو راستہ منتخب کیا ہے وہ امکانات اور خطرات دونوں سے پُر ہے۔ جب الفاظ ان کے تجربہ سے کلی طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کا شعر کھرے سونے کی طرح چمکتا ہے۔

سناٹے آئے در جوں میں جھانکا چلے گئے
گرمیوں کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

بشیر بدر

بشیر بدر کی غزلوں میں

تخلیقات شناسی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

بشیر بدر تخلیقیت شناس شاعر ہیں۔ وہ محتاط اور سنجیدہ سائنسی ذہن رکھتے ہیں اسی لئے ان کی غزلوں میں بھرپور اعتماد ملتا ہے۔ انھوں نے الفاظ کی سونے کی صلیب کے ذریعہ مشاہدے اور تجربے کو فن کا ہنر عطا کیا ہے۔

مشاہدے اور تجربات کی تصدیق تو اس نمسہ کی مدد سے ہو سکتی ہے مگر کچھ ASSERTIONS ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تصدیق اس ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔ اگر لاتعداد مشاہدات ان حقائق کو سہارا دیتے ہیں تو ان مشاہدات کی توجیہات ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہیں کیونکہ ان کا انحصار اس بات پر ہے کہ توجیہ کرنے والا کون ہے۔ ایک فنکار ایک حقیقت میں اس لئے یقین رکھتا ہے کہ یہ اس کا ذاتی تجربہ ہے یا وہ اس کے مزاج اور طبیعت کے موافق ہے۔ جو شئی اسے دوسروں سے الگ کرتی ہے وہ اکساتی ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرے۔ مگر دوسرا فنکار اسے رد کر دے گا محض اس بنیاد پر کہ اس کا پس منظر، مزاج اور طبیعت پہلے فنکار سے مختلف ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی کلیے کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے تو یہ ذہن میں رکھنا ہوتا ہے کہ انفرادی پسند اور ناپسند اسے سمجھنے اور تجربے کی توجیہہ کرنے میں کسی حد تک کارفرما ہیں۔

یہ انفرادی پسند و ناپسند دراصل خارجیت اور داخلیت ہیں۔ جس طرح تعبیر (DENOTATION) اور تضمین (CANNOTATION) میں کوئی واضح حد فاصل نہیں ہے اسی طرح خارجیت کے میدان اور داخلیت کی سرزمین کے درمیان بھی خط کھینچنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر بشیر بدر کی غزلوں کو لے لیں۔ بعض پڑھنے والے اسے اچھا کہیں گے، بعض ناپسند کریں گے اور بعض لغو بھی کہہ سکتے ہیں۔ آرا کا ایک جیسا ہونا مشکل ہے۔ کیونکہ کلام کا معیار کم و بیش ذاتی معیار ہیں۔ مگر اس کے باوجود ایک ناقد یہ حکم لگا سکتا ہے کہ کلام کیسا ہے اور اس کا فیصلہ اس سلسلے میں حتمی ہوگا۔ یہ اس لئے کہ ناقد کلام کے نظام کی ایک خاص

پیمائش رکھتا ہے۔ کلام کے جانچنے کا ایک خاص معیار اپناتا ہے جس سے کسی نتیجے پر پہنچا جاتا ہے۔ پھر جو بھی اس معیاری نظام کو تسلیم کرے گا۔ وہ اس سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں حقیقت کی پیمائش کے لئے کوئی متفقہ آلہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ کوئی معروضی حقیقت بھی موجود نہیں ہے۔ جو کچھ فرد اپنے طور پر جانچتا ہے وہ اس کے ذاتی معیار پر مبنی ہے۔ وہ بہرصورت داخلی ہے۔ یہ داخلیت پسندی دراصل تخلیقیت شناسی ہے۔ جس سے قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور زندگی کے مختلف پہلو کو دیکھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے کسی ایسے شخص کی نظر سے۔ جو فنکار ہے اور جسے نہ صرف واردات بلکہ واردات کا اعادہ اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی خصوصیت ودیعت ہوئی ہے۔

بشیر بدر ایسے ہی تخلیقیت شناس شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے واسطے سے خارجیت یا معروضیت کا کوئی دعویٰ نہیں ملتا البتہ ان کے باطن کا اظہار ملتا ہے۔ جو ہر پڑھنے والے کے اندروں کی آواز اور اپنی ہی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ایسی خوبی ہر شاعر میں نہیں ہوتی ہے۔ مطالعے، مشاہدے اور تجربے سے شاعری کرنے کا انداز جداگانہ ہوتا ہے اسی لئے ہر شاعر عظیم نہیں ہوتا بشیر بدر کی عظمت اس میں ہے کہ وہ زیادہ ذہین حساس اور تجرباتی نظر رکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں، اس کہنے میں جواز پوشیدہ ہوتا ہے ؎

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
یہ غزل کا لہجہ نیا نیا، نہ کہا ہوا، نہ سنا ہوا

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موج ہوا

آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اتر جائیگی، صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں   مجھے گلاس بڑا دے شراب کم کر دے

تخلیقیت شناس غزلوں کے یہ اشعار تخلیقی عمل اور تخلیقی آگ کی روشنی رکھتے ہیں۔ داخلی احساسات کے اظہار کے لئے خارجی وسائل کا استعمال بشیر بدر اس طرح کرتے ہیں ؎

لب ترستے رہے اک ہنسی کے لئے   میری کشتی مسافر سے خالی رہی
تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو   رک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

انسان کی بے حسی اور رفتاروں کی مجبوری کو تخلیقیت شناس بنا کر بشیر بدر نے جو تغزل پیدا کیا ہے اس میں عصری حسیت نمایاں ہے۔ انھوں نے فطرت سے بھی لطف اندوز ہونے والی نظر پائی ہے مسکراتی سحر چمچماتا ہوا دلفریب آفتاب، نرم ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی، مست و بے خود کر دینے والی معطر ہواؤں، نیلگوں آسمان کی بے کراں وسعتوں اور کھیتوں سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو سے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ لیکن ان کا لہجہ اور ان کی آواز بالکل مختلف ہے ؂

سبز پتے دھوپ کی یہ آگ جب پی جائیں گے — اجلے فر کے کوٹ پہنے ہلکے جاڑے آئیں گے

خوش رنگ پرندوں کے لوٹ آنے کے دن آئے — بچھڑے ہوئے ملتے ہیں جب برف پگھلتی ہے

ہلکی ہلکی بارشیں ہوتی رہیں — ہم بھی پھولوں کی طرح مہکا کریں۔

بشیر بدر نے شاعری کو مہذب لہجے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ فکر معتدل کے ساتھ لب و لہجہ کے نئے پن نے دو آتشہ کا کام کیا ہے۔ ان کی غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں صرف شاعرانہ کیفیت کا تجربہ نہیں ملتا بلکہ دوسروں کے اندر شاعرانہ کیفیت پیدا کرنے کی خوبی بھی ملتی ہے ؂

میں نے روکا نہیں وہ چلا بھی گیا — بے بسی دور تک دیکھتی رہ گئی

دعا آنسوؤں میں کھلا پھول ہے — کسی کے لئے بد دعا مت کرو

ضعیف بوڑھی جو پل پر اداس بیٹھی ہے — اسی کی آنکھ میں لکھا ہے زندگی ہوں میں

جذبوں کے لطیف تر پہلو صرف استعاروں کے ذریعے ظاہر کئے جا سکتے ہیں اور استعارے کسی بڑے نقشے کے کٹے ہوئے ٹکڑے نہیں ہوتے کہ انھیں ایک دوسرے سے جوڑ کر نقشہ نئے سرے سے بنا دیا جائے۔ بشیر بدر کی غزلوں میں جو تجربہ مجسم نظر آتا ہے اس میں ان کی تحقیق و تفتیش اور سالمیت ملتی ہے جن پر وہ ایک ہیئت عائد کرتے ہیں۔ یہ تجربہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ابلاغ بہت حد تک ممکن ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی طور وہ ایک مبلغ یا شارح نہیں بلکہ ایک صانع ہیں ؂

آنکھ موندے اس گلابی دھوپ میں — دیر تک بیٹھے اسے سوچا کریں

دیکھا تجھے، سوچا تجھے، چاہا تجھے پوجا تجھے — میری خطا، میری وفا تیری خطا کچھ بھی نہیں

بشیر بدر شعوری اور غیر شعوری طور پر وجودی فلسفہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ دراصل ہر انسان بے نظیر (UNIQUE) ہوتا ہے اور کسی نہ کسی بات میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ قوانین، مسلمہ قواعد اور مفروضات اس کے مسائل کا حل نہیں ہوتے اور نہ یہ بات تجریدی نظر و فکر یا عقلیت سے سمجھی جا سکتی ہے۔ ہر انسان اپنی ذات میں ڈوب کر اپنے طور پر سچائی پا سکتا ہے اپنی

ذات سے الگ ہوکر وہ سچائی نہیں پا سکتا۔ لیکن انسان کی زندگی میں ایک خلا ضرور ہوتا ہے۔ بشیر بدر کی زندگی میں بھی خلا ہے۔ خواہ بیوی کی جدائی کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے ؎

میری چھت سے رات کی سیج تک کوئی آنسوؤں کی لکیر ہے
ذرا بڑھ کے چاند سے پوچھنا وہ اس طرف سے گیا نہ ہو

یہ کسک دل کی دل میں چبھی رہ گئی
زندگی میں تمہاری کمی رہ گئی

دل میں سو غم ہیں تری یاد ہے تنہا تنہا
ایک اجلی سی پری پھرتی ہے بازاروں میں

اس حویلی میں اب کوئی رہتا نہیں
چاند نکلا کسے دیکھنے کے لئے

تیرے بدن پر میں پھولوں سے اس لمحے کا نام لکھوں
جس لمحے کا میں افسانہ تو بھی ایک کہانی ہے

شاعر اپنی رستگاری کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کا جوہر اس کا تابع ہوتا ہے۔ اپنی پسند اور عمل کے لئے وہ ایک ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی خواہش اس کی واحد ذات تک محدود نہیں بلکہ معاشرے کا ہر فرد اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جو کچھ وہ اپنے لئے یا دوسروں کے لئے کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس پر ہوتی ہے۔ دوسروں کے لئے اچھائی کئے بغیر اپنے لئے اچھائی نہیں ہوتی اور وہ اپنے عمل کے معاملے میں بالکل آزاد ہوتا ہے۔ خارجی عوامل اور محرکات اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ بشیر بدر بھی ایسی ہی کیفیت کے شاعر ہیں۔ ان کی نظر میں ہر انسان ایک جزیرہ ہے ساتھ ہی ساتھ تخلیق کا سرچشمہ بھی ہے اسی لئے وہ شخصی میلان اور انفرادی رجحان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ وہ ادب کو زندگی کا آئینہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ انسان کے وجود کو ثابت کرنے کا وسیلہ تصور کرتے ہیں اور اسی میں ان کی تخلیقیت شناسی پوشیدہ ہے ؎

گرمیوں میں اس کے گیسو سائباں در سائباں
سردیوں میں اس بدن کو دھوپ کا دریا کہیں

اسی احتیاط میں وہ رہا، اسی احتیاط میں رہا
وہ کہاں کہاں مرے ساتھ ہے کسی اور کو یہ پتہ نہ ہو

اس کی بھی مجبوریاں ہیں میری بھی مجبوریاں
روز ملتے ہیں مگر گھر میں بتا سکتے نہیں

اپنے دکھ سکھ بہت خوبصورت رہے
ہم جئے بھی تو اک دوسرے کے لئے

شہر میں اب مرا کوئی دشمن نہیں
سب کو اپنا لیا میں نے تیرے لئے

جدید افکار میں بشیر بدر کا تازہ اور بالکل ہی نیا اپروچ رہا ہے اور اس اپروچ سے انھوں نے اہم کام یہ لیا ہے کہ انسان کی فطرت اور اس کے رشتے کے درمیان ربط، ہم آہنگی اور توازن قائم کرنے کی سعی کی ہے ؎

مری آنکھوں میں آنسو کی طرح اک رات آجاؤ
تکلف سے، بناوٹ سے، ادا سے چوٹ لگتی ہے

آتی ہوئی ٹرین کے جو آگے گئی رُکی گئی — اس ماں سے یہ نہ کہنا بقید حیات ہوں

دل، محبت، دمن، دنیا، شاعری — ہر دریچے سے تجھے دیکھا کر دیں

آرزو مندی انسان کا جبلّی تقاضہ ہے۔ اس کا المیہ یہ ہے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اظہار کی انسان میں سماجی ضابطوں کے خوف سے ہمت یا جن کی تکمیل اپنی بے بضاعتی کے سبب قدرت نہیں ہوتی۔ لیکن ان کا بیان جب کوئی شاعر کرتا ہے تو یک گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے۔ شاعری کی طرح خواب بھی انھیں نا آسودہ خواہشات کی وقتی تسکین کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ بشیر بدر کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ تحت الشعور کے پردوں میں چھپی تمناؤں کو اشعار میں بے نقاب کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں نا آسودہ خواہشات کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور پڑھنے والا بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے ؎

بچپن سے میری عادت ہے پھول چھپا کے رکھتا ہوں — ہاتھوں میں جلتا سورج ہے دل میں رات کی رانی ہے

سوچا نہیں اچھا برا دیکھا سنا کچھ بھی نہیں — مانگا خدا سے رات دن تیرے سوا کچھ بھی نہیں

مرے بازوؤں میں تھکی تھکی ابھی محوِ خواب ہے چاندنی — نہ اٹھے ستاروں کی پالکی ابھی آہٹوں کا گذر نہ ہو

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں — کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

بشیر بدر کی غزلوں کے لہجے میں نیا پن اور آگہی آج کی زندگی سے آئی ہے۔ آج کی یہ نئی زندگی ــــ اختراعات، ایجادات، ہلچل اور تیز گامی کے موجودات ہیں۔ جن میں نئے احساسات ہیں اور بدلتی ہوئی صورتوں کے نقشے ہیں فی زمانہ زندگی میں جو OBSCURITY ملتی ہے اس نے تنہائی اور خودنگری کا مزاج پیدا کیا ہے جس سے بشیر بدر بھی الگ نہیں رہے ہیں۔ ان کے امیجز میں غیر مرئی صورتیں، اندرون کو اظہار کا ایک راستہ دکھاتی ہیں جو محسوسات تک جاتا ہے اور اس خودنگری اور تنہائی کے احساسات کو، کانکریٹ بنانے کی کوشش کرتا ہے ؎

ایک بھیگی دھند کی یلغار کو سہتی ہوئی — شاخ کی باہنوں میں گر کر جاودانی ہوگئی

ایک لڑکی اک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی — میں اجلی دھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا

کوئی عشق ہے کہ اکیلا ریت کی شال اوڑھ کے چل دیا — کبھی بال بچوں کے ساتھ آ یہ پڑاؤ لگتا ہے رات میں

وہ فراق ہو کہ وصال ہو تری آگ مہکے گی ایک دن — وہ گلاب بن کے کھلے گا کیا جو چراغ بن کے جلا نہ ہو

اسی سلسلے کا ایک شعر ہے ؎

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں — خاموشی بذات خود آواز کا صحرا ہے

اس شعر میں وجودی اور جمالیاتی تناظر تلاش کرتے ہوئے نظام صدیقی لکھتے ہیں کہ "سناٹے کی شاخ" "زخمی پرندے" اور "آواز کا صحرا" جیسے پر تضاد اور پیچیدگی کے حامل بصری اور سماعی پیکروں کے فنی دربست سے آج کے آدمی کے داخلی اور خارجی احوال کے حشر آگیں "کرب سکوت" کا بیک وقت انفرادی اور اجتماعی تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ جو ایک تہذیبی بحران کا علامیہ ہے۔

آج کا پورا تہذیبی خرابہ بشیر بدر کے اس مکمل اور بھرپور شعر میں قلمبند ہے۔ اس محشر بدوش خاموشی کی اتنی تخیلی طرفگی اور جمالیاتی نادرہ کاری سے تصویر آفرینی انتہائی دل نشیں، جاذب نظر اور فکر انگیز ہے جو ان کے غیر معمولی احساس اور شعلہ آسا تخیل، گداز قلب، شعور عصر اور ریاض فن کا ترجمان ہے جس کی وجہ سے یہ روحانی زلزلہ بیما خاموشی اور لازوال آرٹ میں ڈھل گیا ہے۔ جہاں آواز کی سسکی، سرگوشی اور چپ چپ سناٹا باہم دگر جمالیاتی استغراق کی کیفیت میں ہم آغوش ہیں۔!

بشیر بدر کا ایک شعر ہے ؎

چاند ہاتھ میں بھر کر جگنوؤں کے سر کاٹو اور آگ پر رکھ دو
موم بتی کی رانیں جب بلیڈ سے کھل جائیں چاقوؤں کے سر رکھ دو

اس شعر کو جنسی نفسیات کے موضوع پر منطبق کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے اشعار کسی مسئلہ کا رد عمل ہوتے ہیں۔ بشیر بدر کے اس شعر سے ایک فنکار کے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس درجہ حقیقت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ شعر جنسی لذت کوشی کے لئے نہیں کہا گیا ہے۔ بشیر بدر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ یہ شعر دراصل ایک SHORT STORY پر مبنی ہے۔ اس کا ایک کردار اپنے ساتھیوں سے وہی سب کچھ کہتا ہے۔ جو اس شعر میں کہا گیا ہے۔ یعنی یہ شعر فساد پر ہے۔ اس میں پردہ نشیں عورتوں کے عفت مآب جذبے سے لے کر بدن کی پیلی اور موم بتی جیسی رنگت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فسادیوں کے ایک کردار سے کہلوایا گیا ہے کہ اگر یہ عورتیں RAPE کے خلاف احتجاج کریں تو ان کے جسم کے چاند کو نوچا جائے۔ "جگنوؤں" یعنی ان کے بچوں کے سر کاٹ کر آگ پر رکھ دیئے جائیں "رانوں" پر بلیڈ لگائے جائیں اور چاقوؤں کے زور پر ان کی عصمت لوٹی جائے۔

بشیر بدر کی غزلوں میں عصری حسیت کی جستجو اور دریافت ایک اہم اور بامعنی عمل کی صورت میں سامنے آتی ہے لیکن ان میں طنز کے نشتر بھی ملتے ہیں ؎

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

دشمنی جم کر کرو، لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

غرور اس پہ بہت سجتا ہے مگر کہہ دو   اسی میں اس کا بھلا ہے غرور کم کر دے

رات کا انتظار کون کرے   آجکل دن میں کیا نہیں ہوتا

آج دنیا جس افراط و تفریط میں گھری ہوئی ہے اس سے یہ قوی امکان ہے کہ تمام مذاہب اور تہذیبیں اپنی قدریں کھو دیں گی اور بے راہ روی کی فاحشہ مچھلی ہر جگہ حکمراں ہو گی اس واضح مستقبل کی عکاسی بشیر بدر نے یوں کی ہے ؎

سمندر سوکھ جائیں گے اور اک فاحشہ مچھلی   ہمارے ساحلوں اور جنگلوں کی حکمراں ہو گی

بشیر بدر کی غزلوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ عصری مسائل کتنے ہی کرخت ہوں اور رچا ہے کسی بھی نوعیت کے ہوں، وہ جمالیاتی لباس میں خوش اسلوبی سے ڈھالے ہوئے ملتے ہیں ؎

ڈالی گلاب کی میرے سینے سے آلگی   جھٹکے کے ساتھ کار کا رکنا غضب ہوا

سنانے آئے، دریچوں میں جھانک چلے گئے   گرمی کی چھٹیاں تھیں، وہاں کوئی بھی نہ تھا

کوئی موسم ہو دن گئے بہاروں کے پھرے لوٹ آئیں گے

ایک پھول کی پتی اپنے ہونٹ پر رکھ میرے ہونٹ پر رکھ دو

بید کے زرد مونڈھے پہ بیٹھی ہوئی شام نے اٹھ کے بتی جلائی نہیں

روشنی کا فرشتہ بڑی دیر تک دستکیں دے کے واپس چلا بھی گیا

اگر جغرافیائی زبان استعمال کی جائے تو بشیر بدر کی غزلیں پہاڑ اور وادیاں ہیں۔ ان ہی پہاڑوں کے درمیان DELAWERE جنم لیتا ہے جو صاف شفاف جھیلوں میں سے اور اس علاقے کے ہزاروں چشموں سے نکلتا ہوا، وادی کے بہت سے موڑ کاٹتا ہوا، چھوٹی چھوٹی ندیوں کو ساتھ ملاتا ہوا عظیم ترین دریاؤں میں سے ایک بن جاتا ہے۔ پہاڑیاں اپنی چوٹیوں پر ہری بھری اور زرخیز ہیں اگرچہ اس علاقے کی چوٹیوں میں چٹانوں کی بھی کمی نہیں اور یہ سبھی کچھ مل ملا کر اس علاقے کو وہ رومانوی تصویری کردار عطا کرتا ہے جو شدت سے دلوں کو مسحور کرنے والا ہے۔ درّے کہیں کہیں تنگ مگر خوبصورت اور ہرے بھرے ہیں۔ ان میں سے کوئی چھوٹی سی ندی گھومتی ہوئی گزرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی جھیلوں کے کناروں پر حسین اور زندگی سے بھرپور گاؤں آباد ہیں۔ یا آبادی ندیوں کے کنارے ان مقامات پر ہے جو صنعتی پیداوار کے لئے موزوں ہیں۔ صاف ستھرے ہیں اور کھیت آسانی سے فصل دینے والے ہیں اور ان کی زمین سونا اگلتی نظر آتی ہے اور دلکش مناظر وادی میں جا بجا نظر آتے ہیں ؎

یہ پتھروں کا ہے جنگل، چلو یہاں سے چلیں   ہمارے پاس تو گیلی زمیں کے پودے ہیں

لکڑیوں سے تراشی ہوئی لڑکیاں، بٹن کے نوجواں مختلف رنگ میں
دوست ہیں دوستی سے مگر بے خبر دشمنِ جاں ہیں لیکن خفا تک نہیں

وہ فرشتے آپ تلاش کریئے کہانیوں کی کتابوں میں — جو برا کہیں نہ برا سنیں کوئی شخص ان سے خفا نہ ہو
ملک تقسیم ہوئے دل تو سلامت ہیں ابھی — کھڑکیاں ہم نے کھلی رکھی ہیں دیواروں میں
زمین ماں بھی ہے محبوب بھی ہے بیٹی بھی — زمین چھوڑ کے جاؤں، کوئی سوال نہیں

بشیر بدر کی غزل بقول نظام صدیقی ' اپنے دور کی روح میں گھومتا ہوا آئینہ ہے جس میں ان کی باطنیت کی وسعت اور ہمہ گیری اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ انہوں نے عظیم غزلیہ ادب کے زندہ، تابندہ اور پائندہ روایات سے انتخابی رویئے کے ساتھ روحانی فیضان حاصل کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تمام تہذیبی، سیاسی، سماجی اور فکری تبدیلیوں کے اثرات قبول کئے، اور نئے دور کے نئے موضوعات، مسائل، افکار اور تناظر سے اپنی گہری حسی وجدانی، جذباتی اور فکری وابستگی کو ایک ایسا انوکھا اور دلکش شعری پیکر عطا کیا جو خود اپنی خوبیوں، خامیوں اور ان کے مقلدین کی بدترین ذہنی تناسخی گردشوں کے باوجود اردو کی غزلیہ ادب کی تواریخ کا ایک نیا اور منفرد باب ہے اور اپنی پیش رو غزل کا اگلا قدم بھی۔ ان کی غزل ان کے اپنے باطن کے کرب و درد میں ڈوبی ہوئی نہایت شائستہ آواز ہے جو خود نگر اور خودگر ہونے کے ساتھ ہمہ گیر مقصدی کردار کی حامل ہے اور بیک وقت ادبی اشرافیہ اور پرولتاریہ کے ذہنوں میں صدیوں تک گونجتے رہنے کی غنائی کیفیت سے مملو ہے۔ انہوں نے غیر بالیدہ اور روایتی مقصد بردار ترقی پسند اور فیشن گزیدہ جدیدیت پرست غزلیہ فکر خیال اور احساس کو برسوں کی فرسودہ عادت، بیجا تکرار، منصوبہ بند موضوعات، مقررہ لفظیات، بنے بنائے راستوں، گھسے پٹے محاورات، استعارے، علامات اور پیکر کی گہری گھاٹیوں سے نکال کر لمحہ بہ لمحہ سائنسی عہد کی مشینی زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں، متضاد کیفیتوں، خوش رنگ امیدوں، شدید محرومیوں، خدشوں اور نئے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کا غیر محسوس طور پر حوصلہ بخشا ہے۔

بشیر بدر کی تخلیقیت شناس غزلوں میں الفاظ کی اصوات، ان کی رفتار، ان کا سلسلہ اتلاوات اور کار کا رابطہ زمانی، تمثالوں کی خیال افروزی، فرضی باتوں میں حقیقت کی جھلکیاں، آشنا حقیقتوں میں افسانوں کی سی دلچسپیاں، کسی کلیدی لفظ یا ترتیب کے ذریعہ ایک پوری کیفیت کے معنوں کی طلسم کشائی اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر الفاظ کی موسیقی اور ان کا آہنگی توازن بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

اکائی اور امیج کا بشیر بدر

عزیز اندوری

اکائی اور امیج کا خالق اردو شاعر بشیر بدر نئی غزل کی معتبر آواز سے بہت قریب کا تعلق رکھتے ہیں۔ غزل کے بے تکلفانہ لہجے جسے غزل کے جدید لب و لہجے سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، کو فکری آہنگ سے جوڑنے میں ان کی ذکاوت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ بشیر بدر نے اس لہجے کی ابتدا اس وقت سے کر دی تھی جب سے اردو غزل کو نئی نئی علامتوں سے مزین کرنے اور اس کے جدید لیکن منفرد لہجے کو اپنانے کی جانب رجوع ہونے کا رجحان عام ہوا۔ اس سلسلے میں بشیر بدر کی انفرادیت کا احساس اس وقت پختہ ہوا جب ان کی غزلوں کا مجموعہ "اکائی" (۱۹۶۹ء) کی طباعت ہوئی اور جب انھوں نے بھرپور فکری انداز کو اپناتے ہوئے لہجے کی بے تکلفی کے ساتھ ہی جدید علامتوں اور نئے نئے الفاظ کے استعمال سے نئی شعری معنویت کو ابھارا۔

اکائی کی غزلوں میں ان کے اس فکری انداز و عمل میں زیادہ اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ اسی لیے ان غزلوں کے بیشتر اشعار فکر و فن کے حسن سے مزین ہیں۔ اور معیار و وزن پر پورے اترتے ہیں۔ مثلاً

موت جن شہروں کو اجڑا نے پریشاں کر گئی
پھر انہیں چھونے لگا ہے زیست کے ہاتھوں کا جن

جیسے ورقِ گل پر انگارہ کوئی رکھ دے
یوں دستِ حنائی پر آنسو ابھی ٹپکا ہے

جھنجھلا کے کسی لمحہ وہ توڑ سکتا ہے
اک بچے کی انگلی سے لپٹی رگِ دنیا ہے

جلنے والی ہر اک شئے کے لیے آنسوؤں کی بڑی ضرورت ہے
ایسا قمقم قمقم کے وہ نہیں جلتی جس میں ہلکی نمی نہیں ہوتی

شہر و صحرا کی تقسیم ممکن نہیں ایک قوت ہے جس کے بہت روپ ہیں
ان پہاڑوں میں بھی پیار کا ظلم ہے ان مشینوں میں بھی ظلم کا پیار ہے

ننگے پاؤں فرشتوں کا اک طائفہ آسماں سے زمیں پر اترنے لگا
سر برہنہ فلک زادیاں عرش سے آنسوؤں کے ستارے گراتی رہیں

کیا ہوا کیوں خیمۂ زخم سے کج کلاہانِ غم پھر نکلنے لگے
ہم تو سمجھے تھے اب شہرِ دل لُٹ چکا تھک گئے درد کے کارواں سو گئے

جنسِ دل پہلے بھی کیا گراں مایہ تھی اور اب اس ترقی معکوس میں
سنگ ریزوں کے تاجر مرے دور میں آئینہ ساز و شیشہ گراں ہو گئے

ہم دونوں دنیادار نہیں ہیں اسی لیے صورت کوئی نظر نہیں آتی نباہ کی

مجھ کو ان سچی باتوں سے اپنے جھوٹ بہت پیارے ہیں
جن سچی باتوں سے صدیوں انساں کا خون بہا ہے

زندگی تری فکریں کھلتے ہی گلابوں کا رس نچوڑ لیتی ہیں
پھول جیسی عمروں کے سوچتے ہوئے بچے بوڑھے ہو جاتے ہیں

شاخ پہ جتنے پھول کھلے ہیں اکثر پیغمبر سے لگتے ہیں
لیکن میں تو اس کی مانوں جو ہنس دے انگاروں میں

کاغذی بجوے شیرلاتے ہیں اپنا تیشہ یہی قلم بابا !

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

گدائے جرعہ مے کو حقیر نہ جان کہ اس فقیر سے اس مے کدے کا نام اٹھا

مجروح بہت ہے دل پھر بھی شگفتاں ہے یہ برگِ خزاں دیدہ ہم رازِ بہاراں ہے

اکائی میں شامل بشیر غزلوں میں شعور کی پختگی کے ساتھ ہی علامت سازی اور الفاظ کے انتخاب و استعمال میں وہ شدید جدت ذہنی نہیں ملتی جو ہمیں امیج "(۱۹۷۳ء) کی بیشتر غزلوں میں نظر آتی ہے ان غزلوں کے لہجے اور موڈ میں بھی بشیر بدر نے چونکا دینے والی شوخ علامتوں کا استعمال کر کے اُردو غزل کو ایک نئی جہت سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکائی اور امیج کی طباعت میں صرف چار سال کا فرق ہے۔ لیکن دونوں مجموعوں میں بشیر بدر کے لہجے اور رویئے (TREATMENT) میں کافی فرق (یا تضاد؟) ملتا ہے۔ ان چار برسوں میں بشیر بدر کی غزلوں کے موڈ کی تبدیلی اچانک نہیں ہوئی اور اسے کسی خاص شعری یا ذہنی تتبع کا نتیجہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ اکائی کی چند غزلوں میں جس بے تکلفانہ موڈ اور شوخی کے ہلکے پھلکے تاثرات نظر آتے ہیں۔ بشیر بدر نے انہیں نمایاں کرتے ہوئے ایسی علامتوں اور ایسے الفاظ کو بلا تکلف استعمال کیا جو ان کی طبیعت کی انفرادیت کا کھلا ہوا اعلان بن گئے۔ ان کے اس رویے میں اجنبیت نہ سہی لیکن وہ اپنی شدت کے باعث بیشتر صورتوں میں غیر مانوس سی ضرور نظر آئیں۔ اسی لیے اکائی میں موجود شعری حسیت امیج تک آتے آتے بے تکلفانہ علامتوں کی اختراعی شکل میں تبدیل ہو گئی جس نے

ذہنوں میں مختلف قسم کے ردِ عمل کو جنم دیا اور بشیر بدر کی ذہنی اختراع موضوعِ گفتگو بنی رہی۔ یہاں تک کہ اسے ان کی انفرادیت سے منسوب کر دیا گیا۔ اور اس طرح یہ بھی محسوس کیا جانے لگا کہ بشیر بدر دشت کی سیاحی میں آبادیاں ہی، شگفتگی، کو زیادہ فاصلے تک تازہ رکھنے کے حق میں نہیں۔

شاید اسی لیے انھوں نے اپنی انفرادیت اور شناخت کی بقا کے لیے اپنی غزلوں کی بنیاد کے لیے ایسے الفاظ بھی انتخاب کرنے سے گریز نہیں کیا جن سے بادی النظر میں کسی قسم کی پُر اثر شعریت کو جنم دینے کی توقع نہیں کی جا سکتی وہ شعریت جو غزل کی تجسیم و تزئین کے لیے ناگزیر ہے لیکن میرے خیال میں اس احساس کو تقویت نہیں دی جانی چاہیے کہ بشیر بدر کے اس ذہنی عمل کے پس پردہ کوئی ایسا جذبہ کار فرما رہا ہو جس کے تحت وہ اردو غزل کے چہرے کو مسخ کر کے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہوں بلکہ انھوں نے اپنی طبیعت کی انفرادیت اور جدید شعری تقاضوں کی تکمیل کے خاطر غزل کی از سرِ نو تجسیم کے لیے جس اختراعی اور نامانوس علامات اور الفاظ کا استعمال کیا اس میں چاہے غزل کی جانی پہچانی صورتیں نہ رہی ہوں مگر بشیر بدر نے فکر و شعور اور احساسات کی بلندیوں نے بہت سے مقامات پر ان کے ذہن کو اسی طرح ترو تازہ رکھا ہے جو اکائی کی غزلوں کی تخلیق کا باعث تھا۔

میرا خیال ہے کہ بشیر بدر نے اردو غزل میں مستعمل الفاظ کی محدودیت سے بالکل اسی طرح گریز کیا ہے جس طرح ان کے عہد کے بعض جدت پسند ذہن غزل کے کینوس کو وسیع کرنے اور اس پر مختلف رنگوں کی آمیزش سے نئی نئی تصاویر بنانے کی جانب متوجہ تھے۔ اس طرح بشیر بدر نے اپنے اس ذہنی عمل کا اظہار کر کے جہاں ایک طرف اپنی جدتِ طبع کا اظہار کیا ہے۔ وہیں اپنے عہد کے شعری تقاضوں پر لبیک کہتے ہوئے ان کی تکمیل کی طرف ذکاوتِ حس کے سہارے توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے۔ ٹرک، مشین، ڈبے، صندوق، ٹرین، پٹریاں، اسٹیشن، سائرن، برگ، موٹر، بسیں، ٹریفک، چاقو، مچھلی، چوہے، بلیاں، کتے، گاڑی، خرگوش، گائے، مکھی، بکرے، دیمک، ڈنٹھل، شاور، کلینڈر، چیتھڑے، مونچھیں، بلب، پول (کھمبا)، پھنکار، کوٹ، بیل باٹم، پینٹ، لنگی، بلیڈ، کوٹھے، ڈونگا، کٹورا، پھاگل، ٹافی، پارک، انڈا، شیڈ، بھیڑ، اٹیچی، ناول، کافی ہاؤس، ٹیڈی، بیوی، عورت، مادہ، نر، اینٹ، حقہ، کپاس، لیمپ، لان، بلغم، چھٹا، فاحشہ وغیرہ جیسے بے تکلفانہ استعمال کر کے غزل میں تبدیلیوں کے امکان کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح اپنی غزلوں کو نئی علامتوں اور نامانوس سے الفاظ کا پیکر بنا کر پیش کر کے بشیر بدر نے ایک جدید لہجہ کو اپنانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ نیز داخلی کیفیتوں کے اظہار کے لیے انھوں نے اپنی جدید تر غزل کو ایک وسیلہ بنانے کا حوصلہ بھی کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود امیج کی غزلوں میں ان پیشتر جگہوں پر بھی نظر ٹھہر جاتی ہے۔ جہاں وہ جدید علامتوں کو بار بار دہرانے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی غزلوں میں مچھلی، ریت، بدن، مشین، فرشتہ، پرندے (پنچھی) لان، دھوپ، موج، لباس (کپڑے) بلب، برف، بستر وغیرہ ایسی

علامتیں ہیں جنھیں بشیر بدر نے بار بار استعمال کیا ہے اور ان سے نئی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

تھرکتی مچھلی نکل کر سرکتے کیڑوں سے
تمام رات کو اب بے لباس کر دے گی

حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

لہروں نے گھیر رکھا تھا سارے مکان کو
مچھلی کدھر سے کمرے کے اندر چلی گئی

مچھلیاں ٹوٹتی ہیں کارواں پر
گھوڑے اسکوٹروں کے دیوانے

ساحل پہ مچھلی نے کپڑے اتارے
بڑھتے ہوئے دریا کی دھار کے بائے

ساحل کی تشنہ ریت پہ جو مہرباں ہوئی
دریا بھی ایسی موج کے بے حد خلاف ہے

تم ریت کے جلتے ذروں کو یہ دھوپ ہی چمکائے ورنہ
دریا کترانے والا ہے، بادل ترسانے والا ہے

عرق نچوڑنے والی مشین بیمار ہوئی ہے
ابھی ہمارے بدن سبز کچے کچے ہیں

گلابی جھیل میں نیلے ستارے چمکیں گے
اگر بدن کی سبھی بتیاں بجھا دو گے

وہ جا کے خوشبوؤں کا بدن چوم آئیں گے
رنگوں کے وہ فرشتے ہواؤں میں اڑاؤں گا

آنگن میں ننھے ننھے فرشتے اتریں گے جب
بھوری شفیق آنکھوں میں مسکراؤں گا

ممکن ہے کہ اس طرح وحشت میں کمی آئے
خوابیدہ پرندوں پر اک گولی چلا دینا

آنسو کبھی پلکوں پر تا دیر نہیں رکتے
اڑ جاتے ہیں یہ پنچھی جب شاخ لچکتی ہے

کھلے سے لان میں سب لوگ بیٹھیں چائے پئیں
دعا کرو کہ خدا ہم کو آدمی کر دے

لان پر طیارے بکھر اڑنے لگے
سرخ، نیلی، گاڑیاں چلنے لگیں

امیج کے بعد بشیر بدر کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اس دوران جہاں تہاں ان کی غزلیں پڑھنے یا سننے کا موقع ملا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے فکری ارتقا کو جہاں ایک طرف تقویت پہونچائی ہے۔ وہیں دوسری طرف انہوں نے الفاظ و علامات کے استعمال کے اختراعی عمل کو بھی تیز کیا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان کی علامت سازی اور نئے الفاظ کے برتنے میں اب بھی ان کا موڈ وہی ہے جسے ہم نے اکائی سے امیج تک پرکھا اور دیکھا ہے اور جس کی وجہ سے ان کی بیشتر غزلیں خصوصیت کی حامل ہیں۔

علامت سازی اور نئے الفاظ کے برتنے میں بشیر بدر کی خصوصیت کے ساتھ ہی بشیر بدر کا وہ برتاؤ بھی لائق توجہ ہے جس نے ان کی بیشتر غزلوں کو اب تک ذکر و فکر سے قریب تر رکھا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جو بات محل نظر

بن جاتی ہے وہ ان کے لہجے کی وہ یکسانیت ہے جس نے ان کی بیشتر غزلوں کو شروع سے اب تک ایک خاص موڑ سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اور یہی ہمارا ذہن ان کی غزلوں میں اس لہجے کو ہی دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے جس کی ابتدا انھوں نے اکائی میں کی تھی۔

اب بھی ہمارے ذہنوں میں یہ توقع تازہ ہے کہ بشیر بدر علامت سازی کے تہذیبی و شعوری حسن کا ایک موثر ذریعہ بنائے رکھیں گے۔ اس لیے کہ ان کے فکری انداز میں لہجے کی یکسانیت کو تبدیل کر کے ایک نیا جہت کی تعمیر کرنے کی بے پناہ قوت ہے جس نے انھیں اردو فکر کا شاعر بنا کر شعری حیثیت سے بیشتر قریب رکھا ہے۔

بشیر بدر ایک

جدید غزل کو جو خوبصورت اظہار بشیر بدر نے دیا ہے وہ اب تک کسی شاعر نے نہیں دیا ہے۔ غزل کے اس دور کو بڑی آسانی سے بشیر بدر کا عہد کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر چندر ترکھا

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

بشیر بدر

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سایے ہوئے
وہ تو کہیے انھیں کچھ ہنسی آ گئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

(۱۹۵۵ء)

بشیر بدر

جدید غزل کی الف اور ب

صلاح الدین پرویز

فنون کے جدید غزل نمبر میں بشیر بدر کی تاریخ پیدائش ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء درج ہے اور ان کی غزلیں ۵۶ء میں "سویرا" (لاہور) "نیا دور" (کراچی) اور دیگر ادبی پرچوں میں اس طرح شائع ہوئیں کہ جلد ہی ادبی حلقے ان سے واقف ہو گئے گویا کہ بیس اکیس سال کی عمر میں ایک نئے غزل گو کی حیثیت سے وہ ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اب نومبر ۶۹ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "اکائی"[1] شائع ہوا ہے اس مجموعے میں تقریباً نوے غزلیں ہیں اور غالباً یہ ۵۶ء سے ۶۹ء تک کی غزلوں کا انتخاب ہے یہ عرصہ اردو ادب کی تاریخ میں خاصہ ہنگامہ خیز ہے اس لحاظ سے کہ مقصدی ادب کی گرفت ادیب اور شاعر پر اتنی سخت نہیں رہی تھی کہ لکھنے والا ماحول کے جبر میں انفرادی طور پر کچھ سوچ ہی نہ ہو سکے۔ اگرچہ ان دنوں بھی مقصدی ادب (ترقی پسند ادب) کی گرفت اتنی ڈھیلی ہی تھی جتنی کہ آج ہے، تاہم وہ شدت اور جبر بھی نہ رہا تھا جو ترقی پسندی کے عروج کے وقت تھا۔ مثال کے طور پر ایک زمانہ تھا کہ اُردو کا کوئی نقاد اس وقت تک خود اپنا اعتبار نہیں قائم کرا سکتا تھا جب تک وہ ادب کی اُس افادیت اور مقصدیت کا اعتراف نہ کر لے۔ جو ادب کو کسی نظریہ یا مقصد کا آلہ کار بناتی ہیں "شاہراہ" اور "نیا ادب" خالص مارکسی ادب کے نمائندہ پرچے تھے اور ان میں چھپنے کا ہر نوجوان شاعر آرزومند ہوتا تھا اور ظاہر ہے کہ اسے بغیر ترقی پسند ہونے کے کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔

خود "سویرا" پہلے ترقی پسند ادب کا پرچہ تھا لیکن جن شماروں میں "سویرا" نے بشیر بدر[2]، محبوب خزاں خلیل حشمی اور ظفر اقبال کو متعارف کرایا اس وقت اس کی پالیسی ترقی پسندی کے تابع نہیں تھی اگرچہ کچھ بعد کے شماروں تک مثلاً "سویرا" [illegible] میں ساحر لدھیانوی کی نظم بھی شائع ہوئی تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب انفرادی طور پر سوچنے والے اور ادب میں مقصد کے بجائے ادب کو اولیت دینے والے ادیبوں کے لیے وہ مشکلات نہیں تھیں اور ایسا اندازہ اس دور کے نمائندہ ترین پرچوں سے ہوتا تھا۔

۱۔ اکائی ۲۔ بشیر بدر

مثلاً 'نقوش' (لاہور) 'نیا دور' (کراچی) وغیرہ جن میں انفرادی طور پر سوچنے والے ادیبوں کے لیے اب نسبتاً
آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں اگرچہ ابھی تک انہیں نقادوں کا سکہ چل رہا تھا جن کی تنقید مارکسی تنقید تھی اور انہیں
شاعروں کا ذکر نمایاں طور پر کرتے تھے جو مارکسسٹ تھے مثال کے طور پر اسی زمانے کے 'نقوش' میں
ڈاکٹر محمد حسن کے ایک مضمون میں ترقی پسند شاعر راہی معصوم رضا کا ذکر نمایاں طور پر تھا اور شہریار، بشیر بدر
اور سلیم احمد کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ بات اس لیے بھی اہم ہے کہ اس وقت پرانے ترقی پسند دونوں قسم کے
شاعروں سے کہیں زیادہ یہ نوجوان شعراء چھپ رہے تھے 'سویرا' 'نیا دور' کا خاص انداز یہ رہا ہے کہ وہ چند
ہی شاعر چھاپتے تھے لیکن ان کی پانچ چھ نظمیں غزلیں ایک ہی شمارے میں ہوتی تھیں اور بس ان ہی لوگوں
کی ہوتی تھیں جن کو وہ اہم سمجھتے تھے مثلاً ناصر کاظمی، منیر نیازی، احمد مشتاق، بشیر بدر، شہریار، ظفر اقبال
اور محبوب خزاں وغیرہ۔

۱۹۶۲ء تک ان چند ناموں کے علاوہ غزل میں کوئی ایسا نام نمایاں طور پر نظر نہیں آتا جو اس دور
میں بھی نمایاں رہا ہو اور آج بھی نمایاں ہو آج بھی جدید اور مقبول شاعری کی جو کھیپ ہندوستان اور
پاکستان میں خاصی طویل ہے مثلاً محمد علوی، عادل منصوری، ساقی فاروقی، اطہر نفیس وغیرہ یہ لوگ ۶۲ء سے
نمایاں ہونا شروع ہوئے ہیں۔

محمد علوی اور عادل منصوری نے ۶۲ء تک 'تخلیق' (دہلی) میں جو غزلیں چھپوائیں وہ یکسر روائتی اور
فرسودہ تھیں لیکن جلد ہی ان کے یہاں ایک تیز اور متوجہ کرنے والی جدید تبدیلی کا احساس ہوا اور وہ بہت
تیزی سے اپنی آواز بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس طرح یہ بات رسائل کے مطالعے سے ہی ثابت ہو سکتی ہے کہ کم از کم ہندوستان میں جدید غزل کو
رائج کرنے میں بشیر بدر کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ یہاں اس کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ناصر کاظمی،
منیر نیازی، مجید امجد اور خلیل الرحمان اعظمی وغیرہ بشیر بدر سے پہلے ہی نمایاں طور پر اپنا مقام بنا چکے تھے۔

ادب میں جب تبدیلی آتی ہے خواہ وہ کسی تحریک کی صورت ہو یا کسی لے کی صورت تو اس میں
کچھ تخلیقی فنکار ہوتے ہیں جو صرف کار تخلیق کرتے ہیں اور کچھ تخلیق کے ساتھ تحریک پانے کی تنظیم کرتے ہیں اور کچھ
ایسے ہوتے ہیں جو تخلیقی طور پر تو بہت کمزور ہوتے ہیں لیکن تحریک پانے کی تنظیم میں بڑے سرگرم مجاہد ہوتے
ہیں۔ اسی لیے کبھی کبھی ایسے لوگ تخلیقی فنکاروں سے چند دنوں کے لیے زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں مثال کے
طور پر بشیر بدر صرف غزل کہتے ہیں تیرہ سال وہ نمائندہ ترین رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین
سے لے کر شمس الرحمان فاروقی تک ہر مکتبہ فکر کے نقادوں نے انہیں نظر انداز نہیں کیا ہے گویا کہ ان کی شہرت

ایک لہر کی طرح ہے جو مسلسل ہے لیکن اس میں کوئی سمندری ہنگامہ نہیں، لیکن کچھ تبلیغی فنکار ایک آدھ بحث کی طفیل بہت بلد مشہور ہوئے۔

اشارہ یہ کرنا چاہتا ہوں کہ تبلیغی اہمیت ایک دوسری چیز ہے اور تخلیقی شہرت دوسری چیز۔ بشیر بدر اول تو غزل کہتے ہیں۔ دوسرے ایسا لگتا ہے کہ تخلیقی عمل کے علاوہ انہیں تنظیمی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اکائی پر جو پیش لفظ انہوں نے لکھا ہے (میں سارٹیفکیٹ کس سے لکھواؤں اور کیوں ؟) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے تخلیقی عمل پر اس درجہ بھروسہ ہے کہ وہ تنقید کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا اس طرح عام قاری کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ شاعر کو اپنے طور پر سمجھے اس لیے کہ شاعر تنقید سے ساز باز کر کے اپنی تشریح نہیں کرانا چاہتا۔

اس تمام تاریخی پس منظر سے یہ بات واضح کرنا مقصود تھا کہ بشیر بدر ہندوستان میں جدید غزل کے معماروں میں ہیں اور وہ مسلسل خاموش تخلیق کے بھروسے پر اپنی جگہ بناتے رہے ہیں ان کی غزل میں بڑی شاعری کی امیج ملتی ہے عام طور پر دو غزل کے شاعر جلد ہی متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو ایک ہی طرح کے شعر کہہ سکتے ہیں جیسے رات، چاند، لڑکی ... یا اور موسم کی مخصوص منظر نگاری ناصر شہزاد کے یہاں بھی ہے۔ مزاح، شوخی شہرت اور رعایت لفظی محمد علوی کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن اسلوب کی قتیل غزلیہ شاعری میں عیب یہ ہے کہ چند غزلوں کے بعد شاعر اپنے آپ کو دہرانے لگتا ہے اور وہ اپنے اسلوب کا خود شہید ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بشیر بدر کے یہاں تنوع، وسعت، رنگا رنگی ہے اور شاعر اپنے اسلوب میں اپنی پوری زندگی سمیٹنا چاہتا ہے۔ اس نے مختلف روشنیاں اور سائے، گہرائی اور ہلکا پن، شوخی، سنجیدگی، معاملاتِ حسن و عشق افکار دنیا کے تکراؤ سے جو مختلف اور قائم ہیں مختلف احساسات اور کیفیات پیدا ہوتی ان کے سینکڑوں روپ بشیر بدر کی غزلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً ان اشعار کی فضا اور احساسات اداسی غم اور یادوں کی غماز ہیں۔

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

میری آنکھوں کے تارے اب نہ دیکھ پاؤ گے
رات کے مسافر تھے کھو گئے اجالوں میں

شام آئی تھی اپنے ساتھ لیے تیری یادوں کے جلتے بجھتے دیئے
شام کیا اب تو ساری ساری رات آگ میں روشنی نہیں ہوتی

سناٹے کے شانوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموش بذات خود ایک آواز کا صحرا ہے

میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں
ورنہ ان پتھروں میں آب کہاں

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گزر گئے
جنہیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

بشیر بدر نئی امیجری اور پیکر کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں احساسات کے پیکر ہی ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شروع کی سات غزلیں جو ایک ہی طویل بحر میں ہیں جدید غزل کی متحرک تصاویر اور نئے نئے تلازمے پیش کرتی ہیں ان غزلوں میں نئی نظم کا سارا کام ہے اور یہ غزل میں ایک نیا اضافہ ہے ؎

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موج رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

برف سی اجلی پوشاک پہنے ہوئے پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہیں
وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں۔ آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

اونچے گرجا گھروں میں گھرے نوجواں راہبوں کے دلوں میں دبی خواہشیں
جیسے بیروت کی ساحلی ریت پر دھوپ کھاتی ہوئی لڑکیوں کے بدن

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہئے انہیں کچھ ہنسی آ گئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

اس مختصر مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بشیر بدر کا اپنا ایک خوبصورت سا لہجہ ہے جس میں پوری زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ صرف غم یا صرف خوشی یا کسی نظریئے میں خود کو مقید کرنے کے بجائے زندگی کی رنگا رنگی اور تہہ داری کو مخصوص تجزیاتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل میں ان کی آواز آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ اور ان کے ہم عصر لکھنے والے ان سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً کتاب میں ان کا جب یہ شعر شائع ہوا ؎

دیکھ کر پھولوں کے صفحات پہ شبنم کچھ لوگ میرا اشکوں بھرا مکتوب سمجھتے ہوں گے

اسی رسالے "کتاب" میں چند ماہ کے بعد خورشید احمد جامی مرحوم کا شعر شائع ہوا ؎

اک شاعر بدنام نے کیا خوب کہا ہے اشکوں کو ترے پیار کا مکتوب کہا ہے

دراصل یہ شعر کوئی سرقہ یا توارد نہیں بلکہ ایک اچھے شاعر کا دوسرے اچھے شاعر کے شعر کی ایک طرح سے داد دینا ہے۔

اسی طرح وہ غزلیں جن کے یہ اشعار ہیں ان کا نئے ذہنوں پر تخلیقی طور پر اثر ہوا اور انہوں نے ان سلسلوں کو آگے بڑھایا (مثالیں جان بوجھ کر نہیں دی جا رہی ہیں) ؎

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے
عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

آنکھیں پلکوں سے یہ پوچھتی ہیں قید کب تک رہیں گے ہم بابا

اس مختصر مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بشیر بدر جدید غزل کے اہم شاعر ہیں جن کا اثر ان کے معاصرین قبول کرتے ہیں۔ "اکائی" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے اور خالص جدید غزل کا ایسا مجموعہ ہے جس میں نئی غزل کے امکانات پائے جاتے ہیں۔

///////////////////

وہاب اشرفی

بدر کے پاس دردمند اور حساس دل ہے اور ان کے پاس ایک سوچنے والا دماغ بھی ہے۔ یہ اپنے عصری میلانات سے آگاہ ہیں۔ روایت کے خزانے پر ان کی نظر ہے۔ بہتر شعر میں حسن پیدا کرنے کے لیے جس فنی اسرار اور رموز سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے واقف ہیں۔

///////////////////

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری لوگ تجھ کو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

بشیر بدر

اک پل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا

بشیر بدر

بشیر بدر کی غزل

فیاض رفعت

بشیر بدر کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کی ترتیب و تنظیم میں ایلسوپ (ALLSOP) کی اینگری ڈکیڈ (ANGRY DECADE) سے کوئی استفادہ نہیں کیا گیا اور نہ ہی تو نیتھ سنچری ویو (20TH CENTURY VIEW) کو بنیاد بنا کر مفروضوں اور اندیشوں کی دنیائیں آباد کی گئی ہیں۔ برٹش کاونسل لائبریری کا بھی خادم نہیں ہے جہاں انگریزی کتابوں کی فہرستوں اور ان کے اشاریوں سے استفادہ کر کے نوٹس بنائے اور بچے نقادوں کی ٹیڑھی صفوں میں آگے پیچھے شامل ہو جاتے ہیں — یہ ایک سیدھا سادہ مطالعہ ہے۔ اس مطالعے میں بشیر بدر کی شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ قطعی طور پر مکمل نہیں اس لیے کہ ادب و شاعری میں قطعیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ حوالوں میں کہیں کہیں کلینتھ بروکس CLEANETH BROOKS اور آئی۔ اے۔ رچرڈس (I.A. RECHARDS) کا نام آ گیا ہے تو چونکیے نہیں کہ ادھ کچرے نقاد ان کی تنقیدوں کے معترف نہیں اور جدیدیت اور نوجدیدیت کے شوق میں انہیں خارج از بحث قرار دے چکے ہیں۔ آیئے اب بشیر بدر کی شاعری کا کچھ ذکر ہو جائے۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

مظہر جان جاناں نے یہ کس CONTEXT میں کہا تھا یہ جاننا اور پتہ لگانا کسی نقاد محقق کا کام ہے۔ میں تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ ذہن میں اس شعر کے آتے ہی بشیر بدر کا چہرہ ابھرنے لگتا ہے۔

اس سرزمین پر جہاں شاعروں کی بھرمار ہے۔ بشیر بدر کا دم غنیمت ہے۔ علی گڑھ میں بشیر بدر سے میری ملاقات کب ہوئی، مجھے یاد نہیں، مگر رسالوں میں ان کا نام بہت پہلے پڑھا تھا اور انہیں جان گیا تھا شاید ۵۶، ۵۷ میں ان کی غزلیں خوب چھپنے چھپانے لگی تھیں ان دنوں مجھے ناصر کاظمی اور خلیل الرحمن اعظمی کی غزلوں سے بے حد لگاؤ تھا دھیرے دھیرے بشیر بدر کی بھی امیج بنتی گئی۔ موجود دور میں، میں جذبی کو غزل کا امام مانتا ہوں، ان کے بعد فیض، مجروح اور فراق کو محترم سمجھتا ہوں ان کے بعد غزل کے قافلے میں

بشیر بدر، زبیر رضوی، شہریار، راج نرائن راز، کمار پاشی، منور سعید، کمل کرشن اشک اور محمد علوی شامل ہیں۔ غزل کے اچھے مزاج داں بشیر بدر ہیں۔ اس لیے کہ شعر و شاعری نہ تو پتنگ بازی کا فن ہے اور نہ نٹوں کی طرح رسی پر چلنے کا۔ شاعری کو چیستاں بھی نہیں ہونا چاہیے۔

شاعری میں مزاحیت پسندی اور مجہولیت کے رجحانات کو بھی فروغ نہیں دینا چاہیے۔ شاعری کو محض ذات کے خانوں میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ صرف فرد کے نفسیاتی کے اظہار کا نام بھی شاعری نہیں۔ شاعری کبھی نئی پرانی نہیں ہوتی۔ شاعری اچھی، بری ہو سکتی ہے اور اچھی شاعری بے معنی نہیں ہوتی۔ غالب کا کہا آج بھی حق ہے کہ شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں۔ اور شاعری میں غزل کی برتری سے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ غزل بات کی تہذیب و رفعت کا نام ہے۔ غزل محض ایک صنف سخن کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مخصوص ذہنی رویہ ہے کہ نماز بھی ہے ورنہ مشاہدہ حق کی گفتگو کو بادہ و ساغر کی اصطلاحات میں پیش کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اگر شاعری کا تعلق [illegible] نگہ معنی کی تلاش بھی غزل میں کی جا سکتی ہے۔

بشیر بدر بہت پیارے غزل گو ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ حسرت، فانی، جگر جیسی غزلیں نہیں کہہ سکے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ جذبی، مجروح، سرور اور خمار کی طرح قادر الکلام شاعر بھی نہیں ہیں مگر ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ روایت سے ان کا رشتہ مضبوط ہے اور عصری تقاضوں کا انہیں احساس ہے۔ اس کے ساتھ تہذیبی تبدیلیوں پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ دل تھی اور نگینے جیسے شعر کہہ رہے ہیں اور اگر اسی طرح ریاضت سے کام لیتے رہے تو اپنی منزل پالیں گے۔ میرے نزدیک ان کے یہاں اظہار سے مراد محض انداز بیان نہیں بلکہ طرز احساس انتخاب موضوع، انداز نظر اور انتخاب الفاظ وغیرہ ہے۔ گوئٹے کے نزدیک بھی آرٹ کا اعلیٰ ترین مقصد بیان کی انفرادیت قائم کرنا ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے۔

INDIDUALITY OF EXPRESSION IS THE BEGINNING AND END OF ALL ART

مثلاً بشیر بدر کے یہ اشعار۔

سجھائی کچھ نہیں دیتا شکستہ یادوں نے — کسی کا چہرہ، کسی کے بدن میں جوڑ دیا

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا — ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

دل کی بستی بھی شہر دلی ہے — جو بھی گذرا ہے اس نے لوٹا ہے

روشنی کے مقدر میں نیندیں کہاں، چاند میں طاق پر وہ سجائیں کہیں

ہم چراغِ وفا ہیں جلنا ہے رات بھر آسمان ستارے ہیں وہ جلائیں کہیں

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں
آج دو دریا کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

پہلے مضمونوں کے نوٹس، اور ترتے، اجلے شوکیس میں سج گئے، ٹھیک ہے۔
کیوں دکاندار رکھے کتاب ادب جب اسے کوئی اب پوچھتا تک نہیں

تیرے لب کی مہک، میرے بازو کا بل، تیری آنکھوں کا رس، میرے ہاتھوں کا جس
سالہا سال سے جنس بازار ہے صاحب نقد بولی لگاتے رہے۔

پتھروں کی زمین، پتھروں کے شجر، پتھروں کے مکاں، پتھروں کے بستر
کب سویرا ہوا ہم کدھر کو چلے، کس گلی شام آئی، کہاں سو گئے

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

سسکتے آب میں کس کی صدا ہے کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے
سمیٹو اور سینے میں چھپا لو یہ سناٹا بہت پھیلا ہوا ہے
چھوٹی سی ہتھیلی کو دکھا کر اک سوداگر نے یہ کہا سیدھا شاعر مل جائیں گے اتنے کم دیناروں میں

بشیر بدر کے ان شعروں میں انفرادیت ہے اور بے پناہ صداقت بھی بلا شبہ انہوں نے الفاظ کے رنگوں سے دلنشیں نگار خانے سجائے ہیں ان کے شعروں میں خلوص غم کی شدت ہے جسے میں شدت احساس (INTENSITY OF FEELINGS) سے تعبیر کرتا ہوں مثلاً ان کا یہ شعر ہے۔

شام آتی تھی اپنے ساتھ لیے تیری یادوں کے جلتے بجھتے دیئے
شام کیا اب تو ساری ساری رات آگ میں روشنی نہیں ہوتی

اب ہر طرف دھواں ہے سلگتی حیات کا باتوں میں رس نہیں رہا، ہاتھوں کے جس گئے

امیجری اور طنز و تضاد شاعری کی بنیاد ہیں۔ کلینتھ بروکس نے اپنے ایک مضمون THE LANGUAGE OF PARADOX میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ تضاد کی زبان شاعری کے لیے ناگزیر ہے۔

شاعر جس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہے وہ اکثر تضاد کی زبان ہی میں ممکن ہے۔ نئی نسل میں ایلیٹ بھی ادبی مواد کی تنظیم اور امیجری پر خاص زور دیتا ہے۔ عبد الرحمٰن بجنوری بھی تشبیہ و استعارے کے معنی آفرینی اور حسن آفرینی کے قائل ہیں۔ نہ صرف امیجری کے اعتبار سے بشیر بدر کے شعر خوبصورت ہیں بلکہ طنز و تضاد کی زبان کو بھی انہوں نے تابانی بخشی ہے۔

عقل کی سنگری آہنی آنچیں جیسے بکھر گئیں خوشبوؤں کی دوکاں
دل کے بازار میں خاک اڑنے لگی عطر کے یادوں کے سوداگراں سو گئے

جنس دل پہلے بھی کیا گراں مایہ تھی اور اب اس ترقی معکوس میں
سنگریزوں کے تاجر ہے دور میں آئینہ ساز و شیشہ گراں ہو گئے

سونا دن باتوں میں ... سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے ... شہر کے غزالوں میں

بشیر بدر کے یہاں خیام کی لذت پرستی نہیں بلکہ لذت آزار ہے اور وہ اس لذت آزار سے محظوظ ہونا جانتے ہیں۔

گاہ پانی، گاہ شبنم اور کبھی خوں ناب سے — ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا
اب تو انگاروں کے لب چوم کے سو جائیں گے — ہم وہ پیاسے ہیں جو دریاؤں کو ترسائیں گے
رونے والوں نے اٹھا رکھا تھا گھر سر پر مگر — عمر بھر کا جاگنے والا پڑا سوتا رہا
شاید مرے آنسو سے اس کا کوئی رشتہ ہے — تپتے ہوئے صحراؤں میں جو پھول اکیلا ہے

حالانکہ بشیر بدر نے کلاسیکی روایت کا ساتھ چھوڑا مگر اس کے ساتھ ہی ان کی شاعری میں بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں کے زوال کا پتہ بھی ملتا ہے۔ شہری زندگی کے بے پناہ ہنگاموں کی وجہ سے فرد کی یہاں جو تشنگی احساس ہے شدت انتشار اور خوف و ہراس پیدا ہو چکے۔ شاعر کے ذہن و دل پر ان کا گہرا اثر ہے جس کا اظہار بے ساختہ اور برملا ہوا ہے۔

چاند سورج کے تن جانے سے کچھ کمی زیادتی نہیں ہوتی
شہر میں دن کے وہ علاقے ہیں جن میں اب رات ہی نہیں ہوتی

اب روئے کہاں ساون اب تڑپے کہاں بادل — آنگن نہ بغیچہ ہے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے

دماغ بھی کوئی مصروف چھاپہ خانہ ہے
وہ شور جیسے کہ اخبار چھپتا رہتا ہے

نئے بستر بنے جس میں لپٹ جاتے ہیں ہم
اک سفر کے بعد پھر کھلتے ہیں آدھی رات کو

کبھی کبھی تو یوں لگا کہ ہم سب مشینیں ہیں
تمام شہر میں نہ کوئی زن، نہ کوئی مرد ہے

بارشیں رات چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان گھروں کے اندر برسے

شہر نگار، میری ناظرا داس مت ہو
اب زوال بھی ہے گھر، خوشبو بھی بے وطن ہے

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

گلیاں گھیرے ہیں میدان چپ ہیں اور وہ دیوانہ بھی نہیں
مٹی کا دل بیٹھ گیا ہے کس کی آج اٹھی ہے مٹی

مرا گھبرا مٹی کا مادھو جا دیوانی راہ سے اپنی
تو سونے چاندی کی مورت خود کو کیوں کرتی ہے مٹی

بزم میں ہاں رہ جاتا تھا
دل اکیلا تھا، اکیلا ٹھہرا

چاند آنکھوں کی دعا لے لو
آنسوؤ آج رات بھر چمکو

کوئی بیمار کے قریب رہو
شام ہی سے چراغ سوئے ہیں

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا، بہتا ہوا پانی ہے

ہمارا دل سویرے کا سنہرا جام ہو جائے
چراغوں کی طرح آنکھیں جلیں جب شام ہو جائے

بعض اعتبار سے میں بشیر بدر سے اتفاق نہیں کرتا۔ ان کی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو میرے لیے خاصی اجنبیت لیے ہوئے ہے مثلاً

سانپ کے بوسے میں کیا پیار تھا کہ فاختہ ہم
پھڑپھڑا کر اک صدا لیے آسمانی ہو گئی

جیسے جیسے عمر بھیگی سادہ پوشاکی گئی
سوٹ پیلا، شرٹ نیلی، جانی دھانی ہو گئی

شیشے کی سلائی میں کالے بھوت کا چڑھنا
بام کا ٹھ کا گھوڑا، نیم۔ کانچ کی گولی

وہ نہیں ملی ہم کو بک بٹن، سرکتی جین
زپ کے دانت کھلتے ہی آنکھ سے گری چولی

شعری خیال مکمل ابلاغ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے مگر شاعر کو ارادی ابہام سے گریز کرنا چاہیے۔ مشہور نقاد و فلسفی T. E. HULME نے بھی ارادی ابہام کی مذمت کی ہے اور اسے غیر فنی قرار دیا ہے ——— اور زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں، بشیر بدر سمجھ دار آدمی ہیں۔

مجموعی طور پر بشیر بدر کی شاعری زندگی کی قوس قزح کی اکائی ہے۔ جس میں انسانی کیفیات اور احساسات کے رنگ جھلملاتے ہیں۔ ان کے شعروں میں جو غنائیہ نظم و ضبط ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے آہنگ سے پوری طرح واقف ہیں۔ یہی نہیں بشیر بدر تخیل کی قوت سے اور لفظ و معنی کے

ایجاز و اختصار سے وہ کام لیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اور اس کے یہاں ایک ایسی طرب انگیز تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ شعر کی رنگین وادیوں میں کھوتا چلا جاتا ہے اور ان رنگین وادیوں سے جب وہ ڈوب کر ابھرتا ہے تو اس کے سامنے ایک گہری اور ہمہ گیر معنویت کے چراغ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ندا فاضلی

بشیر بدر کی آواز دور سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے

اب تو تنہائیاں بھی پوچھتی ہیں
قید کب تک رہیں گے ہم بابا
چاند اکثر اداس رہتا ہے
اس کو آخر ہے کس کا غم بابا

بابا ردیف میں اردو کی پہلی غزل - ۱۹۵۶ء

بشیر بدر

ان اونچے شہروں میں پیدل حرف دیہاتی ہی چلتے ہیں
ہم کو بازاروں سے اک دن، کاندھے پر لے جانا بابا

بابا ردیف میں میری دوسری غزل — ۱۹۷۰ء

بشیر بدر

بشیر بدر ایک مطالعہ

شریف ارشد

بشیر بدر کی شاعری میں فن کی دونوں سہیلیاں SENSE اور SENSIBILITY برسوں کی قیامت خیز افتراق کے بعد مصافحہ معانقہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تنقید کی زبان میں ہم یہ کہیں گے کہ ان کے یہاں SENSIBILITY یونیفائیڈ ہو گئی ہے۔ بقول ایلیٹ انگریزی شاعری میں سترہویں صدی سے زوال شروع ہوا وہ اس زوال کی وجہ DISCIATION, OF SENSIBILITY (فقدانِ توازن) بتائے ہیں ان کے خیال میں DONNE کی شاعری SENSIBILITY کا نقطۂ عروج ہے۔ ڈون اور اس کے ہمعصروں کی شاعری میں تعقل اور جذبہ کا توازن اور فکر و احساس کی آمیزش ہے لیکن بعد کی صدیوں میں یہ عناصر LOPE SIDED ہو گئے۔ اور نتیجتاً شاعری رفتہ رفتہ بے جان، بے اثر اور خالص تعقلی ہو کر رہ گئی۔ خیال کی حسی گرفت رفتہ رفتہ ڈھیلی پڑتی گئی اور حسن معنی کی فاختائیں ہاتھوں سے نکل کر فضا میں پرواز کر گئیں ایلیٹ کی تمام تر تنقیدی صلاحیتیں خیالی اور جذبہ کے درمیان کے اسی شگاف کو پُر کرنے پر صرف ہوئی ہیں اور خود ان کی شاعری مرثیہ ہے ان کے اپنے عہد کے اقدارِ فن اور اقدارِ حیات کا وہ انگریزی شاعری میں META PHYSICAL RETURN ہیں۔

اُردو ادب میں جذبہ و تعقل کے درمیان یہ شگاف ۱۹۶۰ء کے بعد میں یہ احساس بہت تیز ہو گیا ہے۔ شاعری ECONOMIC STATISTICS اور LAB-REPORT کی طرح بے جان ہو کر رہ گئی ہے عقل کے خرابے میں احساس کا داخلہ ممنوع ہی نہیں بلکہ شجر ممنوعہ ہے آج کے فنکار کے لیے۔ لیکن بشیر بدر کی غزلیں تعقل و جذبہ کی بہترین آمیزہ ہیں۔ غزل کی حد تک اُردو شاعری میں SENSE یونیفائیڈ ہو گئی ہے۔ ان کے مجموعے "اکائی" اور "امیج" یونیفائیڈ SENSE پیش کرتے ہیں ؎

سمندر بوڑھے ہو جائیں گے اور اک فاختہ مچھلی
ہمارے جنگلوں اور ساحلوں کی حکمراں ہوگی

سسکتے آب میں کس کی صدا ہے
کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے

پھول سی قبر سے اکثر یہ صدا آتی ہے
کوئی کہتا ہے بچا لو میں ابھی زندہ ہوں

کبھی سرخ مومی شمعیں وہاں پھر سے جل سکیں گی
وہ لکھوری اینٹوں والا جو بڑا سا اک مکاں ہے

صدا کی دھوپ نہ چمکے تو گھر اجڑ جائے — وشال مندروں میں گھنٹیوں سے عظمت ہے

جانے کب ڈونگوں میں مہکیں گے تارے — کتنے سورج ہاتھ دھلا کر چلے گئے

وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لیے — بڑھا کے نیزہ زمین سے اٹھا لیا مجھ کو

اک پل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے — پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا

یہ لکڑیاں جو خشک ہیں بے برگ و بار ہیں — ان کو میں اپنی آگ میں جلنا سکھاؤں گا

بشیر بدر کی شاعری میں وجودیت کے نمایاں اثرات ہیں۔ انسان اور انسانی مسائل ان کے شعری تجربات کے مراکز ہیں ان مسائل کی طرف ان کا ذہنی رویہ اور اسلوب نگارش وجودی ہے۔ وہ انتہائی بیباکی اور جرأت ابراہیمی سے عہد حاضر کے سیاسی و سماجی بتوں کو منہدم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ بحیثیت انسان کے انسان میں دلچسپی لینا فرض ہے۔ وجود اگر وجود کے کرب اور دکھوں سے ہمدردی نہیں رکھتا تو پھر وجود کی معنویت کیا رہ جاتی ہے۔ وہی نتیجہ ہوا۔ انسان اور انسان کے مسائل میں دلچسپی لینے کے بھی کئی انداز ہیں۔ ذرا بچ بچ کر ذرا ہٹ ہٹ کر مصلحتوں کی نقاب اوڑھ کر اور بھی ہیں جو انسانی مسائل سے نبرد آزما ہیں لیکن وجودیت پسند ادیب اور شاعر اس منزل تک پہونچنے کے لیے موت سے ڈرتے نہیں بلکہ وہ اس خطرہ کو پل بنا کر گذر جاتے ہیں۔ الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب (موت وہ پل ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے) موت کا وجودی مفکرین اسی طرح استقبال کرتے ہیں۔ بشیر جانتا ہے اس دیے کا انجام جو اکیلا رات بھر ہوا سے لڑتا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنا فرض نبھانا نہیں بھولتا اسے پتہ ہے کہ دریا "اس موج سے بے حد خفا ہے جو ساحل کے "تشنہ ریت" پہ مہرباں ہوتی ہے لیکن ان کے اندر کا ادیب دریا سے نہیں ڈرتا اس کے دل میں امید نام کی ایک شے موجود ہے۔ شہر خموشاں سے گذرتے ہوئے اگر کسی قبر سے یہ آواز آرہی ہو کہ "بچا لو میں ابھی زندہ ہوں" تو آپ کا کیا رد عمل ہوگا۔؟

میں جانتا ہوں کہ انجام کار کیا ہوگا — اکیلا دیا اگر رات بھر ہوا سے لڑے

ساحل کی تشنہ ریت پہ جو مہرباں ہوئی — دریا بھی ایسی موج کے بے حد خلاف ہے

پھول سی قبر سے اکثر یہ صدا آتی ہے — کوئی کہتا ہے بچا لو میں ابھی زندہ ہوں

مایوسی و ناکامی کی اس فضا میں رہ کر بھی بشیر اس مستقبل سے مایوس کبھی نہیں جس کا خمیرہ وہ خود گوندھ رہا ہے۔ انہیں امید ہے یقیناً دھوپ نکلے گی اور وہ اس دھوپ میں اپنے گیلے جذبے سکھا لیں گے۔ آج "شاخ یاد" پہ بیٹھے وہ اور اس کی نسل "کچے امرود" کھا رہے ہیں سہی لیکن کل یقیناً وہ دن بھی آرہے ہیں جب وہ "زرد زرد شاخوں پہ گنگنائیں گے تو زمین پر سونے کے پھول پتے گریں گے"۔

سونے کے پھول پتے گریں گے زمین پر ۔۔۔ میں زرد زرد شاخوں پہ جب گنگناؤں گا

دینار خوب برسیں گے آنگن میں ساری رات ۔۔۔ میں خواب کے شجر کی وہ شاخیں ہلاؤں گا

دیوانہ وار مجھ سے لپٹ جائے گی ہوا ۔۔۔ میں سرخ سرخ پھولوں پہ جب مسکراؤں گا

وہ جاگ کے خوشبوؤں کا بدن چوم آئیں گے ۔۔۔ رنگوں کے وہ فرشتے ہوا میں اڑاؤں گا

سبز پتے دھوپ کی یہ آگ جب پی جائیں گے ۔۔۔ اجلے فر کے کوٹ پہنے ہلکے جاڑے آئیں گے

بشیر کے یہاں "اشتراکی واقعیت" کی تجلیاں بھی ہیں۔ عظیم شخصیتوں کے افکار و نظریات سے ہر عہد میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ سارتر، مارکس اور فرائڈ ہی کے افکار و خیالات سے ہم عصر حیات کے چہرے کا غازہ تیار کیا گیا ہے۔ شرط یہ ہے کہ نظریات شعر کی نغمگی اور آہنگ و اسلوب کو مجروح نہ کریں۔ بشیر کے یہاں مارکسی نغمہ بہت سلیقے سے آئے ہیں۔ مارکس کے گہرے مطالعے نے ان سے ایسے اشعار کہلوائے ہیں۔

سویرے میری ان آنکھوں نے دیکھا ۔۔۔ خدا چاروں طرف بکھرا پڑا ہے

اس دن بجائے اوس کے چمکے گا سرخ خون ۔۔۔ تاروں کے جب میں خلاؤں میں جاؤں گا

بدن کے پیڑ کو خود اس کی شاخ کاٹے گی ۔۔۔ یہی تراش زمین کو نیا شجر دے گی

لیکن بشیر بدر کا یہ شعر ان کے فکر میں ایک "نفسیاتی گرہ" کی حیثیت رکھتا ہے ۔

حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے

سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

اس نوع کا ایک اور شعر ہے جہاں سمندر کو موجودہ "انسانی اسٹیبلشمنٹ" اور اس کے بدکردار فرماں رواؤں کو فاحشہ مچھلی کا علامتی جوڑا پہنایا گیا ہے۔ بشیر کی یہ پیش گوئی خود انہیں کی زندگی میں صحیح ثابت ہو چکی ہے۔ واقعی سمندر بوڑھے ہو چکے ہیں اور فاحشہ مچھلیاں حکومتیں چلا رہی ہیں (سمندر بوڑھے ہو جائیں گے اور اک فاحشہ مچھلی ـــ ہمارے جنگلوں اور ساحلوں کی حکمراں ہوگی) لیکن ان کا یہ فرمان کہ "حقیقت صرف "سرخ مچھلی" جانتی ہے" کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ آیئے گفتگو ذرا تفصیل سے کی جائے وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ صدیوں کا پرانا معاشرہ بوڑھے دیوتا کی طرح بالکل بے مصرف و ناقابل پرستش ہو چکا ہے۔ اب اسے نئے افکار کی روشنی میں ڈھالنے کی ضرورت ہے، لیکن یہ حقیقت سرخ مچھلی ہی جانتی ہے ایسا کیوں؟ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ موجودہ عہد کی تحلیل مارکس کا فکری اجارہ ہے اور عہد حاضر کا عرفان مارکس کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہو سکتا ہے۔ یہاں کہانیوں کا انتخاب تو انہیں رسوا کر سکتا ہے۔ حقیقتوں کا عرفان صرف

سرخ مچھلیوں کا ابار دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ آج کم و بیش بالغ نظر فرد دنیا کی تاریخی، سماجی و سیاسی حالات سے باخبر ہے اگر وہ یہ فرمائیں کہ سرخ رنگ مخصوص افراد کی انفرادیت کو واضح تر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے تو بھی بات نہیں بنتی کیونکہ سرخ تو کمیونزم کا سمبل بن چکا ہے۔ سرخ مچھلی سے یا کارل مارکس مراد ہوگا یا پھر کوئی اشتراکی مفکر۔ یہ رنگ ایسا نہیں ہے کہ صرف پردہ بصارت پر جھلملا کر رہ جائے بلکہ یہ رنگ تو پردہ ساز سماعت پہ رباب کی طرح بجتا ہے۔ بشیر نے اگر یہ کہا ہوتا کہ "سرخ مچھلی" ہی کو سماجی حقیقت کا صحیح عرفان ہے تو یہ صحیح ہو سکتا تھا، واقعی مارکس نے انسانی سوسائٹی کا سائنٹفک اور منظم مطالعہ کیا ہے۔ لیکن "مطلق حقیقت" کا عرفان وادراک تو سمندر کی تمام "بالغ نظر مچھلیوں" کو ہے اور آئندہ بھی یہ عرفان رنگوں کی اسیری قبول نہ کرے گا۔

بات جب سمندر اور مچھلیوں کی چل نکلی ہے تو زندگی کے اداس قصے میں چند لڑکیوں، مچھلیوں کا نام اور بھی۔ بشیر کے یہاں منفرد نازک کا فانوس و داخلی، جادو بہت گہرا ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایک پوری غزل ہے جہاں مصرعوں کے قد آدم آئینوں سے بیتے ہوئے لمحات اور رنگ و روغن نمایاں ہیں۔ کثیر مختلف سائز و قامت کی عورتیں، لڑکیاں کھڑی ہیں اور شعر انفرادیت، ایک خصوصیات، ذوق، دکھ درد، فوائد، ذائقہ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ نسیج کا جھرنا ہیں، یہ جھٹپٹے کی ندیاں ہیں، یہ سرد موسم کا مزاج گرم کر دیتی ہیں، کھٹی میٹھی لڑکیاں ہیں وغیرہ

یہ نسیج کا جھرنا ہمیشہ ہنسنے والی عورتیں — جھٹپٹے کی ندیاں خاموش گہری عورتیں
معتدل کر دیتی ہیں یہ سرد موسم کا مزاج — برف کے ٹیلوں پہ پڑتی دھوپ جیسی عورتیں
سبز نارنجی سنہری کھٹی میٹھی لڑکیاں — بھاری جسموں والی ٹپکے آم جیسی عورتیں
سڑکوں بازاروں مکانوں دفتروں میں رات دن — لال پیلی سبز نیلی جلتی بجھتی عورتیں
شہر میں اک باغ ہے اور باغ میں تالاب ہے — تیرتی ہیں اس میں ساتوں رنگ والی عورتیں
منجمد ہیں برف میں کچھ آگ کے پیکر ابھی — مقبروں کی چادریں ہیں پھول جیسی عورتیں
ان کے اندر پک رہا ہے وقت کا آتش فشاں — کن پہاڑوں کو ڈھکے ہیں برف جیسی عورتیں
فاختائیں تتلیاں مچھلی گلہری بلیاں — زندگی میں آئیں اپنی کیسی کیسی عورتیں

مچھلی بھی بشیر کے یہاں عورت کا ایک سمبل ہے۔ اس سمبل سازی کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ چھ فٹ کی ایک عورت کو ہاتھ میں لے کر اس کے وجود اجزاء مرکبہ کی نفسیاتی و جنسی تحلیل ذرا مشکل تھا پھر مچھلی بے زبان بھی ہے اور بے لباس بھی۔ پھر عورت کے وجود میں جو ایک طرح کی جنسی پھسلن ہے مچھلی اس سے بھی متصف ہے۔ مزید براں ایسی کئی خوبیاں ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ یہ خوبیاں اشعار کے سمندر ہی میں

اپنا بھرپور جلوہ دکھاتی ہیں۔

تھرکتی مچھلی نکل کر سرکتے کپڑوں سے — تمام رات کو اب بے لباس کر دے گی

پتھر جیسی مچھلی کے کولہے چکنے — گنگا جل میں آگ لگا کر چلی گئی

شعلوں کے کپڑے مچھلی نے پھینک دئے — مرخ شیڈ میں زہر کا جسم دمکتا ہے

ساحل پہ مچھلی نے کپڑے اتارے — چڑھتے ہوئے دریا کی دھار کہے ہائے

ناف میں پھول ران پر مچھلی — تتلیاں سو رہی ہیں گالوں پر

مچھلیاں چل رہی ہیں پنجوں پر — جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے

ذیل کے شعر میں مچھلی اور اسکوٹر لڑکیوں کے سنبل ہیں، گھوڑے اور کاریں لڑکوں کے ۔

مچھلیاں اڑتی ہیں کاروں پر — گھوڑے اسکوٹروں کے دیوانے

رات سے بھی انہوں نے عورت کو SYMBOLISE کیا ہے

رات بالکل برہنہ لیٹی ہے — بکھرے ہیں چاند تاروں کے دانے

آم کے باغوں میں جایئے تو مختلف رنگ، سائز اور ذائقے کے پکے ہوئے آموں کی خوشبو سے مشامِ جان معطر ہو جائے گا، ہر آم جیسے یہ کہہ رہا ہو کہ مجھے کھایئے۔ سمندروں میں مچھلیاں ہیں تو یونیورسٹیوں میں لڑکیاں، پکے آموں کی چیختی ہوئی خوشبوئیں۔ بشیر یا کسی بھی شاعر کا ٹیکنیکل وجود کچھ بھی ہو سکتا ہے، وہ ریسرچ اسکالر ہو، لکچرار ہو، کلرک ہو، لائبریرین ہو، ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہو، ڈین ہو، لیکن اس کا حقیقی وجود ایک ہی ہے۔ اس نے بھی آرٹس فیکلٹی، سائنس فیکلٹی، کینیڈی ہال، مولانا آزاد لائبریری، کامن روم، سمینار لائبریری میں بے شمار ایسی مچھلیوں کو اپنے پنجوں پہ چلتے ہوئے دیکھا ہے جن کے چہرے لڑکیوں جیسے ہیں ان سے گفتگو کی ہے، ان کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ کبھی کبھی نیلا سفید کوٹ زمین پر بچھا دیا ہے اور دونوں دور آسمانوں میں کھو گئے ہیں۔ اور کبھی یوں بھی ہوا ہے۔

تب نیچے زرد گھاس کے بستر پہ سو گیا — وہ اپنی سرخ کار کے اوپر چلی گئی

بشیر نے ان اشعار میں اپنے وجود کے جنس زار (گل زار) کا ایک ایک پتہ ایک ایک پھول بکھیر کر رکھ دیا ہے کیونکہ وہ بہت ہی سنجیدہ متین شخصیت کے مالک ہیں ورنہ تحریر و گفتگو میں جو لوگ متین نظر آتے ہیں وہ لوگ اپنی حقیقی زندگی میں اتنے متین اور سنجیدہ نہیں ہوتے اکثر ان کے تکئے کے نیچے سے تصویر کی کتاب نکلی ہے۔ پھر SEX کا اظہار تو زندگی کا اظہار ہے۔

بشیر بدر کی آمد

معین اعجاز

اگر آپ ہندوستان میں رہتے ہیں اور اردو یا ہندی آپ کی زبان ہے تو یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آپ بشیر بدر کے اشعار سے "محفوظ" نہیں ہوں گے۔ بلا سے آپ اردو کے رسالے نہ پڑھتے ہوں (خواہ کسی مجبوری کے سبب یا اردو نہ جاننے کی وجہ سے) لیکن یہ ممکن نہیں کہ کہیں نہ کہیں آپ نے ان کے شعر نہ سنے ہوں۔ اگر مشاعروں میں نہیں جاتے ہوں گے تو کبھی نہ کبھی ریڈیو سے ضرور سنا ہوگا اور اگر ریڈیو کو آپ "آثارِ قدیمہ" میں شامل کر چکے ہیں تو ٹی۔وی تو دیکھتے ہی ہوں گے! ان کے اشعار کا "حملہ" اتنا چوکھا ہوتا ہے کہ ان کی زد میں آئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ پھر یہ اشعار تو زبانِ زدِ خاص و عام ہیں ؎

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

◆

مسافر ہیں ہم بھی مسافر ہو تم بھی　　کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

◆

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

یادش بخیر! مہاتما گاندھی نے قومی زبان کے طور پر ہندوستانی اپنانے کا مشورہ دیا تھا لیکن داد دیجیے پہلے صدر جمہوریہ آنجہانی بابو راجندر پرساد کو، جن کے ایک ووٹ

ہے "ہندوستانی" کے تصور کو رد کر دیا تھا اور جس کے نتیجہ میں ہندی کو (صرف دیوناگری رسم الخط میں) یونین کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ دستور کی پندرہ قومی زبانوں میں ہندوستانی نام کی کوئی زبان نہیں ہے لیکن عوام میں یہی زبان اب بھی مقبول ہے اور بشیر بدر اسی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ مشاعروں میں ان کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کی زبان ہی ہے۔

بشیر بدر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ انتخاب پر کافی زور دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تین دہائی سے زیادہ عرصے سے شعر کہتے رہنے کے باوجود ابھی تک ان کے صرف تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ پہلے اکائی پھر امیج اور اب "آمد" آمد میں آمد ہی آمد نظر آتی ہے۔ الحمد لائبریری ایسے متعدد شاعر دیکھے ہوں گے جن کے بیس بیس، پچیس پچیس مجموعے شائع ہوئے لیکن قاری یا سامع کو ان کا ایک شعر بھی یاد نہیں رہا۔ جو شعر لوگوں کو یاد رہ جاتے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی خوبی تو ضرور ہوتی ہوگی۔ بشیر بدر اس اعتبار سے اس دور کے ان خوش قسمت شاعروں میں ہیں جن کے شعر بہت سے لوگوں کو یاد رہتے ہیں۔

اچھے یا بڑے شاعر کی زبان کے سلسلے میں کوئی کلیہ نہیں قائم کیا جا سکتا ہے۔ تاہم آسان زبان میں شعر کہنے کا سلیقہ بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ غالب پہلے ہی مشاعروں میں بلائے جانے پر سر کے بل جاتے رہے ہوں اور گالیاں بکتے واپس آتے رہے ہوں لیکن نسبتاً مشکل زبان میں شعر کہنے والے ہر شاعر کا ضروری نہیں کہ یہی انجام ہو۔ زبان کے ساتھ ساتھ شاعری اور فنی لوازم کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ فیض احمد فیض بلاشبہ انتہائی مقبول شاعر تھے لیکن ان کی زبان اتنی آسان نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک نہیں متعدد شعرا ایسے پیش کیے جا سکتے ہیں جن کی زبان فارسی آمیز ہے۔ ترقی پسندوں میں مخدوم محی الدین کے بارے میں بھی کم و بیش یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ اب ایسے اشعار کو آپ کیا کہیں گے ؟ -

ع گُل ہیں قندیلِ حرم، گُل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے میخانہ بڑھے دستِ دعا آخر شب

(مخدوم)

قفس ہے تیز رو، سازگی سے تیز کرو
وہ سوئے میخانہ سفیران حرم آتے ہیں

(فیض)

بہرحال ان تمام باتوں کے باوجود جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ خوبصورت خیال کے ساتھ ساتھ خوبصورت (یعنی آسان) زبان استعمال کرنے میں اگر شاعر کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ اس کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ بشیر بدر اس معاملے میں ایک خوش قسمت شاعر ہیں اور ان کا نیا مجموعہ "آمد" اس اعتبار سے ان کی ایک خوبصورت پیش کش ہے۔ اس مجموعہ کے آخری شعر میں بشیر بدر نے خود ہی وضاحت کر دی ہے ؎

مصحفی، غالب کا دیوان کون پڑھتا ہے
بشیر بدر [illegible]

ویسے ان کا یہ مجموعہ بہت خوب ہے اور بڑے شوق سے پڑھا گیا۔ ادبی حلقوں میں کئی جگہ سنا تھا کہ پچھلے دونوں مجموعوں کے مقابلے میں یہ مجموعہ ہر اعتبار سے بہتر اور خوبصورت ہے۔ میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ ادب یا شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں ہر طرح کے تعصب سے دُور رہنا چاہیے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں علاقائی یا دوسری قسم کی گروہ بندیاں اچھی چیزوں سے محظوظ ہونے سے بھی محروم کر دیتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ کسی خاص گروہ سے وابستہ ہیں تو دوسرے گروہ کے اچھے سے اچھے شاعر اور اس کے شعروں کی تعریف کرتے ہوئے ڈریں گے۔ کبھی یہ صورت حال خود آپ کے متعصب ذہن کی دین ہوگی اور کبھی آپ "خیالِ خاطر احباب" ایسا کرنے پر مجبور ہوں گے ورنہ ہو سکتا ہے آپ کے حلقے کے لوگ آپ سے ناراض ہو جائیں۔

بہرحال بات بشیر بدر کی "آمد" کی ہو رہی تھی۔ آمد کے اشعار میں غم جاں، غم دوراں، غم دنیا اور غم دل! غرضیکہ ہر طرح کا غم موجود ہے۔ ایک غم یہ بھی ہے ؎

میں بولتا ہوں تو الزام ہے بغاوت کا
میں چپ رہوں تو بڑی بے بسی سی ہوتی ہے

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں   کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

دلّی ہو کہ لاہور کوئی فرق نہیں ہے
سچ بول کے ہر شہر میں ایسے ہی رہو گے

بشیر بدر کے یہاں بڑے شہروں کی ریاکاریوں اور مصنوعی زندگی کے تئیں بیزاری کا لہجہ بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے قصباتی زندگی اور وہاں کی معصومیت کو قریب سے دیکھا ہے اور اس طرف اکثر لپکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو
رُک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

بات کیا ہے کہ مشہور لوگوں کے گھر
موت کا سوگ ہوتا ہے تیوہار سا

شہر میں رہتے ہوئے ہم کو زمانہ ہو گیا
کون رہتا ہے کہاں، کچھ بھی بتا سکتے نہیں

گھر کتنے ہی چھوٹے ہوں گھنے پیڑ ملیں گے
شہروں سے الگ ہوتی ہے قصبات کی خوشبو

دل اپنا ایک چاند نگر ہے، اچھی صورت والوں کا
شہر میں آکر شاید ہم کو یہ جاگیر گنوانی ہے

وہ درودوں، وہ سلاموں کے نگر یاد آئے
نعتیں پڑھتے ہوئے قصبات کے گھر یاد آئے

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے، ذرا فاصلے سے ملا کرو

قدیم قصبوں میں کیسا سکون ہوتا ہے
تھکے تھکائے ہمارے بزرگ سوتے ہیں

بشیر بدر زندگی سے بیزار کبھی نہیں ہوئے۔ زندگی اپنی تمام تر بے رحمیوں کے باوجود حسین شے ہے۔

زندگی اور میں دو الگ تو نہیں
میں نے سب پھول کانٹے اسی سے لیے

◆

خوش رہے یا بہت اداس رہے
زندگی تیرے آس پاس رہے

اور اب اس زندگی کے کچھ تلخ حقائق پر بشیر بدر کی غزلوں کے اشعار دیکھئے ؎

خوشی ہم غریبوں کی جیسے میاں
مزاروں پہ چادر چڑھائی ہوئی

بڑے تاجروں کی ستائی ہوئی
یہ دنیا دلہن ہے جلائی ہوئی

◆

زندگی اک فقیر کی چادر
جب ڈھکے پاؤں ہم نے سر نکلا

میں نے اس مجموعہ کے اشعار ایک غیر جانبدار قاری کی حیثیت سے پڑھے ہیں۔ پیشہ ور نقادوں کی عینک سے نہیں ! "آمد" میں بشیر بدر نے ایک خط ۲۵ [illegible]ء کے پڑھنے والوں کے نام لکھا ہے۔ اگر اس وقت تک کچھ اردو والے باقی رہ گئے تو وہ یقیناً بشیر بدر کا یہ مجموعہ پڑھ کر انہی کے ایک شعر کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار کریں گے ؎

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

محمد حسن

غزل گو کی حیثیت سے بشیر بدر کی صلاحیتوں پر ایمان نہ لانا کفر ہے۔
(رسالہ شاعر جلد ۵۴ شمارہ ۴)

ارشد عبد الحمید

ڈاکٹر بشیر بدر ہمارے عہد کے ان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے نئی غزلیہ لفظیات کو اپنے اسلوب کی کلیدی [illegible] کا اسلوب اتنا چمکا کہ ایک مستقل اسلوبیاتی رجحان بن گیا۔ آج جدید غزل کا لسانیاتی مطالعہ بشیر بدر کی غزلیہ لفظیات کا ذکر کیے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ نئی لفظیات کا تخلیقی استعمال ان کے اسلوب کا بنیادی وصف ہے۔ انہوں نے "لفظ پرستی" کے تمام تقلیدی رجحانات کو رد کرتے ہوئے اپنی انفرادی غزلیہ لفظیات کی تشکیل پر بھی اتنی ہی توجہ صرف کی ہے جتنی وہ جذبے کی صداقت، احساس کی شدت، اسلوب کی تازگی اور لب و لہجے کی کھنک پر صرف کرتے ہیں۔ خصوصاً غزل کی فرہنگ میں زندگی کی بول چال کی زبان کے نئے الفاظ کا اضافہ جس قدر ان کی غزل کے ذریعے ہوا ہے کسی اور شاعر کی غزل کے ذریعے نہیں ہوا۔ یہی سبب ہے کہ نئی غزلیہ لفظیات کے حوالے سے جب ہم جدید غزل گو شعراء کا مطالعہ کرتے ہیں تو ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، شکیب جلالی، ظفر اقبال اور بانی جیسے شعراء کی صف میں بشیر بدر کی فنکارانہ شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔

ظفر اقبال نے بھی زندگی کے نئے الفاظ کو غزل میں استعمال کیا لیکن یہ استعمال ان کے یہاں اینٹی غزل تک ہی محدود رہا۔ سنجیدہ غزل میں وہ غالب کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ اسی طرح محمد علوی اور عادل منصوری وغیرہ کی غزل میں بھی لفظیات اتنی ذاتی نوعیت کی ہوتی ہے کہ قاری اس کے تخلیقی عمل میں شریک نہیں ہو پاتا۔

نئی غزلیہ لفظیات سے متعلق بشیر بدر کے ادبی نظریات ان کی مختلف نثری تحریروں میں پڑھنے کو ملتے ہیں[۱۹] اس کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی ایسے بہت سے اشعار

ہیں جن سے الفاظ کے متعلق ان کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے ؎

ان لفظوں کے پردوں کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

سنو، لڑکے پاک ابروؤں میں خم کر دے   گرے پڑے ہوئے لفظوں کو محترم کر دے

اب ان دنوں میری غزل خوشبو کی اک تصویر ہے
ہر لفظ غنچے کی طرح کھل کر ترا چہرہ ہوا

ہم نے الفاظ کو آئینہ کر دیا   چھپنے والے غزل میں چمک جائیں گے

تتلی کے نازک پنکھوں پر آنسو کی تحریر غزل ہے
لفظوں کی مینا کاری کو الہامی اشعار نہ جانو

اب راکھ بٹوریں گے الفاظ کے سوداگر   میں آگ پہ رکھ دوں گا نایاب رسالوں کو

ابھی اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کی پلکیں سنوار لوں
مرا لفظ لفظ ہو آئینہ تجھے آئینے میں اتار لوں

راقم الحروف اور صابر حسن رئیس کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں بھی انہوں نے نئے الفاظ کے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے۔[۱۲۵] ان کے نقادوں نے ان کی غزلیہ لفظیات کے نئے پن کو سراہا ہے لیکن اکثر ہوتا یہ ہے کہ بلڈوزر، بالکونی، ریل، شرٹ، کوٹ، بٹن، لان اور ایسے ہی دوسرے الفاظ کی فہرست سازی کو فرض کی ادائیگی سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ الفاظ بھی بےشک بشیر بدر کی غزلیہ لفظیات کا حصہ ہیں لیکن اوّل تو شاعری مجرد الفاظ سے نہیں ہوتی دوسرے غزلیہ لفظیات کی اکائی، ترکیب لفظی، شعری محاورے، ایک مصرعے اور کبھی کبھی پورے شعر کو محیط ہوتی ہے۔ لفظیات کے مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ مجرد الفاظ کے علاوہ

ان اکائیوں پر بھی روشنی ڈالی جانے۔ زیرِ نظر مقالے میں بشیر بدر کی لفظیات کا تنقیدی جائزہ اسی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔

(۲)

اعلیٰ فکری احساس شاعر سے اعلیٰ پیرایۂ بیان کا مطالبہ کرتی ہے اور ژولیدہ بیانی ژولیدہ فکری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ تخلیقی سطح پر فن اور فکر دونوں ایک اکائی کی حیثیت سے نمو پاتے ہیں اور شاعر کے ذہن میں موجود خیال شعر کے جملہ اصول و ضوابط کے ساتھ منضبط ہو کر ہی اظہار کی منزل تک پہنچتا ہے۔ شاعری چونکہ واقعات اور تجربات کے ردِ عمل کا مؤثر فنی اظہار ہے اور یہ اظہار احساس کی لسانی تجسیم کے ذریعے ہوتا ہے اس لیے شعر کا بلند فکری آہنگ سے لبریز ہونا تو ضروری ہے ہی اسی کے ساتھ اثر آفرینی بھی فنِ شاعری کا بنیادی عنصر ہے جو پُر زور اور خوبصورت اندازِ بیان سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی اندازِ بیان یا (STYLE) کو ہم ادبی زبان میں "اسلوب" کہتے ہیں۔

اسلوب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن "اندازِ بیان (یا اسلوب) میں موضوع کا انتخاب، احساس کی شدت، ادبی خلوص، طرزِ فکر اور تاثیر سبھی منزلیں آتی ہیں۔ تاثیر سے لے کر اظہار تک ان میں سے کسی کو بھی علیحدہ کر لیجئے اندازِ بیان کی ترتیب اور نشو و نما کا شیرازہ بکھر جائے گا۔" کسی شاعر کا اسلوب ان تمام عناصر کو انفرادی اختراعیت کے ساتھ برتنے سے متعین ہوتا ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا، شاعری احساس کی لسانی تجسیم کا نام ہے لہٰذا شاعر کی اسلوبیاتی مشین کے بنیادی TOOLS شعر میں مستعمل ہونے والے الفاظ ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے اسلوب میں اثر آفرینی اور انفرادیت کا معرکہ شعری لفظیات کے مخصوص تخلیقی استعمال کے ذریعے ہی سر کرتا ہے۔

مشہور انگریزی شاعر ٹینی سن کا قول ہے کہ "قابلِ توجہ یہ بات نہیں کہ "ہم کیا کہہ رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم کس طرح کہہ رہے ہیں" یہ قول حالانکہ ٹینی سن کی انتہا پسندی کا ثبوت ہے لیکن اس سے اسلوب کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ادب کے تنقیدی مطالعے کے لیے محض اسلوبیات کا تجزیہ ہی کافی نہیں لیکن کسی فنکار کی فکر تک رسائی کا ذریعہ بھی بہرحال اسکی شعری، ادبی لسانیات ہی ہوتی ہے اس لیے لسانیات اور اسلوبیات کے نقطۂ نظر سے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

غزلیہ لفظیات سے مراد وہ شعری لفظیات ہے جو غزل میں مستعمل ہو کر اس کا ایک مخصوص شعری آہنگ، مزاج اور صنفی حیثیت سے ایک مخصوص شناخت پیدا کرتی ہے۔ واضح رہے کہ اس اصول سے نظم کی لفظیات کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر غزل اور نظم کی لفظیات شعری لفظیات ہے جس کی اکائی شعر میں موجود وہ کلیدی لفظ ہوتا ہے جس کے گرد شعر کے خیال کے تانے بانے بنے جاتے ہیں اور لفظ بہ لفظ انسلاک کے ذریعے اس کلیدی لفظ کی معنوی سرایت ترکیبِ لفظی، شعر میں بیان کیے گئے سیاق و سباق اور شعری صورتِ واقعہ تک پہنچتی ہے۔ اس طرح غزلیہ لفظیات کی اکائی محض تنہا لفظ نہ ہو کر کبھی ترکیبِ لفظی، شعری محاورہ، ایک مصرعہ یا بعض صورتوں میں مکمل شعر بھی بن جاتی ہے[۵۲] اس بیان کی روشنی میں کسی فنکار کی غزلیہ لفظیات کا مطالعہ اس کی غزلوں کے ان الفاظ، تراکیب اور شعری محاوروں کا مطالعہ ہے جو کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے فنکار کے شعری آہنگ مزاج اور تخلیقی رویے کی شناخت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زبان چونکہ کسی معروض کے اظہار کے لیے ہی تخلیق نہیں کی گئی بلکہ اس کے ساتھ ہی اس شخص کے کردار، مزاج اور ارادے کا اظہار بھی اس کے ذریعے ہوتا ہے جو اس معروض کو پیش کر رہا ہے[۵۳]۔ اس لیے لفظیات کے ذریعے فن ہی نہیں فنکار کا مزاج، کردار اور ارادہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔

کسی زبان میں لفظ اپنی تخلیق کے لمحۂ اوّل سے ہی مختلف انسانی گروہوں کے درمیان مختلف صورتوں اور اسباب کے زیر اثر مختلف النوع سیاق و سباق میں استعمال ہونے کی بنا پر حوالوں (REFERENCES) اور انسلاکات (ASSOCIATIONS) میں مختلف سطحوں اور ہر سطح پر مختلف جہتوں کا اضافہ کرتا جاتا ہے[۵۴] اردو کی کلاسیکی غزلیہ لفظیات چونکہ عربی اور فارسی سے مستعار لی گئیں اس لیے ان کے سیاق و سباق کے حوالوں کا سلسلہ اتنا ہی طویل ہے جتنی کہ ان زبانوں کی تاریخ۔ اس لحاظ سے اردو کی کلاسیکی غزلیہ لفظیات میں مختلف حوالوں اور ان سے ہماری مانوسیت کے سبب زیادہ بلاغت کا احساس ہوتا ہے۔

لفظیات کوئی بھی ہو، تخلیقی تجربے کے اظہار کے لیے جو بھی زبان منتخب کی جائے، معنویت اور تہہ داری اس کی اساسی شرائط میں شامل ہے۔ زبان میں تہہ داری

کا فقدان تجربے کی سطحیت اور اکہرے پن کا ثبوت ہے۔ چنانچہ ان اشعار میں جہاں شاعر اپنے ذاتی تجربات یا انفرادی افکار کے بجائے لفظیات کی عام روایت کو شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے، شاعری انکشاف کے بجائے استادی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تمثیل اس استادانہ مہارت کا انتہائی نقطہ ہے جس میں دعوے اور دلیل کا تعلق استدلال کی جامد منطق کا پابند ہوتا ہے اور شاعر کے کمال کی انتہا صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ بعض دعووں کے لیے ایسی دلیلیں نظم کرے کہ قاری شعر کے بجائے اس جستجو کی داد دے جو اس دلیل کے سلسلہ میں کی گئی ہے۔ کلاسیکی غزلیہ لفظیات کی کورانہ تقلید کرنے والے شعراء کے ساتھ بھی ہوا کہ "قفس" کے ساتھ بلبل، صیاد اور آشیانہ کی تجریں بٹھانے پر ہی ان کی تمام تر توجہ مرکوز رہی اور انہوں نے تجربے کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا۔ شاعری کے اس نقصان کی تلافی کے لیے ضروری تھا کہ زبان کی بندھی بندیوں کو توڑ کر تجربے کو دوبارہ مرکزی حیثیت کا حامل بنایا جائے۔ چنانچہ جدید غزل گو شعراء نے اپنے انفرادی تجربات کے اظہار کے لیے نئی غزلیہ لفظیات کی تلاش کی اور اس کے تخلیقی استعمال پر زور دیا۔

نئی غزلیہ لفظیات کے استعمال سے جہاں اسلوب میں تازگی اور معنی کی ادائیگی میں قطعیت پیدا ہوئی وہیں سیاق و سباق کے ادبی حوالوں کے فقدان کے سبب نئی لفظیات کے معنوی منظر ناموں میں مختلف رنگوں کی آمیزش اور وسعت نیز کثرتِ معنی کا پیدا کرنا اتنا آسان نہیں رہا۔ اس بات کا انحصار شاعر پر ہے کہ وہ نئی کلیدی لفظیات کا حوالہ جاتی انسلاک دوسرے الفاظ کے ساتھ اتنا مربوط اور تخلیقی سطح پر کرے کہ شعر میں تہہ داری کا فقدان نہ ہونے پائے اور اجنبیت مانوسیت میں تبدیل ہو جائے۔

(۳)

بشیر بدر کا شعری سفر ۱۹۵۰ء کے بعد شروع ہوا۔ یہ دور ترقی پسند شاعری کی مقبولیت کا دور تھا۔ ان دنوں "سرخ سویرا" اور "مارکسی انقلاب" شعراء کے محبوب موضوعات تھے۔ غزل کے مقابلے نظم کو ترجیح دی جاتی تھی اور "حکایتِ غمِ دل" کے بجائے "افسانۂ غمِ دوراں" نظم کیا جاتا تھا۔ رمزیت کو معتوب اور براہِ راست خطابت کو مقبول کیا جا رہا تھا۔ ایسے ماحول میں "غزل" کو گردن زدنی قرار دیا جانا کوئی حیرت کی بات نہ تھی لیکن فیض، مخدوم محی الدین اور مجروح جیسے شعراء نے غزل کو اپنائے رکھا۔ ان شعراء کی غزلیں

بھی حالانکہ ترقی پسند نظریات کی عکاسی کرتی ہیں لیکن رمزیہ انداز بیان، ایجاز اور اعجاز کے سبب ان میں غزلیہ فنکاری کا احترام نظر آتا ہے۔ ان شعراء کی کامیاب غزلیہ شاعری نے اس مفروضے کو بھی غلط ثابت کر دیا کہ غزل سرمایہ دارانہ نظام کی نمائندگی کرتی ہے۔ دراصل غزل اس میٹھے پانی کی طرح ہے جو ہر رنگ کو قبول کر لیتا ہے۔ اب یہ شاعر پر منحصر ہے کہ وہ اس پانی سے کس رنگ کا محلول تیار کرتا ہے۔

ترقی پسند غزلیہ لفظیات پر غور کیا جائے تو اس میں کلاسیکی لفظیات کی توسیع نظر آتی ہے لیکن ترقی پسند شعراء نے اپنے مخصوص نظریاتی حوالوں اور اشاروں کے ذریعے پرانے الفاظ کو نئی معنویت سے ضرور ہمکنار کیا۔ مثال کے طور پر "میکدہ" جو میر کے یہاں تصوف گاہ، داغ کے یہاں شراب خانہ اور اقبال کے یہاں خانۂ خدا یا دیارِ رسول کا استعارہ تھا وہ فیض کے یہاں کمیونسٹ کی رزم گاہ کا استعارہ بن گیا۔ بشیر بدر کے مطابق مختلف نظریات کے شعراء کے یہاں ایک ہی استعارے سے جدا جدا معنی اخذ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہر شاعر کی بنیادی ثبت بھی شعر کے ساتھ منسلک ہوتی۔ بشیر بدر کے اس خیال کے متعلق کسی اور مقام پر رائے کا اظہار کیا جائے گا لیکن یہاں یہ عرض کر دوں کہ شاید اسی الجھن کے سبب سردار جعفری کو فیض کے رمزیہ اندازِ بیان پر اعتراض تھا اور وہ چاہتے تھے کہ فیض "میکدہ" کا استعمال کرنے کے بجائے براہِ راست "کمیونسٹ رزم گاہ" کا استعمال کریں کیونکہ "میکدہ" ملا کی مسجد بھی ہو سکتا ہے، صوفی کی "تصوف گاہ" بھی اور مسلم لیگ کا دفتر بھی۔

بہرحال ... ترقی پسند شعراء نے پرانی لفظیات کے ذریعے نئے معنیٰ کی ترسیل کی اور "کج کلاہی" شکستِ زنداں، پابجولاں، زنجیر پا، صیاد، محتسب، کارواں، قفس، غمِ دوراں، دار و رسن وغیرہ اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ کو نئی معنویت سے ہمکنار کیا۔ نئے حوالوں کے علاوہ اس لفظیات میں کلاسیکی غزل کے تمام عناصر موجود تھے۔ مثلاً پرانے شعری محاورے، فارسی تراکیب وغیرہ۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جب غزل میں جدیدیت کا رجحان سامنے آیا تو جدید شعراء نے حالانکہ اپنے لیے نئی غزلیہ زبان وضع کی لیکن الفاظ اور لفظی تراکیب کا آہنگ کم و بیش وہی رہا۔ (اگر ایسا نہ ہوتا تو جدید غزل کا رشتہ میر اور غالب کی غزل سے استوار

نہ ہوتا۔) اس نئی زبان میں شعری محاوروں کی ساخت اور آہنگ میں تبدیلی، پیکر نگاری، علامت، استعارہ اور تشبیہ سازی میں جدت، نئے الفاظ کا استعمال، اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ کی شمولیت، غیر مانوس یا غیر شعری الفاظ (جیسے مکڑی، چھپکلی، سانپ، چمگادڑ، بھوت وغیرہ) کا جدید عصر، جدید زندگی اور جدید فکر کے تناظر میں استعمال، فارسی تراکیب سے اجتناب وغیرہ ایسی خصوصیات تھیں جنھوں نے نئی غزل کو یکسر ایک نئے لسانی منظرنامے سے روشناس کرایا۔

اسی دوران نومبر ۱۹۶۹ء میں بشیر بدر کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "اکائی" شائع ہوا۔ اس مجموعے کو نہ صرف بے تکلف لہجے، صدق جذبات اور نرم و نازک احساسات کے موثر اظہار کے سبب مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ بشیر بدر کے خوبصورت اسلوب اور نئی لفظیات کی بھی خاطر خواہ پذیرائی کی گئی۔ "اکائی" کی غزلیہ لفظیات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ آج جو اسلوبِ بیان بشیر بدر کی شناخت کا انفرادی نشان ہے اس کی جڑیں کلاسیکی اسالیب اور لفظیات میں پیوست ہیں۔ ان کی غزلیہ زبان کلاسیکیت سے ماخوذ لفظیاتی جواہر کا ذاتی اختراعیت کے ساتھ تراشا ہوا وہ مجسمہ ہے جو ایک جیتی جاگتی دنیا اپنے جلو میں سموئے ہوئے ہے۔ دراصل کوئی کتنا بھی "جدید" ہو جائے اپنی مٹی اور اپنی جڑوں سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کلاسیکیت ہی وہ سرمایہ ہے جس سے جدت کے نئے خزانے جنم لیتے ہیں۔

"اکائی" کی لفظیات میں ہمیں بعد کے مجموعوں یعنی "امیج" اور آمد کی خوبصورت لفظیات کی اوّلین جھلک دیکھنے کو ملتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بات کو انفرادی پیرایۂ بیان میں کہنے کی شعوری تلاش بشیر بدر کو ابتدا سے ہی تھی جس کا سرا ہمیں "اکائی" میں ہی مل گیا تھا اور جو بعد میں ایک خوبصورت اسلوب میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن "اکائی" میں کلاسیکی غزلیہ لفظیات کو بھی سلیقے کے ساتھ تخلیقی سطح پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں کلاسیکیت سے مراد روایت یا قدامت پرستی نہیں ہے۔ محض پرانی لفظیات کا استعمال شاعر کو قدامت پرست ثابت نہیں کر دیتا۔ دیکھا یہ جانا چاہیے کہ کلاسیکی لفظیات کا استعمال تقلید محض کے لیے کیا گیا ہے یا اس کا استعمال انفرادی اختراعیت کے ساتھ تخلیقی سطح پر ہوا ہے۔ ذیل میں "اکائی" کی وہ لفظیات درج کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ

بشیر بدر نے پُرانی لفظیات کا استعمال بھی اپنے انداز اور اپنی ضرورت کے مطابق کیا ہے:۔

"مثل مینارِ عظمت، سینۂ سنگ، زیست، کتبہ، اقوالِ زرّیں، وادیٔ ذہنِ جاوداں بکیراں، رات کا کال جادو رہے زلف میں، دشمنِ جاں، گیسوؤں کی گھٹا مست و سرشار، رقص آواز، پابہ زنجیر، موت کے تیرہ و تار تشان، اہلِ چمن نغمۂ فصلِ گل، شاہدِ زندگی، حلقۂ نور، طائفہ، دل شبِ تارکی سلطنت ہوگیا خیمۂ زخم سے کج کلاہانِ غم پھر نکلنے لگے، آتش بجاں، العطش العطش کوثر علم و فن، گیتی، ترقیٔ معکوس، آئینہ ساز و شیشہ گراں، نبضِ دوراں، آتشِ گل، غزال، گل عذار، یہ ہوائے حقیقتِ فردا، گاہ پانی گاہ شبنم اور کبھی خوناب ہے، حیرتی آنکھیں، مثالِ وقت میں تصویرِ صبح و شام ہوں اب، اجزائے پریشاں، خامشی اتنی اذیت ناک ہوتی ہے کہ بس، سب فنا ہو جائے گا اللہ بس باقی ہوں، دل کی رہِ حیات میں یہ شوخ تمکنت، جامِ جم، نکہتِ گیسو، بزرگانِ جدید، قفل، دلِ شکستہ، شہزادیٔ خواب، دشتِ تمنا، بادِ صبا، برق صفت، شعلہ نما، فنِ سخن، نگارِ فکر و نگاہ، جسم جیسے بھرا بھرا ساغر، جوئے شیر تیشہ، جشنِ چراغاں، نگہِ شوق، برگِ گل، آبِ رواں، مثالِ غنچہ، سکوتِ شام ہر جسم گل فروشاں اب مرکزِ نظر ہے، افسانۂ شبِ غم، یہ حالت گفتنی کم دیدنی ہے، مے سے لبریز چھلکتے ہوئے پیمانے چلے، روزن، چشمِ پُرآب، حضورِ جبر کسی مصلحت کے پیشِ نظر، میانِ بزمِ طرب، محشرِ خرام، گل رُخ، یزید، حسینؑ، فرات، نیزہ زمیں پہ گاڑ کے گھوڑے سے کود جا، آب و خاک و باد شبِ ہجر، خلوصِ شبنم و نکہت وفورِ آتشِ گل، آبشارِ شہر پُرفن، خندۂ گل یہ دشتِ غم کی تپش بیش از عذاب النار، الاماں شاعرانِ خستہ حال، غم وجہِ فگارِ دل غم وجہِ قرارِ دل۔"

اس لفظیات کے علاوہ کلاسیکی اسلوب سے متعلق چند پورے اشعار یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے؎

بدستِ چرخِ بریں ماہ نامے جام اُٹھا
عدد آفتابِ گلابی مہہ تمام اُٹھا

گدائے جرعۂ مے کو بہت حقیر نہ جان
کہ اس فقیر سے اس میکدے کا نام اُٹھا
بایں مظاہرۂ التفاتِ ساقی و مے
کسے خبر کہ کوئی کتنا تشنہ کام اُٹھا

مجروح بہت ہے، دل پھر بھی شگفتاں ہے
یہ برگِ خزاں دیدہ ہمرازِ بہاراں ہے

تا حدِ نظر شہرِ خموشاں کے نشاں ہیں
اللہ مسافر کی کہاں شام ہوئی ہے

محفلِ میکشاں، کوچۂ دلبراں
ہر جگہ ہو لیے اب چلیں دل کہاں

ہم کو کافی ہے یہی حلقۂ زنجیرِ سخن
جاؤ دل جل کے تمہیں بانٹ دو جاگیرِ سخن

ز فرق تا بقدم ایک موجۂ مے ناب
تکلمش کہ بجے جیسے چاندنی میں ستار

ہر رنگِ دلِ پرخوں ہر لالۂ صحرائی
گیسو کی طرح مضطرب رات کی رانی ہے

اے پیرِ خردمنداں دل کی بھی ضرورت ہے
یہ شہرِ غزالاں ہے، یہ ملکِ جوانی ہے

ہم خوشبوئے آوارہ ہم نور پریشاں ہیں
اے بدرؔ مقدر میں آشفتہ بیانی ہے

ان اشعار میں کلاسیکیت سے بشیر بدر کا تخلیقی تعلق نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یہ تعلق اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ان کا "امیج" اور "آمد" کی غزلوں کا اسلوب "اکائی" کے ان منقولہ اشعار سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اس کی جڑیں انھی اشعار کے کلاسیکی اسلوب میں پیوستہ ہیں۔

"اکائی" ہی میں بیشتر ایسی غزلیں بھی ہیں جن میں نئی لفظیات کا تخلیقی استعمال ہوا ہے۔ یہ وہ غزلیں ہیں جنہوں نے "امیج" اور "آمد" کے شاعر کو ایک ٹھوس لفظیاتی بنیاد فراہم کی ہے اس نئی لفظیات کی ایک مختصر سی فہرست بنائی جائے تو وہ اس طرح ہوگی:۔

"برف سی اجلی پوشاک، وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں، پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہوں، دست الفاظ محفوظ کر لے انھیں، نونس، شوکیس لکڑیوں سے تراشی ہوئی لڑکیاں، چین کے نوجواں، آسماں رنگ کا کوٹ، یادوں کے اُجلے فرشتے، دودھیا خامشی، یادوں کی زلفیں، خواہشیں جیسے افریقہ کی بیٹیاں، دھوپ کو چھیڑتے آبنوسی بدن، پھر کبوتر کے جوڑوں کے دل میں چبھتی تنکے چن چن کے لانے کی فطری چبھن، آئینہ خانے میں خوشبوؤں کا بدن، بیروت کی ساحلی ریت، کاغذی مقبرے، مچھلیاں، اک دریچے میں دو آنسوؤں کا سفر، روشنی کے گھروندے، خوشبوؤں کی دکاں، زعفرانی بلور رات کی شاخ، غم وہ ساون ہے جوان کمروں کے اندر برسے، چاند، پھول کے پیالے، آنکھ کے تارے، گلاب کی جنبش، دھوپ، آنسو، اداس بلینا، تتلی، نیند میں ننگے پاؤں چلتے خواب، نیند کی فاختہ، گمراہ فرشتے، رات کی پلکیں، صبح کی آنکھیں، سایہ، کمرہ، صحرا، رگِ دنیا، سانپ، جو پیاس تیز ہو تو ہے ریت بھی تصویر آب، میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں، گیسوؤں کے پھول، نقشِ قدم کا چاند، تجربوں کی ردائیں، پیار کی خوشبو، یاد کسی کی دھوپ ہوتی ہے۔ آہوں کے بادل، آنسو کی کھیتی، نین نگر، روپ دیس کی کلیاں، رنگ و نور کی گڑیاں، چاند دیس کے لوگ، پھول جیسی عمر، چاندنی

کے شعلے۔ خموش برف کی وادیاں، خزاں کے خشک واُداس ہونٹ، آنسوؤں کا سکوت، شبنمی آگ، پورس کی فوج، خزاں کی دھوپ، بالکونی، ٹیبلیٹ، ٹائی کی گرہ، مکھن، ریل، رکشا، موٹر، ڈولی، کالر، ٹیپ، کیک، بٹن، چین، زپ کے دانت، مچھلیاں چل رہی ہیں پنجوں پر، بولیاں بولتے ہوئے ڈبے، کالے جادو کا کمرہ، موسمی اشجار، سوٹ، شرٹ، دھند، شاخ کی بانہیں، چائے کی پیالی، عارض کے اُجالے، سرکش پہاڑیاں، سویرے کا سنہرا جام، کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی، ستاروں کے ہونٹوں پر کپکپی ہے، خدا کی نظموں کی کتاب، بستر بند، ماہتا کا جسم، دہکتے نیزے، چاندی کی کشتی، لہو کا فوارہ، سُرخ چاندنی، تھرکتی مچھلی، نرم بتی، لہو کا چڑھتا سمندر۔"

"اکائی" کی اس نئی لفظیات میں حسّی تلازمے، استعارے، علامتیں نیز تشبیہات کے ذریعے شعری زبان کی تشکیل کی گئی ہے لیکن تشبیہات کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ میر کی طرح بشیر بدر کی لفظیات میں بھی سا منے جیسے، جیسا، طرح، مثل، مثال اور مانند وغیرہ ادوات تشبیہہ کثرت سے استعمال کی گئی ہیں۔ "اکائی" سے لے کر "امیج" اور "آمد" تک تشبیہات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو قاری کے ذہن میں مختلف منظر ناموں کے عکس کھینچتا چلا جاتا ہے۔ "اکائی" کی تشبیہات زیادہ تر فطرت کے شوخ مناظر سے اخذ کی گئی ہیں اور اکثر و بیشتر پیکر نگاری کے ذریعے حسّی تلازموں کی تشبیہاتی تجسیم ایک انوکھے آہنگ اور لب و لہجے کو جنم دیتی ہے۔

تشبیہہ کی شاعری میں ایک خاص اہمیت ہے۔ اس کے ذریعے اسلوب کی بہت سی خصوصیات جنم لیتی ہیں۔ تشبیہہ سے ہی استعارہ بنتا ہے اور تشبیہہ سے مجاز، کنایہ اور دیگر اجزائے ترکیبی بھی وجود پاتے ہیں۔ تشبیہہ بذاتِ خود اثر آفرینی کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے کیونکہ اس میں بنیادی طور پر مشبّہ بہ کو مشبّہ سے برتر و بالا دکھایا جاتا ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں میں تشبیہات غازہ کی طرح محض حقیقت کو چمکا کر ہی پیش نہیں کرتیں بلکہ ان کے ذریعے اثر آفرینی کا کام بھی لیا گیا ہے۔ اس عمل میں تشبیہہ کو استعارے کا روپ دے کر بیان میں قطعیت پیدا کی گئی ہے جس کا سلسلہ پیکر نگاری اور علامت نگاری تک پہنچتا ہے۔ "اکائی" میں حالانکہ تشبیہہ کا استعارے میں بدل جانے کا عمل خاصہ دھیما

ہے لیکن " ایمیج " اور " آمد " میں یہ عمل تیز نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ استعاراتی اظہار بشیر بدر کے یہاں " اکائی " کی تشبیہات سے شروع ہوکر " ایمیج " میں نمو پاتا ہے اور " آمد " میں اس کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ ان کے یہاں پیکر نگاری بھی ہے، استعارہ سازی اور علامت نگاری بھی لیکن تشبیہ نگاری بہرحال بشیر بدر کے یہاں سب سے زیادہ ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اسلوب تشبیہاتی اسلوب ہے۔ اکائی سے منتخب درج ذیل اشعار میں تشبیہات کی خوبصورت اور مؤثر کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے ؎

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم۔ اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

جو پیاس تیز ہو تو ریت بھی ہے چادرِ آب
دکھائی دور سے دیتے ہیں سب تمہاری طرح

برف سی اجلی پوشاک پہنے ہوئے پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہوں
وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

پھول دوا جیسے مہکے ہیں کسی بیماری کی صبح ہوئی ہے

جیسے کہ سارے شہر کی بجلی چلی گئی
آنکھیں کھلی کھلی تھیں مگر سوجھتا نہ تھا

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

خوبصورت، اداس، خوفزدہ وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ بشیر بدر کی تشبیہہ کے علاوہ تعریفی (DEFINITIVE)

اور اطلاعی (INFORMATIVE) لفظیات سے بھی تعبیر ہے۔ وہ ایک واقعے کو بیان کرنے کے لیے ایک دوسرے واقعے کو بنیاد بناتے ہیں اور دونوں کے تشبیہی عمل سے بات کو انوکھے اور مؤثر اسلوب میں بیان کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ؎

کوئی کتبہ نہیں ہیں سرِ راہ ہم جس پہ اقوالِ زرّیں بدلتے رہو
ہم تو آنسو ہیں پلکوں پہ رکھ لو ہمیں جب اشارہ کرو ٹوٹ جائیں کہیں

میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں — ورنہ ان پتھروں میں آب کہاں
میرے ہونٹوں پہ تیری خوشبو ہے — چھو سکے گی انہیں شراب کہاں

پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

میری آنکھوں میں اک چاندنی چوک ہے
گذری عمرِ رواں چاندنی چوک میں

دل کی بستی پرانی دلّی ہے — جو بھی گذرا ہے اس نے لوٹا ہے

میں دن ہوں میری جبیں پہ دکھوں کا سورج ہے
دیئے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

قدم سے آگے چل رہی ہے — مسافر کو گلی پہچانتی ہے

یہاں " گلی کا قدم سے آگے آگے چلنا " اور " مسافر کو پہچاننا " دو الگ الگ باتیں ہیں لیکن ان کے انسلاک نے ایک شعری وحدت کی تشکیل کی ہے اسی طرح "کوئی کتبہ نہیں ہیں سرِ راہ ہم "، " ہم تو آنسو ہیں " ، " میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں"، " میری آنکھوں میں اک چاندنی چوک ہے"، " دل کی بستی پرانی دلّی ہے"، " میں دن ہوں"

اور" میری جبیں پہ دکھوں کا سورج ہے۔" وغیرہ شعری محاورے اطلاقی (INFORMATIVE) اور تعریفی (DEFINITIVE) ساخت کے جملوں کے ذریعے ایک پوری لفظیاتی اکائی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ بیشتر جدید غزلیہ لفظیات اور اسلوب کا بنیادی آہنگ ہے جس سے ان کی انفرادی غزلیہ زبان کی شناخت ہوتی ہے۔

"اکائی" کی لفظیات میں استعاروں کا بھی اہم حصہ ہے۔ یہ استعارے معنوی قطعیت کے ساتھ ساتھ زبان کی توسیع کا بھی کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ نادر تشبیہات کو استعارہ بنا کر ایک نئی دنیا آباد کی گئی ہے۔ چاند، ریل، پیڑ، سمندر، پھول، پتھر، چاند اور ایسے ہی دوسرے الفاظ سے "اکائی" میں استعاراتی اظہار کی جھلک ملتی ہے۔ کہیں استعارہ ایک ہی لفظ ہوتا ہے اور کہیں ناکام استعاروں کی مثالیں بھی ملتی ہیں:

گردنوں میں لٹک رہی ہے زباں ——— (ٹائی)
اور آنکھوں پہ رکھے ہیں شیشے ——— (عینک)

اک بڑا جادو کا کمرہ
اور پردے پہ لڑکیاں لڑکے ——— (سنیما ہال)

اب سفر کا نیا طریقہ ہے
لوگ لیٹے ہیں چلتے ہیں کمرے ——— (ٹرین)

ساز پر شور و کرب ہنستا ہے
بولیاں بولتے ہوئے ڈبے ——— (ریڈیو)

ان مثالوں سے قطع نظر "اکائی" میں کامیاب استعاراتی اظہار کا ایک جہان آباد ہے۔ ان میں زیادہ تر استعارے زندگی کی روزمرہ کام میں آنے والی اشیاء کو نئے معنی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ مچھلی، ریل، بکری کے بچے، شجر، سورج، برف، باغ، پھول، روشنی وغیرہ الفاظ نہ صرف مانوس ہیں بلکہ قاری کو تخلیقی عمل میں اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں ۔

وہ غزل والوں کا اسلوب سمجھتے ہوں گے
چاند کہتے ہیں کسے خوب سمجھتے ہوں گے

"افق" میں جدید غزل کے مروجہ استعاروں مثلاً گھر، موج، دریا، سمندر، دھوپ، جزیرہ، سناٹا، لمحہ، عکس، صدا، پانی وغیرہ کثرت سے موجود ہیں لیکن انہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے نئے استعاروں کی تخلیق بھی کی گئی ہے اور مروجہ استعاروں کو نئے معنی میں استعمال ہوا ہے

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

ڈالی گلاب کی مرے سینے سے آ لگی
جھٹکے کے ساتھ کار کا رکنا غضب ہوا

مچھلیاں چل رہی ہیں پنجوں پر　　جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے

تھرکتی مچھلی نکل کر سرکتے کپڑوں سے
تمام رات کو اب بے نقاب کر دے گی

صبح سے ڈھونڈھ رہے تھے کہ کہاں ہے سورج
اب نظر آئے ہو تو سارا جہاں روشن ہے

روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جس رات لوگ
کوئی سایہ میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

ہو سکتا ہے کل سورج سوتا ہی مجھے پائے
اک سانپ مرے دل میں سمٹا ہوا بیٹھا ہے

باغ ہے ایک پھول لاکھوں میں رنگ سب کا جدا جدا سا ہے

استعارہ لفظ کے مجازی معنی میں استعمال کا نام ہے اس لحاظ سے مندرجہ بالا اشعار میں چاند، گلاب کی ڈالی، مچھلیاں، سورج، روشنی، رنگ، سایہ، سانپ، باغ اور پھول وغیرہ" اکائی" کی غزل کی فرہنگ میں نئے معنی اختیار کر لیتے ہیں۔

پیکر نگاری غزل میں کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن نذیر غزل میں جس کثرت کے ساتھ پیکر تراشی کی گئی ہے اس کی مثال غزل کے کسی اور اسلوب یا عہد میں نہیں ملتی۔ مومن کا مشہور شعر ہے ؂

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

پیکر نگاری، حسی تلازمات کی تجسیم کا نام ہے۔ اس میں حواسِ خمسہ کے ذریعے ہمارے متخیلہ کے متاثر ہونے اور اس تاثر کی لفظی تصویر بنا دینے کا عمل مخفی ہے۔ یعنی وہ تشبیہ، استعارہ یا معروض کا کوئی وصف جو حواسِ خمسہ کے حسی تجربے کی مصوری کرتا ہے، پیکر کہلاتا ہے۔ یہ حسی تجربہ تخلیقی تجربے کا حصہ بن کر بیان کے تاثر میں اضافے کی سعیِ مشکور کا سبب بنتا ہے۔" اکائی" کی پیکر نگاری اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے نئی لفظیات کا ہی جنم نہیں ہوتا بلکہ مفہوم کی ادائیگی اور اثر آفرینی میں بھی مدد ملتی ہے۔" اکائی" میں پیکر نگاری کی انتہا تجربے کے گہرے پن اور اس کی داخلیت میں مضمر ہے۔ گویا پیکر نگاری بجائے خود اہم نہ ہو کر شعر کے تجربے اور تاثر کی کامیابی پر منحصر ہے ؂

ان کہے شعر ہیں وادیِ ذہن میں مختلف رنگ کے جھلملاتے دیئے
دستِ الفاظ محفوظ کر لے انہیں چل رہی ہے ہوا بجھ نہ جائے کہیں

جس کو دیکھو مرے ماتھے کی طرف دیکھے ہے
ورنہ ہوتا ہے کہاں اور کہاں روشن ہے

چاندنی بھی مری طرح حیرت میں ہے
چھپ گیا کوئی آواز دے کر کہاں

بہت مصروف ہے انگشتِ نغمہ — مگر تم تو ابھی تک بانسری ہو

وہ دریا میں نہانا چاندنی کا — کہ چاندی جیسے گھل کر بہہ رہی ہو

بے تاب ہے رنگت کے لیے پیار کی خوشبو
کب آکے قریب آئے گی تلوار کی خوشبو

کیا زندگی ہماری گلی تک کبھی آئی تھی
گیسوؤں کے پھول یہ نقشِ قدم کا چاند

علامت نگاری شعری لسانیات کے ارتقار کا عروجی نقطہ ہے۔ ایک استعارہ اس وقت علامت بن جاتا ہے جب اس کے ذریعے اس مثالی مواد کی تجسیم کی جاتی ہے جو کسی اور طرح معرضِ اظہار میں نہیں لائے جا سکتے۔[۱۱] یہ ایک پیچیدہ طریقۂ اظہار ہے علامتی اظہار کی زبان کے ذریعے شاعر سرعت سے بدلتے ہوئے انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی مجرد اور مجسّم کے درمیان تقابلی اشاریت پر مبنی لفظیات سے کرتا ہے۔ "اکائی" کی علامتیں زندگی کی روزمرہ کی زبان سے تعلق رکھنے کے باوجود اکہری نہیں ہیں۔ ان میں ہمہ جہتی اور تہہ داری ہے اور شاعر کے مقصد کی ادائیگی میں وہ پورے تقابلی پس منظر کے ساتھ معاون ہوتی ہیں۔ "ریل"، "چائے"، "لان"، "جنگل"، "پیڑ"، "سمندر"، "چاند"، "مچھلی" وغیرہ علامتیں نئی تہذیب، عصری الجھنوں اور شہری زندگی کی گھٹن کا آئینہ ہیں۔

(۳)

بشیر بدر کا دوسرا شعری مجموعہ "امیج" جولائی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی غزلوں میں نئی لفظیات کی تلاش اور کلاسیکیت سے انحراف کی لے اور زیادہ تیز ہو گئی دوسرے الفاظ میں یہ مجموعہ تجرباتی لفظیات کا مجموعہ ہے جس کی کامیاب مثالیں اسلوب میں چار چاند لگا دیتی ہیں اور نسبتاً کم کامیاب یا ناکام لفظیات مزید تجربوں کی راہیں ہموار کرتی ہے۔

تشبیہاتی اسلوب اس مجموعے کا بھی بنیادی وصف ہے لیکن استعاروں میں اضافہ ہوا ہے اور امیجز غزلیہ لفظیات میں استعاراتی اظہار سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ پیکر نگاری میں مزید تجربات سامنے آتے ہیں اور اکثر کامیاب ہیں لیکن سب سے زیادہ فروغ علامتی اظہار کو ملا ہے۔ جس میں تجربے کی نوعیت کے اعتبار سے علامتوں کا بلیغ استعمال نہ صرف اسلوب بلکہ مفہوم کو نمایاں کر دیتا ہے۔

"امیج" میں "اکائی" کی چند غزلیں "شعوری تبدیلیوں" کے ساتھ شامل کی گئی ہیں اس کے علاوہ "اکائی" سے "بہتر پتھر" کے عنوان سے ۲۰ اشعار بھی ضمیمے کے طور پر درج ہیں ان اشعار میں بھی پرانی لفظیات کو بدل کر نئے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "اکائی" کا ایک شعر ہے :-

دل ہمارا بھی کا شہر وفا ہے — جو بھی گذرا ہے اس نے لوٹا ہے

یہ شعر "امیج" میں اس طرح نقل کیا گیا ہے :-

دل کی بستی پرانی دلی ہے — جو بھی گذرا ہے اس نے لوٹا ہے

ان تبدیلیوں کے علاوہ لفظیات سازی میں بھی بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جن کا اندازہ "اکائی" اور "امیج" کی لفظیات کے تقابلی مطالعے سے ہوتا ہے۔ "امیج" کی چند اہم لفظیات حسب ذیل ہیں :-

"سسکتا آب، بوڑھا دیوتا، خوشبو چیختی ہے، جزیرے، شب خون، پتھروں کا جنگل، غرق پتھر پڑنے والی مشین، فرکے کوٹ، دفتر کا قلم، مل کی مشینیں، دل کے باغی فرشتے، جگنو، جھاڑیاں، خوشبو، تتلی، سونے کے پھول پتے، خوشبوؤں کا بدن، رنگوں کے فرشتے، دینار، خواب کا شجر، بدن پہ جمی دھوپ، رومال روشنی کے ہوا میں اڑاؤں گا، بدن کی مٹی، نیلے بادل کا گاؤں، روشنی کے بدن، چلتی گھڑیوں کی سوئیاں، رات کا ٹیپ، موسم کے پاک چہرے، سرمئی ہڈیاں، خاکی اشجار، مختلف پیچ میں اک کسی شخصیت کا یاد کا پھول، دھوپ کے چھپاتے ہوئے ہاتھ، نیم کے پھول، ناریل کے درختوں کی پاگل ہوا، گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا، یادوں کی کافور جیسی مہک، بید کے زرد مونڈھے پہ بیٹھی ہوئی شام، خشک ڈنٹھل، فاختہ کی گھنی بند

پلکیں، لان، جنگلی آم کی جان لیوا مہک، فاختہ دھوپ کے پل پہ بیٹھی رہی، گیلری میں چھپی دوپہر، ناریل کی طرح توڑ کر پی لیا، سبز پلکیں، دست ندی، بند پلکیں کترتے ہوئے سائیکل پر چلیں دھوپ کی قینچیاں، درد کا پاک لوبان، ریشمی بالوں والے پھول کی گرم ٹوپی، سرخ خرگوش، کبوتر کا خون، کلینڈر میں بیٹھا ہوا سرخ بلا، مکڑی موج، زرد ساڑی، پس ماندہ قصبے کی پتلی سڑک، ٹریفک، سپاہی، جھاگ کے پہاڑ، کھلے صابنوں کی مہکتی ندی، پاؤں اسٹیل، سینہ سڑک، ہاتھ لکڑی کے جنگلے، چھپنے کی ندیاں، سبز نارنجی سنہری کھٹی میٹھی لڑکیاں، مقبروں کی چادریں، آسمانی گھنٹیاں، شام کا کالا گلاب جامنوں کے باغ، اودی اودی لڑکیاں، طیارے، گلاس، ابابیل، پیوں نلب مکان، کھیت، سبز کائی چادر، رات کا رس، راکشش، چاندی کشتی، لہو کا فوارہ، مانڈ، دیمک، راکھ پہ دھوپ جمانا، پیار کی گہری جھنکاریں، دیہاتی پانی کے جھوٹے موتی، دھوپ نئی بیل باگم پہنے سڑکوں کی کشتی پر تیرے، راکھ کا کرتا، دھول کی لنگی، جگنوؤں کا سر، موم بتی کی رانیں، بلیڈ، چاقو، برف کے ثمر، دھوپ کا سرا بجرا، آگ کا سمندر، دھوپ کی گٹھڑی، ملبہ، دیوار، خیمے، برف میں رکھی ٹھنڈی بوتل چپک گئی، دونالی، غازی، ڈونگے گارا، چونا، مچھلی کے کوٹھے، گنگا جل، چھت، چھاگل، دستانے، گھوڑے، اسکوٹر، برف کی ٹافیاں، بیرک، وردیاں، پیٹیاں، چیٹیاں، تیزاب، لحاف، سرخ تشدد، قلفیاں، پکے امرود، چٹنیاں، گلہری، دودھ، قمیص ایلچی، انگنی، سرمہ، مستی، کنگھی، چوٹی، مینا، کہرے کے لرزیدہ ہاتھ، تلسی اور ادرک کی چائے، شاور، ٹاول، اپنے ہی مرچے پودینے سوکھ گئے۔

دودھ جلیبی، غزلیں اب تک شراب پیتی تھیں، نیم کا رس، فکر کی بے لباس شاخیں، گیلے جذبے، فن کی پتی، برقی لڑکی، نورنامہ، کافی ہاؤس، ٹیڈی تہذیب، ٹیڈی فکر و نظر، ٹیڈی غزلیں، غبارہ، کتے، خونخوار بلی سنہری بیڑیاں، اسٹیشن، بدن کی بتیاں، گولی، صوفے، مسہری، بھورا لحاف، کواڑوں کی اوٹ، جذبوں کی ناگنیں، لفظوں کی بین، مادہ دنر،

برادہ، آنگن کی مہندی، سانپ، ریت، تلوے، مَن، گانے جب گئے کا بدن چاٹے، خرگوش، کوکر، ڈشیں، سناٹے کی شاخیں، خاموشی بذات خود آواز کا چہرہ ہے، پلکوں کے دیے، انجم، سرخ موی شمعیں، کھوری اینٹیں، فیتے، جس چھپر کے نیچے گاؤں کے بوڑھے حقّہ پیتے ہیں، دھوپ کا شیشہ، پیڈل، کہرے کا کمبل، بیئر، کیلے کے چھلکے، کرکار، روٹیاں ادری اٹھا کے گھاٹ پہ جانے لگے ہرن، بلڈنگ، بلدی، ناف میں پھول، ران پہ مچھلی، ایک مٹھی دھوپ، پھول سی قبر، آسماں کا زرد کتا، یاد کے بلغمی بچھونے چار دن کی چاندنی، چاند کی ڈولی، اُمس، تولیہ میں دھوپ کی خوشبو، نوبان میں چنگاری، کٹورہ، آفتاب ؛

ان لفظیات کے ماخذ زندگی کے بول چال کے الفاظ، آس پاس کی اشیاء اور مناظرِ فطرت کی وہ تصویریں ہیں جو ہمارے چاروں طرف بکھری ہوتی ہیں لیکن جن پر عام آدمی کی توجہ بہت کم مرکوز ہوتی ہے۔ ان لفظیات میں ایک خاص بات یہ ہے کہ شاعر کا تعلق اپنے گھر بار اور آس پاس کے مناظر سے اتنا گہرا اور اتنا جذباتی ہے کہ اس کی تمام تر لفظیاتی دنیا انہی اشیاء اور مناظر سے ترتیب پاتی ہے۔

اپنی نحوی ساخت کے اعتبار سے اس لفظیات پر فارسی کا ذرا بھی اثر نہیں۔ "اکائی" میں فارسی کی جو آمیزش کہیں کہیں دیکھنے کو ملتی تھی۔ "امیج" کا لفظیاتی منظر نامہ اس سے یکسر خالی ہے۔ فارسی تراکیب بھی یکسر ترک کردی گئی ہیں۔ ان کی جگہ کا، کے، کی وغیرہ ہندی طرز کے لفظیاتی رشتوں سے کام لیا گیا ہے۔ فارسی اضافت کا استعمال شعوری طور پر ترک کیا گیا ہے اور فارسی عربی الفاظ کے بجائے اردو کے عام زندگی کے الفاظ نیز دیگر زبانوں جیسے ہندی انگریزی وغیرہ کے عام فہم الفاظ کو غزل کے آہنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، "امیج" لفظیاتی تجربوں کی ایک ایسی لیبوریٹری ہے جہاں الفاظ کو تولنے پرکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ "امیج" کی لفظیات اور تجربوں کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان تجربوں کے نتائج کا تجزیہ کرکے "آمد" کی وہ لفظیات وجود میں لائی گئی جو غزلیہ لفظیات میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ "آمد" کی بھرپور

غنائیت میں "اکائی" اور "ایمیج" کے ان تجربات کا اہم حصہ ہے اور "اکائی" کی بند خوشبو "امیج" سے گزرتی ہوئی "آمد" تک پہنچتے پہنچتے بیکراں ہو جاتی ہے۔

"ایمیج" میں (IMAGES) یعنی پیکر نگاری کی بنیادی حیثیت ہے۔ حسی تجربات کی لسانی تجسیم اور پیکریت کے ذریعے ان غزلوں میں جو تصاویر ابھرتی ہیں ان پر نگاہ جم سی جاتی ہے ؎

سسکتے آب میں کس کی صدا ہے — کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے

دہکتی دھوپ سمندر ہے یہ جزیرے ہیں
گھنے درخت جو پیڑوں پہ سایہ کرتے ہیں

بید کے زرد مونڈھے پہ بیٹھی ہوئی شام سے اُٹھ کے بتی جلائی نہیں
روشنی کا فرشتہ بڑی دیر تک دستکیں دے کے واپس چلا بھی گیا

گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اُتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائیگا

دن کے سارے کپڑے ڈھیلے ہو گئے — رات کی سب چولیاں کسنے لگیں

سرمہ، مسّی، کنگھی، چوٹی بھولی ہے — سوکھے پتوں پر جو مینا بیٹھی ہے

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

سارے بدن کا تناؤ فضا میں — کسے کسے کپڑوں میں پھنسی پھنسی شام

"امیج" کے استعارے اس کی لفظیات کی دوسری بڑی خصوصیت ہیں۔ "اکائی" میں ریل

کی پٹری " دھوپ، شام، چاند، پھول، جگنو، تتلی وغیرہ تشبیہات " ایمج " کے استعاروں میں تبدیل ہو گئی ہیں ؎

حقیقت سُرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

آنگن میں ننھے ننھے فرشتے اڑیں گے جب
بھوری شفیق آنکھوں میں میں مسکراؤں گا

فاختائیں، تتلیاں، مچھلی، گلہری، بلیاں
زندگی میں آئیں اپنی کیسی کیسی عورتیں

پتھر جیسے مچھلی کے کولھے چمکے
گنگا جل میں آگ لگا کر چلے گئے
تتلی بھاگے تتلی کے پیچھے پیچھے
پھول آئے اور پھول چرا کر چلے گئے

مچھلیاں لوٹتی ہیں کاروں پر
گھوڑے اسکوٹروں کے دیوانے
اُجلے چوہے نفیس سوٹوں میں
اچھے لگتے ہیں جیسے افسانے

"آمد" بشیر بدر کی غزلوں کا تیسرا مجموعہ ہے جو اکتوبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ۱۹۷۲ء کے بعد کی غزلیں شامل کی گئی ہیں اور کچھ غزلیں " اکائی " اور " ایمج " سے منتخب شدہ ہیں جن کی لفظیات میں خاطر خواہ تبدیلی کی گئی ہے لیکن ان کی نشاندہی بعد میں۔ پہلے یہ عرض کر دوں کہ " آمد " کی لفظیات ایک عطر کی طرح ہے جو " اکائی " اور " ایمج " کے تجربات سے کشید کیا گیا ہے۔ اس عطر میں کلاسیکیت کی خوشبو بشیر بدر کے انفرادی اسلوب کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر غنائیت اور موسیقی کا ایک ایسا آہنگ تیار کرتی ہے جس کی کھنک دل و دماغ میں دیرپا تاثرات چھوڑتی ہے اور مواد، اسلوب اور آہنگ ایک شعری وحدت میں ڈھل جاتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ " اکائی " اور " ایمج " میں لفظیات کا جو دریا اونچے نیچے پہاڑی راستوں سے گذر رہا تھا وہ " آمد " میں میدانی علاقوں میں اُتر آیا ہے جہاں اس کا بہاؤ یکساں رفتار کے ساتھ ایک مقررہ سمت

کی جانب ہے۔" آمد" میں جذبات کی زیریں لہریں ایک مخصوص لفظیاتی آہنگ اور (RYTHM) کے ساتھ فن اور فکر کا حسین امتزاج پیش کرتی ہیں۔ " اکائی" اور " امیج" کے بھٹکتے، شور وغل مچاتے الفاظ " آمد" کی غزلوں میں میدانی علاقے میں بہنے والی کسی ندی کی طرح خاموشی کے ساتھ نرم سیر ہیں اور لفظیات کی گھن گرج احساس کی شدت میں تبدیل ہوگئی ہے۔" آمد" میں بشیر بدر کا لہجہ انتہائی نرم اور نازک ہے۔ اسی اعتبار سے لفظیات میں بھی (UNDERTONES) کا خیال رکھا گیا ہے اور وہ سوز و گداز جو غزل کا داخلی حصہ ہے اپنی پوری شعریت کے ساتھ مفہوم نیز اسلوب کو نمایاں کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

" آمد" میں لفظیات کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ ایک مضمون کے چند صفحات میں اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ عرض کیا جا چکا ہے کہ شاعری مجرد الفاظ سے نہیں ہوتی بلکہ ایک لفظ سے دوسرے الفاظ کے ذہنی و معنوی انسلاک کے ذریعے اپنے مخصوص شعری معنیٰ کا اظہار کیا جاتا ہے۔" آمد" کی غزلوں میں حشو و زوائد کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے اس لحاظ سے شعر کی کلیدی لفظیات ترکیب لفظی نہ ہو کر پورے مصرعے یا پورے شعر کو محیط ہے یعنی ہر شعر اپنے پورے وجود کے ساتھ شعری لفظیات کی اکائی میں تبدیل ہو جاتا ہے سادگی " آمد" کی غزلوں کا سب سے قیمتی زیور ہے۔ التزام شعری، صنائع بدائع اور علم بیان کے دوسرے تمام اجزا اس وقت پھیکے پڑ جاتے ہیں جب شاعر انتہائی سادگی سے بغیر شعری تکلفات کے، کسی جذبے کا اظہار احساس کی تمام تر شدت کے ساتھ سہل ممتنع میں مؤثر اور دلنشیں پیرائے میں کر دیتا ہے اور دو اور دو چار قسم کی تنقید دیکھتی ہی رہ جاتی ہے۔" آمد" میں تشبیہات سے لے کر علامتوں تک ہر طرح کی لفظیات موجود ہے لیکن ان کا وجود جذبے کی صداقت اور اسلوب کی بے تکلفی کے ساتھ ضم ہو کر ایک مکمل شعری وحدت کو جنم دیتا ہے اور لفظیات کی یہ کساوٹ ہی شعری لسانیات کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔

" آمد" میں بشیر بدر نے اپنے منفرد اسلوب اور انفرادی لفظیات کا کتنا خیال رکھا ہے اس کا ثبوت " اکائی" اور " امیج" کی غزلوں کے وہ اشعار ہیں جو خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ " آمد" میں دوبارہ شریکِ اشاعت کیے گئے ہیں۔ بشیر بدر کے اسلوب اور لفظیات کے ارتقائی سفر کی نشاندہی کے لیے ان تبدیلیوں کا مطالعہ ایک نہایت اہم ذریعہ

ہے۔ ذیل میں ان تبدیلیوں کا ایک سرسری خاکہ تقابلی مطالعے کے لحاظ سے درج کیا جارہا ہے جس سے لفظیات کے متعلق بشیر بدر کے تخلیقی رویے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے بھی ہیں لوگ ایوان میں — مگر پھول کاغذ کے گلدان میں (آمد ص۳۵)

ہمارے بھی ہیں لوگ ایوان میں — انگوٹھے سجے ہیں قلمدان میں (آمد ص۱۲۶)

وہ نہیں ہے تو اسکی آس رہے — ایک جائے تو ایک پاس رہے (امیج ص۲)

خوش رہے یا بہت اداس رہے — زندگی تیرے آس پاس رہے (آمد ص۵۲)

اک ذہن پریشاں میں خواب غزلستاں ہے — پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے
(اکائی ص۱۰۳)

اک ذہنِ پریشاں میں وہ پھول سا چہرہ ہے — پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے
(آمد ص۵۹)

غم وجہ فگارِ دل غم وجہ قرارِ دل — آنسو کبھی شیشہ ہے آنسو کبھی پانی ہے
(اکائی ص۱۰۲)

رونے کا اثر دل پر رہ رہ کے بدلتا ہے — آنسو کبھی شیشہ ہے آنسو کبھی پانی ہے
(آمد ص۵۹)

سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں — بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں
(اکائی ص۱۴۲)

سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں — بس ذرا وفا کم ہے تیرے شہر والوں میں
(آمد ص۶۸)

بھول کر اپنا زمانہ یہ بزرگان جدید — آج کے پیار کو معیوب سمجھتے ہونگے
(اکائی ص۲۸)

بھول کر اپنا زمانہ یہ زمانے والے — آج کے پیار کو معیوب سمجھتے ہونگے
(آمد ص۸۷)

ان اشعار میں جس طرح پرانے الفاظ کو بدلا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "آمد"

تک آتے آتے " اکائی " کا شاعر لفظیات کے کن مدارج سے گذرا ہے اور اب اس کا کیا لفظیاتی مزاج اور اسلوب ہے۔

" اکائی " میں تشبیہات کا ایک طویل سلسلہ تھا جو " ایمج " میں کچھ کم ہوا لیکن " آمد " میں پھر وہی تشبیہاتی اسلوب دیکھنے کو ملتا ہے۔ " ایمج " کے مقابلے " آمد " میں استعاروں کا استعمال کم ہوا ہے لیکن علامتی اظہار بدستور قائم ہے۔ " ایمج " کے الفاظ کو پھیلان پلک کر " آمد " کی غزلوں میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً " غزل کی سچی کتاب " اشتہار، خزاں کی زردی شال، اداس پیڑ، دھوپ کی پتیاں، نیل، مہکتے ہونٹوں کے چاند، لان، انار، جگنو، دلائیاں، پاندان، میز پوشش، پیچوان، عطردان سالہجہ، ہرن، باز، کبوتر، گلاس درویش، ریشمی شال، چڑیاں، چاول، صراحی، کھجور، دیمکوں کے قافلے، ڈور کاٹنے، بس، سوٹ، سڑک کی لال بتیاں، مزاروں پہ چادر چڑھاتی ہوئی اداسی کی بلبلیں سرائے، لاری، چھتر، کالی بلی، پشواز، پچروا، بھیڑ، دھوپ کے گجرے، گور، کھانے کی میز، گڑیا گڈے، کوہ نور، نیر، بھگوان، من مندر، نورانی داڑھی، اسٹیشن، ساجن، ساگر، گردھر ناگر، جیون، بابا، چادروں اور شامیانے، قالین، کرائے کے گھر، پگڑی، اردو والوں کا کیمپس، بھائی " وغیرہ لفظیات میں " ایمج " کے لفظیاتی تجربات کی جھلک ملتی ہے لیکن یہاں اس کی نوعیت محض تجرباتی نہیں ہے بلکہ شعر کے فکری اور داخلی آہنگ میں ان الفاظ کی اکائیاں مکمل طور پر جذب ہو گئی ہیں۔

" آمد " کی تشبیہات میں مشابہت کے ساتھ ساتھ تشبیہہ کے تلمیحی اور تہذیبی پس منظر کو پوری طرح تخلیقی سطح پر برتا گیا ہے اس طرح تشبیہات میں تہہ داری اور معنویت کا عنصر مشابہت کے اوصاف کو اور زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر " اکائی " کا ایک شعر ہے ؎

اس کی اردو میں بھی اب کے مغربی لہجہ ملا
کالے بالوں کی بھی رنگت زعفرانی ہو گئی

اس شعر میں دو تہذیبوں کے سنگم کی طرف اشارہ ہے لیکن شعر بیانیہ سے آگے نہیں بڑھ سکا لیکن اردو کے ہی حوالے سے " آمد " کا ایک بیانیہ شعر بھی اثر پیدا کرتا ہے جو تشبیہہ کی کامیابی ہے ؎

وہ عطردان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

یا اسی طرح "آمد" میں ایک اور تشبیہ ہے ؎

خاموش ہوں میں خاک اُڑتی ہے
اردو والوں کے کیمپس کی طرح

یا

شام تک کتنے ہاتھوں سے گذروں گا میں
چائے خانے میں اردو کے اخبار سا

ان سبھی اشعار میں اردو زبان و ادب کی تاریخ، اردو تہذیب اور دورِ حاضر میں اردو کی علمی و سماجی صورتِ حال پر گہری نظر رکھتے ہوئے تشبیہ سازی کی گئی ہے۔ "آمد" میں ایسی لاتعداد مثالیں ہیں جہاں مشبّہ اور مشبہ بہ کے تاریخی و تہذیبی پس منظر کو کامیابی کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہے۔ طوالت کے خوف سے یہاں چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے ؎

آنکھوں میں رہا دل میں اُتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

کوئی پھول دھوپ کی پتّیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سُنا ہوا

سُنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی
دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو

وہ جیسے سردیوں میں گرم کپڑے دے فقیروں کو
لبوں پر مسکراہٹ تھی مگر کیسی حقارت سی

بڑے تاجروں کی ستائی ہوئی   یہ دنیا دلہن ہے جلائی ہوئی

کرن پھول کی پتیوں میں دبی　　ہنسی اس کے ہونٹوں پہ آئی ہوئی
خوشی ہم غریبوں کی جیسے میاں　　مزاروں پہ چادر چڑھائی ہوئی

اس طرح ساتھ نبھنا ہے دشوار سا
تو بھی تلوار سا میں بھی تلوار سا

جس میں اپنی پرندوں سے تشبیہ تھی　　تم کو اسکول کی وہ دعا یاد ہے

یہ غزل کہ جیسے ہرن کی آنکھ میں پچھلی رات کی چاندنی
نہ بجھے خرابے کی روشنی کبھی بے چراغ یہ گھر نہ ہو

دن تو نکلا خریدا ہوا آدمی　　اے خدا رات بھی سب کی عورت نہ ہو

محبت، عداوت، وفا، بے رُخی　　کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

اب بھی چہرہ چراغ لگتا ہے　　بجھ گیا ہے مگر چمک ہے وہی

"آمد" کی یہ تشبیہات بشیر بدر کے گہرے مشاہدے اور زندگی کے وسیع مطالعے کی دین ہیں جن میں اسلوب کو خوبصورت بنانے کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی کی بے پناہ قوت کو بروئے کار لایا گیا ہے۔

"امیج" کے سلسلہ میں عرض کیا گیا تھا کہ اس کی لفظیات میں کلاسیکیت سے پرہیز روا رکھا گیا ہے اور زندگی کے نئے الفاظ کو غزل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "آمد" میں اس شعوری کوشش کے نتائج کی روشنی میں نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ (آکائی "کی مانند") کلاسیکی لفظیات اور فارسی تراکیب کی آمیزش سے غزلیہ غنائیت کی بازیافت ایک خوشگوار آہنگ کو جنم دیتی ہے۔ "آمد" میں AS IT IS WHAT IT IS کے اصول پر لفظوں کی فطری آمد کو ہی روا رکھا گیا ہے اور لفظیات کے انتخاب کی شعوری

کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اللہ ہی اللہ، خاموش پہاڑوں کی ندا، پیڑوں کی صفیں، پاک فرشتوں کی قطاریں، آنسو کی غزل حمد و ثنا، سورۂ یٰسین، غزل کی سچی کتاب، ذرا فاصلے سے ملا کرو، حسن پردہ نشیں، عاشقانہ لباس، بے حجاب، گرمیٔ شوق، خزاں کی زرد سی شال، میل کا پتھر، کوئی دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا، مہکتے ہونٹوں کے چاند، منبر، بساط، پرانی دلائیاں، پاندان کی خوشبو، میز پوش، پیچوان، زردان، عطردان، زعفران، لاالہ الااللہ، اذان، باز، تاراج و غارت، تمازت، حرارت، پیغمبر، آیت، بشارت، نوک پلک، ابرو، محترم، تحریر، تشکر، درویش، اہل کرم، کھجور کے پیڑ، سیاہی، بے ریا روحیں، قدیم قصبے، بوسوں کے چراغ، دیمکوں کے قافلے، صحیفے، کہرے کی یورش، تاجر، مزار، چادر، ایوان، مقدس مزاروں پہ قوالیاں، عطر و لوبان، نمائش، مراثے، زلفیں، تحریر و گفتگو، بینائی، سرخ سنہرا صافہ باندھے شہزادہ گھوڑے سے اترا، کالے غار سے کمبل اوڑھے جوگی نکلا، زنداں، بدگمانی، آسیب، زنجیر، گرفتار، فرشتوں کی صحبت، شکوہ گلہ، تفصیل، شہر وفا، عاشقی، قبا، دست دعا، تشبیہ، میکدہ، چراغ کا قیدی، گردِ سفر کی تہیں، سانولی شام، ستیش، چاندنی کا بدن، خوشبوؤں کا سایہ، آئینہ، بالیاں، ہار، اذنِ قیام، گرد و غبار، رحیم و کریم، صفت، محوِ خواب، خرابہ، پائمالی، انگنائی، زرد پھولوں کا قافلہ، سفینے، نام اور نمبر، شمعیں، زنداں کے اندھیرے، نغمات، سلاسل، جزیرے، ساحل، خاکسار، سوغات، ستاروں ضو، شکستوں کے ڈیرے منڈیروں پہ ہیں، فصیل، پرچم، روح و دل کی ریاضت، دلنوازی، دھوپ کا شجر، جام، تذکرہ، روایت، شہ سوار، پردۂ فن، چلمن، گلوں کو شہیدوں کا بچپن کہو، مدفن، خار و خس، سلطنت، نصاب، صبح عارض، شام گیسو، کمیں گاہ، قفس، خانقاہ، سلام و پیام، تغزل، شاداب، فراق، وصال، محال، یوسف، تاج و تخت، سرِ راہ، سرِ شام، منظرنامہ، نام نامی، وغیرہ لفظیات میں نئی لفظیات کے ساتھ کلاسیکی لفظیات کی آمیزش سے ایک نئی غزلیہ زبان وضع کی گئی ہے جو بشیر بدر کے انفرادی اسلوب سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔

پیکر تراشی "آمد" میں ایک براہِ راست بیانیہ (DIRECT NARRATION) کا ذریعہ بن گئی ہے۔ "اکائی" اور "امیج" کے پیکر یہاں اپنا ایک کردار لے کر موجود

ہوتے ہیں اور پیکر نگاری بجائے خود غزل کی نئی زبان بن جاتی ہے۔ زیادہ تر خوشبو، چاندنی، روشنی وغیرہ الفاظ کا وجودی اظہار (PERSONIFICATION) اسلوب اور لفظیات کے علاوہ مفہوم پر بھی اثرانداز ہوا ہے۔ یہ چند اشعار دیکھئے ؎

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایہ ہے
بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

پھولوں میں بسی چاندنی راتوں کی نمازیں
خوشبو ہی ستاروں کی دعا اللہ ہی اللہ

یہ خزاں کی زرد سی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

مری آنکھیں، مرے ہونٹوں پہ یہ کیسی تمازت ہے
کبوتر کے پروں کی ریشمی اجلی حرارت سی

کوئی لشکر ہے کہ بڑھتے ہوئے غم آتے ہیں
شام کے سائے بہت تیز قدم آتے ہیں

اُداسی بچھی ہے بڑی دُور تک بہاروں کی بیٹی پرائی ہوئی

کس کی خاطر دھوپ کے گجرے ان لوگوں نے پہنے تھے
جنگل جنگل روئے میرا، کوئی نہ آیا رات ہوئی

سر پہ سایہ سا دستِ دعا یاد ہے
اپنے آنگن میں اک پیڑ تھا یاد ہے

پھول کمہلا گئے آنچلوں سے کے ۔۔۔۔۔ سانولی شام میں نمک ہے وہی

"آمد" کے ان اشعار میں "خوشبو" کی مرکزی حیثیت ہے۔ بشیر بدر کی زیادہ تر پیکر نگاری "خوشبو" اور "چاندنی" کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ کئی غزلوں میں "خوشبو" ردیف کے طور پر استعمال کی گئی ہے اور "اذان کی خوشبو"، "پاندان کی خوشبو" یا "جذبات کی خوشبو"، "سوغات کی خوشبو" نیز "اکائی" میں "تلوار کی خوشبو"، "پیار کی خوشبو" وغیرہ لفظیات پیکر تراشی سے ان کے تخلیقی رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ سادگی "آمد" کا سب سے بڑا گہنا ہے۔ "آمد" میں ایسی کئی مثالیں ہیں جہاں بات کو انتہائی سادگی کے ساتھ کہا گیا ہے اور صنائع بدائع کے فقدان کے باوجود اثر آفرینی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور بشیر بدر کا انفرادی اسلوب بھی قائم رہتا ہے۔ اس مطالعے کے اختتام سے قبل ان اشعار کی مثالیں بلا تبصرہ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ؎

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

وہی شہر ہے وہی راستے وہی گھر ہے اور وہی لان بھی
مگر اس دریچے سے پوچھنا وہ درخت انار کا کیا ہوا

چڑیوں کے لیے چاول پودوں کے لیے پانی
تھوڑی سی محبت دے ہم چاہنے والوں کو

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیئے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

اک سواری آئے گی اک جائیگی   باری باری سب کی باری آئیگی

پروردگار جانتا ہے تو دلوں کا حال
میں جی نہ پاؤں گا جو اسے کچھ بھی ہوگیا

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی   یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا
رات کا انتظار کون کرے   آجکل دن میں کیا نہیں ہوتا

مندر گئے مسجد گئے پیروں فقیروں سے ملے
اک اس کو پانے کے لیے کیا کیا کیا، کیا کیا ہوا

آنسوؤں کی جہاں پائمالی رہی   ایسی بستی چراغوں سے خالی رہی

خاک جب خاکسار لگتی ہے   کس قدر باوقار لگتی ہے
صبر کر صبر کرنے والوں کی   بے بسی شاندار لگتی ہے

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو
رُک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

راستے میں کوئی کھنڈر ہو گا   شہ سواروں وہاں رُکا کرنا

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے   کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

جہاں پیڑ پر چار دانے لگے   ہوا و ہوس کے نشانے لگے
پڑھائی لکھائی کا موسم کہاں   کتابوں میں خط آنے جانے لگے

مجھ سے بچھڑ کے خوش رہتے ہو میری طرح تم بھی جھوٹے ہو

اگر واقعی تم پریشان ہو کسی اور سے تذکرہ مت کرو

بچھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں آجاتی
اسے بھی غم نہیں ہوتا مجھے بھی غم نہیں ہوتا

ہجر و وصال کے سارے قصے جھوٹے ہیں
حق ملتا ہے کس کو اپنا کہنے کا

اسی شہر میں کئی سال سے مرے کچھ قریبی عزیز ہیں
انہیں میری کوئی خبر نہیں مجھے ان کا کوئی پتہ نہیں

میں چپ رہا تو اور غلط فہمیاں بڑھیں
وہ بھی سنا ہے اس نے جو میں نے کہا نہیں

بہت سے اور بھی گھر ہیں خدا کی بستی میں
فقیر کب سے کھڑا ہے جواب دے جاؤ

(۴)

بشیر بدر کی غزلیہ لفظیات سے متعلق اس طویل بحث سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں اس کا خلاصہ اس طرح ہے :-

(۱) نئی غزلیہ لفظیات کا استعمال بشیر بدر کے اسلوب کی کلیدی اساس ہے۔

(۲) انکی لفظیات کے بنیادی ماخذ گھر بار، پاس پڑوس اور شہری زندگی کی وہ تمام زبانیں ہیں جن کے تخلیقی استعمال سے بشیر بدر کی غزلیہ لفظیات کی فرہنگ مرتب ہوتی ہے۔

(۳) ان کی لفظیات میں مشبہٌ اور مشبہٌ بہ اور انہی اعتبار سے ادوات تشبیہہ کا استعمال سب سے زیادہ ہوا ہے یعنی بشیر بدر کی غزلیہ لفظیات اور اسلوب بنیادی طور تشبیہی ہے۔

(۴) اطلاعی (INFORMATIVE) اور تعریفی (DEFINITIVE.) ساخت کی لفظیات ان کی غزلیہ لفظیات کا اہم حصہ ہے۔

(۵) ایک واقعے کو بیان کرنے کے لیے وہ ایک دوسرے واقعے کو بنیاد بنا کر دونوں کے تشبیہی عمل سے خیال کا اظہار ان کی غزلوں میں اکثر و بیشتر ہوا ہے۔

(۶) ان کی استعاراتی لفظیات میں چاند، ریل، پیڑ، سمندر، پھول، جگنو، پنجرہ، مچھلی، تتلی سورج، دھوپ، برف، سانپ، بلی، دریا، جزیرہ، سناٹا، وغیرہ اہم استعارے ہیں۔

(۷) پیکر نگاری بشیر بدر کے اسلوب کا اہم حصہ ہے اور خوشبو، نغمہ، چاندنی، پھول، دھوپ وغیرہ سے متعلق حسی تلازمے اور ان کی لسانی تجسیم ان کی پیکر نگاری کے مرکزی نشان ہیں۔

(۸) بشیر بدر کی علامت نگاری میں ریل، چائے، لان، جنگل، پیڑ، چاند، مچھلی وغیرہ نئی تہذیب، عصری الجھنوں اور شہری ماحول کی گھٹن کے عکاس ہیں۔

(۹) "امیج" بشیر بدر کے لفظیاتی تجربات کا سب سے بڑا مجموعہ ہے جس کے نتائج کی روشنی میں "آمد" کی لفظیات منتخب کی گئی۔

(۱۰) "امیج" سے قبل "اکائی" میں بھی نئی لفظیات استعمال کی گئی لیکن اس میں کلاسیکی لفظیات کا استعمال بھی کثرت سے ہوا ہے۔

(۱۱) پائمال کلاسیکی لفظیات اور فارسی تراکیب نیز فارسیت سے مکمل اجتناب اور اس کے مقابل کامیاب انفرادی لفظیات کی تخلیق بشیر بدر کا شعوری لفظیاتی پروگرام ہے۔

(۱۲) "آمد" غزل کی داخلی غنائیت اور سوز و گداز سے مملو ہے جو "اکائی" اور "امیج" کے تجربات کی روشنی میں ایک نئی زبان کی غنائیت کی شناخت کا منظر نامہ ہے۔

حوالہ جاتی اشاریہ

۱۔ "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ" مصنفہ بشیر بدر ۱۹۸۱ء مطبوعہ انجمن

ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔

۲۔ "ایک شاعر خوشبو سا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر بشیر بدر" کے عنوان سے یہ تفصیلی انٹرویو سہ ماہی "انتخاب" ٹونک (راجستھان) کے شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر محمد حسن: "ادبی تنقید" ۱۹۵۵ء لکھنؤ ص۱۹

۴۔ سلیم شہزاد: "جدید غزل کی لفظیات" ص۶۶ مطبوعہ رسالہ "نمائندہ نئی نسلیں" علیگڑھ اکتوبر ۱۹۸۵ء۔

۵۔ COLARIDGE, S.T. BIOGRAPHIA LITERARIA p. 253

۶۔ قاضی افضال حسین: "میر کی شعری لفظیات" ص۱۱

۷۔ " " " ص۱۵۷

۸۔ والی آسی: "آمد" کا پہلا فلیپ کور، مطبوعہ مکتبہ دین و ادب، لکھنؤ اکتوبر ۱۹۸۵ء

۹۔ بشیر بدر: "آمد" کا پیش لفظ ص۱

۱۰۔ "اکائی" میں یہ مصرعہ اس طرح ہے ع "دل ہمارا بھی شہرِ دلی ہے"

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

جمیل جالبی

گذشتہ دس بارہ سال سے بشیر بدر کی غزلیں نیا دور میں شائع ہوتی رہی ہیں مجھے یاد ہے کہ جب ان کی غزلیں پہلی بار نیا دور میں اشاعت کے لیے آئی تھیں تو ان کے لہجے کے چونکا دینے والے نئے پن نے جس میں احساس و فکر دونوں تازہ بتازہ سے تھے مجھے متاثر کیا تھا شعر پڑھتے وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑنے کا احساس ہوا تھا۔ اس غزل میں دو چیزیں تھیں اپنے زمانے کا احساس اور دوسرے اپنی روایت سے گہری وابستگی یہی خصوصیت ان کی ساری غزلوں میں رنگ بھرتی رہی ہے۔ شروع کی غزلوں میں ان کے ہاں تجربہ سمٹ کر آتا ہے بعد کی غزلوں میں یہ تجربہ پھیلتا نظر آتا ہے۔

بشیر بدر کی آواز میں ایک نیا پن ہے۔ ان کے ہاں نغمگی بھی ہے اور عہد حاضر کی آواز بھی ان کے لہجے میں دل کو موہ لینے والی ایک ایسی جاذبیت ہے کہ یہ مجموعہ جدید اردو غزل میں قابل ذکر اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ (اکائی پر تبصرہ / نیا دور کراچی ص: ۳۱۳ - ۳۱۴)

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

بشیر بدرؔ
اظہار کی نئی جہت

احتشام اختر

بشیر بدر رنگ اور خوشبو کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری نکہتِ گل اور تتلیوں کے پروں کی طرح خوبصورت نازک اور لطیف ہے۔ غزل کے آسمان میں بشیر بدر کی شاعری دھنک کی طرح ہے۔ تتلیوں کے پروں کی نزاکت نکہتِ گل کی لطافت اور سات رنگوں کی یہ دھنک ان کے ہاں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھی خوشگوار اور شیریں بنا دیتی ہے۔ قاری کے دماغ کو ان کی شاعری معطر کرتی ہے اور دل کو فرحت دیتی ہے گویا بشیر بدر کی شاعری روح افزا شاعری ہے۔ ان کی شاعری زندہ رہنے اور زندگی سے پیار کرنے کی امنگ اور ولولہ پیدا کرتی ہے۔ میرے خیال میں حیات پرور متحرک اور عہد آفریں شاعری کی پہچان بھی یہی ہے۔

دل درد میں ڈوبا ہوا پھولوں کا بدن ہے
سانسوں میں رچی ہے تری سوغات کی خوشبو

ہلکی ہلکی بارشیں ہوتی رہیں
ہم بھی پھولوں کی طرح بھیگا کریں

چاند چہرہ، زلف دریا، بات خوشبو، دل چمن
اک تمہیں دے کر خدا نے دے دیا کیا کیا مجھے

دوڑتے ہیں پھول بستوں کو دبائے
پاؤں پاؤں تتلیاں سے چلنے لگیں

رات اِک تالاب کے آئینے میں
جھلملاتی کشتیاں چلنے لگیں

خوشبو کو تتلیوں کے پروں میں چھپاؤں گا
پھر نیلے نیلے بادلوں میں لوٹ جاؤں گا
دیوانہ وار مجھ سے لپٹ جائے گی ہوا
میں سُرخ سُرخ پھولوں میں جب مسکراؤں گا

پکے گیہوں کی خوشبو چیختی ہے
بدن اپنا سنہرا ہو چکا ہے

بشیر بدر کی شاعری میں کلاسیکیت بھی ہے ترقی پسندی کے عناصر بھی ہیں اور جدیدیت کی لے بھی۔ ان کی شاعری زندگی اور سماج کے متنوع اور متضاد خیالات احساسات اور رجحانات کی ترجمان ہے یہ دنیا اور خود حضرت انسان کی ذات تضادات کا مجموعہ ہے۔ اگر رات نہ ہو تو دن کی کیا اہمیت۔ اگر کالا نہ ہو تو گورے کی کیا قدر و قیمت! اعلیٰ شاعری کی پہچان یہی ہے کہ وہ حال ماضی اور مستقبل کا آئینہ ہوتی ہے۔ ادب کی کچھ قدریں ایسی ہوتی ہیں جو ابدی اور آفاقی ہوتی ہیں۔ بشیر بدر کی شاعری ابدی اور آفاقی قدروں کی حامل ہے۔ چنانچہ بشیر بدر کی شاعری پر کسی قسم کا لیبل لگانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں میں چند اشعار پیش کرتا ہوں جن میں کلاسکی رنگ بھی ہے اور جدیدیت اور ترقی پسندی کے عناصر بھی شامل ہیں ؎

ہم دلی بھی ہو آئے ہیں لاہور بھی گھومے
اے یار مگر تیری گلی تیری گلی ہے

اب تو تنہائیاں بھی کہتی ہیں
ہے ترا بھی کوئی صنم بابا

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

راہیں روایتوں کی اگر روندنے چلوں
سر پر مجھے بزرگوں کا دامن بھی چاہیئے

سناٹے آئے درجوں میں جھانکا چلے گئے
گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

ڈالی گلاب کی مرے سینے سے آ لگی
جھٹکے کے ساتھ کار کا رُکنا غضب ہوا

چڑھا کے پیٹھ پہ بکری کے بچے گھر میں گئے
یہ دُنیا اب ہمیں سرکس کا شیر کر دے گی

عرق نچوڑنے والی مشین پیاسی ہے
ابھی ہمارے بدن سبز کچے کچے ہیں

پھول سا کچھ کلام اور سہی ؛ اِک غزل اس کے نام اور سہی

دن میں دفتر کا قلم مل کی مشینیں سب ہیں ہم
رات آئے گی تو پلکوں پہ ستارے آئیں گے

اخبار میں تو ایسی کوئی خبر نہیں تھی ؛ جلسے مکان جھوٹے افسانے کہہ رہے تھے

ہم کیا جانیں دیواروں سے کیسے دھوپ اُترتی ہوگی
رات رہے باہر جانا ہے رات گئے گھر آنا بابا

بشیر بدر نے غزل کے مزاج کو بدلا ہے۔ غزل کی لفظیات اور تلازمات کو بدلا ہے اور ان میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ پرانے استعارات اور الفاظ کو نئی معنویت عطا کی ہے۔ بشیر بدر کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے انگریزی کے الفاظ کو غزل کی زبان میں سمونے اور غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے اگر انگریزی کا لفظ غزل میں عدم احتیاط اور خوش اسلوبی سے نہ استعمال کیا جائے تو غزل کا شعر ہزل بن جاتا ہے۔ چنانچہ اکبر الہ آبادی کے مزاح کی بنیاد ہی انگریزی الفاظ ہیں۔ مزاحیہ شاعری کے لیے تو انگریزی الفاظ بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں اور ان [illegible] ہے لیکن غزل میں انگریزی الفاظ کے ذریعہ تغزل کا رنگ پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بشیر بدر نے یہ مشکل کر دکھایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

یہ زعفرانی پل اوور اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

ڈالی گلاب کی مرے سینے سے آلگی — جھٹکے کے ساتھ کار کا رُکنا غضب ہوا

تھکے تھکے پیڈل کے بیچ چلے سورج — گھر کی طرف لوٹی دفتر کی شام

وہ جیسے ہی داخل ہو سینے سے مرے لگ کر
تم کوٹ کے کالر پر اک پھول سجا دینا

انگریزی الفاظ کے ساتھ ساتھ بشیر بدر نے ہندی الفاظ کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ فارسی تراکیب اور اضافتوں سے انھوں نے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ ان کی غزلوں کی زبان آسان اور سلیس ہے اسی لیے عوام سے قریب تر ہے۔ ان کے کلام کی سلاست اور روانی ان کو مشاعروں میں بھی مقبولیت عطا کرتی ہے۔ بشیر بدر کا کلام عوام

وخواص دونوں میں یکساں طور پہ مقبول ہے ؎

صدا کی دھوپ نہ چمکے تو گھر اجڑ جائے ۔۔۔ وشال مندروں میں گھنٹیوں سے عظمت ہے

تمام رات یہ اسٹیشنوں پہ بھٹکیں گے ۔۔۔ ہرے درختوں سے پنچھی اگر اُڑا دو گے

پیار کی گہری جھنکاروں سے سارا بدن آکاش ہوا ہے
دودھ پلانا تن ڈسوانا ہے دستور پرانا بابا

عشق کا تصور میر کے کلام میں بھی ہے اور اقبال اور غالب کے کلام میں بھی ہے اور مومن اور داغ کے ہاں بھی تصورِ عشق موجود ہے لیکن ان تصوراتِ عشق کی صورتیں مختلف ہیں۔ عشق ایک فطری جذبہ ہے اور بشیر بدر اس جذبے سے اچھوتے کیسے رہ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے عشق کو جدید تناظر میں دیکھا ہے اور پیش کیا ہے۔ بشیر بدر کے تصورِ عشق میں مومن اور داغ کی جذباتیت اور اکہرا پن نہیں ہے ان کے تصورِ عشق میں میر کا سوز و گداز غالب کا فکری حجم اور اقبال کا تعقل شامل ہے ؎

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے ۔۔۔ انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

وہی خط کہ جس پہ جگہ جگہ دو مہکتے ہونٹوں کے چاند تھے
کسی بھولے بسرے سے طاق پر تہہِ گرد ہوگا دبا ہوا

میرے ہونٹوں پہ تیری خوشبو ہے ۔۔۔ چھو سکے گی انھیں شراب کہاں

بہت دنوں سے مرے ساتھ تھی مگر کل شام
مجھے پتہ چلا وہ کتنی خوبصورت ہے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

فاختائیں تتلیاں مچھلی گلہری بلیاں
زندگی میں آئیں اپنی کیسی کیسی عورتیں

زندگی کے اداس قصّے میں : ایک لڑکی کا نام اور سہی

نیا تجربہ کرنے اور کچھ نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش میں بشیر بدر کے بعض اشعار بہت سپاٹ ہوکر رہ گئے ہیں اور ابہام کی حدوں سے نکل کر اہماں کی سرحدوں میں داخل ہوگئے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے نثری غزل کا بھی تجربہ کیا تھا لیکن ان کا یہ تجربہ کوشش ناکام بن کر رہ گیا۔ امیج میں اس قلم کے تجرباتی اشعار کی تعداد زیادہ ہے لیکن 'آمد' میں اور 'اکائی' میں ہمیں خاصہ توازن اور اعتدال نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر 'امیج' سے میں چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

ہیٹر میں بجھی بجھی بیمار سرسوں — پانی تو پانی ہے کیسے کھول جائے

چونچ پتھر کی ہل نہیں سکتی — گھاس میں ایک سُرخ کیڑا ہے

ناف میں پھول ران پر مچھلی — تتلیاں سو رہی ہیں گالوں پر

ایک خرگوش برف پر لیٹا — اک گلہری کا سر دتن چاٹے

اگر مجھ کو کرنوں کے نیزے لگے — میں کتے کو کچا چبا جاؤں گا

تیر رہی ہے آگ کی مچھلی سینے میں
تم سمجھے تھے شاید برف کی برنی ہے

بلیاں کرسیوں پہ آبیٹھیں — زنگ آلود چمچے کھنکانے

رطب و یابس کس کے کلام میں نہیں ہوتا؟ ہر بڑے شاعر کے ہاں خراب شعر بھی مل

جاتے ہیں۔ لیکن ایک اچھے شاعر کی قدر و قیمت کا تعین اس ہلکے خراب اور کمزور اشعار کی بنیاد پر نہیں بلکہ اچھے اور معیاری اشعار سے ہوتا ہے۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ بشیر بدر کے مذکورہ بالا اشعار ناپختہ کار ذہن کی پیداوار ہوں۔ انھوں نے اکائی سے لیکر آمد تک ایک طویل شعری سفر طے کیا ہے بلکہ اکائی کی اشاعت کے دس بارہ سال پہلے سے وہ رسائل میں چھپ رہے تھے۔ بشیر بدر اپنے ہم عصروں میں اپنی عمر اور اپنی شاعری کی عمر کے لحاظ سے معمر اور بہت سینیر شاعر ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے اس قسم کے اشعار شعوری طور پر کہے ہوں۔ کیونکہ آزادی کے بعد سے لیکر اب تک انھوں نے مختلف ادبی تحریکوں اور رجحانات کا اثر قبول کیا ہے۔ چنانچہ میں نے جیسا کہ اوپر کہا کہ شاعر کی عظمت اور معیار کا تعین اس کے اچھے اشعار کی بنیاد پر ہوتا ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ بشیر بدر کے شعری مجموعوں میں خوبصورت اور معیاری اشعار کی تعداد کم نہیں ہے۔

بعض شاعر ایسے ہوتے ہیں جو اپنے صرف ایک شعر کی بدولت دنیائے شاعری میں حیاتِ جاوداں حاصل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ راجہ رام نرائن موزوں اپنے اس شعر کی وجہ سے امر ہو گئے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اردو زبان جب تک زندہ ہے موزوں کا یہ شعر زندہ رہے گا اور خود موزوں زندہ رہیں گے، اپنے اس اکلوتے شعر کی بدولت۔ یہی بات بشیر بدر کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے اگر بشیر بدر کچھ نہ کہتے اور صرف یہی ایک شعر کہتے تب بھی وہ ہمیشہ زندہ رہتے۔ صرف یہی ایک شعر انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا ؎

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

اِدھر کچھ عرصہ سے بشیر بدر کی ”انا پسندی“ موضوعِ گفتگو اور موضوعِ بحث رہی ہے اور ان کی خود ستائی کا لہجہ یا ان کا اپنے بارے میں LOUD THINKING کا سا انداز لوگوں کو ناگوار گزرا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو تعلّی تو شعرا کی روایت رہی ہے اور مقطع میں تعلّی یا خود ستائی اچھی سمجھی جاتی رہی ہے۔ خود میر بھی اپنے زمانے کے شاعروں

کو خاطر میں نہیں لائے اور شاعروں کی تعداد ان کی نظر میں ڈھائی یا پونے تین ہی تھی پھر شاعر کا حساس اور خود دار ہونا تو نہایت ضروری ہے۔ اس لیے بشیر بدر اگر نقادوں اور شاعروں کو خاطر میں نہیں لاتے تو کچھ غلط نہیں کرتے۔

واقعی دونوں بہت مظلوم ہیں نقاد اور
ماں کہے جانے کی حسرت میں سُلگتی عورتیں

تفصیل کیا بتائیں ہمارے بھی عہد میں
تعداد شاعروں کی وہی پونے تین ہے

معترضین کے اعتراضات سے بشیر بدر کا ادبی وقار کم نہیں ہوگا۔ مجموعی طور سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف آخر کی اردو غزل گوئی کا جائزہ لیتے وقت ایک طالب علم نقاد اور محقق کے لیے بشیر بدر کی شاعری کا مطالعہ ضروری ہوگا۔

وارث کرمانی

.....ذہانت اور فکری حسن میں ازلی رشتہ ہے اس کے ثبوت میں بشیر بدر کے یہ شعر دیکھے جا سکتے ہیں۔

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل گھنی — جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انہیں کچھ ہنسی آ گئی — بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

کوئی کتبہ نہیں ہے سر راہ ہم جس پہ اقوال زریں بدلتے رہو
ہم تو آنسو ہیں پلکوں پہ رکھ لو ہمیں جب اشارہ کرو ٹوٹ جائیں کہیں

تیرے اور میرے پیار میں اکثر سارے جذبات مشترک ہیں مگر
دھوپ کتنی ہی مہرباں ہو جائے یہ کبھی چاندنی نہیں ہوتی

بشیر بدر سو فیصدی غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں گیتوں کی بزم موسیقی کا ایسا رچاؤ ملتا ہے جو بے ساختہ انہیں ہماری نظروں میں عزیز و محترم کر دیتا ہے ....
بشیر بدر اس گروہ کے بہترین غزل کہنے والوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

(اردو غزل - اردو ادب آزادی کے بعد، ص: ۱۰۲-۱۰۳، مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سیمنار)

بشیر بدر اور نئی اردو غزل

اشہر ہاشمی

ڈاکٹر جاوید تہاں نے شاعری کی تاریخ میں نام محفوظ کرا لینے کے لیے صرف "ایک شعر" کی بہت نرم شرط قائم کی ہے اور بشیر بدر کا تقریباً "ہر شعر سلگتا ہوا شعر" ہے پھر بھی بشیر بدر ایک اندیشے کا اظہار کرتے ہیں ؎

ہماری شہرتوں کی موت بے نام و نشاں ہوگی
نہ کوئی تذکرہ ہوگا نہ کوئی داستاں ہوگی

اس شعر میں شہرتوں کی بے نام و نشاں موت کی پیشین گوئی کر کے ڈاکٹر بشیر بدر نے کم از کم اس کا اقرار کرلیا ہے کہ وہ شہرت کو دائمی نہیں سمجھتے مگر منصوبہ بند، ایماندارانہ اور ثمر آور کاوشوں کی حیاتِ جاوداں کے قائل وہ بھی ہیں جس کا اظہار انہوں نے اس شعر

حرف اک خواب تھی جدید غزل
ناز کر ہم سے بے کمالوں پر

میں کردیا ہے۔ "ہم" کا صیغہ جمع متکلم کا ہے اس سے بشیر بدر نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ 'ہم' یہاں بشیر بدر نے شاید اپنے ہی لیے استعمال کیا ہو مگر یہ لفظ اس وسعت کے ساتھ استعمال ہوا ہے کہ دوسروں کے علاوہ ان صاحبانِ کمال میں ناصر کاظمی اور باقی منیر نیازی، ندا فاضلی، شہریار، ظفر اقبال، احمد مشتاق، مظہر امام، قیصر شمیم، حسن نعیم، پرکاش فکری مظفر حنفی، باقر مہدی، عمیق حنفی، محمد علوی، سلطان اختر اور مخمور سعیدی کا بھی احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ بشیر بدر کی شاعری کا ان شاعروں کے ساتھ موازنہ کرنا بے سود ہوگا اس لیے کہ بشیر بدر کا رویہ ان تمام ممتاز و منفرد شعراء سے قدرے مختلف ہے۔ بشیر بدر خالص ہندوستانی اردو کو غزل کی زبان بنانے کا مشن لے کر چل رہے ہیں۔ ان شعراء اور بشیر بدر کے درمیان

بنیادی فرق فارسیت کے ردو قبول کا ہے۔ بشیر بدر اُردو کو فارسی اور عربی کے اثر سے پاک کرنے کی کوشش میں ہیں اور اردو غزل کے دامن میں ایسے الفاظ کو گہر پارے بنا کر ڈالتے چلے جانے کی کامیاب سعی کر رہے ہیں جو دوسری زبانوں سے تو آئے مگر اردو میں ایسے کھپ گئے کہ ان میں سے ہر لفظ کو تھوڑی سی شعری جرأت کے ساتھ غزل میں سمویا جا سکتا تھا۔ سوال ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں پہل بشیر بدر نے کی یا یگانہ چنگیزی نے ہ۔ یگانہ نے ایسے ناہموار اور تغزل پر بار لفظوں کو شعری زبان سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی. جو اس سے قبل غزل کی زبان کے لیے ناموزوں سمجھے جاتے تھے مگر یگانہ کی غزلوں میں وہ الفاظ آج بھی کراہتے محسوس ہوتے ہیں جبکہ بشیر بدر نے شعریت سے محروم جس لفظ کو بھی سمیٹا اسے غزل کے سامنے خود سپردگی کا ہنر پہلے سکھایا لہٰذا کامیاب پہل کا سہرا بشیر بدر کے سر جاتا ہے ؎

اگرچہ بشیر بدر نے اس قسم کے اشعار کہے ہیں ؎

سر پہ سایہ سا دستِ دعا یاد ہے
اپنے آنگن میں اک پیڑ تھا یاد ہے

دل پر بھی تھیں گردِ سفر کی تہیں
کاغذ پہ انگلیوں کا نشاں کوئی بھی نہ تھا

کبھی حسن پردہ نشیں بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں، مرے ساتھ تم بھی چلا کرو

دل وہ درویش ہے جو آنکھ اُٹھاتا ہی نہیں
اس کے دروازے پہ سو اہلِ کرم آتے ہیں

مرے بازوؤں میں تھکی تھکی ابھی محوِ خواب ہے چاندنی
نہ اُٹھے ستاروں کی پالکی، ابھی آہٹوں کا گذر نہ ہو

چھوڑ آیا ہوں زمین و آسماں　　　فاصلہ اب اور کتنا رہ گیا

جن میں فارسی اضافت سے ایک مرکب لفظ استعمال ہوا مگر حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان کے شعروں کی زبان بالکل سادہ، سلیس اور عام فہم ہو۔ ان کے سامنے محض اردو غزل کا قاری یا سامع نہیں رہا۔ انہوں نے غزل کے کروڑوں شیدائوں کا لحاظ رکھتے ہوئے غزل کو ہر کسی کے لیے قابلِ قبول بنانے کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اپنے مشن میں وہ اب تک کامیاب ہیں۔ بشیر بدر نے غزل کی زبان پر بات کرتے ہوئے کتابی اُردو اور اُردو، اردو غزل اور غزل جیسے سوالات بھی اُٹھائے ہیں۔ ان امور پر بحث کے اور بھی مواقع آئیں گے مگر آج جہاں غزل کی بے پناہ مقبولیت کا دور ہے وہیں غزل کے ساتھ غیر شاعرانہ سلوک کا بھی زمانہ ہے۔ آج بشیر بدر اپنی کوششوں سے غزل کو گھر گھر پہنچانے میں کوشاں ہیں تو ایسے شاعر بھی ہیں جو غزل کے حوالے سے مگر کسی غزل سنگر کی مقبولیت کو کلید بنا کر گھر گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔ غزل اسٹیٹس سمبل کیا بنی اس سے ناشاعروں کا نام بھی وابستہ ہونے لگا۔ اب غزل گائیکی بعض شعرا کا محبوب موضوع بنتی جارہی ہے۔ کسی مغنیہ کے غزل کیسٹ پر تحسینی کلمات میں تبصرے لکھ کر چھپوانے کا رجحان پہنچنے بھی لگا ہے۔ پہلے غزل سنگر شاعر کو ڈھونڈتا تھا۔ اب غزل گو سنگر کی تلاش میں ہے۔ فلم "آمرے" کی غزلیں سنئے تو سر دھننے کے بجائے سر پیٹنے کو دل چاہے، اس فلم میں غزل کے نام پر جو بھیانک چیز سازوں پر صدابند کی گئی ہے وہ اگر غزل ہے تو اردو غزل کی ۴۰۰ سالہ روایت ایک پل میں ریزہ ریزہ ہوکر بکھر چکی ہے۔ ایسے میں اگر بشیر بدر غزل کی اعلیٰ روایتوں کا احترام عروض و فن کی پابندی کرتے ہوئے غزل کو اپنا ہندوستانی حسب نسب دے کر اکیسویں صدی میں لے جارہے ہیں تو ان کی غزل نہ صرف توجہ کی مستحق ہے بلکہ لائقِ تحسین بھی۔

میرے ساتھ مشکل یہ ہے کہ نہ تو ڈاکٹر شریف ارشد کی طرح بشیر بدر کو "ناصر کاظمی کے بعد جدید تر غزل کا سب سے بڑا اسٹیبلشمنٹ" مان سکتا ہوں، نہ ہی قاضی افضال حسین کی طرح غزل کی نئی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے انہیں کسی شمار قطار میں نہیں رکھنے کی جرأت مجھ میں ہے۔ میرے لیے بشیر بدر نئی اردو غزل کے ایک محترم اور معتبر شاعر ہیں جن کے فکر و فن کی گرفت سے قاری یا سامع تو خیر بچ ہی نہیں سکتا شعراء کا بھی ایک گروپ ان کے زیر اثر آئے بنا نہیں رہ سکا ہے۔ بعض دیگر مقبول شعراء کی زبان پر

"مصنوعی زبان" کی تہمت دھرنے والے کچھ ایسے ناپختہ اذہان کے قلمکار بھی ہیں جنہوں نے بشیر بدر کی کتابی اُردو اور اردو کی بحث کو پوری طرح ڈائجسٹ کئے بغیر نے کرنا شروع کر دیا مگر ان کی شاعری اسلوب اور فکر دونوں اعتبار سے بشیر بدر کی کھلی پیروی ہے۔ نہ صرف نظام فکر بشیر بدر سے ادھار لیا ہے بلکہ الفاظ کی وہ دنیا بھی جس میں جہاں دعا کو آنسوؤں میں کھلا پھول کہتے ہیں تو غزل کا لہجہ دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا پھول بنے مگر تقلید میں تخلیق والا انداز نہ پہلے کبھی پایا گیا نہ اب پایا جا سکتا ہے۔ بشیر بدر نے شروع سخن سے اپنی وابستگی کے ابتدائی دنوں ہی میں اپنا اسلوب، اپنا لہجہ اور اپنی زبان طے کر لی تھی اور غزل کے پورے سرمائے کو سامنے رکھ کر اپنی ایک الگ آواز بنانے کی منصوبہ بند کوششوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے غزل پر فارسیت کے غلبے کے خلاف بغاوت کی بشیر بدر کے یہاں عربی اور فارسی کے اثر سے آزاد اُردو کا استعمال اور غزل میں ایسے الفاظ کو شعریت کے ساتھ شامل کرنے کی کوشش میکانکی عمل نہیں جو دوسری زبانوں بالخصوص انگریزی اور ہندی سے اردو میں آئے اور روانی سے روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہونے لگے۔ غزل کے ایسے ہی اشعار میں بشیر بدر کے اس دعوے کی ٹھوس دلیل موجود ہے کہ:۔

ہم سے پہلے غزل میں انگریزی سے آیا ہوا کوئی اردو لفظ غزل کو غزل بنا دتیا وقت وقت سے بدلتے ہوئے مزاج اور ہماری شعری جسارت نے ان اشعار کو غزل کی رمزیت۔ تہہ داری حسن و وقار عطا کیا۔

ایک آہٹ سی نزدیک آتی ہوئی   لان میں شام کا پھول کھلتا ہوا

سنسان راستوں سے سواری نہ آئے گی
اب ڈھول میں اَٹی ہوئی لاری نہ آئے گی

کھانے کی اک میز ہمارے گھر ہوتی   گوَر لحافوں کے اکثر بدلے جاتے

جو کوئی دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے   وہ زعفرانی پلوور اسی کا حصّہ ہے

اپنا ٹیپ بجا کر کوا سنتا ہے سب کو اپنی بولی اچھی لگتی ہے

مچھلیاں ٹوٹتی ہیں کاروں پر گھوڑے اسکوٹروں کے دیوانے

سبز پتے دھوپ کی یہ آگ جب پی جائینگے
اجلے فر کے کوٹ پہنے کالے جاڑے آئینگے

وہ جو پھول چمکتا ہے اس ٹہنی پر ہاتھ آئے تو پھول نہیں تو تتلی ہے

عیب پُرانے گھر کا یہ ہی ہے بابا کوئی آئے نہ آئے گھنٹی بجتی ہے

شاور کے نیچے کھلتی جاتی ہے شام میری آنکھوں پر ایک ٹاول لپٹی ہے

دومنٹ میں کوکر کی سات ڈشیں اُنگلیاں اب غزل کا فن چاٹے

ان شعروں میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ لان، لاری، کورٹ، پل اوور، ٹیپ، کار، اسکوٹر، فر، شاور، ٹاول، کوکر، ڈشیں بشیر بدر کی غزل میں شامل ہونے سے قبل یقیناً شعریت سے عاری تھے۔ بشیر بدر نے انہیں حسن تغزل بخشا اور شعروں میں شامل کریں۔ اس سے غزل کی ایک بالکل نئی فضا بنی ہے اور نئی غزل کو بشیر بدر سے "بے کمائوں"، پر اسی لیے ناز کرنا چاہیے کہ اس کی تجسیم کے لیے جو ماحول درکار تھا وہ بشیر بدر نے نہ صرف تیار کیا بلکہ عام بھی بنا دیا۔ بشیر بدر کی غزلوں میں غزل کے روایتی داخلی اور خارجی ماحول سے مختلف ایک مکمل نئی فضا ملتی ہے اسکی وضاحت کے لیے ایک چھوٹی سی مثال لی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ دوسروں کے یہاں بھی ہو مگر بشیر بدر کے یہاں بدلتے ہوئے سماجی رویّوں کی عکاسی کے لیے جام کی جگہ لینے گلاس آگیا ہے ۔

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کردے

اُداس رات ہے کوئی تو خواب دے جاؤ
مرے گلاس میں تھوڑی شراب دے جاؤ

دونوں اشعار میں جام کا محل ہے۔ روایتی غزل گو حتیٰ کہ ترقی پسند شاعر بھی کسی الجھن میں پڑے بغیر جام ہی لکھتا "تو مجھ کو جام بڑے دے" "یا" ہمارے جام ہیں" مگر بشیر بدر نے جس بے تکلفی سے گلاس استعمال کیا ہے وہ بدلتے ہوئے ماحول اور تبدیل شدہ مجلسی آداب کے تقاضے پر کھری اترتی ہے۔ دونوں اشعار میں گلاس قافیے کی رعایت سے بھی نہیں آیا جیسے (شاید ساقی فاروقی کا مصرع) وہ رات کاٹی ہے جب ہاتھ میں گلاس نہ تھا۔ نئے ماحول اور نئے مجلسی رویوں میں انگریزی الفاظ کے اُردو بننے اور پھر شعر کی زبان میں تبدیل ہونے کا عمل یوں تو احمد فراز کے یہاں بھی ہے۔ ایک محاورہ 'THERE ARE MANY SLIPS BETWEEN COD AND LIPS احمد فراز نے اپنی غزل کے ایک مصرع میں یوں سمویا ہے ؎

جام سے لب تک ہزاروں جنبشیں ہیں

اس طرح بشیر بدر کے یہاں" ذرا فاصلے سے ملا کرو (KEEP DISTANCE) کا اردو روپ ہے۔ اس تبدیلی کو بشیر بدر مغرب کے رویے اور انگریزی زبان کے کسی فقرے کا سوسال میں غزل ہونے کا داخلی عمل قرار دیتے ہیں۔ بشیر بدر کا ذرا فاصلے سے ملا کرو (KEEP DISTANCE) کا اُردو روپ ہے تو کسی نے KEEP SAFE DISTANCE کو یوں غزل کا مصرع بنانے کی سعی کی ہے ؎

میں سب سے رکھتا ہوں محفوظ فاصلہ قائم

مگر یہ طے ہے کہ اس نئی تبدیلی کا آغاز، جس کے نتائج یقیناً دور رس ہیں، بشیر بدر سے ہوا۔ ان کی غزلوں کی بے پناہ مقبولیت نے دوسرے ہمعصر شعراء کے یہاں اس رویے کو اپنانے میں رہی سہی جھجک بھی ختم کردی۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے کہیں 'میل' اور 'کلومیٹر' کا معاملہ بھی اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ میل ابھی تک استعمال ہو رہا ہے اگرچہ اس کی جگہ کلومیٹر آگیا ہے مگر غزل کلومیٹر کا مرحلہ درست وقت آنے پر طے کرے گی۔ اگر یہ سوال غزل کے حوالے سے نہیں بلکہ پوری شاعری کے حوالے سے اٹھتا تو یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ اردو نظم کلومیٹر کا مرحلہ برسوں پہلے طے کر چکی ہے۔ تنگنائے غزل میں سہ حرفی 'میل' کی جگہ سات حرفی

"کلو میٹر" کی گنجائش نکلنے میں یقیناً اب تک کامیابی نہیں ہوئی۔ میل کی جگہ غزل میں کلو میٹر کے آنے میں تاخیر کا احساس جس طرح بشیر بدر کو ہوا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے تمام الفاظ کی کمیسٹری کھنگال چکے ہیں جنہیں وہ غزل بنانا چاہتے ہیں یا جن الفاظ میں غزل کی زبان کا ہمسفر بننے کا امکان ہے۔

غزلوں میں بالکل نئی فضا، نئے معاشرے کی جھلک، نئے رویوں کی عکاسی جس جرأت کے ساتھ بشیر بدر کی غزلوں میں ہو رہی ہے اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ روایت سے ان کا انحراف کوئی اتفاقیہ حادثہ نہیں۔ سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔ انہوں نے نہ تو تقلید میں لفظوں کو کسی اور طے کردہ معنی میں استعمال کیا نہ لفظ اور معنی کے درمیان اتنا بعد پیدا کر دیا کہ قاری کو تفہیم کے لیے بہت زیادہ ذہنی ورزش کرنی پڑی۔ ان کی غزل ترسیل کے المیے کا شکار ہوئی ہے مگر کہیں کہیں کیوں کہ ابلاغ کی سطح ایک نہیں، مختلف ہے۔ کہیں ایک دشوار شعر بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے، کہیں ایک سیدھا سادا شعر مبہم کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے بشیر بدر کی غزلیں دو متوازی لہروں میں چلی ہیں۔ ایک تو بالکل عام سیدھے سادے قابل فہم، زود اثر اشعار جیسے کہ ؎

ایک لڑکی بہت سے پھول لیے　　دل کی دہلیز پر کھڑی ہوگی

محبوب کا در ہو کہ بزرگوں کی زمیں　　جو چھوٹ گیا پھر اسے مڑ کر نہیں دیکھا
بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑینگے　　اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

ستاروں کی طرح سے چراغوں کی لو تک　　تمہیں ہم ملیں گے جہاں رات ہوگی

مجھے پڑھنے والا پڑھے بھی کیا، مجھے لکھنے والا لکھے بھی کیا
جہاں نام میرا لکھا گیا، وہاں روشنائی الٹ گئی

خوبصورت سی پیروں میں زنجیر ہو　　گھر میں بیٹھا رہوں میں گرفتار سا

ایک لڑکی ایک لڑکے کے کاندھے پر سوئی تھی
میں اجلی گہری دھند میں یادوں کی کھو گیا

تم کو اسکول کی وہ دعا یاد ہے　　جس میں اپنی پرندوں سے تشبیہ تھی

مجھ سے کیا بات لکھانی ہے کہ اب میرے لیے
کبھی سونے کبھی چاندی کے قلم آتے ہیں

"آمد" کی غزلوں میں یہ سلاست اور متانت پچھلے دونوں شعری مجموعوں "اکائی" اور "امیج" کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ دوسری طرف ذرا سے پیچیدہ، بظاہر ابہام زدہ مگر نئے امکانات کے حامل نئی اشعار بھی کہے

ناگن جیسی ایک لکیر چمکتی ہے　　تین سمندر، دو صحرا [illegible] کے آگے

کالی بلی سر پر رکھ کر آئے گی　　تھوڑی دیر میں ایک چراغوں کی تھالی

سمندر بوڑھے ہو جائیں گے تو ایک فاحشہ مچھلی
ہمارے ساحلوں اور جنگلوں کی حکمراں ہوگی

گھاس میں ایک سُرخ کیڑا ہے　　چونچ پتھر کی ہل نہیں سکتی

کچے پھل کوٹ کی جیب میں ٹھونس کر جیسے ہی میں کتابوں کی جانب بڑھا
گیلری میں چھپی دوپہر نے مجھے توڑ کر ناریل کی طرح پی لیا

بھی ہیں۔ یہ متوازی لہر بشیر بدر کی غزلوں کی خصوصیت ہے مگر آپس میں ایک دوسرے سے کہیں برسرِ پیکار کہیں ایک دوسرے کو آگے بڑھاتی ہوئی دونوں لہروں میں آخر سلاست و سلامت روی کے ساتھ شاعر کو اپنے دور سے ۵۰ سال آگے لے جانے والی لہر حاوی آ چکی ہے۔ جو "آمد" کی غزلوں میں اپنے پورے کمال و جمال کے

ساتھ موجود ہے اور یہ بھی منصوبہ بندی ہی کی دین ہے۔ اگر بشیر بدر کا نام اُردو غزل کے انتہائی مقبول و معتبر شعراء میں لیا جاتا ہے تو اس لیے کہ مشاہدہ اتنا گہرا ہے کہ ان کے اشعار سامع یا قاری کو اپنے گرد بکھری ہوئی ریزہ ریزہ زندگی کے کسی کیف بہرور یا روح فرسا تجربے کی بازیافت محسوس ہوتے ہیں اور یہی سبب ہے ان کے اشعار فوراً منسلک ہو جاتے ہیں۔ ایسے کتنے ہی اشعار ہیں جو آج نہ صرف اُردو والوں بلکہ دوسروں کی نوکِ زبان پر ہیں۔

تم بھی ہو بیسویں صدی کی طرح　　خوبصورت، اداس، خوف زدہ

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

میں چُپ رہا تو اور غلط فہمیاں بڑھیں
وہ بھی سُنا ہے اس نے جو میں نے کہا نہیں

ہماری زندگی میں پھول بن کر کوئی آیا تھا
اسی کی یاد میں اب تک یہ تحریریں مہکتی ہیں

دِلّی ہو کہ لاہور کوئی فرق نہیں ہے
سچ بول کے ہر شہر میں ایسے ہی رہو گے

کبھی دھوپ دے کبھی بدلیاں دل و جاں سے دونوں قبول ہیں
مگر اس محل میں نہ قید کر جہاں زندگی کی ہَوا نہ ہو

جن ہاتھوں میں مہندی کی جھالر ہوتی　　برتن گھستے گھستے آخر راکھ ہوئے

بہت اچھا سا کوئی کوٹ پہنو تنگدستی میں
اُجالوں میں چھپی ان بدلیوں کو کون دیکھے گا

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

شہریار

نئی غزل پر کسی بھی عنوان سے گفتگو کی جائے بشیر بدر کا ذکر ضرور آئے گا وہ ایک سچے اور زندہ شاعر ہیں
(رسالہ شاعر جلد ۲۵ شمارہ ۲)

کرامت علی کرامت

بشیر بدر کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تقریباً ہر شعر میں نئے انداز میں کچھ نئی بات کہنے کی کوشش کی ہے اس شعر کا تعلق جدید حس سے ہو یا انسان کے لافانی تجربات سے ..... جدید غزل کی تاریخ میں اس کی حیثیت سنگ میل کی سی ہے۔ (تبصرہ اکائی شاہکار ۱۹۷۰ء شمارہ ۲-۳۹)

راج نرائن راز

بشیر بدر ہمارے ان معدود چند شعرا میں سے ہیں جنہوں نے اردو غزل کو جدید حسن سے روشناس کرانے اور اسے نیا رنگ و آہنگ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ (تبصرہ اکائی آجکل جولائی ۱۹۷۱ء)

جگتار (پنجابی کے مشہور شاعر)

غالب کے بعد بشیر بدر کے اشعار میں جو تازگی شگفتگی ندرت اور بلاغت ہے وہ شاید اردو ادب کے پورے عہد ماضی میں بھی کہیں نہیں۔

اِک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

بشیر بدر

غزل کا نیا اسلوب

ڈاکٹر کمار پانی پتی

آج سے تقریباً تیس برس پہلے ڈاکٹر بشیر بدر ایسے ہی کسی دلنواز ساز کی تلاش میں تھے جو ابھی تک کسی غزل گو کے ہاتھ نہیں لگ پایا تھا۔ اپنے تخلیقی سفر کے آغاز میں ہی وہ سمجھ چکے تھے کہ "زبان اور اس کا شعر رواں دواں دریا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ مزاج بدلتا ہے"۔[1] ۱۹۵۵ء میں ہی انھیں پوری طرح یقین ہو چکا تھا کہ "مجھے اپنی غزل کی اساس جذبوں کی انوکھی صداقت کے ساتھ ساتھ زبان کی زندہ اور بدلتی ہوئی لطافت پر رکھنی چاہیے"۔[2] ان کی رائے میں بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر ایسی غزل کا دور برقی رفتار سے لد رہا تھا جس میں فارسی اور عربی سے بوجھل اردو زبان میں اکثر ایسے اشعار تخلیق کیے جا رہے تھے جنھیں عوام تو سمجھنے سے بھی قاصر تھے مگر "ہمایوں" جیسے ادبی جرائد میں ابھی "ارشاداتِ عالیہ" جیسے عنوان دے کر شایع کیا جا رہا تھا ۔

نہ خیالِ عشقِ بتاں ہے اب، نہ تلاشِ حسنِ نکو ہے اب
نہ وہ ذوقِ بادۂ ناب ہے، نہ وہ شوقِ جام و سبو ہے اب
جو جگر میں زخم تھا چارہ گر، وہ جگر سے سینے تک آ گیا
تری کوششوں سے حصول کیا، یہ فضول فکرِ رفو ہے اب
وہ جنابِ شیخ خدا شناس، ہوئے ایسے شیفتۂ بتاں
کہ وہ ذکر ہے، نہ وہ شغل ہے، وہ نماز ہے نہ وضو ہے اب[3]

بشیر اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ دورِ حاضر میں غزل اس زبان میں کہی جانی چاہیے، جس میں اس دور کی ابھرتی ہوئی زبانوں کی آمیزش کچھ اس طرح ہو جائے کہ سننے والے دیر تک اس کی شیرینی کا مزہ لے سکیں۔ ملک کے بٹوارے کے بعد آزاد بھارت میں ہندی اور سنسکرت

جیسی زبانوں کا اپنا ہی مقام بنتا جا رہا تھا ۔ چنانچہ ایک اور مسئلہ بھی درپیش تھا ۔ تہذیبی اور تمدنی سطح پر ہندی اور سنسکرت کو محض زبانیں ہی قرار دینا اُس بہترین تہذیب کی توہین کرنے کے مترادف تھا جسے گاندھی اور گوتم کے پیغام کی روح قرار دیا جاتا ہے ۔ اس تہذیب کی اپنی ہی شوکت ہے ۔ اس کی اپنی ہی چاشنی ہے ۔ چنانچہ ہوا کا رُخ پہچانتے ہوئے بشیر بدر نے اپنی غزل میں اس تہذیب کو اپنانے کی طرح اپنایا ۔ پس ان کی غزل پر اس تہذیب کی جو چھاپ ہے اُسے ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ کس سادگی سے فرماتے ہیں ؎

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو ۔۔۔ رُک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر
تم جنھیں پھول سمجھے ہو آنکھیں ہوں ۔۔۔ پاؤں رکھنا زمیں پر ذرا دیکھ کر
پھر دیئے رکھ گئیں تیری پرچھائیاں ۔۔۔ آج دروازۂ دل کا کھلا دیکھ کر

بشیر قاری کو اکثر اس فضا میں پہنچا دیتے ہیں جہاں اُن کی غزل میں اُسے اصل بھارت کی مٹی کی خوشبو آنے لگتی ہے اور وہ خالص ہندوستانیت کا لطف محسوس کرنے لگتا ہے ۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے ان کا یہ شعر ؎

کس کی خاطر دھوپ کے گجرے ان شاخوں نے پہنے تھے
جنگل جنگل روئے میرا ، کوئی نہ آیا ، رات ہوئی

کتنے سیدھے سادے الفاظ میں وہ اپنے دل کی بات کہہ جاتے ہیں ؎

لب ترستے رہے اِک ہنسی کے لیے ۔۔۔ میری کشتی مسافر سے خالی رہی
چاند تارے کبھی ہمسفر تھے مگر ۔۔۔ زندگی رات تھی ، رات کالی رہی

ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ ورنہ کیسے کہہ سکتے تھے وہ زندگی سے اس قدر ہمکنار ہو کر ایسے نازک اشعار ؎

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں ۔۔۔ کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا
رات کا انتظار کون کرے ۔۔۔ آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا
کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی ۔۔۔ یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

مگر بشیر نے زندگی کی کڑواہٹوں کے جام بھی مزے لے لے کر پیے ہیں ۔ شاید مندرجہ ذیل اشعار ان کے کسی ذاتی سانحہ کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں ؎

شعر میرے کہاں تھے کسی کے لیے ۔۔۔ میں نے سب کچھ لکھا ہے تمہارے لیے

اپنے دکھ سکھ بہت خوبصورت رہے　　ہم جئے بھی تو اک دوسرے کے لیے
ہمسفر نے مرا ساتھ چھوڑا نہیں　　اپنے آنسو دیئے راستے کے لیے

مگر زندگی کی گردن توڑ محرومیوں اور تلخیوں کے باوجود بشیر نے خوشیوں کی پھول مالائیں پرونے کی کوششوں کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ اور اَن گنت ایسے اشعار تخلیق فرمائے جو جذبات کی کیفیتوں کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ خوشگوار فضاؤں کا نکھرا ہوا روپ بھی پیش کرتے ہیں ؎

میرے سینے پہ خوشبو نے سر رکھ دیا　　میری باہوں میں پھولوں کی ڈالی رہی

پھول سی انگلیاں کنگھیاں بن گئیں　　اُلجھے باتوں سے ماتھا ڈھکا دیکھ کر

مگر اَن گنت ایسی کامیابیوں کی ذہنی مسرتوں کے باوجود وہ زندگی کی مایوسیوں کے زیر اثر یہ کہے بغیر بھی نہ رہ سکے ؎

بے آس کھڑکیاں ہیں ستارے اداس ہیں　　آنکھوں میں آج نیند کا کوسوں پتہ نہیں
چہرے پہ آنسوؤں نے لکھی ہیں کہانیاں　　آئینہ دیکھنے کا مجھے حوصلہ نہیں

یوں تو بشیر بدر کے منظر عام پر آنے سے پہلے بھی 'گاہے گاہے' ایسے شعر سننے میں آتے رہے جن پر آج بھی اکثر بشیر کی تخلیقات ہونے کا شک گزرتا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمایئے مرزا یگانہ چنگیزی کے یہ اشعار ؎

کس کی آواز کان میں آئی　　دور کی بات دھیان میں آئی
ہائے کیا کیا نگاہ بھٹکی ہے　　جب کبھی امتحان میں آئی
یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی　　کہیئے کیا بات دھیان میں آئی[۴۶]

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بشیر بدر سے پہلے کوئی شاعر اپنے اسلوب کو آج کے دَور کی غزل کا محبوب اور مقبول اسلوب ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ 'اکائی' 'امیج' اور 'آمد' جیسے مجموعات اپنے وقت سے پہلے منظر عام پر نہیں آ سکتے تھے اور بشیر سے پہلے کوئی بھی غزل گو اپنی غزلیات یہ کہہ کر پیش نہیں کر سکتا تھا کہ "آج کی غزل میں مجھ سے زیادہ محبوب شاعر بقید حیات نہیں"[۴۷] اس میں شک نہیں کہ اس مقام پر پہنچنے کے لیے بشیر کو دہائیوں تک زبردست محنت کرنی پڑی۔ شاید ان کے مندرجہ ذیل اشعار ان کی

اسی جد و جہد کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

یوں تو بشیر سے پہلے بھی ان گنت شعراء اپنے اپنے ڈھنگ سے، اپنی اپنی سطح پر غزل کے اسلوب میں شگفتگی اور تازگی پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کی کوششیں کر چکے تھے۔ کبھی فرسودہ ترکیبوں کو خیرباد کہہ کر، کبھی خلوص اور سچائی کا آسرا لے کر، کبھی نئی نئی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کی طرف رجوع کر کے، کبھی اردو زبان کو ہندی سنسکرت کے نزدیک لا کر، کبھی شعر اور نثر کے درمیانی فاصلے کو کم کر کے، کبھی موزوں زمینوں، قافیوں اور ردیفوں کے امتزاج سے ترنم اور موسیقیت کی ترنگوں کو گلے کا ہار بنا کر اور کبھی تسلسل کا سہارا لے کر، مگر بہت بڑی بات تھی، ان سبھی خاصیتوں کو یکجا کر کے دورِ حاضر کی غزل کا رنگ روپ نکھارنا اور غزل کے لیے وہ زبان پیدا کرنا جس کو سمجھنے کے لیے ہندی سنسکرت، فارسی یا غزل کی بجائے بادلوں، پانیوں، ہواؤں اور رنگوں کی زبان کو پڑھنے، سیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت محسوس ہو۔ بھلے ہی اپنے ادبی سفر کے آغاز میں بشیر کو اپنے اس اقدام کو کشمکش اور گومگو کے ذہنی تناؤ اور روایات کے دباؤ میں آگے بڑھانا پڑا ہو۔ مگر آج صورتِ حالات بالکل بدل چکی ہے۔ آج بشیر کا اسلوب آج کی غزل کا محبوب اسلوب بن چکا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں: "غزل میں نیا منظرنامہ عظیم و قدیم غزل سے الگ، اور اس قدر مروج ہو جائے گا میرے سوا شاید کسی اور کو تیس برس پہلے اس کا یقین نہیں تھا۔ لوگ غصے اور جھلاہٹ میں اس نئے اسلوب سے غزل کی جگہ ہزل لکھ جاتے تھے اور ہماری جدید پرست تنقید ہزل کی شکست و ریخت، ادبی قلابازی کو غزل کا جدید رویہ کہہ کر شاباشی دے رہی تھی۔ یہ میں تھا جو..... اس گمراہ تنقید کو حقارت سے دیکھتا ہوا غزل کے جدید تغزل کو اپنی روح کے نغمے سے گنگناتا آگے بڑھتا رہا۔"[۳]

اور آج صورتِ حالات یہ ہے کہ جب کسی مشاعرے میں بشیر بدر اپنی کسی غزل کا کوئی مصرعہ گنگنانا شروع کرتے ہیں تو سامعین ان سے پہلے ہی پورا شعر پڑھ دیتے ہیں ـــ

ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کی غزل سامعین کی روح کی آواز ہے۔ سامعین اردو رسم الخط نہ جانتے ہوئے بھی ان کی غزل کی زبان سے واقف نظر آتے ہیں۔ کئی بار تو مشاعرہ میں اُن کے لیے غزل پڑھنا ہی مشکل ہوجاتا ہے۔ ایک بار ایک آل انڈیا مشاعرہ میں مَیں نے خود اپنے کانوں سے انھیں یہ کہتے ہوئے سُنا: "ایسے لگتا ہے کہ یہ غزل آپ کی ہے اور میں اسے چُرا کر مشاعرہ میں پڑھنے کے لیے لے آیا ہوں۔"

بشیر کی اس مقبولیت کی بنیاد ہے ان کی غزل کی سلیس اور نفیس زبان اور اس کا ہندوستانی شجرۂ حسب و نسب جس کی وجہ سے وہ آزاد بھارت کی بدلی ہوئی فضا میں بھی کسی لحاظ سے غیر ہندوستانی دکھائی نہیں پڑتی۔ اس میں غالبؔ، حسرتؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کے خلوص و فکر کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے اور تلسیؔ، میراؔ، سورؔ، اور بہاریؔ کے سُروں کی جھنکار بھی سُنائی دیتی ہے۔ انگریزی ادب کے گہرے مطالعے کے زیرِ اثر اُن کی غزل میں برِصغیر کے دلوں کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ بنی نوعِ انسان کی سسکیاں اور ہچکیاں بھی سُنائی دیتی ہیں۔ اس میں عشق و محبت کی آمیزش بھی ہے اور نسلِ آدم کی درد بھری آہیں بھی۔ بشیر کی غزل روایات کی پابند بھی ہے اور ترقی پسند تحریک کی جانب اٹھتا ہوا ایک زبردست قدم بھی۔ اس میں حافظؔ اور سعدیؔ کا فلسفہ بھی موجود ہے اور ناصرؔ کاظمی اور ندا فاضلی کی جدیدیت بھی۔ مگر ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ان کی غزل میں آہستہ آہستہ پہلو بدلنے والی اس لطافت کی بھی کمی نہیں جس کو بشیر بدر کی انفرادیت کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ اس مقالے کے آخیر میں قارئین کی دلچسپی کے لیے بشیر بدر کی ایک غزل پیش کرنا چاہوں گا، جو واقعی اُس اسلوب کی آبرو ہے جسے ہم بنا کسی ڈر یا جھجھک کے آج کی غزل کا محبوب اور مقبول اسلوب کہہ سکتے ہیں ؎

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سُنا ہوا
جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا
کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

وہی خط کہ جس پہ جگہ جگہ دو مہکتے ہونٹوں کے چاند تھے
کسی بھولے بسرے سے طاق پر تہ گرد ہوگا دبا ہوا

مجھے حادثوں نے سجا سجا کے بہت حسین بنا دیا
مرا دل بھی جیسے دلہن کا ہاتھ ہو مہندیوں سے رچا ہوا

وہی شہر ہے وہی راستے وہی گھر ہے اور وہی لان بھی
مگر اس دریچے سے پوچھنا وہ درخت انار کا کیا ہوا

مرے ساتھ جگنو ہے ہمسفر مگر اس شرر کی بساط کیا
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

* *

اسلوب احمد انصاری

بشیر بدر اُردو کے جدید ترین شعرا میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مروجہ رسمیات میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے یہاں جزیات نگاری، عمومی مشاہدات کے ان دیکھے پہلوؤں کی عکاسی اور ایسی نادر پیکر نگاری ہے جو نہ صرف چونکاتی بھی ہے اور دعوت فکر بھی دیتی ہے اور اپنے اندر طنزیہ نغمگیت بھی رکھتی ہے۔

* *

۱۔ بشیر بدر : ایک خط : ۲۰۲۵ء کے پڑھنے والوں کے نام" (آمد : صفحات ۴-۱۶)
۲۔ ایضاً - ایضاً - ص : ۱۴
۳۔ رسالہ ہمایوں (سلور جوبلی نمبر : جنوری ۱۹۴۷ء) ص ۵۴
۴۔ بشیر بدر کے اشعار اُن کی کتاب "...." سے لیے گئے ہیں
۵۔ حفیظ ہوشیارپوری : شاعری کے پچیس سال رسالہ ہمایوں (سلور جوبلی نمبر : جنوری ۱۹۴۷ء) ص ۱۶۵
۶۔ بشیر بدر : ایک خط : ص ۴
۷۔ ایضاً - ایضاً : ص ۱۴
۸۔ ایضاً - ایضاً : ص ۱۴

ڈاکٹر جلال انجم

آزادی کے بعد جب ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا تو آہستہ آہستہ ہندی زبان عوام کی ضرورت کا ایک حصہ بنتی گئی اور رابطہ کی زبان بن جانے کی وجہ سے ہندی اور اردو دونوں زبانوں نے ایک دوسرے کے الفاظ سمونا شروع کر دیئے۔ ہندوستان کی بیشتر فلمیں جنہیں ہندی کا نام دیا جاتا ہے اس میں ۸۰ فیصد الفاظ اردو ہی کے استعمال ہوتے ہیں اسی طرح ریڈیو، ٹیلی ویژن کے نشریات میں بھی اردو الفاظ کے استعمال کا یہی حال ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ اردو کے یہ تمام کے تمام الفاظ عوام میں رائج ہیں اور بلا جھجک استعمال ہوتے ہیں۔

یہی حال اردو زبان کا بھی ہے کہ جو ہندی الفاظ عوامی مزاج میں رچ بس گئے ہیں۔ وہ اُردو ادب پاروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ یہ رجحان لاشعوری طور پر بڑھتا جا رہا ہے۔ غزل جس کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ اپنے عصر کو اپنے آپ میں جذب کر لیتی ہے تو وہ ہندی الفاظ سے پرہیز کیوں کرے۔ اس لیے ہندی کے بہت سے الفاظ اس کے گلے کا ہار بنے ہوئے ہیں

جب ہم بشیر بدر کی غزل کا لسانی مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نقوش واضح ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بشیر بدر نے اپنے عہد کے مسائل سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ ان کا برملا اظہار اپنی شعری تخلیقات میں کیا ہے۔ بشیر صاحب نے جہاں اپنی غزل میں عصری مسائل کو پیش کیا ہے وہیں ہندی کے بڑھتے چلن کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ ہندی کا استعمال خوب، خوب کیا ہے۔

ہندی اور ہندوستانی فلسفہ حیات میں پنر جنم بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر

بشیر بدر نے اس فلسفہ سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ دو شعر پیش ہیں:

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

دو بھٹکتی ہوئی روحیں جیسے ملیں یوں ملیں وہ نگاہیں مگر خوف ہے
زیست ہے رات میں جنگلوں کا سفر اس جنم میں بھی ہم کھو نہ جائیں کہیں

ان دونوں اشعار میں شاعر کے دل و ذہن پر کھونے اور پانے کا احساس عجیب کشمکش کے ساتھ جلوہ گر ہے یہاں پہلے شعر میں اس کے پاس جو کچھ ہے اس کو وہ کھونا نہیں چاہتا بلکہ جو اس کو پانے کی تمنا کر رہا ہے اور دوسرے شعر میں جب اگلے جنم میں دونوں کی روحیں ملتی ہیں تو زندگی ان کو رات میں جنگلوں کا سفر محسوس ہوتی ہے اس پر پھر نہیں بچھڑنے کا احساس کھائے جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ مندروں کی عظمت ان کے ذہن میں رچ بس گئی ہے جس کو انہوں نے ایک علامت کے طور پر اپنایا ہے۔ مندر کی امیجری ان کے یہاں بار بار مختلف پیرایوں میں ملتی ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میرے بچپن کے مندر کی وہ مورتی دھوپ کے آسماں پر کھڑی تھی مگر
ایک دن جب میرا قد مکمل ہوا اس کا سارا بدن برف میں دھنس گیا

غزل کے مندر میں دیوانہ مورت رکھ کر چلا گیا
کون اسے پہلے پوجے گا بحث چلی دیوتاؤں میں

صبح بستر سے اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی
دھوپ کی آہٹ پہ چونک اٹھے تیا مندر کے کلس

صدا کی دھوپ نہ چمکے تو گھر اجڑ جائے
وشال مندروں میں گھنٹیوں کی عظمت ہے

آ مرے سینے پہ سر رکھ اپنے کان سے سُن پگلی
میرے بھگوان بول رہے ہیں من مندر کی گھنٹی میں

***

مندر گئے، مسجد گئے، پیروں فقیروں سے ملے
اک اس کو پانے کے لیے کیا کیا کیا، کیا کیا ہوا

***

کس کو سلام کرتے ہو بازار میں
یہ کسی گھر کے مندر کی مورت نہ ہو

***

ان کی آنکھوں کو غور سے دیکھو
مندروں میں چراغ جلتے ہیں

ان اشعار میں بچپن کے مندر، بتوں کے مندر، مورت پوجنا، دیوتاؤں، مندر کے کلس و نشان، مندر، میرے بھگوان، من مندر کی گھنٹی، مندر کی مورت اور مندروں میں چراغ جلنا وغیرہ، مندر، مورت اور دیوتا کا وہ عکس ہیں جن میں پاکیزہ عقیدت کا جذبہ جلوہ گر نظر آتا ہے جو ان کی عظمت کا ثبوت بہم کرتے ہیں۔ اسی طرح دیوی دیوتاؤں کے تصور کی جھلکیاں بھی بشیر بدر صاحب کے یہاں انوکھے انداز میں موجود ہیں جیسے ؎

گیلے گیلے مندروں میں بال کھولے دیویاں
سوچتی ہیں ان کے سورج دیوتا کب آئیں گے

***

پیاسی رات کا رس راکشس بناتی تھی
سویرے لوگوں سے کہتی تھی دیوتا مجھ کو

***

پیار کی گہری جھنکاروں سے سارا بدن آکاش ہوا ہے
دودھ پلانا تن ڈسوانا ہے دستور پرانا بابا

***

انڈا مچھلی چھوکر جن کو پاپ لگے
ان کا پورا ہاتھ لہو میں ڈوبا ہے

آہستہ آہستہ دل پر دستک دو
دھیرے دھیرے یہ دروازہ کھلتا ہے

میں دن ہوں میری جبیں پر دکھوں کا سورج ہے
دیئے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

یہاں پر بھی بال کھولے گیلے گیلے مندر، سورج دیوتا، راکشش، دیوتا آکاش، پاپ لگے، دستک، دھیرے دھیرے دکھوں کا سورج وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کے پس پردہ ہندو اور ہندوستانی فلسفہ اور کلچر پوشیدہ ہے بلکہ اگر ان کو ہندی تلمیح کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں بشیر بدر کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس کا استعمال اس فنکارانہ چابکدستی سے کیا ہے کہ وہ اردو غزل کا ایک حصہ بن کر رہ گئے ہیں اور یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ اردو کے نہیں بلکہ ہندی کے ہیں

انہیں میں سنورتے رہو عمر بھر
سدا میری آنکھوں کو درپن کہو
وہ جب چاہے سرسبز کردے مجھے
مرے واسطے اس کو ساون کہو

مدت سے ریت کے صحرا میں آیا نہ گیا بادل کوئی
کس دیش گئے سارے پنچھی سوکھا ہے شجر تنہا تنہا

موسم کی خوشبو میں اکثر غم کی خوشبو مل جاتی ہے
آموں کے باغوں میں کیسے ساون ساون برسا آنسو

مانا رستہ بہت کٹھن ہے پھر بھی سایہ دار شجر ہیں
ٹہنی کو تلوار نہ سمجھو آنچل کو دیوار نہ جانو

پربت پربت، بادل بادل، کرن کرن اُجلے پروانے دو پنچھی ہم دونوں

اگر بارشیں آ گئیں راہ میں سمندر کی تہہ میں اُتر جاؤں گا

ایک گونج بھٹکتی ہے سنسان پہاڑوں میں
جب رات کے سینے میں دل میرا دھڑکتا ہے

بات کیا ہے کہ مشہور لوگوں کے گھر موت کا سوگ ہوتا ہے تیوہار سا

ہزاروں بھیس میں پھرتے ہیں رام اور رحیم
کوئی ضروری نہیں ہے بھلا بھلا ہی لگے

ان اشعار میں بشیر بدر صاحب نے ایسے الفاظ کو اپنی غزل کا حصّہ بنایا ہے جن کو ابھی تک نظر انداز کیا جاتا رہا تھا یا اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ وہ غزل کا حصّہ بن سکیں لیکن یہاں پر یہ کام بڑے سلیقہ سے کیا گیا ہے کہ کوئی انگلی بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ مثلاً درپن، ساون، دیش، کٹھن، پربت پربت، کرن کرن، سمندر، سنسان، موت کا سوگ اور رام رحیم وغیرہ۔

بشیر کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں دو زبانوں کا ہی نہیں بلکہ دو تہذیبوں کا امتزاج ملتا ہے اور یہ امتزاج ایک نئی آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے جسے ہم خالص ہندوستانی کلچر یا اردو کلچر کا نام دے سکتے ہیں۔ اور یہی وہ وصف ہے جو انہیں اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت دلاتا ہے۔ ★

گوپی چند نارنگ

بشیر بدر کی غزل نجی زندگی سے لیے ہوئے حسی پیکروں کا نگار خانہ ہے۔ موجودہ عہد میں جن شاعروں نے غزل کی معنوی حدود کو وسیع کرنے اور غیر رسمی سادہ لہجہ کے نئے اور انتہائی پرتاثیر تخلیقی امکانات کو بروئے کار لانے میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ ان میں بشیر بدر کا نام خاص امتیاز کا حامل ہے۔

مجھے حادثوں نے سجا سجا کر بہت حسین بنا دیا

اشوک شرما (پنجابی) ——— ترجمہ۔ کرشن ادیب

یہ سات برس پہلے کی بات ہے۔ بمقام کھرڑ ضلع چنڈی گڑھ میں ایک بہت بھرپور کلچرل پروگرام کا اہتمام ہوا تھا۔ پنجابی گلوکار امرجیت گورو اور آسا سنگھ مستانہ نے سماں باندھ دیا تھا اور لوک گائک گورداس مان کے سننے اور چاہنے والوں کی بھیڑ تو قابل دید تھی۔ پنڈال تو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بیٹھ کر سننا تو ایک طرف۔ لوگوں کو کھڑا ہونے کے لئے بھی جگہ بمشکل تمام مل رہی تھی۔ گورداس مان کی آخری آئیٹم ختم ہوئی تو لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا "اور سناؤ اور سناؤ" اسٹیج سکریٹری نے اپیل کی آپ لوگ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ آج کی محفل کے اور بھی کئی خوبصورت رنگ آپ کو دکھائے جائیں گے۔ جس میں اردو مشاعرہ بھی شامل ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس قدر دلکش اور بھرپور پروگرام کے بعد مشاعرہ سنے گا کون؟ اسٹیج سکریٹری کے اعلان کے ساتھ گورداس مان سے آٹوگراف لینے والے مداحوں کی بھیڑ پنڈال سے اٹھنا شروع ہو گئی۔ عین اسی وقت ایک اکہرے بدن والے آدمی نے اسٹیج پر آکر مائیکروفون سنبھال لیا۔ اور چند ہی لمحوں میں جو لوگ اٹھ کر جا رہے تھے۔ رک گئے۔ جو سامعین کھڑے تھے وہ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ مشاعرہ رات کے دو بجے تک جاری رہا۔ اس وقت کے وزیر تعلیم (جو محض مشاعرے کے آغاز کے لئے شمع روشن کرنے آئے تھے) سمیت، لوگ ہلنے کا نام نہیں لے رہے تھے بلکہ مشاعرے کے اختتام پر انہیں زبردستی گھروں کو بھیجنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ جس شخص نے مشاعرے کی نظامت کا اور سننے والوں پر جادو کر دیا تھا وہ اکہرے بدن والے آدمی اردو زبان کے معروف ترین شاعر ڈاکٹر بشیر بدر تھے۔

وہی بشیر بدر جو کئی مرتبہ یوم آزادی کے سلسلے میں ہونے والے لال قلعہ کے مشاعروں کی نظامت کرتے رہتے ہیں اور جن کے بغیر کبھی بھی اردو مشاعرہ مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

وہ دن اور آج کا دن حالانکہ اس واقعہ کو سات سال بیت گئے ہیں تاہم ڈاکٹر بشیر بدر میں آج بھی وہی صلاحیت کارفرما ہے۔ ابھی چند ہی گذرے پریس کلب میں صحافیوں کے سامنے اپنا تازہ کلام پیش کر کے ثابت کر دیا کہ بشیر بدر آج بھی غزلیہ شاعری کا منفرد اور پرکشش نام ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کے شاعری میں تخیل کی بلندی کے علاوہ زبان کی سادگی ہے۔ وہ خالص ہندوستانی زبان یعنی بولے جانے والی زبان میں شعر کہتا ہے اور جس کا بھی عام شعرائے قطعاً مختلف ہے۔ اس کی غزلیں براہ راست دلوں میں اتر جانے والی ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر کس و ناکس کا محبوب اردو شاعر ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر اپنی غزلوں میں وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جنہیں عربی فارسی سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کی شاعری میں "اضافت" کا استعمال بھی ترک کر دیا ہے اور اس قدر آسان بلند پایہ اشعار کہتا ہے کہ ہر سامع اور قاری کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور وہ بے ساختہ داد دیتے ہیں۔ اسی لئے بشیر بدر لاکھوں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے۔

اگر آج برصغیر ہند و پاک کے سب سے زیادہ مقبول اور بہترین شعراء کی فہرست ترتیب دی جائے تو یقیناً ڈاکٹر بشیر بدر کو اس میں نہ صرف شامل کرنا پڑے گا بلکہ اس کے نام کا تعین بھی سرفہرست ہوگا مقبول ترین گلوکاروں نے اس کی غزلیں گائی ہیں۔ جن میں جگجیت سنگھ، چترا سنگھ، آشا بھونسلے اور طلعت عزیز کے علاوہ بیسیوں گلوکار ہیں جن کی آواز کی پہچان بشیر بدر کا کلام بنا ہوا ہے ہندوستان سے ٹورنٹو، واشنگٹن تک دنیا کے ہر دیگ مشاعرے پڑھنے جاتا ہے اور جہاں کسی بڑے چھوٹے شاعر کا کلام نہیں جمتا وہاں بشیر بدر مشاعروں کی روح رواں بن جاتا ہے لوگ مسلسل اس کا کلام سنتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر بشیر بدر میرٹھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں وہ الگ بات کہ یونیورسٹی میں حاضری کبھی کبھار ہوتی ہے ان کے زیادہ تر ایام مشاعروں کی شرکت میں گزر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بدر قومی یکجہتی کی علامت ہیں۔ جو اپنے ملک کے لئے دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں کہ

دعا کرو یہ پودا سدا ہرا ہی رہے اداسیوں میں بھی چہرہ کھلا کھلا ہی رہے

لیکن لعنت ہے ان فرقہ پرست، وطن دشمن طاقتوں پر جنہوں نے پچھلے دنوں میرٹھ کے فسادات میں ڈاکٹر بشیر بدر جیسے انسانیت نواز شاعر کے مکان کو بھی آگ لگا کر خاک کر ڈالا۔ اور آفرین ہے بشیر بدر

بدر کہ جب وہ اس اندوہ ناک حادثے کے بعد پنجاب کے شن ادیب سے ملنے آیا تو اس کے ماتھے پر کوئی دکھ کی شکن نہیں تھی۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرٹھ جیسے فساد زدہ جہاں سینکڑوں ہزاروں مسلمان لٹ گئے، گھر جلا دیے گئے۔ وہاں بشیر بدر کے گھر کو ایک مسلمان کا گھر سمجھ کر جلا دینا کوئی تعجب خیز خبر نہیں تھی۔

پچھلے دنوں پاکستان کلا کیندر نے ڈاکٹر بشیر بدر کی عزت افزائی کے لئے ایک مخصوص محفل کا اہتمام کیا تھا لیکن وہ غیر ملکوں کے دوروں پر مشاعرے پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ انہیں کچھ رقم بطور عزت افزائی دی جانی تھی۔ یہ کوشش پوری نہ ہو سکی لیکن چند روز پہلے بشیر بدر صاحب اپنے عزیز شاگرد وید دیوانہ سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ چنانچہ کلا کیندر نے یہ موقع غنیمت جانا۔

شاید اب تک بہت سے لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ میرٹھ کے فسادات کے دوران ڈاکٹر بشیر بدر کے مکان کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ گھر کے باقی افراد کو ان کے دوستوں اور ہمسایوں نے (جو کہ غیر مسلم تھے) بچا لیا۔ اس دلدوز حادثے کے بعد بشیر بدر کو چاہنے والے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھنا چاہتے تھے شاید اسی لئے بھرپور محفل آراستہ ہوئی۔ ڈاکٹر بدر کے چہرے سے اس حادثے کا کوئی ردعمل نہیں تھا وہی بشاش چہرہ، ملنساری اور خوبصورت جملے ان کی زبان پر تھے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کو علم ہے کہ آج کا انسان اتنا مجبور ہے کہ وہ ہر وقت محبت کر ہی نہیں سکتا۔ پھر بھی زندگی کے حسین اور رومانٹک لمحوں کو انہوں نے اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ اسی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں بشیر بدر کے دل میں زندگی کی دھڑکن موجود ہے۔ زندگی کی نزاکتوں اور لطافتوں کو انہوں نے اس محفل مشاعرہ میں یوں ظاہر کیا ہے

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

جس پر ہماری آنکھ نے موتی بچھائے رات بھر
بھیجا وہی کاغذ اسے ہم نے لکھا کچھ بھی نہیں

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

میری چھت سے رات کی سیج تک کوئی آنسوؤں کی لکیر ہے
ذرا بڑھ کے چاند سے پوچھنا وہ اسی طرف سے گیا نہ ہو!

اشعار میں بشیر بدر کی مخصوص ادا پر جب لوگوں نے "واہ، واہ" اور تحسین کے ڈونگرے برسانے شروع کئے تو بدر کہنے لگے۔

یہ پھول کوئی مجھ کو وراثت میں ملے ہیں
تم نے میرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

یہ شعر سن کر یوں محسوس ہوا کہ بشیر بدر کی گفتگو کا رخ بدل گیا ہے!!

میرٹھ کے حادثے نے سارے ملک کو بدنام اور ذلیل کر کے رکھ دیا ہے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک اٹھتے ہیں جس کی وجہ سے اقلیتی فرقہ خاص گھٹن محسوس کرتا ہے۔ یہ گھٹن ڈاکٹر بشیر بدر کے دل کے کسی اندرونی گوشے میں بس چکی ہے اور شاعری ہی ان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ زندگی کے ان تلخ تجربات سے سمجھوتہ کرنے کے باوجود ان کا کہنا ہے کہ ؏

مجھے حادثوں نے سجا سجا کے بہت حسین بنا دیا

انسان کو انسان کی حیثیت میں دیکھنے والے شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کو یہ سمجھ نہیں آیا کہ "وہ کون لوگ ہیں جو کشتیوں کو ڈبوتے ہیں" لیکن اس کے باوجود بشیر بدر انسانی تعلقات اور محبت کی علامت ہے ؎

یہ سوچ اب آخری سایہ ہے محبت — اس در سے اٹھو گے تو کوئی در نہ ملیگا

لیکن جانے کیوں ان کے ذہن و دل میں یہ بات کیوں رہتی ہے جو کہ یہ شعر بھی کہلواتی ہے ؎

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے یہاں فاصلے سے ملا کرو

ڈاکٹر بشیر بدر سمجھتے ہیں کہ حالات اس حد تک بد سے بدتر ہو چکے ہیں کہ جانے کس وقت کوئی عزیز سے عزیز شخص بھی آنکھیں پھیر لے لوگ تو جرم کرتے وقت کبھی کوئی طے شدہ پروگرام نہیں بناتے۔ وقت بے وقت کوئی نہ کوئی دنگا، ہنگامہ شروع کر دیتے ہیں لہٰذا انھوں نے اپنے اشعار میں اس طرف بھی اشارہ دیا ہے ؎

بے وفا باوفا نہیں ہوتا — ختم یہ فاصلہ نہیں ہوتا
رات کا انتظار کون کرے — آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا
اگر وہ چاہیں تو زندہ جلا بھی سکتے ہیں — دعا کے ہاتھ حکومت کی بے بسی ہوں ہیں

فسادوں کے بعد "اسٹیٹسمین" اخبار کا جو نمائندہ ڈاکٹر بشیر بدر کے آتش زدہ گھر کو دیکھنے گیا اس کے ہاتھ فقط قرآن مجید کے ترجمے کا مسودہ اور ڈاکٹر بشیر بدر کے گھر کے افراد کی تصویریں لگیں۔ جو اس نے شاعر کو سونپنے کے لئے سنبھال کر رکھ لیں۔ اتنے حوصلہ مند شاعر کے اندر یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے جو سوالات اٹھتے ہیں ان کا کوئی جواب دے ؎

وہی شہر ہے وہی راستے وہی گھر ہے اور وہی لان ہے
مگر اس دریچے سے پوچھنا وہ درخت انار کا کیا ہوا

پھر بھی ان کا کہنا ہے ؎

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے   آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

زندگی کے حقائق دیکھنے کے بعد ڈاکٹر بشیر بدر کا "کانٹوں بھرا بستر" بیچ بیچ دیکھا جا سکتا ہے۔ محفل مشاعرہ اختتام پذیر ہونے لگی کہ ایک آواز آئی بدر صاحب پھر کب ملیں گے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کا معقول جواب تھا ؎

مسافر ہیں ہم بھی مسافر ہو تم بھی   کسی موڑ پر پھر ملاقات ہو گی

(بشکریہ ماہنامہ "نوا پنجابی" امرتسر)

خوبصورت، اُداس، خوفزدہ   وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

بشیر بدر

وقت مشّو مذصفوں کا مذصف ہے،   وقت آئے گا، انتظار کرو

بشیر بدر

اردو ادب میں ایک نئے یگ کے بانی

ڈاکٹر بشیر بدر

بابو رام شرما کشور

آج سے تقریباً تیس سال پہلے اردو شعر و ادب کی دنیا میں ایک ایسی شخصیت نمودار ہوئی جس نے عصرِ حاضر میں شروع سے ہی اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس نئی آواز کے سوز و ں میں رنگینی اور نکھار آتے گئے۔ اس شخصیت اور اس آواز کا نام ہے ڈاکٹر بشیر بدر اُن کی شاعری کے ساتھ ہی اُردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر اس نئے دور کو بشیر بدر یگ کا نام دیا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں اُردو کے بہت سے شاعر اور عالم سوچتے تھے کہ غزل کا زمانہ تمام ہو چکا تھا۔ وہ موجودہ زمانہ کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ویسے بھی غزل کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ اس کا ہر شعر ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہوتا ہے اور ایک شعر کا دوسرے شعر سے تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن اسی زمانہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو کہتے تھے کہ غزل ہی اردو ادب کی آبرو ہے۔ غزل کا دور نہ تو ختم ہوا ہے اور نہ کبھی ختم ہو سکتا ہے۔

ایک طرف تو اس قسم کی باتیں چل رہی تھیں اور دوسری طرف ڈاکٹر بشیر بدر آئے اپنے فکر و فن، اپنے استعارات اور اپنی تشبیہات کے سہارے غزل کو نہ صرف ایک نیا روپ ہی نہیں دیا بلکہ اسے پرانی گھسی پٹی راہ سے ہٹا کر نئی شاہراہوں سے روشناس کرایا اور اس کا رخ بڑی تیزی کے ساتھ نئی وادیوں کی طرف موڑ کر اسے نئی بلندیوں تک پرواز کی قوت عطا کی۔ سن ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں ایک ایسا دور آیا تھا جب بہت سے لوگ ایسا سوچنے لگے تھے کہ اب اس ملک میں اُردو کا کوئی مستقبل نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر بشیر بدر اُن لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس ناامیدی کے عالم میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ اُردو کا جنم ہندوستان میں ہی ہوا تھا اور اس کی پرورش بھی اسی ملک میں ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں بھلا اسے یتیم کی طرح بے یار و مددگار کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اُردو بھی بجا طور پر سرکار کی توجہ کا مرکز بنی اور اردو کے فروغ کے لیے ایسے ادارے قائم کئے گئے جو انگریزوں کے راج میں دیکھنے کو بھی نہیں ملتے تھے۔ بھارت سرکار اور بہت سی ریاستی سرکاروں کی طرف سے اُردو اکادمیاں قائم کی گئیں

اور ہر سال لاکھوں روپے دیکر ان کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔ ان اداروں نے اُردو ادب کی نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

لیکن اس معاملے میں سب سے بڑا کام کیا ڈاکٹر بشیر بدر کی غزلوں نے جو لوگ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے وہ بھی ان غزلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ یہ تو ہمارے من کی بات ہماری زبان میں ہی کہی جا رہی ہے۔ جو سیدھی ہمارے دل میں دل میں اترتی جا رہی ہے۔

ہر زبان کے بارے میں یہ بات جو بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی فنکار ایسا ہوتا ہے جو اپنے زمانے کے علاوہ آنے والے زمانے کے شاعروں کے لیے بھی ایک مثال بن جاتا ہے۔ اس کی زبان چاندی کھرے ٹکسالی سکوں کی طرح کھنکھناتی اور سونے کی طرح چمکتی ہے اس کے الفاظ اور طرز بیان مشعل راہ کی طرح دوسروں کو راستہ دکھلاتے ہیں اردو ادب میں اس معاملے میں مرزا داغ دہلوی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے کہا ہے۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

جب ہم لوگ داغ کی کسوٹی پر زبان کو پرکھنا شروع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر کی زبان خالص ہوتا ہے۔ یہی زبان خالص اردو ہے جس پر عربی یا فارسی کا غلبہ نام کو بھی نہیں ہے۔ ویسے تو اُردو کی تشکیل ہی فارسی کے علاوہ اور بھی کئی زبانوں کے چیدہ الفاظ اور محاوروں کی بنا پر ہوئی ہے اور خود داغ سے بہت پہلے خدائے سخن میر نے کھلے دل سے فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت و اپبھرنش برج بھاشا اور پنجابی کے الفاظ کو اپنا کر ایک ایسی زبان کو سجا سنوار کر پیش کیا تھا جسے انہوں نے اپنی خاص زبان بتلایا تھا اور کہا تھا۔

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

ڈاکٹر بشیر بدر نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا ہے۔ ان کے کلام میں انگریزی کے الفاظ کو بھی بڑی فراخ دلی سے اپنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں۔

یہ زعفرانی پل اور اسی کا حصہ ہے
جو کوئی دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

اسی طرح انہوں نے لان (LAWN) گلاس (GLASS) جیسے بہت سے الفاظ کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی غزلوں میں سمو دیا ہے۔

سنسکرت کے عالموں نے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں ڈوبی ہوئی الفاظ کی ترتیب کو ہی شاعری کہتے ہیں۔ ان کے مطابق شاعری میں ان تین اوصاف کا ہونا ضروری بتلایا گیا ہے (i) اوج (ii) پرساد اور (iii) مادھریہ یعنی زندہ دلی سادگی اور شیرینی۔

ڈاکٹر بشیر بدر کا کلام ان خوبیوں سے بھرا پڑا ہے۔ بڑی سے بڑی بات کو نہایت سادگی اور مٹھاس کے ساتھ کہہ کر وہ ہمارے احساسات کو گدگدا دیتے ہیں۔ پیش ہیں ان کے یہ اشعار۔

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے ‎ ‎ ‎ ‎ کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

خدا ایسے احساس کا نام ہے ‎ ‎ ‎ ‎ رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

رات کا انتظار کون کرے ‎ ‎ ‎ ‎ آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے ‎ ‎ ‎ ‎ یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

فکر و آگہی کے اس شمارے میں ان کے کلام اور شخصیت کے ہر پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اس لیے میں اس معاملے کو اور زیادہ طول نہ دیکر فقط یہ کہنا چاہوں گا کہ میں ان کے نزدیک کس طرح پہونچا اور انہوں نے مجھے کس قدر متاثر کیا۔ بات تقریباً ۱۰۔۱۲ سال پرانی ہے جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں ۱۹۷۴ء میں بھارت سرکار کی وزارت خزانہ سے رٹائر ہوا تھا سرکاری کام کاج کے بندھن سے آزاد ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ اب تو میرا سارا وقت میرا اپنا ہے۔ وہ دن گئے جب میں کسی کا نوکر تھا۔ اس وقت میں نے میر کے بارے میں ہندی میں ایک کتاب لکھی۔ میں جانتا تھا کہ غالب کے بارے میں تو ہندی میں بہت کچھ لکھا جا چکا تھا مگر میر کے بارے میں کوئی قابل ذکر کتاب نظر نہیں آتی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہندی جگت کو بھی میر کی عظمت سے آگاہ کرایا جائے بنیادی طور پر میں ہندی۔ انگریزی اور سنسکرت کا طالب علم رہا ہوں لیکن میرے دل میں اردو کے لیے بھی اسی قدر محبت رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اردو کی تعلیم غیر رسمی طور پر حاصل کی ہے۔ جب میں نے اردو کے بڑے بڑے شاعروں کے کلام کو پڑھا تو میں نے دیکھا کہ سودا سے لے کر ناسخ غالب اور فراق گورکھپوری جیسے خود پسند لوگوں نے بھی میر کی استادی کو کھلے دل سے قبول کیا ہے۔ جب میری کتاب کا نسخہ تیار ہو گیا تو میں اپنے بیٹے پروفیسر نونیت کمار شرما کے پاس میرٹھ میڈیکل کالج پہونچا اور ڈاکٹر بشیر بدر سے رابطہ قائم کیا۔ میں چاہتا تھا کہ ان جیسا کوئی عظیم عالم اور شاعر اس پر نظر ڈال سکے تو بہت اچھا ہو۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنا بیش قیمت وقت دے کر اس کام کو پورا کرنے میں میری امداد کی اور میری تحریر کو شروع سے آخر تک سنا۔ اس کام کے لیے وہ کئی ہفتے

تک ہمارے گھر روزانہ آتے رہے اور اپنے خیالات سے مجھے محظوظ کرتے رہے۔ بعد میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کتاب کا مقدمہ لکھ کر میرے کام کو سراہا جس کے لیے میں ان کا بھی احسان مانتا ہوں۔ ڈاکٹر بشیر بدر کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش ہے کہ گذشتہ ۱۰۔۱۲ سالوں میں ان کے اور میرے خاندان کے درمیان باہم پیار کا یہ ناتا اتنا مضبوط ہوتا چلا گیا کہ اب ہم لوگوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ڈاکٹر موصوف سدا سے ہی ہمارے اپنے تھے۔

یہ بات تو سبھی کو معلوم ہے کہ گذشتہ تین چار مہینے پہلے تک میرٹھ میں جو فسادات ہوئے تھے ان کی چپیٹ میں ڈاکٹر بشیر بدر کا گھر بھی آ گیا تھا اور اسے بھی جلا دیا گیا تھا۔ اس وقت ہندوستان پاکستان عرب ممالک انگلینڈ اور کناڈا وغیرہ کئی ملکوں سے ان کے دوستوں اور قدردانوں نے ان کو میرٹھ چھوڑ کر اپنے یہاں آ کر بس جانے کی دعوت دی تھی۔ مگر ڈاکٹر بشیر بدر نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا۔

اس دھرتی کو پیار کیا تھا پیار کیا ہے پیار کروں گا
جب میں جاؤں میرے مرگھٹ کی مٹی کی چادر رکھنا

جو انسان یہ کہتا رہا ہو کہ۔

با وفا ساتھ ساتھ چلتے ہیں بے وفا راستے بدلتے ہیں

اس کے لیے ایسا جواب نہ دینا اس کے اخلاق کے برعکس ہوتا۔ رہی دنگے فساد کی بات تو وہ تو سبھی کے لیے تھے۔

چمن پر جب گری بجلی قیامت ہو گئی برپا نشیمن جل گئے کتنے چمن والوں سے مت پوچھو

خوشی کا مقام ہے کہ اب میرٹھ کے حالات بھی حسب معمول پرسکون ہو گئے ہیں اور ڈاکٹر بشیر بدر کے مکان کی بھی مرمت ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کے بارے میں جو بات خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ ہے کہ جیسا نام ویسا وصف۔ جب کبھی وہ کسی محفل یا مشاعرے میں اپنا کلام پڑھنے کے کھڑے ہوتے ہیں تو سب سے پہلے تو اپنی دودھ جیسی مسکان سے محفل کو نہلا دیتے ہیں۔ اس وقت یہ عالم ہوتا ہے کہ میر کے یہ الفاظ دماغ میں بجلی کی طرح کوند جاتے ہیں۔

منہ کھلے اس کے چاندنی چھٹکی دوستو سیر ماہتاب کرو

اس کے بعد ان کے کلام کے امرت کی بارش شروع ہوتی ہے جو محفل کو سرشار کرتی چلی جاتی ہے حالانکہ علامہ اقبال نے یہ اشعار کسی اور پس منظر میں کہے ہیں پھر بھی ان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ

ڈاکٹر بشیر بدر کے بارے میں بھی پوری طرح صحیح معلوم ہوتا ہے۔

زینتِ گلشن بھی ہے آرائشِ صحرا بھی ہے ـــــ تیرے ہنگاموں سے اے دیوانۂ رنگین نوا

اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے ـــــ ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعتِ پرواز میں

اب اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں صرف یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنے کلام سے فقط اُردو ادب کو ہی نہیں بلکہ سارے ہندستانی ادب کو مالا مال کیا ہے۔ آج ان کو جو عالم گیر شہرت اور عزت ملی ہے وہ اس کے پوری طرح حق دار ہیں۔ ہماری تو دعا ہے کہ وہ سلامت رہیں اور شعر و ادب کے چمن کو اسی طرح شاداب کرتے رہیں۔

[illegible] کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے ـــــ خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

بشیر بدر

تمام عمر مرا دم اسی دھوئیں میں گھٹا ـــــ وہ اک چراغ تھا میں نے اسے بجھایا ہے

بشیر بدر

عالمی غزل کا پہلا حرف

ڈاکٹر رضیہ حامد

غزل موضوعات کی نہیں بلکہ تجربات کی شاعری ہے [illegible] کے ہر شعر میں ایک تجربہ [illegible] نمایاں ہوتا ہے ایک مخصوص شاعرانہ رویہ کسی بھی موضوع کو غزل بنا سکتا ہے۔ [illegible] ذکر کے [illegible] بشیر بدر [illegible] ہے بشیر بدر کی شاعری کی [illegible] حسن [illegible] عشق، سفر [illegible] رد و قبول کرتی اپنے اندر [illegible] تجربات [illegible] اور حالات کی بازگشت بڑے دلفریب انداز میں سنائی دیتی [illegible] کے رشتوں [illegible] کو بالکل نئے انداز میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں [illegible] تجربات کو نئے رنگ و آہنگ [illegible] کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں جن کو پڑھ کر [illegible] دل کی آواز [illegible]

سوچا تجھے، دیکھا تجھے، چاہا تجھے، [illegible] تجھے
میری وفا میری خطا، تیری خطا کچھ بھی نہیں

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

کبھی ہم سفر تری راہ میں [illegible] گزر گئے
تجھے یاد کرکے تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

مسافر ہیں ہم بھی مسافر ہو تم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

چراغوں کی لو سے ستاروں کی ضو تک
تمہیں میں ملوں گا جہاں رات ہوگی

شاعر غیر معمولی طور پر حساس ہوتا ہے۔ آج کا شاعر براہ راست یا بلاواسطہ انداز بیان کا قائل نہیں ہے، وہ کسی شئے کے بیان سے زیادہ اس کے تاثر کو پیش کرنے کا قائل ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے قاری سرسری طور پر نہیں گزرتا بلکہ وہ رک رک کر ہر شعر کو پڑھتا اور محسوس کرتا ہے اس کو تازگی توانائی اور نادرکاری کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ بشیر بدر کے کلام میں بنی نوع انسانی کی زندگی کی فطری جمالیات اور

دھڑکن صاف سنائی دیتی ہیں، ان کی شاعری انبساط و کیف کی شاعری ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں میں محبوب کا سراپا، سادگی، سادہ لوحی اور حسن و عشق کے ناز و انداز اور دلداریاں دل فریب انداز میں نظر آتی ہیں۔ ذوقِ جمال کے ساتھ ساتھ بشیر بدر کا مذاق شاعری بہت صاف ستھرا اور خوبصورت ہے۔ غزل کا شاعر فن اعلیٰ شاعرانہ فکر و فن سے کسی جذبے کی تجسیم کرتا ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں کو پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بشیر بدر کی غزلوں میں شعریت و تغزل بدرجہ اتم موجود ہے ایک سرشاریت، رچاؤ، گھلاوٹ، لطافت، شیرینی اُن کی غزلوں میں پائی جاتی ہے یہ شاعر کے خلوص اس کی دردمندی، تجربے کی شدت، فکر کی رسائی اور مشاہدہ کی گہرائی کا نتیجہ ہے۔ بشیر بدر کا لہجہ دل نواز پُر تاثیر اور غنایت لیے ہوئے ہے ؎

کبھی جب تمہارا خیال آ گیا — کئی روز تک بے خیالی رہی

وہی شہر ہے وہی راستے وہی گھر ہے اور وہی لان بھی — مگر اس دریچے سے پوچھنا وہ درخت انار کا کیا ہوا

میرے سینے پہ خوشبو نے سر رکھ دیا — میری بانہوں میں پھولوں کی ڈالی رہی

آنسو کبھی پلکوں پہ زیادہ نہیں رکتے — اڑ جاتے ہیں یہ پنچھی جب شاخ لچکتی ہے

سب کھلے ہیں کسی کے ہاتھ پہ — اس برس باغ میں گلاب کہاں

یہ آنسو ہیں انھیں پھولوں میں شبنم کی طرح رکھنا — غزل احساس ہے احساس کا ماتم نہیں ہوتا

پھول سی انگلیاں کنگھیاں بن گئیں — اُلجھے بالوں سے ماتھا ڈھکا دیکھ کر

بشیر بدر کی شاعری صرف غم و کاکل کی شاعری نہیں انسانی روح کے کرب کی شاعری بھی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں جہاں شہر و جگہ کی نقش گری کی ہے وہ صنعتی زندگی کی ایک ایسا مرکز ہے جہاں فرد اپنا داخلی وجود کھو چکا ہے۔ بشیر بدر کی غزل اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہے اور اس کے ساتھ حیات و کائنات کی طرح آفاقی اور وسیع ہے ؎

خوبصورت اداس خوف زدہ — وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں — بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو — رُک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں — کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے — یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

بشیر بدر زندگی کے امکانات کی طرف سے کبھی مایوس نہیں ہوتے زندگی کی گہری تاریکی میں بھی حالات و واقعات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقیقت و صداقت کے متلاشی رہتے ہیں۔ زندگی کے ہمہ جہت پہلو سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں انسانی قوت ارادی، آزادیٔ عمل اور تعمیر ذات کے ذریعہ

گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکلنے کی جرأت کی ہے۔ غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہے۔ عصر حاضر کی غیر محفوظیت، خوف، تردد، تشویش اور انتشار عام کے باوجود انسانی قدروں کو برقرار رکھنے کی شدید تڑپ ہے۔

اس وسیع اور رنگا رنگ کائنات کی اشیاء اور مظاہر کو اپنے جذبے اور احساس کے پیکر عطا کرنے کا وسیلہ بہت کم شعراء نے بنایا ہے۔ بشیر بدر نے ایک سی توجہ کے ساتھ شاعرانہ موجودات، مناظر اور تماشوں کی حصار بندی کا عمل اختیار کیا ہے۔ جو ان کی بے پناہ جسارت اور مہم پسندی کا غماز ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں میں کہانی سنانے کا انداز ہے۔ مختلف منزلوں، مرحلوں سے دوچار تجربوں کو انھوں نے ماہرانہ چابکدستی سے غزل کے پیکر میں سمویا ہے۔ بشیر بدر نے تجرباتی عمل میں غزل کی دردمندی، فکری بلندی و سلامتی اور روح کی سرشار کر دینے والی نغمگی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ وہ غزل کے زبردست مزاج داں ہیں انھوں نے غزل کی دنیا میں زندگی کے کئی پہلوؤں کے لیے بند دروازے کھول دیئے۔

بشیر بدر کے تجربوں کی اصل اساس ان کی جذباتی جست ہے یا ان کا احساس۔ وہ جذبات و احساسات کو پیکر میں ڈھال دیتے ہیں جن کا تصور بھی محال ہے یہ ان کا فنی کمال ہے ان کے بے تکلف شعر کا رد عمل ذہن جذبے و احساس کی سطح پر بے تکلف ہوتا ہے ؎

ہماری شاخ کا نوخیز پتہ ——— ہوا کے ہونٹ اکثر چومتا ہے

کتنی صدیوں کی منتوں کا امیں ——— کوئی سجدے بساط طے کیا

باتیں کہ جیسے پانی میں جلتے ہوئے دیئے ——— کمرے میں نرم نرم اجالا سا بھر گیا

تری آنکھوں میں ایسا سنور جاؤں میں ——— عمر بھر آئینے کی ضرورت نہ ہو

رات کی بھیگی بھیگی چھتوں کی طرح ——— میری پلکوں پہ تھوڑی نمی رہ گئی

پوچھا جو میں نے اس سے کہیں اور اب ملو گے ——— چٹکی میں ریت لے کر اس نے اڑا دیا ہے

انسان حالات کا شکار ہے اب زندگی کے مثبت اور اعلیٰ اقدار سے اس کا ایمان اٹھ گیا ہے۔ عشق میں وفاداری صرف نام کی چیز رہ گئی ہے اس کے باوجود ابھی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دل کی گہرائیوں سے اعتماد کے ساتھ عشق کی ترنگ اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو بشیر بدر نے مختلف انداز سے پیش کیا ہے جن میں عشق کے سرمست نشاطیہ اور والہانہ جذبوں کو جاوداں بنا دیا ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں میں سماجی و معاشرتی رسم و رواج کی خوبصورت جھلک بھی ملتی ہے ؎

آنسو کو کبھی اوس کا قطرہ نہ سمجھنا ——— ایسا تمہیں چاہت کا سمندر نہ ملے گا

چاہا تھا میں نے چاند کی پلکوں کو چوم لوں ——— ہونٹوں پہ میرے صبح کے تارے بکھر گئے

دل کی خاموشی پہ نہ جاؤ   راکھ کے نیچے آگ دبی ہے
یہ بات کیوں کہی مجھ سے سکوت دریا نے   چراغ پانی میں اکثر بہائے جاتے ہیں
ایک میں ایک تم اک دیوار تھی   زندگی آدھی آدھی بٹ گئی
پھر دیئے رکھ گئیں تیری پرچھائیاں   آج دروازہ دل کا کھلا دیکھ کر

ذہین شاعر نئے نئے راستوں کی تلاش وجستجو کی ہمہ وقت کوشش کرتا ہے۔ تجربوں کی صداقت، تخیل کا انوکھا پن اور احساس کی شدت نے مل کر بشیر بدر کی تلاش میں جو رنگ بھرا ہے وہ منفرد ہے۔ اُن کی آواز دور سے پہچانی جاتی ہے۔ ذہنی انتشار و افکار، زندگی کی تیزروی کا احساس بشیر بدر کی غزلوں میں پایا جاتا ہے جو وصل میں بھی طمانیت اور سکون سے فیضیاب ہونے سے روکتا ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی صحیح ترجمانی ملتی ہے۔ بشیر بدر کے اشعار اپنی جگہ ایک مکمل داستان ہیں جن کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ انسانی احساسات اور جذبات کے مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں زندگی کے مختلف انداز، تنہائی، کرب، بے رحمی، سفاکی، مجبوری، رحم دلی، خلوص، محبت، دوستی و دشمنی کو بشیر بدر نے ایسے پیکر عطا کئے ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ غزل کے اشعار کو جا بجا زندگی کے تجربوں سے مزین کیا ہے۔ بشیر بدر نے اپنے ذاتی غم کا اظہار جہاں کیا ہے وہ غم بھی ان کا اپنا نہ ہو کر آفاقی ہو گیا ہے ؎

اب کے آنسو آنکھوں سے دل میں اترے   رخ بدلا کیسا دریا نے بہنے کا
کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں   ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا
بارش بارش بجلی قبر کا کھلنا ہے   جاں لیوا احساس اکیلے رہنے گا
بھیگی پلکیں، گھنے گیسو، حسیں دامن، سبک آنچل   جہاں کی تپتی راہوں میں یہ سائے یاد آتے ہیں
میرا یہ عہد ہے کہ آج سے میں کوئی منظر غلط نہ دیکھوں گا   میری بیٹی نے میری پلکوں کو کتنی معصومیت سے چوما ہے
پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا   میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر دیکھا

مشینی دور کی مصروف ترین حیات میں اب بھی انسان کی زندگی میں کچھ لمحات محبت کی سرشاری، وصل کی لذتیں اور جدائی کا کرب اور اذیت کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ محبت جو انسان میں حسن پیدا کرتی ہے، جو انسان کے دل کو نرمی اور لچک دیتی ہے، آج کا عاشق پہلے سے زیادہ حساس ہے وہ محبت میں مر نہیں جاتا وہ دوسروں کے لیے جینا جانتا ہے۔ اپنے محبوب کی چاہ کو اپنے تک محدود رکھ کر اپنی زندگی بخیر و خوبی گزار سکتا ہے۔ وہ اپنے ازدواجی رشتہ کو بہت خلوص و احترام کے ساتھ زندگی بھر نباہ دیتا ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کی غزلوں میں آج کے دور کے عاشق کا پرتو بہت حسن و خوبی کے ساتھ نظر آتا ہے۔

اب تیرے میرے بیچ ذرا فاصلہ بھی ہو — ہم لوگ جب ملیں تو کوئی دوسرا بھی ہو

تو جانتا نہیں مری چاہت عجیب ہے — مجھ کو منا رہا ہے کبھی خود خفا بھی ہو

وہ ایک پیڑ ہے آ اس سے مل کے رو لیں ہم — یہاں سے تیرے میرے راستے بدلتے ہیں

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایہ ہے — بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے — مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے — انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

بڑی آرزو تھی مجھ کو کوئی خاک ہو کے بجھتی — اتر آ مری زمیں پر تو یہی آسماں ہے

بشیر بدر کی غزل میں حالات کی سفاکی، اپنے عہد کی بے حسی کا اظہار ہے عالم گیر پیمانے پر تباہی اور موت کا تصور ہے۔ انھوں نے تنہائی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ تنہائی کا احساس صرف محبوب کی جدائی کا نتیجہ ہے نہیں بلکہ وہ دنیا کی شناسائی اور دوستوں کی بے حسی، اجنبیت، آپسی تعلقات میں فاصلے جیسے محسوسات ہیں۔ بشیر بدر کی غزل میں یہ اصلی روپ میں نظر آتی ہے۔ دنیا داری کے ساتھ وفاداری کا احساس لیے ہوئے ہے

پلا کے رات کا رس کشش کنار کی تھی — سو برسے لوگوں سے کہتی تھی دیوتا مجھ کو

ہجر و وصال کے سارے قصے چھوڑے ہیں — حق ملتا ہے کس کو اپنا کہنے کا

بچھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں آجاتی — اسے بھی غم نہیں ہوتا مجھے بھی غم نہیں ہوتا

بشیر بدر کے شعور میں پختگی، مزاج میں انفرادیت ہے۔ انھوں نے جدید شعری تقاضوں کی تکمیل کی خاطر زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کو واضح کرنے کے لیے نئے الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ آزادانہ سوچنے، محسوس کرنے اور بیان کرنے کی ہمت کی اور غیر مروجہ الفاظ کو غزل میں جگہ دی۔ بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے ایسے الفاظ بار بار غزل میں لائے جو اس سے پہلے نظر نہیں آئے۔ جو لفظ بشیر بدر غزل میں لاتے ہیں وہ اپنی جگہ نگینہ ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام الفاظ موجود ہیں جو آج کا عام قاری بولتا اور سنتا ہے۔ بشیر بدر کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غزل کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ بشیر بدر میں اختراعی قوت بدرجہ اتم موجود ہے، ان کا اجتہاد جرأت مندانہ ہے۔ انھوں نے الفاظ کی تراش خراش، نئے استعاروں، پیکروں اور علامتوں کی تخلیق کی ہے پرانی علامتوں کو نئے مفاہیم کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ غزل کو نئے الفاظ، پیکر و علائم سے معنوی وسعتیں دینے کی کامیاب کوشش کی ہے، ان کی پیکر تراشی کے عوامل نئے ہیں، تشبیہات کی دنیا نئی ہے، الفاظ کے تلازمے نئے ہیں جس کی وجہ سے ان کی غزل میں سحر کاری کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

درخت، پہاڑ، دریا، پیڑ، برف، وادی، مکان، کھڑکیاں، گھاس، کمرے، دریچے، جھیل سب غزل میں ہم آہنگ ہو گئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان اور مظاہر کائنات ایک اکائی ہے بشیر بدر کے اشعار کو پڑھ کر ایسا ہوتا ہے کہ وہ پھول، خوشبو، مرغزار، ندی اور جھرنوں کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں نیم روشنی اور خواب کی سی کیفیت پائی جاتی ہے ؎

اب ان دنوں میری غزل خوشبو کی اک تصویر ہے ۔۔۔ ہر لفظ غنچے کی طرح کھل کر ترا چہرہ ہوا

میں گھر سے جب چلا تو کواڑوں کی اوٹ سے ۔۔۔ نرگس کے پھول چاند کے ہاتھوں میں چھپ گئے

بشیر بدر نے عالمی سیاق و سباق میں آج کی غزل کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بشیر بدر کے شعری اسلوب کے نظام کو سمجھنے میں ان کی کئی تحریروں سے مدد ملتی ہے۔ ان کی کتاب "آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ" اور رسالہ "شاعر" میں شائع ان کے مضمون "غزل کی زبان" کو پڑھنے سے ڈاکٹر بشیر بدر کی میر فہمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی اور ابن انشا میر کے اسلوب کو دوبارہ زندہ کرنے میں نمایاں ہیں۔ ان تینوں مرحوم شاعروں کی دردمندی، آہستگی، لفظوں کے انتخاب کی نرم روی واقعی میر کا طریقہ ہے اس سلسلہ میں بشیر بدر کی غزل کی زبان کو ملایا جائے تو لوگ عام طور پر اس سے جلد اتفاق نہیں کریں گے۔

بشیر بدر کی غزل کی زبان "دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا پھول"، "کئی میل ریت کو کاٹتی ہوئی موج، اُجلے فر کا کوٹ، ناریل کے درختوں کی پاگل ہوا، زعفرانی پلور، برف کی پوشاک پہنے ہوئے دعاؤں میں سر جھکائے اُجلے اُجلے پیڑ، کہرے میں پہاڑوں سے اترتی بسیں، وغیرہ میر کی دنیا سے اس حد تک مختلف اور نئی نئی ہے جیسے مغلیہ عہد سے لندن کے نائٹ کلبس۔ ٹورنٹو کے گرد و نواح میں جدید عہد کی پُرسکون نوآبادیاں ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ابن انشا تقسیم وطن کی شام کے سائے ہیں جو میر کے اسلوب اس کی دھوپ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یہ میر کے وارث نہیں نور تن ضرور ہیں۔ بشیر بدر کا رویہ میر کے ساتھ وہی ہے جو مثنوی سحر البیان میں تاج الملک کا اپنے باپ کے ساتھ تھا۔ جو حال کا ماضی سے ہوتا ہے بیٹا باپ کی محبوب حریفانہ توسیع ہے تاج الملک وہ حال ہے جو اپنے باپ یعنی ماضی کی آنکھوں کی روشنی بن کر اپنی انفرادیت کی نئی روشنی دیتا ہوا آنکھیں کھولتا ہے۔ وہ عشق اور زندگی کی صحرا نوردیوں کا سفر دکھ اور سکھ کے ساتھ طے کرتا ہے۔ میر و غالب کی غزل کی زبان سے بشیر بدر کی غزل کی زبان بالکل الگ لگتی ہے۔ بشیر بدر کا غالب سے داخلی رشتہ فکری طور پر تلاش کیا جا سکتا ہے غالب کی زبان سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ لیکن غزل کی زبان کے انتخاب میں عالمی پیمانے پر اُن کا رشتہ میر سے ہے۔

جب میرؔ نے اپنے سے پہلے کی شاعری کی زبان کو از سرِ نو پرکھا تھا۔ میرؔ نے کچھ تابدار لفظوں کے تاج چھین لیے تو کچھ نئے لفظوں کی تاج پوشی بھی کی۔ اس وقت اُردو کی دنیا دہلی سے لکھنؤ تک تھی۔ بھوپال حیدرآباد۔ اور دہلی میں بڑا فاصلہ تھا۔ آج یورپ و امریکہ میں رہنے والے پاکستانی اور دہلی میں رہنے والے ہندوستانی کی اردو میں ایک عالمی رشتہ ہے۔ دونوں کی دفتری زبان انگریزی ہے ان کی مادری زبان یعنی اردو۔ اس ماں کے دودھ کی طرح ہے جس میں ساری دنیا کی محبت کی چاشنی ان اور جل شامل ہے۔ بشیر بدرؔ نے شعوری یا لاشعوری طور پر اس عالمی غزلیہ اُردو کا طریقہ کار میرؔ سے ہی سیکھا ہے۔ دونوں کا کلیہ ایک ہی ہے یعنی اپنے عہد کی کارآمد عام بول چال کی زبان کو شعریت اور تغزل کا حسن و وقار عطا کرنا۔ رابطہ وسائل کی کمی کی وجہ سے جو کام میرؔ نے لکھنؤ اور دہلی کے پیمانے پر کیا تھا بشیر بدرؔ نے وہ کام لکھنؤ، دہلی، سے امریکہ کینیڈا کی اس اردو میں کیا ہے جو بیرونی افریقہ متحدہ عرب امارات ہوتی ہوئی مشرق و مغرب کو خدا کی ایک اکائی بناتی ہے۔

عوام و خواص دونوں کے دل و دماغ جب کسی شاعر کو قبول کرتے ہیں اس وقت اس شاعر کی مقبولیت اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدرؔ عوام و خواص میں یکساں مقبول ہیں۔ ہندی کے بہت سے لکھنے والوں پر بشیر بدرؔ کی غزل کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کی اکثر علاقائی زبانوں میں ان کی غزلوں کا ترجمہ ہوتا رہتا ہے، فرانسیسی و انگریزی میں بشیر بدرؔ کی غزلوں کا ترجمہ ہو کر بہت مقبول ہوا۔

بشیر بدرؔ نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو سمجھا اور برتا ہے۔ اپنے دور کی زبان کو شاعری کی زبان بنانا آسان کام نہیں۔ بشیر بدرؔ نے اپنے آس پاس بولی جانے والی زبان کو دوام بخشا اور غزل کو پسندیدہ اور زندگی کی زبان بنا دیا۔

تم نے دیکھا ہے کسی میرا کو مندر میں کبھی
ایک دن اُس نے خدا سے اس طرح مانگا مجھے

بشیر بدر

سلامت اللہ خاں

جدید غزل گو شعرا میں بشیر بدر صاحب بھی ہیں جو میرے خیال میں کئی اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے صرف غزل ہی کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اس لیے ان کا کلام ایک طرح سے جدید غزل کی نمائندگی بھی کرتا ہے اور سمت کی طرف اشارہ بھی جس سمت میں جدید غزل کو اپنی بقا کے جانا ہے ان کی غزلوں میں جدیدیت کی نکتہ اسی اور بذلہ سنجی ہے لیکن انہوں نے فن اور شائستگی کے حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ ان کی شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس میں انہوں نے نئے مضامین اور نئے طرز بیان سے غزل کے دامن کو وسیع نہ کیا ہو۔ ان کے بیان کی خوبی ان کے نادر برمحل تشبیہات اور استعارے ہیں جو لطف بیان کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

ان کہے شعر ہیں وادیٔ ذہن میں مختلف رنگ جھلملاتے رہے
دستِ الفاظ محفوظ کر لے انہیں چل رہی ہے ہوا بجھ نہ جائیں کہیں

ار سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں

آ ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلتا ہے اور بولتا تک نہیں

تیر اور میرے پیار میں اکثر سارے جذبات مشترک ہیں مگر

دھو تی ہی مہرباں ہو جائے یہ کبھی چاندنی نہیں ہوتی

روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جس رات لوگ
ایک سایہ میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

ہو سکتا ہے کل سورج سوتا ہی مجھے پائے

ا سانپ مرے دل میں کب سے چھپا بیٹھا ہے

اور جس شاعر نے یہ شعر کہا ہو سہ

دروازے شہرِ درد کے کھلنے دو دوستو
نکلے گا مسکراتا ہوا شام غم کا چاند

اس کے لیے فن شعر میں کون سا کار نمایاں اور شاعری میں کون سی کامرانی ناممکن ہے۔

اردو ادب آزادی کے بعد، مطبوعہ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۲ء و جدید اردو غزل ۱۹۴۷ء کے بعد ۔ ۱۲۲ - ۱۲۴ ص)

عہد ساز شاعر

رفعت سلطان

ڈاکٹر بشیر بدر جدید غزل کے عہد ساز شاعر اور غزل کے منفرد نقاد ہیں انھوں نے شعری سفر میں جہاں نئی غزل کو بھرپور فکری انداز عطا کیا ہے وہیں لہجے کی بے تکلفی کے ساتھ جدید علامتوں اور نئے نئے الفاظ کے استعمال سے اپنے اشعار کو مزین کیا ہے۔

انسان اور انسانی مسائل بشیر بدر کے شعری تجربات کے مراکز ہیں وہ اپنے اشعار میں انتہائی جرأت و بے باکی سے انسانی مسائل سے نبرد آزما ہیں ؎

میں جانتا ہوں کہ انجام کار کیا ہوگا
اکیلا پتہ اگر رات بھر ہوا سے لڑے

انگنائی میں کھڑے ہوئے بیری کے پیڑ سے
وہ لوگ چلتے وقت گلے مل کے روئے تھے

دلی ہو کہ لاہور کوئی فرق نہیں ہے
سچ بول کے ہر شہر میں ایسے ہی رہوگے

خوبصورت اداس خوف زدہ
وہ بھی ہو بیسویں صدی کی طرح

دشمنی جم کے کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

بشیر بدر کی ایک خوبی ان کا حوصلہ اور امید ہے انھوں نے جدید غزل میں فعالیت اور جولانی کی فضا پیدا کی ہے ان کے یہاں درد ہے مایوسی نہیں گداز ہے ناکامی نہیں ناسازگاری ہے بے بسی نہیں۔ جدید غزل پر جس غیر فطری مایوسی، رشتوں کی شکست و ریخت اور بے تکلفی کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس سے بڑی حد تک بشیر بدر کی غزل پاک ہے ؎

سونے کے پھول پتے گریں گے زمیں پر
میں زرد زرد شاخوں پہ جب گنگناؤں گا

دشمنوں کی طرح اس سے لڑتے رہے
اپنی چاہت بھی کتنی نرالی رہی

آنکھوں کی کشتیوں میں سفر کر رہے ہیں وہ
جن دوستوں نے دل کے سفینے ڈبوئے تھے

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گزر گئے
جنہیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

عشق غزل کا سب سے اہم موضوع ہے بشیر بدر کی غزلوں میں عشقیہ جذبات و احساسات اور واردات کی ترجمانی نئے ماحول نئے انداز اور تصوّرات کے ساتھ پائی جاتی ہے عشقیہ موضوعات میں تنوع اور نفسیاتی گہرائی ہے انسانی زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کا گہرا شعور ہے۔ ان کے اکثر عشقیہ اشعار پوری زندگی اور وقت کے سیاق و سباق میں معنویت کا خوبصورت اظہار ہیں۔

وہ چہرہ کتابی رہا سامنے بڑی خوبصورت پڑھائی ہوئی

اس شہر کے بادل تیری زلفوں کی طرح ہیں یہ آگ لگاتے ہیں بجھانے نہیں آتے

ایسا لگتا ہے کہ تو مجھ سے جدا ہو جائے گا تیرے میرے درمیاں اب فاصلہ کوئی نہیں

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایہ ہے بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

سوئے کہاں تھے آنکھوں نے تکیے بھگوئے تھے ہم بھی کبھی کسی کے لیے خوب روئے تھے

خوش رہے یا بہت اداس رہے زندگی تیرے آس پاس رہے

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

شعر میں جب متوازن فقرے جمع ہو جاتے ہیں تو ان میں موسیقیت پیدا ہو جاتی۔ جو شاعری کا نہایت لطیف جزو ہے بشیر بدر کے کلام میں ایسے بے شمار اشعار ہیں جو موسیقیت سے بھرپور ہیں۔

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

تم بھی مجبور ہو ہم بھی مجبور ہیں بے وفا کون ہے باوفا کون ہے

بعض اوقات شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی لیکن اس کا طرز ادا اس قدر تیکھا ہوتا ہے کہ دل میں اتر جاتا ہے۔ یہ طرز ادا لطف زبان کی بنا پر پیدا ہوتا ہے ان کے بہت سے اشعار لہجے کے منفرد تیور سے ان کی پہچان بن جاتے ہیں۔

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

کبھی جب تمہارا خیال آ گیا کئی روز تک بے خیالی رہی

بشیر بدر کی شاعری میں عقل و جذبہ کا توازن، فکر و احساس کی آمیزش کے جلوے جا بجا نمایاں ہیں

سسکتے آب میں کس کی صدا ہے کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے

پھول سی قبر سے اکثر یہ صدا آتی ہے کوئی کہتا ہے بچا لو میں ابھی زندہ ہوں

وہ شہ سوار تھا رحم دل تھا میرے لیے　　　　بڑھا کے نیزہ زمیں سے اٹھا لیا مجھ کو

اک پل کی زندگی مجھے بے حد حسین ہے　　　　پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور لوٹ جاؤں گا

کہاں سے آئی یہ خوشبو یہ گھر کی خوشبو ہے　　　　اس اجنبی سے اندھیرے میں کون آیا ہے

غزل میں معنویت کے اضافے کی خاطر زبان و بیان کو نکھارنے اور سنوارنے کا رجحان بشیر بدر کے یہاں عام ہے انھوں نے جدید غزل میں نئی نئی علامتوں کے پودے لگائے اور ان کو خاص طور پر نشو ونما دی ہے اسٹیشن سائرن ٹریفک ناول لیمپ، کوٹ، کلینڈر، بلیاں، کتے، چاقو، چڑیاں، بسیں، مچھلی، کافی ہاؤس جیسے بے شمار الفاظ کے استعمال سے نئی شعری معنویت کو ابھارا اور اردو غزل کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر نے ہندی اور انگریزی الفاظ کو اپنے اشعار میں سمو کر جدید تغزل کی صفت سے آراستہ کیا ہے ان کی غزلیں نئے اسلوب نئے لہجے اور نئی زبان سے مزین ہوتی ہیں جو غزل گوئی سے انحراف کی نشاندہی کرتی ہیں اور جس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے بشیر بدر کو عصری تقاضوں کا احساس ہے اور وہ نئی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

یہ زعفرانی پُل اور اسی کا حصہ ہے　　　　کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

کھلے سے لان میں سب لوگ تمھیں بیٹھے ہیں　　　　دعا کرو کہ خدا ہم کو آدمی کر دے

مچھلیاں ٹوٹتی ہیں کاروں پر　　　　گھوڑے اسکوٹروں کے دیوانے

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں　　　　مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے

بشیر بدر کی شاعری میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی ہیں لیکن مجموعی اعتبار سے ان کی شاعری میں ایک بڑی شاعری کی امیج ملتی ہے۔ اشعار کا تنوع رنگا رنگی اور وسعت اس کے لیے شاہد ہیں۔ ان کی شعری جسارت نے غزل کو نئی فضا سے روشناس کیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہندوستان میں جدید غزل کے معماروں میں بے شمار کیے جانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

جیسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا، کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

بشیر بدر

جدید تشریحات

خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم

تہذیبوں کے ساتھ حقیقتیں بدلتی رہتی ہیں۔ رشتے بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد جو رویہ پیدا ہوتا ہے وہ جدید ہوتا ہے۔ میں مثال کے ذریعہ اپنی بات واضح کروں گا مثلاً آپ نے ابھی عشق و محبت کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ عشق و محبت کے سلسلہ میں پُرانے رویہ میں رقیب کا تصور تھا۔ دربان کا خطرہ تھا۔ محبوب کے نہ ملنے کا تصور تھا وغیرہ مگر اب سماج میں تبدیلی آگئی ہے۔ اب پابندیاں نہیں ہیں رقیب اور دربان کا تصور ختم ہوگیا۔ اس لحاظ سے آج کے دور کے اعتبار سے نئی حقیقتوں کے پیش نظر جو رویہ ہوگا وہ جدید ہے۔

مثلاً بشیر بدر کا شعر ہے۔

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے　　　انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

یہ بالکل نیا رویہ ہے۔ پُرانا عاشق یہ کبھی نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایک نئے دور کا عاشق ہی کہہ سکتا ہے جسے اپنی محبت سے غرض نہیں پُرانے عاشق کو صرف محبت سے غرض ہوتی تھی اور اس کی محبت کے درمیان آنے والے آدمیوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتا تھا اور شوہر و بیوی کے رشتہ ٹوٹنے کی یا کسی کے مرنے کی دعا کرتا ہے لیکن نئے عاشق کے لیے یہ ناانصافی ہے کہ اس طرح سماجی انتشار پھیل جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اگلے جنم تک انتظار کیا جائے۔ یہ ایک نیا رویہ ہے۔　　(ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے ایک انٹرویو کا اقتباس بحوالہ "علیگرین" علیگڑھ)

اشہر ہاشمی

ہنسی معصوم سی، کاپی پہ بچوں کی عبارت سی　　　ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت سی (بشیر بدر)

قاری کو بشیر بدر کا شعر سن کر گذر جانے میں ہی عافیت نظر آئے گی مگر چونکہ آج کی شاعری سننے سے زیادہ پڑھنے اور پڑھنے سے زیادہ غور و فکر کا تقاضہ کرتی ہے لہٰذا اس تقاضے کا اطلاق ہوتے ہی قاری کی نگاہ میں تین پیکر اُبھرتے

ہیں (۱) معصوم سی ہنسی (۲) کاپی پر بچوں کی عبارت اور (۳) ہرن کی پیٹھ پر بیٹھا پرندہ۔ دوسرا پیکر زیادہ اہم ہے۔ بچے کاپی پر بے مقصد عبارتیں کاڑھتے ہیں۔ قلم یا پنسل سے کچھ آڑا ترچھا بنا دیا۔ اس حرکت میں بے مقصدیت اور معصومیت کا امتزاج ہوتا ہے۔ ایسی ہی بے مقصدیت اور معصومیت اس مذکورہ ہنسی میں ہے مگر اس کا ردّعمل یہ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ وہ معصوم سی ہنسی جو صرف ہنسی تھی بے مقصد سی جس میں یاد سگنل جیسا کوئی پیغام نہیں تھا بے ارادہ تھی جیسے کاپی پر بچوں کی الجھی عبارت جیسی کہ ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت۔ اگر بشیر بدر نے شرارت کے بعد ہرن کے ردِّعمل کو مخفی رکھ کر قاری کو ایک پیغام دیا ہے کہ وہ اس شعر کی تکمیل اپنی ذہنی شرکت سے کرے۔ پیٹھ پر بیٹھے پرندے کا چونچ مارنا لازمی ہے پرندے کی چونچ لگنے کے بعد ہرن قلانچیں بھرنے لگتا ہے اور جنگل کی تہذیب خوب جانتی ہے کہ ہرن کی قلانچوں اور خوشی کا رشتہ کتنا اٹوٹ ہے۔ قلانچیں اس شعر میں بھی بے پناہ خوشی کی مخفی علامت ہے۔ کسی معصوم (یعنی بے ارادہ) بے مقصد ہنسی نے شاعر کو ویسا ہی مسرور کر دیا ہے جیسے کہ جنگل کی وسعتوں میں قلانچیں بھرتا ہرن۔ یہاں ایک نامعلوم جذبے کی دریافت مکمل ہوتی ہے۔ شعر کہہ کے شاعر کو اطمینان بخش مسرت ملتی ہے اور شعر تک پہونچ کر قاری کو حیرت آمیز خوشی۔

(ماہنامہ شاعر جلد ۶۷ شمارہ نمبر ۲، صفحہ ۲۶)

- - - - -

تخلیق: اللہ خاں راز اٹاوی

کوئی کاغذ نہ تھا لفافہ میں
صرف تتلی کا ایک پر نکلا

یوں تو جناب ڈاکٹر بشیر بدر صاحب کے مندرجہ بالا شعر کا مطلب واضح اور سیدھا سادا ہے لفافہ کھولا تو اس میں کوئی کاغذ نہ تھا صرف تتلی کا ایک پر رکھا ہوا تھا۔

بظاہر دیکھنے میں یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ احوال کاغذ پر نہ لکھ کر صرف تتلی کا ایک پر لفافہ میں ارسال کر دیا۔ لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ قدرتی اظہارِ حقیقت اور وارداتِ قلبی کا یہ انوکھا، نادر، جدید، دلکش، فنکارانہ، پراسرار اور اچھوتا شاعرانہ اسلوب ہے جسے سمجھا گیا تو میرے نزدیک نزدیک اس خوبصورت شعر کی مخفی رازداری حق تلفی ہوگی۔

پیغام کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لیے ہر دور اور زمانے میں CODE LANGUAGE کا استعمال کیا گیا ہے یا ایسے ذرائع، وسیلے اور تدابیر اپنائی گئی ہے کہ پیغام مخفی انداز سے فردِ متعلقہ تک پہونچ سکے۔ لیکن یقین کیجئے تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ کتنے بھی حجابات ہوں لیکن جلوے کی جھلک دکھائی ہے

یا ___ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔

تتلی کے پر سے جن خوبصورت اشارات، کنایات، فنی چابکدستی، دلکش انداز فکر، انوکھا طریقۂ اظہار خیال، شاعرانہ پرکاری، موثر انداز بیان اور حسین و جمیل پیغام رسانی کی سمت اشارا ہے وہ جدید بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔

نرم و نازک تتلی کی ساخت بذات خود قدرت کا حسین و جمیل شاعرانہ فنی کمال ہے جس کا صرف ایک پر شعرا کے دیوانوں پر بھاری ہے۔ قوس قزح میں ڈھلے خوشنما ریشمی رگ و ریشے، شام اودھ اور صبح بنارس کے دل موہ لینے والے جھلملاتے آنچل میں چمکتا ہوا طلسمی نکھار، دیدہ وروں کے واسطے وجدانی کیفیت طاری کرنے کے لیے بھرپور دعوت نشۂ نظارگی ہے۔

واردات قلبی کیفیات دل اور افسانۂ حیات کی موشگافیوں کو لفظی جامہ پہنانے کے لیے لاتعداد صفحات ناکافی ہیں۔ لیکن یہاں تتلی کا ایک پر اپنے خوبصورت اور حسین دامن میں ایک رنگت و غمناک داستان حیات سمیٹے ہوئے ہے۔

تتلی کے پر کی خوشنما ساخت دل سے کتنی مناسبت و مطابقت رکھتی ہے شوخ اور دیدہ زیب رنگوں کا اچھوتا ابھار، حسین، ریشمی رگ و ریشے سے مزین، قدرت کی صناعی کا نادر و دلکش نمونہ جو دل میں ہے وہی تتلی کے پر میں بدرجۂ اتم نمایاں و جلوہ افروز ہے۔

ملفوف سے تتلی کا ایک پر جو جامد و ساکت ہوتے ہوئے بھی اپنے غمگین شفق زار میں وہ خاموش رنگینی و رعنائی سموئے ہوئے ہے جس کا مطلب و مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ زندگی کی دلکشی و ہماہمی زمانے کی بے التفاتی، آلام روزگار اور گردش دوراں کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔ اب زیست صرف تتلی کے پر کی طرح خاموش، ساکت، جامد، بے حس اور نقش فریادی بن کر رہ گئی ہے۔ جس کی المناک اور رنگین داستان تتلی کے پر میں جگمگاتے نقش و نگار، حالات زندگی، واردات حسی و جذبات قلبی کا خوبصورت، حسین، رنگین، خاموش اور پرسکون افسانہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی جیتی ہوئی دلکش و سبق آموز حقیقت ہے۔ جسے بیان کرنے کے لیے عقل سلیم بے بس، ذہن کی موشگافیاں مجبور، قوت گویائی گنگ اور قلم کے لیے ہزارہا صفحات قرطاس ناکافی ہیں۔

خوشبو سی ایک غزل

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

کھلتی ہوئی رنگت، دراز قامت، چمکدار آنکھیں، کمر پر دونوں ہاتھوں کو اٹھائے پورے چہرے سے مسکراتا ہوا شاعر بشیر بدر اس وقت ہندوستان ہی کے نہیں بیرونی ممالک کے شاعروں کی بھی آبرو ہے بہت کم شعرا ایسے ہیں جنھیں مختصر مدت میں اتنی زیادہ عوامی مقبولیت حاصل ہوئی ہے جتنی کہ بشیر بدر کے حصے میں آئی ہے۔ اس مقبولیت کی وجہ کہیں ان کی شخصیت ہے کہیں آواز ہے کہیں غزلوں کا آہنگ اور کہیں وہ عوامی فکر ہے جس کے بکتے رہنے کے لیے بہت سے دوسرے شعرا اپنا اپنی قینچیاں لیے ہوئے دواوین کی ورق گردانی کرتے رہتے ہیں

بشیر بدر کی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ اردو دنیا میں جس قدر مقبول ہیں اتنے ہی ہندی والوں میں بھی یہ مقبولیت انھیں خان عبد الغفار خاں کی اتنی عمر بھی دے سکتی ہے اور ان کی صلاحیتوں پر سوالیہ نشان بھی لگا سکتی ہے کیونکہ عظمتوں کی دنیا ایسے خوابوں، جنوں اور بھوتوں کی دنیا ہے جن کے نہ تو جسم ہوتا ہے اور نہ وہ گرفت میں آسکتے ہیں۔

ہماری دنیا عقل کی نہیں خواہشوں کی پجارن ہے اور خواہشوں کا چکر شروع ہوتا ہے تو دانش وروں، شاعروں، ادیبوں اور پیغمبروں تک کو گمراہ کر دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عظیم ڈرامہ نگار شیکسپیئر اپنی شریک حیات کو ایک بوسیدہ پلنگ دیئے جانے کی وصیت کرتا ہے، ملٹن اپنی نوجوان بیوی سے تنگ آکر مسئلہ طلاق پر ایک فکر انگیز مقالہ سپرد قلم کرتا ہے، جرمن شاعر اور مفکر گوئٹے اپنی محبوبہ سے اس وقت عقد کرتا ہے جب اس کا بیٹا سترہ برس کا ہو جاتا ہے، سوفٹ اپنی نازک اندام محبوبہ لیڈی سٹیلا کے لیے آنسو بہاتا ہے، داستافسکی رقیب سے لڑتا ہوا مارا جاتا ہے اور چینیوں کا پیغمبر کنفیوشس اپنے مہمان سے خود ہی کہتا ہے کہ میں گھر پر موجود نہیں ہوں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ بشیر بدر ایسی عظمتوں تک پہونچنے سے بچ جائیں اور شاید خدا بھی یہی چاہتا ہے، اسی لیے میرٹھ کی آگ خوب خوب بھڑکی اور خوب خوب نونہالوں کو خاکستر کر گئی لیکن بشیر بدر کو کوئی گزند

نہیں پہونچا سکی اور حسن کمال کے اس دعوے کو بھی پامال کر گئی کہ غزل کا انتقال ہو چکا ہے۔

بشیر بدر پر اب ان کا کوئی اختیار یا ان کی کوئی حکمرانی نہیں رہ گئی ہے، کیونکہ اب وہ ہماری زبان اور ہماری تہذیب کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ ان کی تکلیف ہماری الجھن بن چکی ہے۔ ان کی لغزش ہمارے دامن کا داغ سمجھا جائے گا اور ان کی شاعری ہمارے لیے مشعل راہ بنے گی جس میں ہم اپنی دھرتی کی سچ دھج اپنا ماضی اور حال اور اپنے چہرے کے خد و خال دیکھ سکیں گے۔

بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے ۔۔۔ حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی ۔۔۔ دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو

وہ عطردان سا لہجہ مرے بزرگوں کا ۔۔۔ رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

دبا تھا پھول کوئی میز پوش کے نیچے ۔۔۔ گرج رہی تھی بہت پیچوان کی خوشبو

خدا کا شکر ہے میرے جوان بیٹے کے ۔۔۔ بدن سے آنے لگی زعفران کی خوشبو

گلوں پہ لکھتی ہوئی لا الٰہ الا اللہ ۔۔۔ پہاڑیوں سے اترتی اذان کی خوشبو

میری جہالت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ میں جن حضرات کو شاعر تسلیم کرتا ہوں انھیں بس سفید شیڈس کی طرح انگلیوں پر گن لیجئے۔ آپ تعجب کریں گے اور میری کم علمی و کم عقلی پر ماتم کریں گے کہ میں نے ابھی تک فراق اور فیض کو شاعر ہونے کی سند تفویض نہیں کی ہے کیونکہ مجھے نہ تو ان کے اشعار متاثر کر سکے ہیں اور نہ زبان۔ بس فراق کی گفتگو ضرور اچھی لگی ہے اور فیض کو خدا نے انداز گفتگو کبھی نہیں دیا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۸۲ء میں جب میں نے اپنے ایک مضمون میں بشیر بدر کو "عظیم شاعر" تحریر کیا تھا تو کچھ دوستوں نے بہت ناک بھوں چڑھائی تھی اور اپنے شکن آلود چہروں سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا ـــــ کسی حد تک ان کا یہ رد عمل جائز بھی تھا کیونکہ ڈاکٹر بشیر بدر کو مشاعروں میں جن اشعار یا غزلوں پر داد ملتی ہے اگر انھیں بنیاد بنایا جائے تو وہ واقعی قابل اعتنا نہیں، لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ مشاعروں میں مقبول اور ہر کس و ناکس کی زبان سے فوارے کی طرح چھوٹتے ہوئے زیادہ تر اشعار اس قابل ہوتے ہیں کہ انھیں گندے نالے میں ڈبو دیا جائے لیکن یہ کام اس لیے دشوار اور ناممکن ہے کیونکہ بے وزن چیزیں ڈوبتی نہیں۔

خیر چھوڑیے، میں بھی کہاں اختلافی موضوع لے بیٹھا، لیکن یہ تذکرہ اس لیے ناگزیر تھا تاکہ میری بات کی وضاحت ہو جائے۔ یہاں مجھے زیر نظر غزل کے اشعار سے بحث ہے اور مجھے بشیر بدر

کے سیاق وسباق میں جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان اشعار کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے شاعر نے صرف یہی ایک غزل کہی ہے اور مجھے اسی کی بنیاد پر اس کی ادبی حیثیت اور اہمیت کا یقین کرنا ہے۔

غزل کو غور سے پڑھنے پر محسوس ہوتا ہے جیسے گاؤں بھر کی فضاؤں میں پھولے سے لپی پتی حویلی کے سامنے تین سو برس پرانے نیم کے پیڑ ہیں اور گھنیرے درختوں کے نیچے ہریانہ کی پوربیاوں کی عالیشان گوئیاں اس طرح بندھی ہوئی ہیں کہ ان کی سینگوں میں کڑوا تیل چمک رہا ہے، سفید دودھ جیسی پیٹھ پر ہرے اور سرخ رنگ کے کپڑوں کی جھالریں جھول رہی ہیں اور گردن میں مراد آبادی گھنٹیوں کی مالائیں سر کی ہر جنبش پر بول اٹھتی ہیں۔ بائیں طرف گوبر اور بھوسے سے لپے ہوئے چبوترے کے قریب ام بھینس اپنے نومولود پڑوے سے اٹھکھیلیاں کر رہی ہے۔ حویلی کے بڑے پھاٹک کے مردانے میں گاؤں کے مکھیا شیخ برکت علی صاحب [illegible] بیٹھے ہوئے نیچے کا لمبے پیچوان والا حقہ گڑگڑا رہے ہیں اور خادم چاندی کے خاصدان سے پان کی گلوریاں مہمانوں کو پیش کر رہا ہے۔ قریب ہی تین فٹ اونچا اگالدان بھی موجود ہے ـــــ حویلی کے اندر دادی تن زیب کا سفید دوپٹہ سر پر ڈالے کرتے اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس اونچے پائے کے تخت پر سولہ کلو وزنی پاندان کے پاس بیٹھی ہوئی دساوری پانوں کو ترتیب دے رہی ہیں اور اس بات پر فخر کر رہی ہیں کہ خاندان کی بہوئیں کھلا سر لے کر ان کے سامنے نہیں آ سکتیں۔

غزل پڑھ کر روسا کا پورا ماحول، پورا ماضی اور پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتا ہے۔ جو افراد اور گھرانے ماضی کی چاشنی رکھتے ہیں ان کے لیے اس غزل میں بڑی مٹھاس ہے، بڑی زندگی ہے اور بڑا مزہ ہے۔ عام لوگ نہ تو اس مٹھاس، زندگی اور مزے کو محسوس کر سکتے ہیں نہ تصور ہی کر سکتے ہیں، لیکن پرتھوی راج چوہان، مہاراجہ ہلکر، شہنشاہ اکبر، شیر شاہ سوری اور رنجیت سنگھ کے خاندان کے افراد کے لیے یہ غزل ایک دلفریب نغمہ ہے۔ پولینڈ، سویڈن اور تاج انگلستان کی قدیم ہمرازیوں کے لیے اس میں بڑا سکون ہے اور لکھنؤ کے خاندان شاہی، نیشاپور، بلوچستان اور قبائلی کے سرداری نظام اور اودھ کے تعلقداروں اور زمینداروں کے لیے یہ ایک ایسا لطیف جھونکا ہے جو اپنے شانوں پر ہمالیہ کی بلندیوں کی ٹھنڈک اور گنگوتری کی پوترتا لے کر آتا ہے۔

اٹھارویں صدی کی آخری دہائی میں جب فرانس سماجی برائیوں کی آخری منزلوں سے گزر رہا تھا تو فرانسیسی ادیبوں اور شاعروں نے اصلاح معاشرہ کے لیے جس تحریک کو پروان چڑھایا تھا

اسے رومانی تحریک کہا جاتا ہے اور یہ تحریک اپنے جلو میں انقلاب، مناظر فطرت، ماضی پرستی اور محیر العقول واقعات کو لیے ہوئے تھی لیکن اس تحریک کا سب سے توانا پہلو ماضی پرستی تھا جسے بشیر بدر نے بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ اس لیے بشیر بدر کو جدید رومانی شعرا کی اس صف میں شامل کرنا چاہیے جہاں کبھی اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی نظر آتے تھے۔

عام قاری عورت کے تذکرے کو رومانیت سمجھتا ہے لیکن بقول مجنوں گورکھپوری "عورت رومانیت ہے، لیکن صرف عورت ہی رومانیت نہیں ہے" یہ حقیقت ہے کہ بشیر بدر کی شاعری پر عورت سوار ہے، اسی لیے نوجوانوں میں آج وہ مقبول ترین غزل گو سمجھے جاتے ہیں، لیکن جو لوگ رخت سفر کھول چکے ہیں وہ بشیر بدر کو عورت میں نہیں، تو اکے بیٹوں کے افکار میں تلاش کریں گے۔

لکھنؤ سے ملیح آباد چلنے والی ایک پرائیویٹ بس میں بشیر بدر کا یہ شعر تحریر ہے ؎

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

ظاہر ہے کہ یہ ایک ڈرائیور کی پسند کا شعر ہے جیسے عورت بھی عزیز ہے اور موت کا خطرہ بھی ہمہ وقت لاحق ہے۔ شعر پڑھ کر میرے ایک دوست فرمانے لگے "یار! بشیر بدر بہت" باذوق شاعر لگتا ہے"۔

میں نے جواب دیا "جی ہاں یا یوں سمجھئے کہ" ہاں جی "پھر انھیں چینیوں کی دعوتیں اور ان کے کھانے کے شوق کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ چینی عورت کے حسن کو دیکھ کر بشیر بدر کی طرح "ذوق کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس کی کھلی ہوئی گوری تندرست بانہوں سے گوشت کاٹ کر سیخ کے کباب بنانے کی سوچتا ہے اور سمندر کی سطح پر اچھلتی کودتی خوبصورت مچھلیوں کے بارے میں اس کی صرف یہی رائے ہوتی ہے کہ انھیں کڑھائی میں تل کر خوب چٹپٹا کر کے کھایا جائے، یہاں تک کہ چینی ڈاکٹر آدمی کے گردے کا آپریشن کرتے کرتے اسے نکال کر ہیٹر پر بھی رکھ سکتا ہے۔ بس یہی حال بشیر بدر کا ہے کہ ان کی شاعری پر عورت کا عکس ذرا گہرا اور گھمبیر ہے۔ عورت کا تذکرہ غیر ضروری نہیں، لیکن غیر ضروری حد تک غیر ضروری ہے۔

میں بشیر بدر کو بہت غور سے دیکھ رہا ہوں اور بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں اور ابھی بہت دن تک انھیں زندہ سلامت اور تابناک دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ مستقبل میں ماضی کی قدر کی جا سکے۔

سبز پتے دھوپ کی یہ آگ جب پی جائیں گے
اُجلے فر کے کوٹ پہنے ہلکے جاڑے آئیں گے

بشیر بدر

بیک نظر

نام : سید محمد بشیر تخلص : بدرؔ

والد : سید محمد نظیر مرحوم ۔ والدہ : عالیہ بیگم ۔ بیوی : سیدہ قمر جہاں شہناز (مرحومہ)

اولادیں : سید [illegible] ۔ سید نصرت [illegible] ضیا واحد

تعلیم : ایم ۔ اے ، پی ۔ ایچ ۔ ڈی [illegible]

تعلیمی امتیازات : (۱) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی [illegible] [illegible] ب نمبر

ترتیب دیا جسے یونیورسٹی نے کتابی صورت [illegible]

(۲) ایم ۔ اے (پریویس) میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام مضامین کے ایم اے

(پریویس) کے طلبا میں اول [illegible] ایم [illegible] اسکالرشپ ملا ۔

(۳) ایم ۔ اے (اردو) میں فرسٹ ڈویژن [illegible] ڈویژن لانے پر یونیورسٹی

گولڈ میڈل اور سارے مضامین کے ٹاپرس میں فرسٹ رہنے پر "راد ھا کرشنن

پرائز" ملا ۔

انعامات : اکائیؔ (غزلوں کا پہلا مجموعہ) پر اردو اکیڈمی یوپی کا انعام (۱۹۶۹ء)

امیجؔ (غزلوں کے دوسرے مجموعے) پر اردو اکیڈمی یوپی کا انعام (۱۹۷۳ء)

آمدؔ (غزلوں کا تیسرا مجموعہ) پر اردو اکیڈمی یوپی کا انعام (۱۹۸۵ء)

آمدؔ

پر بہار اردو اکیڈمی کا انعام (۱۹۸۶ء)

آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ پر اردو اکیڈمی کا انعام (۱۹۸۱ء)

بیسویں صدی میں اردو غزل (تنقید) (۱۹۸۱ء)

امتیاز میر ۔ میر اکاڈمی (۱۹۸۵ء)

تمہارے لیے (غزلوں کا انتخاب ہندی میں) دو ایڈیشن

سفر : پاکستان (دوبار)

کناڈا (ایک بار)، امریکہ (تین بار)

دبئی، شارجہ، ابوظہبی، بحرین، مسقط، دوہا (قطر)

فرائض اور امتیازات :

۱۔ ممبر ساہتیہ اکاڈمی، ہند (دہلی)

۲۔ رُکن مجلس انتظامیہ اور مجلس عامہ اردو اکیڈمی لکھنؤ

۳۔ رُکن مجلس انتظامیہ ترقی اردو بورڈ (مرکزی حکومت ہند) دہلی

۴۔ صدر، بورڈ آف سٹڈیز، ریسرچ ڈگری کمیٹی، میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ

۵۔ ایکسپرٹ، انعامی کمیٹی، ہماچل پردیش اکاڈمی

۶۔ ممبر، بورڈ آف سٹڈیز، کروکشیتر یونیورسٹی

میرے بڑے بھائی کا بچپن

سید محمد ضمیر

اَلحمدُللہ العزیزِ الحکیمِ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلامُ علٰی مُحَمَّدٍ وَآلہٖ وَاَصحابِہِ الکَرِیمِ

حمد و صلوٰۃ کے بعد روحانی فیض اور معلوماتِ ناظرین کے لئے مندرجہ ذیل حقائق پیش خدمت ہیں۔

خداوند کریم کا احسان ہے کہ آج سن ۱۹۲۵ء کا ایک واقعہ تقریباً ۷۴ سال گذر جانے کے بعد بھی موضوع بکیا۔ تحصیل ٹانڈہ۔ تھانہ بسکھاری۔ پوسٹ شنکل بازار، ضلع فیض آباد۔ یو۔پی (بھارت) کے عمر رسیدہ لوگوں کو یاد ہے۔ گاؤں کے اپنے پرائے بتاتے ہیں کہ وہ ایک ولی صفت انسان تھا جس نے شام کو داعیٔ اجل کو لبیک کہنے سے پہلے گاؤں والوں کے حقوق ادا کر دیئے تھے اور نائی کو بلا کر اپنی چارپائی اور بستر تک عنایت فرما دیا تھا۔ دن بھر یادِ خدا میں سرگرم رہا۔ جس طرح تقریباً اپنی زندگی کے ۸۰ سال عاجزی انکساری و بہادری کے ساتھ گذارے اسی طرح شاندار طریقے سے موت کا استقبال کیا۔ دنیائے فانی سے رخصت ہونے والے دن گھر والوں کو نمازیں پڑھوائیں۔ کھانا کھلوایا اور پھر تلقین و وصیت بھی فرمائی تھی۔ فرمایا تھا سب کو مالک حقیقی سے ایک دن ضرور ملنا ہے۔ دنیاوی زندگی محض آزمائش کی گھڑیاں ہیں جو شکر بیٹے امید وخوف میں گذر گئیں۔ پھر فرمایا دو دن کے بعد میری اہلیہ بھی رخصت ہو کر اپنے مالک حقیقی سے ملے گی۔ آبائی باغ میں دونوں قبریں آس پاس بنائی جائیں۔ جب سب اہل و عیال رشتہ دار چالیسویں کی فاتحہ کے لئے جمع ہوں تو فلاں کمرے کی دہلیز کھودی جائے اور زر سے بھرا گھڑا برآمد ہونے پر چار حصے آپس میں بھائی بہن بانٹ لیں اور پانچویں حصے سے ایک ساتھ میری اور اہلیہ کی رسم آخر ادا کی جائے۔ آخر میں کلمہ شریف خود پڑھا اور سب سے پڑھوایا اور پردہ فرمایا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ حدیث نبوی میں ہے کہ مصیبت کے وقت اسے پڑھنا رحمت الٰہی کا سبب ہوتا ہے۔

کتنا سادہ ہے زندگی کا نظام جس کو آنا ہے اس کو جانا ہے (بشیر بدر)

جب ولی صفت انسان کا ذکر اور بہ ہوا جو واقعی ولی تھا اور اس کا اندازہ ناظرین علی حضرت رحمت اللہ علیہ کے مترجم قرآن کو پڑھ کر خود لگا سکتے ہیں۔ اس بزرگ نے جس طرح فرمایا عین اس کے مطابق اس کی بھی دو دن کے وقفے سے اسی ہاغ میں اسکی اہلیہ بھی عالم برزخ میں رہ کر حشر کے دن کے انتظار میں ہیں اور ہمیں بھی ایمان والا ہونے کے ناطے اس کا یقین کرنا چاہیئے۔ ایک اور واقعہ عرض کر رہا ہوں جس سے یقین کامل انشاء اللہ ہو جائے گا۔ ایک بار یہی بزرگ ایک زمین کے مقدمہ میں حاضر عدالت کچہری شہر فیض آباد میں ہوئے۔ حاکم عدالت نے بنا سماعت اگلی تاریخ تعین فرمائی۔ ایسا ہونے پر کسی غصہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ کچھ ترمیم کر دی جائے۔ حاکم نے تیور بدل کر گفتگو کی اور کہا یہ عدالت ہے گاؤں کی چوپال نہیں۔ ولی کامل نے فرمایا سب سے بڑی عدالت اللہ تعالیٰ کی ہے وہاں کا حکم یہ ہے کہ خادم تو حاضر ہو جائے گا مگر حاکم مقررہ تاریخ پر نہ آسکے گا۔ اور ایسا ہی ہوا حاکم مقررہ تاریخ پر اپنے لخت جگر کی اچانک رحلت پر عدالت کا کام انجام نہ دے سکا اور اس طرح آئندہ کی تاریخ مقررہ ہوئی جو وہ بزرگ چاہتے تھے۔

ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں کہ نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ جس بزرگ کامل ولی کا آپ ذکر ملاحظہ فرما رہے ہیں ان کی ایک اور صاحب کے جوان العمری کے واقعہ کو بھی سماعت فرمائیں اور وہ اس طرح ہے کہ وہ اپنے ایک چھ ماہ کے بیٹے کو لیکر لکھنؤ سے فیض آباد بذریعہ ریل روانہ ہوئیں۔ اثنا سفر میں ایک ولی کامل کی نظر ان پر پڑی جو اسی ڈبے میں سفر فرما رہے تھے۔ ولی کامل نے پوچھا کہ بیٹی گود میں کیا ہے؟ جو فرمایا خدا کی امانت۔ ولی کامل نے فرمایا بیٹی مجھے دے دو میں بیٹا بنا کر رکھ لوں گا۔ جواب ملا کیا کوئی اپنا لخت جگر کسی کو دیتا ہے؟ سفر طے ہوتا ہے چھ ماہ کا لڑکا نہایت خوبصورت تندرست کبھی اپنی والدہ اور کبھی اپنے والد کے پاس گود میں آتا جاتا کھیلتا رہا آخر میں کامل بزرگ نے خدا کا حکم سنا دیا۔ فرمایا بیٹی اگر امانت دار اپنی امانت واپس کر لے تو تم کیا کرو گی۔ فرمایا نماز شکرانہ سے نعم البدل طلب کروں گی۔ الحمد للہ کیسی روح پرور گفتگو ہوئی اور آج میری والدہ محترمہ جو تقریباً اپنی عمر کے ۸۵۔۸۰ سال مجاہدانہ پورے کر چکی ہیں جب ہمیں ایسے ایمان افروز واقعات سناتی ہیں تو قلبی دنیا میں انقلاب رونما ہوتا ہے۔ ناظرین کو یقیناً اس واقعہ میں بھی درس ایمانی و رحمت خداوندی کے جلوے نظر آئیں گے۔

مندرجہ بالا گفتگو کے ایک ہفتہ کے بعد اچانک وہی بچہ نمونیا کی بیماری کا شکار ہوا اور

خدا کو پیارا ہو گیا۔ ماں کے سامنے وہی منظر پھر نمودار ہوا۔ جب ان کے والد محترم جناب محمد حسین صاحب مدفن سے فارغ ہو کر گھر واپس لوٹے تو دیکھا کہ ان کی اہلیہ سر بسجود ہے۔ نماز سے فارغ ہونے پر غم غلط کرنے کے لئے پوچھا کس وقت کی نماز ادا کی گئی۔ جواباً مندرجہ بالا واقعہ مجبوراً پیش فرما دیا۔ سارا گھر رو دیا۔ ماتم کدہ میں نعم البدل کی دعائیں ہوئیں۔

تعارف کا غرض ہے کہ وہ ولی صفت انسان جن کے صرف دو واقعات صحت کے ساتھ مجھ تک پہونچے اور آپ تک پہونچانے کی جرأت کی وہ ہیں عالی جناب قاضی شاہ محمد اصغر علی جو سرکار مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کچھوچھہ شریف فیض آباد کے غلام اور میرے بڑے بھائی صاحب جناب شاہ بشیر بدر صاحب کے دادا محترم ہیں۔ اور جس ولیہ کا ذکر کیا وہ ہیں جناب والدہ محترمہ عالیہ بیگم جو حضرت سیدنا مصباح الحسن رحمۃ اللہ علیہ پھپھوند شریف اٹاوہ کی مریدہ ہیں۔ سرکار کی غلامی کا شرف مجھے بھی اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ ۱۹۹۱ میں اس وقت حاصل ہوا جب بہت بیمار تھا اور صحت یابی کے لئے ہی داخل سلسلہ ہوا تھا۔ بفضلہ تعالیٰ جسمانی و ایمانی صحت مجھے آج بھی حاصل ہیں۔

ہاں تو عرض کر رہا تھا کہ نعم البدل کی دعائیں ہونے لگیں تھیں جو مقبول بارگاہ ہوئیں اور قاضی شاہ محمد ظہیر مرحوم صاحب کے گھر میں سال نہیں گذرا تھا کہ بدر نمودار ہوا۔ جس کو آج ہم سب بشیر بدر کے نام سے جانتے، دیکھتے، سنتے اور پڑھتے ہیں۔ جناب بدر صاحب کے بڑے بھائی ظہیر اور اس کے بعد ان چھوٹے بھائی شمیم دونوں کا وصال شہر فیض آباد میں چھ۔ چھ ماہ کی عمر میں نمونیا کی بیماری میں ہوا تھا۔ اسی لئے جناب بدر صاحب کی عمر بالخیر کی دعائیں کرانے والدین لکھنؤ سے فتح پور (ہسوہ) کی سرکار سید شاہ نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ بے کس پناہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت بدر صاحب تقریباً ۷-۸ سال کی عمر میں داخل ہو چکے تھے اور والدہ صاحبہ کا بیان ہے کہ قرآن شریف کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ حضرت سرکار سیدنا شاہ نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ نے انکے لئے دعاء فرمائی اور ساتھ ساتھ از خود فرمایا آئندہ خدا پھر نعم البدل بیٹا ہی عطا فرمائے گا اور وہ اپنے دادا محترم جیسا خوب نماز پڑھنے والا ہوگا۔ قبولیت کا وقت تھا آج قلم کی معرفت سے آپ سے مخاطب خادم محمد ضمیر مصباحی مادر گرامی میں تھا سرکار شاہ نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ہم دونوں بھائیوں کو جو دعائیں دیں وہ آج بھی ہر قدم پر ہمیں حاسدوں اور مفسدوں کی شرارتوں سے بچا رہی ہیں مضمون کے طویل ہونے کی وجہ سے انہیں یہاں

تحریر نہیں کر رہا ہوں مگر انشاءاللہ تعالیٰ اس مضمون میں سرکار رحمۃ اللہ علیہ کی کچھ کرامتوں کا ذکر ضرور کروں گا جن کا تعلق بدر صاحب سے خصوصی اور ہم سب سے اجمالی طور پر ہوگا۔ اسطرح خادم آج جو بھی نیک کام کرے یا ممتاز رضیہ حامد کو میرا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر بدر یوں کہیں "نمیر (میرا بھائی) فرشتوں جیسا ہے اور میں گنہگار اس کا بڑا بھائی ہوں" یہ سب کچھ ان بزرگان دین کا عطیہ ہے جن کی نگاہ کرم نے ہمیں نوازا ہے۔ نگاہ اولیاء اللہ سے انسان مسکین صفت بن جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب صغیر سنی سے ہی عاجزی و انکساری اور تواضع پسند طبیعت کے مالک ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ حافظ محمد صدیق اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ میں جب وہ ہائی اسکول فائنل کے طالب علم ۱۹۴۹ء میں تھے تو ڈاکٹر صاحب کو انہیں عادتوں کی وجہ سے سبھی بہت چاہتے تھے اور میری اپنی شرارتوں کو ان کے کہنے پر معاف بھی کر دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلی غزل ۱۹۴۸ء میں شہر اٹاوہ کے مشہور بزرگ سید شاہ مراد شاہ رحمت اللہ علیہ کے عرس مبارک کے موقع پر آل انڈیا مشاعرے میں محفل اردو میں پڑھی تھی۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ اسی مشاعرہ میں ان کی غزل انکی کم عمری کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے اعلیٰ تخیل کو سراہتے ہوئے بہت پسند کی گئی تھی اور جناب مونس مرحوم صاحب ایڈیٹر اور جناب ضامن علی صاحب رئیس شہر نے ڈاکٹر صاحب کو بدر کے خطاب سے نوازا تھا اور آج الحمدللہ ڈاکٹر صاحب محتاج بیان نہیں۔ آج برصغیر ہند و پاک میں بلکہ غیر ممالک میں ڈاکٹر صاحب کے ہزاروں شعر دل کے ورق پر نقش ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن پر اکثر ان کا کلام سننے کو ملتا ہے اور جس مشاعرے میں بدر صاحب نہیں ہوتے تو لوگوں کی نگاہیں ہر آنے والے شاعر کو بدر سمجھ کر استقبال کرتی ہے اور پھر مایوس ہو جاتی ہے ابھی شہر مین پوری کے دیوی میلا و نمائش کے مشاعرہ میں اسی سال آخر تک انتظار رہا اور مشاعرہ عجیب اداسی کے انداز میں ختم ہوگیا۔ ان دنیاوی جھمیلوں سے دور خاص بات یہ ہے کہ روحانی محافل میلاد شریف میں خادم ان کے شعر اکثر پڑھتا ہے کیونکہ ان شعروں مجھے وہ شعر بہت پسند ہیں جن میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی جھلک ملے یا امت محمدیہ کے لئے اصلاح کا پیغام ہو۔ ملاحظہ فرمائیں بدر صاحب فرماتے ہیں ؎

مجھے ایسی جنت نہیں چاہئے — جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے

گھروں پہ لکھتی ہوئی لا الہ الا اللہ — پہاڑیوں سے اترتی اذان کی خوشبو

اک نام کی تختی کا مجھے شوق ہوا تھا — پانی پہ ہواؤں نے لکھا اللہ ہی اللہ

خدا ایسے احساس کا نام ہے — رہے سامنے اور دکھائی نہ دے
دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے — جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں
دادیوں سے تراشی ہوئی لڑکیاں — جن کے لہجوں میں ختم ہوتے ہیں
دوست ہیں دوستی سے مگر بے خبر — دشمن جان ہیں لیکن خفا تک نہیں

سن ۱۹۴۹ء میں ... کے خطاب سے نوازے جانے کے بعد حافظ محمد صدیق اسلامیہ انٹر کالج اناؤ کے ہونہار طالب علموں کی دلچسپی اردو زبان میں اور بڑھ گئی اور اسی طرح مجھے یاد ہے سینیر اور جونیر طلبا ہفتہ میں دو دن اپنے اپنے درجات سے اپنی اپنی اردو شعروں سے بھری کاپیاں لیکر اور پھر ایک ساتھ جمع ہو کر آپس میں مقابلہ کرتے تھے ہمارے اردو کے معلم جناب نثار صاحب مرحوم ہماری غلطیوں کی نشاندہی بڑی شفقت سے کرتے تھے یہ سلسلہ جاری تھا کہ اچانک ہمارے والد محترم بہت بیمار ہوئے اور ہم سب کو اپنے وطن جانا پڑا۔ اور وہاں سے تقریباً چھ ماہ بعد ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء میں والد صاحب کا تبادلہ سرکاری ملازمت میں لمبی چھٹی کے بعد شہر فتح پور (ہسوہ) ہوگیا اور اس طرح سرکار سیدنا شاہ نجم الدین رحمتہ اللہ علیہ کے قرب میں پہونچ گئے والد محترم کی صحت نے وہاں بھی ساتھ نہ دیا اس وقت ہم چار بھائی بقید حیات تھے۔ ڈاکٹر صاحب سب سے بڑے راقم (شاہ محمد ضمیر) صغر سنی میں شاہ محمد صغیر اور چھ ماہ کے شاہ محمد اقبال۔ ہم دونوں بھائیوں نے مسلم انٹر کالج فتح پور میں داخلہ لیا ہی تھا کہ والد صاحب کی علالت میں اضافہ ہوا اور ان کا ملازمت پر جانا قطعی بند ہوگیا۔ انہیں پریشانیوں میں سب سے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوگیا اور سرکار سیدنا شاہ نجم الدین رحمتہ اللہ علیہ خواب میں تشریف لائے اور میری والدہ صاحبہ سے فرمایا۔ گھبرانا نہیں فتح تمہاری ہوگی فتح پور تمہارا ہے۔ والدہ محترمہ نے حیات میں دیدار کیا تھا۔ فرماتی ہیں خواب میں دیکھا کہ نہایت عمدہ لباس پہنے ملبوس تھے۔ چہرہ مبارک نور سے جگمگا رہا تھا۔ سب سے چھوٹے بھائی کے وصال پر سرکار کا یہ فرمانا کہ فتح پور تمہارا ہے ایک معنی خیز بات تھی اور آج سمجھ میں آتی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں اقبال بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور بدر صاحب سب سے بڑے۔ اقبال میاں سے صغیر بڑے تھے۔ اقبال کے وصال کے بعد صغیر میاں۔ صغیر میاں ہی رہے اور اقبال ڈاکٹر بدر صاحب کو نصیب ہوا۔ بدر صاحب کی والدہ محترمہ آج بھی بقید حیات ہیں اور ہر وقت دعا کرتی رہتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ والد صاحب کی مستقل علالت کے بعد بھی جب ۵۹/۵/۱۲ء میں ان کا وصال ہوا۔ لگ بھگ پانچ سال بدر صاحب کو اپنی پڑھائی موقوف کر کے پوری ذمہ داری کے ساتھ ہم سب کو پڑھایا لکھایا اور ۱۹۵۵ء میں ملازمت کے

سلسلے میں الہ آباد تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے سیتاپور تعلیم پوری کی۔ علی گڑھ پہونچے اور الحمد للہ آج بدر صاحب کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی نگاہ کرم کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم اے میں سب سے زیادہ نمبر لانے میں ان کا ریکارڈ بدستور قائم ہے۔

صرف ایک واقعہ ۱۹۴۷ء کا عرض ہے۔ اسلامیہ کالج میں انسپکٹر آف اسکول آئے بدر صاحب کھڑے آٹھویں میں تھے۔ انسپکٹر نے تاریخ کے پیریڈ میں سوال کیا کہ ۱۸۵ء کی اہمیت کیا ہے۔ بدر صاحب ہوئے کہ ۱۸۸ء تک ہماری تاریخ روشنائی سے لکھی ہوئی ہے اور اس کے بعد سے آج تک ہمارے لہو سے لکھی گئی ہے۔

ساری دنیا میں ان کی غیر معمولی شہرت، بے شمار دنیاوی اعزاز۔ بقول ڈاکٹر اختر نظمی، "کیسا ہی غیر مہذب اور شوخ مجمع کا مزاج ہو بشیر بدر میں کوئی روحانی طاقت ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کو دیکھ کر وہی مجمع مہذب اور متین ہو جاتا ہے اردو مشاعرے کو جو اعلیٰ شعریت اور پر وقار عظمت ڈاکٹر بشیر بدر کی مسلسل محنتوں سے ملی موجودہ عہد میں اردو زبان کی بقا کی جو کامیاب سعی ان کے شعروں سے ہوئی وہ بذات خود ہماری لسانی اور شعری تاریخ کا حصہ ہیں۔" ہمارے بزرگوں کی تعلیم کا یہ فیضان ہے کہ ہم اپنی خدمت پر خود پردہ ڈالتے ہیں اسلئے اپنے محترم بھائی کی کامیابیوں کی داستان اپنے آپ لکھنا ہمارے بزرگوں کی تعلیم کے منافی ہے۔

کمار پاشی

بشیر بدر کی غزل پڑھتے ہوئے میں نے مزہ غنا کا منفرد ذائقہ محسوس کیا ہے۔ کھردرے سے کھردرے اور غزل باہر الفاظ بھی ان کے اشعار میں نرم، میٹھے اور سچے لگتے ہیں۔

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

بشیر بدر

میرے بھیاجی

خورشید فاطمہ زیدی

میری سب سے چھوٹی بہن سلمٰی زیدی (ایم۔ اے۔ انگلش) میرے بھیاجی ڈاکٹر بشیر بدر کے سب سے چھوٹے بھائی سید صغیر سے منسوب ہیں۔ لیکن میرے لیے اس رشتے سے کہیں زیادہ اس کی اہمیت ہے کہ وہ میرے بھیاجی ہیں۔ میں نے انھیں سنہ ۱۹۴۶ء میں پہلی بار دیکھا۔ وہ زمانہ ہے جب وہ اپنی نامکمل تعلیم کو دوبارہ مکمل کرنے کی پوری جدوجہد کر رہے تھے۔ اس وقت وہ مشاعروں کیا کسی شعری نشست تک میں جانے سے سختی سے پرہیز کرتے تھے۔ ہاں ادبی رسائل جیسے نقوش (لاہور) سویرا وغیرہ میں بڑی امتیازی شان سے چھپتے تھے دراصل پاکستانی رسائل کا تعارف ہم لوگوں کے لیے نیا نیا تھا۔ ہندوستان میں یہ رسائل عام نہ تھے اسی لیے ہم ان رسائل کی اہمیت نہیں سمجھتے تھے میں انٹرمیڈیٹ کی تیاری کر رہی تھی۔ عوام کیا، غیر ادبی خواص بھی اُن کی شعری صلاحیتوں سے ناواقف تھے۔ ہاں ایک اچھے کرکٹ کے کھلاڑی کی حیثیت سے وہ بہت مقبول تھے عام خیال تھا کہ اب وہ یوپی کی اس ٹیم میں منتخب ہونے والے ہیں جو رنجی ٹرافی کے لیے منتخب ہو گی۔ لیکن اس ٹیم میں اُن کا انتخاب نہیں ہو سکا۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے کسی ناانصافی کا رونا نہیں رویا بلکہ صدق دل سے اُن کا خیال تھا کہ ان میں اب وہ اسٹیمنا (طاقت) نہیں رہا تھا جو ایک کرکٹر کے لیے ضروری ہے۔

ہم تین بہنیں ہیں، فیروزہ فاطمہ زیدی، میں اور سلمٰی زیدی۔ میرے دو بھائی ہیں۔ ایک بھائی ہمارے والدین نے ہمیں دیا دوسرے جو خدا کی عطا ہیں یعنی آپ لوگوں کے ڈاکٹر بشیر بدر ـــــــ

میرے والد صاحب بہت سادہ اور حد سے زیادہ سیدھے مزاج کے آدمی ہیں (یہی سیدھا پن ان کا دشمن ہے) ہم دو بہنیں ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ ہمارے تایا صاحب ہم کو پڑھنے میں مدد دیا کرتے پھر بشیر بدر سے بھی مدد لینے لگے۔ اس طرح ہمارا تعارف بھیاجی سے ہوا۔ کہاوت ہے کہ شکر خورے کو شکر...... لہٰذا بھیاجی کو چونکہ پڑھنے کا شوق تھا اور ہے اس وجہ سے بہت جلد ہم لوگ گھل مل گئے۔ ذہنی اور مزاجی ہم آہنگی اور دلچسپی نے بہت مدد کی۔ بھیاجی کے پڑھنے پڑھانے کا شوق ہمیشہ رہا ہے بھیاجی سیتاپور سے

تلسی پور نکہیم پور آئے تھے اور وہاں پھر بھی اپنے متعدد شاگرد اور مرید چھوڑ کر آئے تھے۔ اکثر وہ لوگ ان سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اس وقت بھیا جی کم گو اور زیادہ سوشل نہیں تھے۔ ہمارا گھر اور دفتر بھی ان کا حلقہ تھا۔ (اب تو دنیا ان کو ہر وقت گھیرے رہتی ہے) اس لیے ان کی خوبیوں کو جاننے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کو سمجھ بھی وہی سکتا تھا جو خود تعلیم یافتہ ہو۔ جس وقت نکہیم پور میں بھیا جی آئے ہیں ان کی شاعری بچپنے کی حدود سے نکل چکی تھی اور پختگی کی طرف آ رہی تھی ؂

پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

یہ شعر ان کی ایک پرانی کلاسیکل غزل کا ہے جو آج بھی تازہ ہے۔ آج بھیا جی نے نہ صرف شاعری میں ایک نئی راہ پیدا کی بلکہ علم و ادب کا ایک سمندر بن گئے جس میں بڑی بڑی طوفانی کشتیاں غوطے کھا رہی ہیں۔ ایک بہت ہی پیارا اور پرانی غزل کا شعر ہے جو اپنے معنی کی سادگی اور جذبات اور روح کی خوبصورتی کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول ہوا۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

یہ شعر مرحومہ مینا کماری کی ڈائری میں لکھا ہوا تھا اور اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے کئی رسائل میں میں نے یہ شعر پڑھا۔

ہمارے گھر کا ماحول شروع سے ہی ادبی اور سیاسی رہا۔ میرے چچا صاحب M L A ہیں اور تایا صاحب بہت شوقین اور باذوق آدمی تھے ادب کے معاملے میں۔ بھیا جی سے ملاقات ہونے سے پہلے مجھے ان کے سامنے جاتے ہوئے جھجک کے ساتھ کچھ خوف سا بھی ہوتا تھا نہ معلوم کیوں جب کہ میری بڑی بہن ان سے پڑھتی تھیں۔ ان کے پڑھانے کی تعریف اپنی بہن سے سن کر مجھے بھی ان سے پڑھنے کا شوق ہوا۔ انٹر فارم بھر کر میں بھی ان کی شاگردی میں داخل ہو گئی۔ بھیا جی کے پڑھانے کا اسلوب اور انداز اتنا اچھا تھا کہ آج باغ و بہار۔ گلزار نسیم۔ آئی سی۔ ایس اور نمک کا داروغہ وغیرہ کے اسباق میرے ذہن نشین ہیں۔ بھیا جی کی مجھ پر کچھ خصوصی شفقت ہوئی۔ معلوم نہیں کہ یہ میری ان سے عقیدت تھی یا میرا پڑھائی کا شوق اور لگن کہ وہ مجھے بہت محنت سے پڑھاتے۔ اگر بھیا جی برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں کہ میں ایمان داری کے ساتھ سوائے پڑھائی کے اور کوئی بات جانتی ہی نہیں تھی۔ میرا دھیان کسی شوق یا فیشن میں اور نہ ہی خالی بیٹھ کر آپس میں سہیلیوں سے بات کرنے میں تھا۔ صرف میں اور میری پڑھائی تھی یوں سمجھئے کہ مجھے کورس کی کتابوں کا ہر صفحہ اور اس کی

لیکن میری نظریں اور میری انگلیاں رہتی تھیں۔ اس بات پر اتنا خوش ہوتے بھیا جی رہتے تھے۔ تمہاری تیاری
اور اسٹڈی تو ایسی ہے اگر ممکن ہوتا تو بی اے کے امتحان میں ابھی میری بڑی کامیابی دے رہی تھیں
خورشید کو بھیج دیتا جیسے کہ ایک ماہر سپاہی کو میدان جنگ میں بھیجتے ہیں۔ یہ تعریف میرے لیے ہزاروں
انعامات سے بالاتر تھی۔ بھیا جی ہمیشہ مجھے بیٹا ہی کہتے۔ آج تک یہ رشتہ اور محبت قائم ہے۔ ایک
بار ایک غزل لکھی جس کے شروع کا ایک شعر ہے

نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

شعر سن کر وہ نے ایک دم داد دی اور کہا آپ نے بہت چالاکی سے کام لیا ہے اس میں۔ صبح جب
صبح ہو ہی گئی تو روشنی آ ہی جائے گی۔ میری اس بات سے بھیا جی بہت زیادہ خوش ہوئے۔

ہر سال جب راکھی کا تہوار آتا تو میں ضرور رنگ برنگی راکھی اپنے ہاتھ سے بنا کر بھیا جی کو باندھتی
ایک بار کی بات ہے کہ پڑھائی میں میری کوئی غلطی تھی بھیا جی نے مجھے خوب ڈانٹا اور میں اتنا روئی کہ میری
آنکھیں سوج گئیں، چونکہ کبھی ڈانٹ نہیں پڑی تھی اس لیے احساس زیادہ ہوا اور ان کا استادی والا دل
پگھل گیا۔ صرف محبت کرنے والے بھائی کا روپ ہی رہ گیا۔ میرے اوپر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ میرے دل میں
بھیا جی کے لیے بطور استاد ان کا ادب اور لحاظ آج تک ہے۔ میں کبھی ان سے شوخ ہونے کی بے تکلف
ہونے کی ہمت نہیں کر پاتی ہوں۔

میرے تایا صاحب مرحوم بھیا جی پر بہت زیادہ مہربان تھے۔ حالانکہ وہ ہر کسی سے بے تکلف ہونا یا قربت
رکھنا زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمارے ادبی شعور کی پہچان اس زمانے سے ہوئی جب قاضی عبدالستار
صاحب صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ جن سے بھیا جی کے بے حد پُرخلوص فیملی ریلیشن ہیں اور
علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی شاید تحریک میں تقویت ان کی مدد سے آئی۔ بھیا جی کے گھر آنے اور
ہمارے گھر بھی ان کی ادبی نشستیں جمتیں۔ ہمارے تایا بطور خاص ہر کام میں دلچسپی لیتے۔ بڑا اچھا
ماحول لگتا۔ ہم لوگ صرف تماشائی رہتے۔ صرف کانوں سے کام لیتے۔ اس دوران مزے مزے کے کھانے
مرحومہ شہناز بھابی پکا کر سب کو کھلاتی تھیں۔ بھیا جی علی گڑھ سے امتحان دیتے رہے اور پہلی پوزیشن
لاتے رہے۔ ۱۹۶۸ میں ہماری شادی ہوگئی بھیا جی علی گڑھ مستقل رہنے کے لیے چلے گئے۔ میر و اقبال
پر مباحثے اور بات چیت کی محفل ختم ہوگئی۔ علی گڑھ کے کویت ہاؤس ہاسٹل سے اکثر بھیا جی اپنی سرگرمیوں
کے بارے میں مجھ کو خط لکھتے رہتے تھے۔ میں کہتی کہ آپ تو ہندوستانی فلم کے ہیرو کی طرح ہیں جو کام

کریں گے اس میں کامیاب ہوں گے۔ چاہے وہ امتحان ہو۔ مشاعرہ ہو یا کہ سیمینار۔ علی گڑھ کی پڑھائی کے دوران بھیا جی نے اپنے، بیوی بچوں کو ان کے ننیہال ضلع بستی میں بھیج دیا تھا۔ بھیا جی کی پڑھائی ترقی اور جدوجہد اور آج جو پوزیشن ہے اس کو بنانے میں ان کی بیوی مرحومہ شہناز بھابی کا بہت بڑا تعاون ہے۔ لکھیم پور کی سروس کے دوران اپنی تنخواہ اور مشاعروں کے ذریعے اتنا روپیہ بھیا جی نے جمع کیا کہ اپنی پڑھائی اور بیوی بچوں کا پورا خرچ اٹھایا۔ کسی سے کبھی ایک پیسہ کے طالب گار نہیں ہوئے۔ ہمارے لیے ایک نمونہ تھا ترقی اور محنت کا۔ ان کی لگن اور شوق نے ہمارے دلوں میں بہت اونچا مقام بنالیا۔ صرف پڑھائی اور کچھ بننے کی لگن میں مستقل نوکری چھوڑ دی جب کہ لوگ اس نوکری کو پانے کے لیے ہزاروں روپے رشوت دینے کو تیار تھے اور نوکری نہیں ملتی تھی۔ چونکہ بھیا جی کی لائن تو یہ تھی جس پر آج اللہ تعالیٰ نے ان کو پہونچایا ہے میں اکثر کہتی کہ جو ڈگری آپ کو ملے گی وہ آپ فریم کرا کر رکھ لیجئے گا اس پر بھیا جی جواب دیتے کہ ڈگری تو وہ فریم کرائی جائے گی جو میں بانٹوں گا۔

میری شادی کے بعد بھیا جی اکثر مرادآباد آتے رہتے۔ میرے شوہر کے چچا قمر مرادآبادی صاحب مرحوم جو بہت قابل شاعر اپنے وقت کے استاد اور بہت ہی نیک بزرگ تھے ان کے مشاعروں میں بھیا جی ضرور آتے۔

ادبی ذوق شوق رکھنے کے باوجود گھر کی ذمہ داریوں اور گرہستی میں پھنس کر اس کو پورا کرنے کا موقع بالکل نہیں مل پاتا تھا بچے بھی بہت چھوٹے تھے۔ میرے شوہر سید اختیار الحق صاحب بذات خود بھیا جی کے گرویدہ ہیں۔ وہ ایک خوبصورت با اخلاق اور ملنسار انسان ہیں۔ ایک بار جو ملاقات کرلے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ازدواجی زندگی پُرسکون اور مطمئن ہے۔ پہلے میں یہاں ایک مقامی کالج پڑھاتی تھی مگر اب نہیں پڑھاتی ہوں۔ میرے چار بیٹے ہیں۔

خدا تعالےٰ نے آج بھیا جی کو جس بلند مقام پر پہونچایا ہے وہ ان کی محنت نیکی اور سخت جدوجہد اور بے ضرر طبیعت کا ثمرہ ہے۔ کبھی کسی کو تکلیف دینا تو جانتے ہی نہیں۔ مگر قدرت کی طرف سے ایک بہت بڑی آزمائش ہوئی کہ ۳-۴ سال پہلے ہماری بھابی کو اللہ نے ان سے جدا کر دیا۔ اس صدمے کو کیسے کیسے برداشت کیا یہ ان کی گرتی ہوئی صحت اور کلام سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھیں دنوں ٹی۔ وی پر ایک پروگرام تھا۔ جس میں آخر میں بھیا جی پیدل پیڑوں کے نیچے ٹہلتے ہوئے جا رہے ہیں پیڑ کے پتّے جھڑ رہے ہیں اور راستہ سنسان ہے بیک گراؤنڈ سے یہ غزل گائی جا رہی تھی

انھیں راستوں نے جن پر میرے ساتھ تم چلے تھے   مجھے روک روک پوچھا تیرا ہم سفر کہاں ہے

یہ سین مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ سبھی وہاں موجود لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن خدا تو بہت بڑا حکیم ہے اس نے پھر ان کو ہمت دی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا اور اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادی سے سبکدوش ہوئے۔ پچھلے دنوں میرٹھ کے فسادات میں بھیا جی کا گھر گرہستی کا سامان غنڈوں نے جلایا سب کچھ جل کر خاک ہو گیا اس کے باوجود ان کا صبر و ضبط دیکھنے کی چیز ہے۔ ان کی زبان پر ذرا سا بھی شکوہ نہیں خدا نے ان کو وہ جوہر دیا ہے کہ جو کوئی لوٹ نہیں سکتا۔ خدا کا شکر ہے بھیا جی دو ماہ پہلے امریکہ اور کناڈا میں عالمی مشاعروں اور سیمیناروں میں شرکت کے لیے گئے تھے اور ساتھ خیریت کے وطن واپس آ گئے ہیں۔

میرے بھیا جی کو اللہ نے اتنا دیا ہے کہ جب چاہیں جہاں چاہیں گھر بنا لیں۔ اور میری دعا بلکہ کوشش ہے کہ وہ اپنا بھی گھر بسا لیں کیوں کہ زندگی میں اب تھکا دینے والا وقت آنے والا ہے خدا ان کی اولاد کو لائق اور فائق کرے آمین۔

مجھے پڑھنے والا پڑھے بھی کیا مجھے لکھنے والا لکھے بھی کیا
جہاں میرا نام لکھا گیا وہیں روشنائی الٹ گئی
(بشیر بدر)

پرکاش فکری

بشیر بدر کی غزلوں میں جو کھلی کھلی قدرتی رنگوں سے جھلکتی ہوئی فضا ملتی ہے اور قاری کو جن دنیاؤں کی سیر کراتی اور جس نشے سے سرشار کرتی ہے اس کی مکمل تصویر کھینچنا الفاظ کے لیے مشکل مرحلہ ہے غزل کی تعمیر میں یوں داخلی جذبہ ہی سنگ بنیاد کا کام کرتا ہے، مگر بیشتر غزلیں جو ان دنوں کہی جا رہی ہیں وہ داخلی جذبے کے بجائے داخلیت سے زیادہ کام لیتی ہیں اور اسی لیے بیشتر مقامات پر قاری ان کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ مگر بشیر بدر کے ساتھ ایسی بات نہیں۔ قاری جب ان کی نگاہوں سے اندر اور باہر دیکھتا ہے تو انوکھے منظروں کی حیرت زائیاں باور کرا دیتی ہیں کہ آدمی اگر ذات کے حصاروں کے ذرا پرے دیکھے تو دنیا خوبصورت لگ سکتی ہے۔

اب مرا انتظار ختم ہوا۔
اب تجھے انتظار کرنا ہے۔
بشیر بدر

ڈاکٹر اظہار الحسن

بادش بخیر! — یہ آج سے تقریباً سترہ اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے جب بشیر بدر کا یہ شعر بہت تیزی سے شہرت اور مقبولیت کی فضاؤں میں گشت کر رہا تھا۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

اس شعر نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ وؔلی اورنگ آبادی کی یاد تازہ کرا دی تھی، لوگ ایک دوسرے کو تحفتہً یہ شعر بھیجنے لگے تھے۔ بشیر بدر کا متعارف بھی اسی شعر کے ذریعہ کرایا جانے لگا تھا۔ یونیورسٹی کے طلبا ان سے ملنے اور ان کو دیکھنے کے متمنی رہنے لگے تھے اس وقت وہ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو) کر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے راقم الحروف نے بھی ایم اے اردو میں داخلہ لیا اور اسی طرح بشیر بدر چونکہ فائنل ایر میں تھے، ہمارے بھائی بن گئے۔ جب ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک عظیم شاعر کے علاوہ عظیم انسان بھی ہیں۔ اس وقت بشیر بدر بھائی ہندوستان کے مشہور اور مستند شاعر تسلیم کئے جا چکے تھے اور کوئی بھی آل انڈیا مشاعرہ ان کی شرکت کے بغیر مکمل اور کامیاب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

طالب علمی کا دور بھی عجیب دور ہوتا ہے کاش یہ دَور ہمیشہ قا[illegible]گر وقت تو بہتے دریا کی مانند ہوتا ہے، آگے بڑھتا ہی جاتا ہے، یہ دَور ختم ہوتا ہے زندگی کے مسائل آکر گھیر لیتے ہیں اور دن بہ دن ترقی کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تو بات چل رہی تھی بشیر بدر بھائی کی۔ اس وقت کلاس میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور لڑکوں کی کم۔ ہمارے بیچ میں بھی ہم پانچ لڑکے تھے اور شاید دس گیارہ لڑکیاں — یہی تعداد کم و بیش فائنل میں تھی۔ ہمارے

شعبۂ اُردو میں کوئی خاص روم نہیں ہے۔ بس لے دے کے ایک سیمینار لائبریری کا کمرہ ہے جو ریڈنگ روم اور کامن روم دونوں کا کام کرتا ہے۔ خالی پیریڈس میں کتابوں سے دلچسپی رکھنے والے کتابوں سے مغز زنی کرتے رہتے اور گپیں چھوڑنے والے الگ اپنی ٹولی بناکر بیٹھ جاتے۔ ہمارے ساتھ خدا کے فضل سے کوئی کتابوں کا کیڑا نہیں تھا اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ دیگر باتیں بھی خوب تفصیل کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ایک بات اور عرض کرنا چاہوں کہ مسلم یونیورسٹی کی دیرینہ روایات کے مطابق سینئر اپنے جونیئر کے بھائی کی مانند ہوتا ہے اور اپنی سینیئرٹی قائم رکھنے کے لیے وہ ضرورت پڑنے پر ہر قسم کی قربانی دینے کو بھی تیار رہتا ہے، چھوٹے بڑے مسائل حل کرنے، ان کی رہبری کرنے میں، وہ اپنے جونیئرس کا پورا پورا خیال رکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کا ادب و احترام کا بھی بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہم لوگ بشیر بدر کو بڑا بھائی مانتے ہوئے ان سے رہبری حاصل کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مذاق بھی شائستگی کے ساتھ ہوجاتا تھا۔

ایک دوپہر جب پریویس اور فائنل کے تقریباً سب ہی طلباء وطالبات سمینار یا کامن روم میں جمع تھے اور موضوع گفتگو تفریح تھا تو مجھے شرارت سوجھی اور میں نے کہا: خواتین وحضرات! بشیر بدر بھائی نے طالبات کی شان میں بہت ہی سچا اور حقیقت پر مبنی شعر کہا ہے۔ اگر اجازت ہو تو پیش کیا جائے۔ ارشاد ارشاد کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔ خاص طور پر لڑکیاں پیار بھری نظروں سے بشیر بدر بھائی کی طرف دیکھنے لگیں اور بشیر بھائی میری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں کون سا شعر بھئی!

ہاں تو شعر عرض کرتا ہوں ؎

اتنی کتابیں لاد دیں یہ ٹوٹ جائیگی
عورت تو گھاس کاٹنے والی مشین ہے

بس صاحب پھر کیا تھا تمام لڑکیاں بشیر بھائی کے سر ہوگئیں اور بشیر بھائی کو پیچھا چھڑانا دشوار ہوگیا۔ بھئی یہ شعر میرا ہرگز نہیں ہے، یہ اظہار تو یوں ہی شرارتاً میرا کہہ کر آپ لوگوں کو مجھ سے بدظن کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہوئے بشیر بھائی ہنسنے لگے۔ سارا کمرہ زعفران زار بن گیا اور لڑکیوں کے چہرے گلنار۔

جہاں سمندر ہوتا ہے وہاں مچھلیاں بھی ضرور ہوتی ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ سمندر کی گہرائی اور دیگر راز و رموز مچھلی ہی زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہے، اس وقت بھی کئی سمندر تھے

اور مچھلیاں بھی۔ شاعر چونکہ اشاروں اور کنایوں سے بات کرتا ہے اور علامت بنا کر وہ اپنا مدعا بیان کرجاتا ہے لہٰذا بشیر بھائی کا یہ شعر بھی بہت مشہور اور مقبول تھا ؎

حقیقت سُرخ مچھلی جانتی ہے — سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

اس وقت بشیر بھائی کے ترنم کا خاص انداز تھا (جو آج بھی ہے) وہ اپنے منفرد لب و لہجہ اور ترنم کے خالق تھے اور اس ترنم کی نقل کرنا، ابھرتے شاعروں کی کمزوری بن کر رہ گیا تھا خاص طور پر اس بحر کی غزلیں ؎

کوئی کتبہ نہیں ہے سرِ راہ، ہم جس پہ اقوال زریں بدلتے رہیں
ہم تو آنسو ہیں پلکوں پہ رکھو ہمیں جب اشارہ کرو ٹوٹ جائیں کہیں

جب بھی موقع ملتا ہم لوگ بشیر بدر بھائی کو مجبور کرتے اور ان کی غزلیں لطف لے لے کر سنتے بڑا پُرلطف دور تھا وہ بھی، آج یاد آتا ہے تو دل تڑپ تڑپ جاتا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی شگوفہ کھلتا اور دن ہنسی خوشی کے ساتھ گذر جاتا لیکن انقلاب پذیر زمانہ کبھی ایک حال پر نہیں رہتا۔ سالانہ امتحان ہوا۔ بشیر بھائی نے ایم۔ اے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا، نمبر اتنے حاصل کئے کہ فیکلٹی آف آرٹ کا ریکارڈ توڑ دیا اور ایک بار پھر بشیر بدر بھائی کا نام بحیثیت طالب علم گفتگو کا موضوع بن گیا۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے ریسرچ (تحقیق) میں داخلہ لیا اور جدید غزل کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ جدید غزل، چونکہ ان کا اپنا فیلڈ تھا جس کے وہ کھلاڑی تھے، اسی لیے ہاتھ دکھانا شروع کردیئے اور ہم لوگوں کا ایم۔ اے بھی مکمل ہوا اور راقم الحروف نے بھی ریسرچ میں ایڈمیشن لیا اور ہمارے ساتھ ساتھ کچھ اور ہمارے کلاس فیلو نے داخلہ لیا، اس طرح محبتیں پھر زندہ ہوگئیں اور شعر و شاعری، بحث و تنقید کا بازار پھر گرم رہنے لگا۔

ریسرچ اسکالر (RESEARCH SCHOLAR) کی حالت بڑی قابلِ رحم ہوتی ہے اس کو ایک ایک قدم سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے چونکہ بہت کم شعبے ایسے ہوتے ہیں جہاں پارٹی بندی یا سیاست کے گندے جراثیم نہیں ہوتے ورنہ ہر شعبہ میں یہ گندگی اس طرح بکھری رہتی ہے کہ جو بھی گذرتا ہے اس کا دامن آلودہ ہوجاتا ہے۔ ریسرچ اسکالر اور نگراں کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ اگر نگراں کسی بھی طرح کی سیاست کا شکار ہے یا اسے کردیا گیا ہے تو اس کی نگرانی میں کام کرنے والے طلبا بھی اسی کے ساتھ سمجھے

جاتے ہیں اور مخالف پارٹی والے اپنے تمام قرضے اس کے طلباء سے وصول کرتے ہیں کیونکہ طلباء ہی ایسی معصوم ہستی ہوتے ہیں جن کی آواز سوائے اس کے نگراں کے کوئی اعلیٰ افسر سننے کو تیار نہیں ہوتا حالانکہ یہ بالکل ضروری نہیں کہ طلباء اپنے نگراں کی ہر بات سے متفق ہوں (علاوہ تحقیق کے) مگر مخالف پارٹی والے ان کو اپنے نگراں کا سرگرم کارکن خیال کرکے اس سے سوتیلی ماں جیسا سلوک کرنے لگتے ہیں اور چونکہ بحیثیت صدر اس کو پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اس لیے اس کے سو خون معاف ہوتے ہیں۔ بشیر بھائی اور راقم الحروف دونوں ایسی گندی سیاست اور پست ذہنیت کے شکار ہوئے۔ بشیر بھائی کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ "سمتِ غیب" سے ہوا چلی اور گلستان کی بہار کو خزاں میں بدل گئی۔ صدر شعبہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور دوسرے پروفیسر صدر شعبہ کی کرسی پر متمکن ہوئے۔ شعبہ کی اندرونی سیاست کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں اور ہر وہ شخص جو ہواؤں کے رُخ پر بدل جانے کا ہنر جانتا تھا، بدلنے لگا۔ "چلو اس طرف کو ہوا ہو جدھر کی" کے مصداق صاحب علم و فن، ہوائی مرغ کی طرح اپنی گردنیں موڑنے لگے چند ایسے بھی تھے جو اُصول اور سچائی پسند تھے اور "ہوائی مرغ" کے فن سے ناواقف تھے، بس وہی لوگ نشانہ بنے۔ بشیر بھائی بھی ان ہی چند لوگوں میں سے تھے جو سیاست کے شکار ہوئے، دوسرے ان کی شہرت اور مقبولیت، بحیثیت شاعر ان کی راہ میں رکاوٹ بنی۔ کیونکہ کوئی بھی صدر شعبہ یہ بات برداشت نہیں کرسکتا کہ علمی، ادبی محفلوں میں اس کا تعارف اس کا شاگرد کرائے۔ وہ اپنے چراغ کے سامنے دوسرے کے سورج کو بھی ماند دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ بشیر بھائی کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ باوجود تمام اہلیت کے وہ یونیورسٹی کے اسٹاف پر نہ آسکے۔ بشیر بھائی ظاہر ہے کہ دل برداشتہ ضرور ہوئے ہوں گے انہوں نے ایک شعر کہہ کر مستقبل کی پیشین گوئی کردی۔

شہرت کی بلندی بھی اک پل کا تماشہ ہے جس شاخ پہ بیٹھے ہو، وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ ہر شاخ کی قسمت میں ایک نہ ایک دن ٹوٹنا یا سوکھنا لکھا ہوتا ہے، بہرحال یہ شاخ بھی ایک دن ٹوٹ گئی۔

بشیر بھائی کے علی گڑھ چھوڑنے پر نہ صرف وہ خود بلکہ تمام انصاف پسند اور ادب نواز انسان دل برداشتہ ہوئے۔ اس دور میں ایک اور بھی کمی یا خامی تھی، آج کی طرح

'روٹیشن آف ہیڈ' کا قانون نہیں تھا بلکہ جو ایک بار صدر شعبہ ہوگیا وہ اپنی زندگی یا ملازمت کی آخری سانس تک صدر رہتا تھا اور اس موقع سے وہ خوب من مانی کر کے اپنی طاقت کا جائز و ناجائز استعمال کرتا تھا اور اس کا ہر فیصلہ جائز اور صحیح تصور کیا جاتا تھا۔

میرٹھ یونیورسٹی اس معاملے میں کافی خوش قسمت رہی کہ اس نے ایک عالمی شہرت کے شاعر اور ایک لائق استاد کا تقرر کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے یہ موقع کھو دیا۔ بشیر بھائی کو علی گڑھ چھوڑنے کا ہمیشہ افسوس رہا کیونکہ انہیں علی گڑھ سے بے لوث اور بے انتہا محبت تھی اور اب بھی ہے اور میرا یقین ہے کہ آئندہ بھی رہے گی کیونکہ شاعر محبت و خلوص کا جیتا جاگتا پیکر ہوتا ہے، اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کا وہ کبھی شکار نہیں ہوتا۔ اس کی محبت بے پایاں اور خلوص بے کراں ہوتا ہے۔ بشیر بھائی علی گڑھ نمائش کے مشاعرے میں ہر سال شرکت کرتے ہیں اور ان کے ہر جملے سے علی گڑھ کے بے پناہ پیار اُمڈتا محسوس ہوتا ہے۔

آج بشیر بدر کا نام جدید غزل کی دنیا میں عالمی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ مشاعروں میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جب تک بشیر بدر اپنا کلام نہ سنادیں، سامعین کا مجمع ہمہ تن گوش بیٹھا انتظار کرتا رہتا ہے۔ ملک کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی جیسے امریکہ، کنیڈا، دوبئی، پاکستان وغیرہ میں بشیر بدر کو مدعو کیا جا چکا ہے اور امید کرنا چاہیئے کہ بشیر بدر کا نام ہمارے ملک کی عزت و توقیر میں چار چاند لگائے گا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

تم مری زندگی ہو یہ سچ ہے — زندگی کا مگر بھروسہ کیا

جیسے جنگل میں آگ لگ جائے — ہم کبھی اتنے خوبصورت تھے

آتی ہوئی ٹرین کے جو آگے رکھ گئی — اس ماں سے یہ نہ کہنا کہ بہ قید حیات ہوں

قدم سے آگے آگے چل رہی ہے — مسافر کو گلی پہچانتی ہے

یہ شب جیسے کوئی بے ماں کی بچی — اکیلے روتے روتے سو گئی ہے

سجھائی کچھ نہیں دیتا، شکستہ یادوں نے
کسی کا چہرہ کسی کے بدن میں جوڑ دیا

سو خلوص باتوں میں، سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں

نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی یہ کھڑکی کھولو ذرا، صبح کی ہوا ہی لگے

میں اپنی راہ میں دیوار بن کے بیٹھا ہوں
اگر وہ آیا تو کس راستے سے آئے گا

بہت دنوں سے مرے ساتھ تھی مگر کل شام
مجھے پتہ چلا وہ کتنی خوبصورت ہے

نظام صدیقی

بشیر بدر کی منفرد سحر کار آواز اور نئی علامتی صورت گری کا سرچشمہ اس کی نادر روزگار تصویر کاری اور اچھوتی نازک بینی ہے جس نے اردو غزل کے ماضی صوری، معنوی اور صوتی سطح پر آج کی فضا اور آئندہ کے خوابوں سے منسلک کر کے ایک تہذیبی اکائی کی درخشاں علامت بنا دیا ہے۔ اس کی پوری غزلیہ شاعری ایک حسین طلسماتی داخلی ڈرامہ کے مسحور کن منظر اور معانی کا پوری شدت اور توانائی کے ساتھ بھرپور انکشاف کرتی ہے۔ اس کے الفاظ ڈرامے کے کرداروں کے مانند مختلف غزلیہ اشعار کے اسٹیج پر رنگ و آہنگ میں نمودار ہوتے ہیں اور اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مختلف جذبات و حسیات کی روشنیوں اور رنگوں کے ساتھ بشیر بدر کے اختراع اور استعمال کردہ الفاظ کے صوتی اور معنوی ہیئت عجیب عجیب ہیولے تخلیق کرتی ہے۔ لفظوں کی ڈرامائی کیفیت، صوت و غنا کی بھرپور جامعیت، تخیل کی براقی بلکہ تابکاری کی انتہائی واقعیت، اچھوتا آہنگ، کیف و کم اردو غزل کو ایک نیا مزاج نیا نظام اور نئی طرح عطا کرتے ہیں۔

(آج کے نقاد کا نیا ادبی رول اور اس کے بنیادی مسائل، مطبوعہ ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۷۵ء)

میرا بچّہ میرا دوست

گیان چند گرداب

ڈاکٹر بشیر بدر بسا اوقات مجھے استاد کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ شاعری میں ان کا کوئی اُستاد نہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ان کی شاگردی کا تعلق کسی اور بات سے ہے۔ بہرحال جب کبھی وہ استاد کہہ کر مجھے دوسروں سے متعارف کراتے ہیں تو میرے دل میں بے اختیار ایک مبہم سا احساس تفاخر چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ آپ ہی بتائیے اگر آپ کو بدر صاحب جیسے مشہور و مقبول شاعر کا استاد بنا دیا جائے تو آپ کیا محسوس کریں گے ؟

اس وقت میرے سامنے بشیر بدر کے تحریر کردہ چار رقعے رکھے ہیں۔ اکتوبر ۸۴ء کی دو تحریروں میں انھوں نے مجھے اپنا سرپرست اور مہربان محترم کہا ہے اور فروری، مارچ ۸۷ء کے رقعوں میں مجھے استادِ محترم کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ میں عمر میں بدر صاحب سے بیس سال بڑا ہوں۔ اس لیے مجھے ان کا بزرگ کہلانے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن انھوں نے مجھے اپنا استاد کیونکر کہنا شروع کر دیا۔ اس کی وضاحت کے لیے ان کی نجی زندگی کے کچھ پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ امید ہے کہ یہ تذکرہ ناظرین "فکر و آگہی" کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔

۱۳ر جنوری ۷۶ء کا ذکر ہے۔ لوہڑی کا دن تھا۔ شاستری نگر میرٹھ میں سی بلاک کی کچھ پنجابی خواتین نے مل جُل کر لوہڑی کا تیوہار منانے کا فیصلہ کیا۔ سی بلاک اُن دنوں نیا نیا آباد ہوا تھا۔ اُتر پردیش ہاؤسنگ بورڈ کے تعمیر کردہ چالیس مکانوں میں بمشکل پندرہ خاندان رہتے تھے۔ بشیر بدر بھی ایک مکان (سی ۵۶) میں بطور کرایہ دار رہائش پذیر تھے۔ رات کو حسبِ دستور جب کھلے میدان میں لوہڑی جلی تو بشیر بدر بھی اپنی بیگم قمر جہاں شہناز تین بچوں ٹیٹو۔ بینو اور صبا کے ساتھ وہاں تشریف لائے۔ اسی جگہ میری پہلی ملاقات بدر صاحب

سے ہوئی۔ میری تجویز پر بدر صاحب کو جلسہ کا صدر بنایا گیا۔ محلہ کے بچوں نے ناچ گانے پیش کیے اور پروگرام کے آخر میں بدر صاحب نے تین چار غزلیں سنائیں۔ ان کی ایک غزل کے دو اشعار مجھے اب تک یاد ہیں۔

آنکھیں آنسو بھری۔ پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں۔ نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہئے انھیں کچھ ہنسی آگئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

اب وہ گیسو نہیں ہے جو سایہ کریں اب وہ یارو نہیں جو سہارا بنیں
موت کے بازوؤ۔ تم ہی آگے بڑھو تھک گئے آج ہم گھومتے گھومتے

پہلی ملاقات کے بعد ہی بدر صاحب نے مجھے اپنے دوستوں کے زمرہ میں شامل کر لیا۔ الہ آباد میں فراق گورکھپوری۔ ہرونش رائے بچن اور بسمل الہ آبادی کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے بعد میرٹھ میں مجھے کسی ایسے نامور شاعر کے پاس رہنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ جس کے سایۂ شفقت میں بیٹھ کر میں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکوں۔ بدر صاحب سے ملنے کے بعد میری یہ حسرت بھی پوری ہو گئی۔

اُن دنوں ڈاکٹر صاحب علی گڑھ یونیورسٹی چھوڑ کر نئے نئے میرٹھ کالج میں آئے تھے۔ آمدنی معقول تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ انہیں آسودہ حال کہا جا سکے۔ مشاعروں میں شامل ہونے کے لیے وہ اکثر اوقات باہر جایا کرتے تھے۔ بہر حال اس قدر مصروف بھی نہیں تھے کہ محلے والوں کو ان کا دیدار بھی نصیب نہ ہو۔ انہی دنوں ہمارے بلاک کے دو مکانوں میں بیک وقت مسلح ڈاکہ پڑا۔ ڈاکوؤں نے نہ صرف اہلِ خانہ سے مار پیٹ کی بلکہ زیورات اور قیمتی سامان بھی اٹھا کر لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا مکان بھی اسی لائن میں پڑتا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے ڈاکوؤں نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ سوچا ہو گا۔ شاعر کا مکان ہے یہاں دن میں کچھ نہیں ملتا۔ رات کو کیا ملے گا۔

ڈاکہ زنی کی واردات کے بعد محلے والوں نے ٹھیکری پہرہ دینے کا فیصلہ کیا۔ باری باری دو گھروں سے ایک ایک آدمی لیا جاتا تھا، اور وہ رات بھر پہرہ دیتے تھے۔ ڈاکٹر

صاحب تو اکثر باہر رہتے تھے ۔ جب کبھی ان کا نمبر آتا ۔ بیگم بدر اپنے بڑے لڑکے ٹیٹو کو ہمارے
ساتھ بھیج دیتیں، جو کہ ان دنوں کالج کا طالب علم تھا ۔ رکھشا سمتی کا سکریٹری ہونے کے ناطے
میں ان کے مکان پر جاکر آواز دیتا ۔ ٹیٹو اندر ہے۔ تو بیگم بدر دروازے کی اوٹ سے جواب
دیتیں ۔ آپ کچھ دیر انتظار کیجئے، ابھی ٹیٹو کو بھیجتی ہوں ۔

جب بدر صاحب سے میرا میل جول بڑھا تو وہ اپنے گھریلو معاملات میں مجھ
سے صلاح مشورہ کرنے لگے ۔ بیگم بدر بھی میری بہت عزت کرتی تھیں۔ شاستری نگر میں آنے
کے بعد انھوں نے پردہ عملاً ترک کر دیا تھا ۔ گھر میں کوئی پرابلم ہو، وہ اپنا بزرگ سمجھ کر مجھ کو
بے تکلف بتا دیتی تھیں ۔ میں بھی جہاں تک ہو سکتا ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

ایک دن بیگم بدر (شہناز) کچھ پڑوسنوں کے ساتھ اپنے مکان کے باہر کھڑی تھیں۔
اتفاقاً میں بھی ادھر سے گزرا۔ انھوں نے آداب عرض کہا ۔ میں رسمی طور پر جواب دینے کے
بعد آگے نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد صبا ہمارے گھر آئی اور کہنے لگی ۔ انکل جی ۔ ممی آپ کو
بلا رہی ہیں ۔ میں بدر صاحب کے مکان پر پہنچا تو بیگم بدر غمگین لہجہ میں بولیں۔ بھنڈاری صاحب
آج آپ ہمارے گھر کے پاس سے گزرے تو آپ نے ڈاکٹر صاحب کی خیر و عافیت بھی نہیں
پوچھی، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب سخت بیمار پڑے ہیں ۔ میں اندر بیڈ روم میں گیا
تو دیکھا کہ بدر صاحب کو تیز بخار چڑھا ہوا ہے ۔ کہنے لگے ۔ مجھے آج رات کی گاڑی سے مشاعرہ
میں شرکت کے لیے لکھنؤ جانا ہے ۔ ٹمپریچر بہت ہائی ہے ۔ کیا کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا کہ
میں جیسے تیسے گاڑی میں سوار ہو جاؤں ۔ میں نے کہا ۔ کیوں نہیں ۔ بخار کیا ۔ آجکل تقریباً ہر
مرض کا فوری علاج ہو سکتا ہے ۔ انھوں نے کہا ۔ پھر لائیے نہ میرے لیے کوئی ایسی دوائی ۔
چنانچہ میں فوراً گڑھ روڈ پر ڈاکٹر گپتا کے کلینک میں پہنچا اور کچھ کیپسول اور گولیاں وہاں سے
لے آیا۔ جنھیں کھاتے ہی بدر صاحب کا ٹمپریچر نارمل ہو گیا اور وہ تندرست ہو کر بر وقت
سٹیشن پر پہنچ گئے ۔

کچھ دنوں کے بعد بدر صاحب ایک کل ہند مشاعرہ میں شریک ہونے کے لیے کلکتہ
گئے ۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے ایک ہفتہ کے اندر واپس آنا تھا ۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا
کہ نہ وہ خود آئے اور نہ ہی ان کا کوئی خیریت نامہ وہاں سے موصول ہوا۔ بیگم بدر سخت فکر مند
تھیں کہ جانے کہاں رک گئے ہیں۔ ان کی بے قراری کا یہ عالم تھا کہ کسی کل چین نہیں پڑتا تھا۔

بھوک پیاس ختم ہوگئی - چہرہ زرد ہوگیا۔ آٹھوں پہر پریشان رہتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگیں ڈاکٹر صاحب کی کچھ خبر نہیں۔ جانے کہاں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کسی حادثہ کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ گھبرائیے نہیں۔ ڈاکٹر صاحب بخیر ہوں گے۔ آپ ناحق فکر مند ہیں۔ بولیں۔ آپ کو کیسے پتہ ہے؟ میں نے کہا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ اگر کوئی حادثہ ہوگیا ہوتا تو کیا اخباروں میں ان کے متعلق خبر نہ چھپ گئی ہوتی۔ وہ بے ساختہ مسکرانے لگیں۔ لیکن اگلے لمحہ پھر ان کے چہرے پر غم کے بادل چھا گئے۔ دو تین دن کے بعد کلکتہ سے بدر صاحب کا بھیجا ہوا منی آرڈر ان کو ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ ایک اور مشاعرہ میں شرکت کے لیے دوسری جگہ جا رہا ہوں۔ دس دن کے بعد لوٹوں گا۔ یہ اطلاع پڑھ کر بیگم بدر کو قدرے تشفی ہوئی۔ مجھ سے کہنے لگیں۔ آپ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں یونہی اتنے دنوں پریشان رہی۔

کرایہ کے مکان میں رہتے رہتے جب ڈاکٹر صاحب کا دل بیزار ہوگیا تو میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ہاؤسنگ بورڈ کو ایم آئی جی (مڈل انکم گروپ) مکان کی الاٹمنٹ کے لیے عرضی دیدیں۔ بیگم بدر بولیں۔ سی بلاک مجھے قطعاً پسند نہیں۔ ان میں برآمدہ نہیں ہے۔ اگر ہمارے مکان میں برآمدہ نہ ہوا تو میں کرایہ کے مکان میں رہنا زیادہ پسند کروں گی۔ خوش قسمتی سے عرضی دینے کے کچھ ماہ بعد ہی ان کو الاٹمنٹ لیٹر آگیا۔ ان کو ڈی بلاک میں جو مکان (نمبر ڈی ۱۲۰) الاٹ ہوا وہ بہت ہی خوشنما تھا اور اس میں برآمدہ بھی تھا۔

بیگم بدر چاہتی تھیں کہ جلدی سے جلدی اپنے مکان میں چلی جائیں لیکن بورڈ والوں نے قبضہ دینے میں کچھ دیر کردی۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب، ان کا پڑوسی پریتم گری گوسوامی اور راقم انکے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیگم بدر کہنے لگیں۔ کل رات میں نے ایک خوشگوار خواب دیکھا کہ ہمارا گھریلو سامان ٹرک میں لدا ہے اور گوسوامی صاحب اور بھنڈاری صاحب ہم کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے ہیں۔ بدر صاحب ہنس کر بولے۔ بیگم۔ مجھے حیرت ہے کہ بھنڈاری صاحب تمہارے دل ودماغ پر اس قدر چھا گئے ہیں کہ اب تمہیں خواب میں بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نقل مکانی کر کے ڈی بلاک میں چلے گئے۔ یہ مکان ہمارے مکان سے قریباً ایک فرلانگ دور تھا۔

ڈی بلاک میں چلے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ہاں میرا آنا جانا کم ہوگیا۔ جب کبھی میں ان کے ہاں جاتا تو پتہ چلتا کہ وہ مشاعرہ میں شرکت کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں کبھی کالج

جاتے ہوئے سڑک پر مل جاتے تو راستہ میں سلام دعا ہو جاتی یا پھر عید دیوالی پر ملاقات ہوتی بہر حال جب کبھی ان سے ملتا تو بڑے تپاک سے پیش آتے ۔

ان کے پڑوس میں ایک نیا سکول کھلا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب رسم افتتاح کی ادائیگی کے لیے وہاں آئے ۔ جب کلچرل پروگرام پیش کرنے کا وقت آیا، تو سکول کے منیجر نے نظامت کے فرائض مجھے سونپ دیئے ۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس موقعہ پر موجود تھے ۔ میں نے ان سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی تو انھوں نے مسکرا کر کہا۔ معاف کیجئے میرے کلام پڑھنے سے آپ خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس جائیں گے ۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ بعض اوقات ناظم مشاعرہ بھی شاعر کے باعث پٹ جاتے ہیں ۔ ایک سچا واقعہ آپ کو سناتا ہوں ۔ مشاعرہ میں ایک نوآموز شاعر اپنا کلام سنا کر سامعین کو بور کر رہا تھا ۔ اتنے میں ایک شخص لٹھ گھماتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ شاعر صاحب بہت گھبرائے، مارے ڈر کے اس نے شعر خوانی بند کر دی ۔ لٹھ باز نے کہا ۔ جناب، گھبرائیے نہیں ۔ آپ شعر پڑھنا جاری رکھیے ۔ مجھے آپ سے کوئی ناراضگی نہیں ۔ میں تو ناظمِ مشاعرہ کی پٹائی کرنا چاہتا ہوں ۔ جس نے آپ کو یہاں بلایا ہے ۔

اپنے مکان میں آکر ڈاکٹر صاحب کا رہن سہن بالکل بدل گیا۔ ڈرائنگ روم میں نیا صوفہ سیٹ اور کھانے پینے کی نئی میز کرسیاں لگائی گئیں ۔ اس میں ٹی وی سیٹ اور فرج رکھا گیا۔ پہلے ڈاکٹر صاحب کے پاس سکوٹر تھا ۔ اب ایک فیئٹ کار بھی پورچ میں کھڑی ہوگئی مئی ۸۴ء میں جبکہ گھر میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ ایک ایسا سانحہ وقوع پذیر ہوا جس سے ڈاکٹر صاحب پر رنج و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ۔ ان کی غیر موجودگی میں جبکہ وہ انڈو پاک مشاعرہ میں شمولیت کے لیے پاکستان گئے ہوئے تھے ۔ ان کی رفیقۂ حیات بیگم قمر جہاں شہناز اچانک اس دارِ فانی سے رحلت کر گئیں ۔ جب مجھے ان کے انتقال کی خبر ملی تو میں فوراً ڈی بلاک میں پہنچا ۔ وہاں دیکھا کہ ٹیٹو اور بینو رو رہے ہیں اور صبا اپنی والدہ کی موت کے صدمہ سے بیہوش پڑی ہے ۔

جناب دیپک قمر اور دوسرے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح پاکستان میں ڈاکٹر صاحب سے رابطہ قائم ہو جائے ۔ لیکن صد افسوس ان کو بروقت اطلاع نہ مل سکی ۔ اور ان کی غیر موجودگی میں ہی بیگم بدر کا جنازہ اٹھا ۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اور لوگوں کے علاوہ آس پاس کے اکثر ہندو پڑوسی جنازہ میں شامل ہوئے ۔ ڈاکٹر صاحب اپنے محلہ میں از حد مقبول تھے اور ہندو پڑوسیوں کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے اور دوستانہ

تھے جب شاستری نگر مارکیٹ سے ملحقہ قبرستان میں مرحومہ کو دفنایا گیا تو ڈاکٹر صاحب کے ہندو دوست اور مداح بھی کثیر تعداد میں وہاں موجود تھے۔

شہناز کے انتقال کے بعد بشیر بدر گھر میں خود کو تنہا سا محسوس کرنے لگے۔ بہر حال انھوں نے اس صدمہ کو نہایت صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ انہی دنوں انھوں نے غزل کہی۔ اس کے دو اشعار ان کے دلی کیفیت کے آئینہ دار ہیں ؎

اُداسی کا یہ پتھر آنسوؤں سے نم نہیں ہوتا
ہزاروں جگنوؤں سے بھی اندھیرا کم نہیں ہوتا
کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا

ایک اور غزل میں انھوں نے لکھا:

بارشیں بارش کچّی قبر کا کھلنا ہے
جاں کیوا احساس اکیلا رہنے کا

بدر صاحب ابھی اپنی رفیقہ حیات کی جدائی کے غم میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ان کے متعلق دلی کے مشہور انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز میں ایک لمبی بحث چھڑ گئی۔ ۹ر جولائی ۱۹۸۴ کے اشوع میں علی گڑھ کے جناب نقوی کا ایک خط چھپا جس میں انھوں نے لکھا کہ ڈاکٹر بشیر بدر مشاعروں کے مقبول شاعر ہیں۔ انھیں اردو کا عظیم ترین شاعر و نقاد کہنا غلط ہے۔ ایک ہفتہ پیشتر اسی روزنامہ میں جناب خالد ملک زادہ (بجنور) کا ایک تعریفی خط شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے ڈاکٹر بدر کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ وہ اردو کے عظیم ترین جدید شاعروں اور نقادوں میں سے ایک ہیں۔ نقوی صاحب نے ملک زادہ کے اسی جملہ کو توڑ موڑ کر مباحثہ شروع کر دیا۔

جناب نقوی کے خط کے جواب میں میں نے لکھا کہ بدر صاحب کا درجہ جدید غزل کے معماروں میں بہت بلند ہے اور ان کو محض مشاعروں کا مقبول شاعر کہنا ان کے کارناموں پر پانی پھیرنے کے مترادف ہے۔ ان کے دو مجموعہ ہائے کلام " اکائی " اور " ایمج " پر ان کو اکاڈمی کی جانب سے ایوارڈ مل چکے ہیں اور ان کی نثری کتاب " آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ " بھی انعام حاصل کر چکی ہے۔ میرا یہ خط ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۸ر جولائی میں شائع ہوا۔

اس کے بعد ۶ راگست کے ہندوستان ٹائمز میں جناب نیر نے لکھا کہ ڈاکٹر بدر نے اردو غزل میں انگریزی الفاظ کا استعمال کر کے نہ صرف اپنے امیج کو گرایا ہے۔ بلکہ اردو ادب کو بھی کافی نقصان پہنچایا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے یہ فرمایا کہ اکبر الہ آبادی۔ ہلال رام پوری اور حاجی لق لق جیسے ظرافت نگار شعرا۔ نے اپنے کلام میں انگریزی الفاظ کا ضرور استعمال کیا ہے۔ مگر سنجیدہ اردو غزل میں ایسی جدتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ روایتی غزل گو شاعروں کے متعدد اشعار زبان زد خلائق ہیں لیکن جدید غزل گو شاعروں کا ایک شعر بھی لوگوں کو یاد نہیں اور نہ ہی مشاعرہ ہال کے باہر ان کو کوئی یاد رکھتا ہے۔

جناب نیر کے جارحانہ حملہ کے جواب میں میں نے ہندوستان ٹائمز کو ایک اور طویل خط بھیجا جو اگلے ہفتہ اس جریدہ کے ۱۳ راگست کے اشوع میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں میں نے کہا کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ جب زندگی میں انقلاب آتا ہے تو ادب کے ساتھ ساتھ شاعری کی شکل و ہیئت اور زبان بھی بدل جاتی ہے۔ میں نے مزید لکھا کہ اردو غزل کی زبان کو سادہ بنانے اور اسے نیا رنگ عطا کرنے کا شرف بشیر بدر کو ہی حاصل ہے جنھوں نے گھسی پٹی ترکیبوں، قدیم علامتوں اور فرسودہ استعاروں کو ترک کر کے غزل کو ایک نیا انداز بخشا ہے۔ ان کی غزلوں میں انگریزی الفاظ (مثلاً لان۔ ربن۔ گلاس۔ کار اور بس وغیرہ) کا استعمال محض جدت طرازی نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد موجودہ زمانہ کے آدمی کے بدلتے ہوئے احساسات و رجحانات کی کارگر ڈھنگ سے عکاسی کرنا ہے۔

بدر میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ شعر میں انگریزی کا ایک لفظ استعمال کر کے دورِ نو کے احساسات کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس میں ادبی چاشنی بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی متعلقہ دور کا تعین بھی۔ مثلاً

وہ زعفرانی پُل اوور" اسی کا حصہ ہے
جو کوئی دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

میں نے اس خط میں نیر صاحب کے روائتی الفاظ پر زور دینے کی ضد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ زبان اور اسالیبِ بیان بھی وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں۔

میرے دلائل کا جواب دینے کی بجائے جناب نیر نے مجھ پر دشنام طرازی کا الزام

لگایا اور غالب کے اس شعر پر بحث ختم ہوگئی ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

اس قلمی جنگ کے بعد میں بدر صاحب کے اتنے قریب ہوگیا کہ قریباً ہر روز ان سے ملاقات ہونے لگی۔ میرا قیاس تھا کہ بیگم بدر کی وفات کے کارن ان کی تخلیقی قوتیں کسی حد تک مفلوج ہو جائیں گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وہ نہ صرف جلد ہی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے بلکہ اُن کے بحرِ سخن سے ایسے آبدار موتی نکلے کہ لوگ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ چند مہینے تو ڈاکٹر صاحب کے دل و دماغ پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا۔ لیکن یک بیک آسمان سے بجلی گری اور کاشانۂ سکونِ قلب جل کر خاکستر ہوگیا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کو اپنی رفیقۂ حیات سے والہانہ محبت تھی۔ وہ ان کی بے پناہ محبت سے محروم ہوئے۔ تو دامنِ صبر و شکیب ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور وہ دماغی ٹینشن (کھنچاؤ) کا شکار ہوگئے۔ وزیر صحت مسز محسنہ قدوائی کی وساطت سے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ان کا طبی معائنہ کرایا گیا۔ لیکن ان کے مرض کی صحیح تشخیص نہ ہوسکی۔ کچھ ڈاکٹر کہتے تھے کہ انہیں گیس کی تکلیف ہے اور کچھ یہ کہتے تھے کہ گیس سے دماغی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت جو بگڑی تو بگڑتی ہی چلی گئی۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب انھوں نے باہری لوگوں سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا۔ گھر والے دوست احباب سبھی پریشان کہ کریں تو کیا کریں۔ مشاعروں میں شرکت کے لیے انھیں دور دور سے دعوت نامے آتے تھے۔ لیکن وہ اس وہم میں مبتلا تھے کہ اب میں دوڑ دھوپ کر ہی نہیں سکتا۔ میری نوکری چھوٹ جائے گی۔ بچے کشکولِ گدائی لے کر گھومیں گے۔ صبا کی شادی کیسے ہوگی۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ میرا تخت و تاج چھن گیا ہے۔ میرے خواب بکھر گئے ہیں۔ ادبی دنیا میں مَیں نے جو رول ادا کرنا تھا وہ ادھورا رہ جائے گا۔ یا اللہ تو نے مجھے اوپر اٹھا کر کہاں نیچے زمین پر پھینک دیا ہے۔

میں بار بار ان کی ڈھارس بندھاتا کہ آپ کا مرض عارضی ہے۔ پرماتما کی مہربانی سے آپ جلدی صحتیاب ہو جائیں گے۔ لیکن میری باتوں کا ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ مجھے جتنے حوصلہ افزا اشعار یاد تھے۔ انھیں سنائے۔ لیکن بے سود ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اسی دوران میں ان کے بڑے لڑکے معصوم (عرف ٹیٹو) کی شادی ہوئی۔ ہم تین چار دوستوں نے جوں توں کرکے انھیں کار میں بٹھایا اور علی گڑھ لے گئے۔ خدشہ تھا کہ راستہ میں ان کی طبیعت خراب نہ ہوجاتے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ ان کا موڈ اچھا رہا۔ علی گڑھ میں بھی وہ نارمل رہے۔ واپسی پر ان کو پھر گیس کے دورے پڑنے لگے۔ آخر کار میڈیکل کالج کے ماہر نفسیات سے مشورہ لیا گیا۔ انھوں نے مرض کی جڑ کو پکڑا۔ اور کچھ ایسی دوائیاں دیں کہ آہستہ آہستہ بیماری کنٹرول میں آگئی۔

دوران علالت دو باتیں ایسی ہوئیں۔ جن کا ذکر کرنا اشد ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ شدید علالت کے باوجود ڈاکٹر صاحب غزلیں لکھتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن دنوں جو شاہکار ان کے قلم سے نکلے۔ وہ شاید انھوں نے کمال صحت میں بھی تخلیق نہیں کیے تھے۔ تنہائی انکے لیے سوہانِ روح تھی۔ اپنے گھر میں اکیلے بیٹھے بیٹھے جب ان کا دل گھبرانے لگتا۔ تو پیدل چل کر میرے گھر آجاتے اور کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہتے۔ آج سویرے ہی ایک تازہ غزل کے کچھ اشعار لکھے ہیں۔ کہو تو سناؤں۔ جب میں ان کا کلام سنتا تو ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا کہ اتنے شدید دماغی انتشار کے باوجود وہ اتنے اچھے شعر کہہ لیتے ہیں۔ اُن دنوں بیماری کی حالت میں بدرؔ صاحب نے جو خوبصورت اور شاندار غزلیں لکھیں۔ ان میں سے چند "مٹھی بھر غزلیں" کے عنوان سے بمبئی کے ماہنامہ "شاعر" میں شائع ہوئی ہیں۔ ناظرین انھیں پڑھ کر خود ہی اندازہ لگائیں کہ ایک بیمار شاعر نے اتنی صحت مند غزلیں کیسے لکھ ڈالیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ بدر صاحب کے حاسدوں اور دشمنوں نے ان کی بیماری کا پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے ایسی بے بنیاد اور گمراہ کن افواہیں پھیلائیں کہ بس کچھ نہ پوچھئے کسی نے کہا کہ بدرؔ صاحب نے ایک ۱۸ سالہ حسین و جمیل لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ اور اس کے چکر میں دیوانہ ہو گئے ہیں۔ کسی نے یہ بے پر کی اڑائی کہ گھر بار چھوڑ کر تارک الدنیا ہو گئے ہیں۔ اس لیے ان کو مشاعرہ میں بُلانا بیکار ہے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

حاسد و دشمن تو درکنار۔ کئی دیرینہ دوستوں نے بھی ان سے کنارہ کشی کرلی۔ میرے سوائے بدرؔ صاحب کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ میں سوچتا تھا۔ اگر ایسے نازک دور میں ہم اس عظیم شاعر کی تخلیقات سے محروم ہو گئے۔ تو اردو شاعری اور مخلوط ہندوستانی کو ناقابل

تلافی نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ اسی جذبہ سے متحرک ہوکر میں نے دل و جان سے ان کی دیکھ بھال کی اور ذاتی پریشانیوں کے باوجود گھنٹوں ان کے ساتھ رہا۔ ان کے بچوں نے بھی تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ آخر کار ہماری کوششیں بارآور ہوئیں اور بدر صاحب مکمل طور پر صحتیاب ہوکر دوبارہ میدان عمل میں کود پڑے۔

مجھے خوشی ہے کہ میرے عزیز دوست کے سب اوہام غلط ثابت ہوئے۔ صحتیابی کے بعد وہ باقاعدہ کالج جانے لگے۔ صبا کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ شعر گوئی تو خیر انھوں نے کبھی ترک نہیں کی تھی۔ ہندوستان کے علاوہ بین الاقوامی مشاعروں میں بھی وہ دھڑلے سے شامل ہونے لگے۔ تندرست ہونے کے بعد وہ نیویارک۔ واشنگٹن۔ سان فرانسسکو اور اٹلانٹا گئے۔ مسقط (عمان) کے دو روزہ مشاعرہ میں شرکت کی۔ دوحا (قطر) میں سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ میرٹھ کے ہولناک فسادات میں ان کا مکان نذرِ آتش ہوگیا۔ لیکن ان کے ماتھے پر شکن نہیں پڑی۔ آجکل وہ پھر امریکہ گئے ہوئے ہیں۔

ایک دن میں نے بزرگانہ انداز میں بشیر بدر سے پوچھا۔ بچہ۔ تو مجھے استاد کیوں کہتا ہے۔ بدر صاحب مسکرا کر بولے۔ شاعری میں میرا کوئی استاد نہیں تھا۔ آپ نے مجھے نثری زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سکھایا تو میں نے آپ کو استاد مان لیا ؎

ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی؟

●●

وہ ایک ذات کہ روشن ہے جس کا ہر پہلو

ملک زادہ جاوید

مجھے اس بات پر ہمیشہ سے ناز ہے کہ میں ڈاکٹر بشیر بدر کے قریبی لوگوں میں سے ایک ہوں۔ عام طور پر جنریشن گیپ کی وجہ سے نئی نسل کے لوگوں سے بزرگوں کی کم بنتی ہے مگر میرے اور بشیر بدر صاحب کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اور ہم لوگوں کے بیچ میں شفقت، محبت کا ایک ایسا رشتہ کافی مدت سے جڑا ہوا ہے جس کا ٹوٹنا بہت مشکل ہے۔ آج میرے سامنے ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ کا خط ہے جس کے ذریعے انہوں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ فکر و آگہی کا اگلا شمارہ محترم ڈاکٹر بشیر بدر صاحب کے نام سے منسوب ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے نام سے منسوب شمارہ میں مَیں اپنی شرکت ضروری سمجھتا ہوں اس لیے ان کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں چند سطریں تحریر کی شکل آپ کے سامنے ہیں۔ ویسے تو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا احاطہ کرنا مجھ جیسے طفل مکتب کے لیے مشکل ہوتا مگر ان کی اپنے خوردوں کی شفقت اور اپنائیت نے میری یہ مشکل آسان کردی اور میں باوجود اس کے کہ کبھی کبھی لوگوں کی تنقید و تبصرہ کی زد میں آکر بھی اپنے خیالات و احساسات کو بدل نہیں سکا اور جتنا زور بڑھتا اتنا ہی ان کے قریب ہوتا گیا اور بہت قریب سے ان کے بارے میں سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

آج ہندوستان کے جن شعراء کی شہرت صرف ملک ہی نہیں بلکہ ملک کے باہر بھی ہے ان میں ڈاکٹر بشیر بدر کا نام بہت نمایاں ہے وہ مشاعروں کے توسط سے صرف ہندوستان ہی کے مختلف شہروں میں نہیں پہچانے جاتے بلکہ پاکستان، دبئی، بحرین مسقط، کناڈا اور امریکہ میں بھی اپنی شناخت بنا چکے ہیں ان کی شہرت میں ان کے کلام

اور ان کی شخصیت دونوں کا دخل ہے وہ چاہے اپنے اشعار تحت میں سنائیں یا ترنم میں وہ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح شعر کا مجموعی تاثر سامعین کے دلوں میں اتارا جاتے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کی شخصیت کا ایک اہم رُخ ان کی صداقت اور بے باکی ہے۔ دبئی کے ایک مشاعرے میں جو فیض احمد فیض کی یاد میں منعقد ہوا تھا اس میں انہوں نے مشاعرہ کے صدر علی سردار جعفری کو بڑی سختی کے ساتھ اس وقت ٹوکا جب وہ اس وقت مشاعرہ گاہ سے باہر جانے لگے جس وقت ڈاکٹر صاحب اپنا کلام پیش کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ "آپ زمین پر نہیں چل رہے ہیں بلکہ میری غزل کے سینے پر سے گذر رہے ہیں"۔ بحرین کے مشاعرے میں انہوں نے معروف پاکستانی شاعر احمد فراز کو جو عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ ہندوستانی شاعر مشاعروں میں داد کی بھیک مانگتے ہیں، بُری طرح جھڑک دیا۔ یہ اور اسی طرح کے بہت سے واقعات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ڈاکٹر بشیر بدر اپنے اصولوں اور نظریات کے سلسلے میں کسی سے مفاہمت نہیں کرتے۔

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے سری نگر میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں ہندوستان کے کئی مشاہیر شعرا شریک ہوئے۔ فراق اور بشیر بدر دونوں جگن ناتھ آزاد کے مہمان تھے۔ آزاد صاحب کے مکان پر فراق صاحب حسبِ معمول اپنی شاعری کی عظمتوں کے قصے بیان کر رہے تھے۔ جب بہت دیر ہوگئی تو ڈاکٹر بشیر بدر نے بڑی معصومیت سے فراق صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کی شاعری میں اپنے زمانے کی بیدار ہوتی ہوئی کسی قدر تعلیم یافتہ عصری عورت کے بجائے پانچ ہزار سال پرانی تاریخی عورتوں سے کیوں عشق کا اظہار ملتا ہے۔ بشیر صاحب نے اپنی بات اور واضح کرنے کے لیے فراق صاحب کا ایک شعر سند کے طور پر پیش کیا جس کا ایک مصرع یوں ہے ؎

"قامت ہے کہ کوہسار پہ چڑھتا ہوا دن ہے"

فراق صاحب اپنی عظمتوں پر کب تنقید برداشت کرتے؟ انہوں نے تلخ کلامی کی ابتدا کی اور بات یہاں تک بڑھی کہ دونوں آپے سے باہر ہوگئے۔ فراق صاحب بشیر صاحب کو بُرا بھلا کہتے رہے جو کہ مومن، ثاقب اور حسرت کا چربہ تھا۔ بالآخر جگن ناتھ آزاد کو دونوں کو الگ الگ کمروں میں قید کرنا پڑا۔ شام کو جب مشاعرہ ہوا تو یہ بدمزگی رنگ لائی، بشیر بدر کی نئی نئی آواز کشمیر کی خوبصورت فضاؤں میں پہلی

بار اتنی قریب سے سنی گئی تھی اور ان کے پسند کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان سے غزلوں پر غزلوں کی فرمائش کر رہی تھی۔ فراق صاحب حسبِ معمول یہ سب نہیں برداشت کر سکے اور مشاعرے کے اسٹیج پر گالی گلوج پر اتر آئے۔ کشمیر کے مہذب اور مہمان نواز سامعین نے بڑی دیر تک فراق صاحب کی بزرگی کا خیال کرتے ہوئے انہیں برداشت کیا لیکن نوجوان صحافی اور سیاست داں تمیم احمد شمیم مرحوم نے فراق صاحب کو بڑی سختی سے دائرۂ ادب میں رہنے کی تاکید کی۔ جب معاملات کافی بڑھ گئے تو بشیر بدر نے سامعین سے یہ مطالبہ کیا کہ اب ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ ہم دونوں میں سے ایک کو آپکو رخصت کر دینا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فراق صاحب کو بغیر پڑھے ہوئے مشاعرہ گاہ سے واپس آنا پڑا۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ فراق صاحب نے پاکستان کے کئی ادبی رسائل مثلاً نقوش لاہور کو یہ خط لکھا کہ اگر 'نقوش' میں بشیر بدر کا کلام چھپے گا تو وہ اس پرچے کو اپنا قلمی تعاون نہیں دیں گے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ محمد طفیل مرحوم مدیر نقوش بشیر بدر جیسے نئے شاعر کو اپنے پرچے میں شائع کرتے رہے اور فراق صاحب کئی برس نقوش سے ناراض رہے۔ اس طرح لال قلعے کے اور ڈی۔ سی۔ ایم مشاعروں کے کنوینروں کو فراق صاحب نے خط لکھا کہ اگر بشیر بدر ان مشاعروں میں شرکت کریں گے تو وہ شریک نہیں ہوں گے۔ لال قلعے کے مشاعرے کے کنوینر نے بشیر بدر سے معذرت لے لی اور ان کا دعوت نامہ منسوخ کر دیا لیکن ڈی۔ سی۔ ایم کے مشاعرے کے کنوینر ساہنی صاحب نے فراق صاحب کو خط لکھا کہ (اب ہم آپ دونوں کو مدعو کر چکے ہیں اس لیے اپنی طرف سے کسی سے معذرت کرنا میرے لیے بد اخلاقی ہوگی اور آپ کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر بشیر بدر مشاعرے میں شریک ہوں گے تو آپ نہیں آئیں گے .... ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ اس سال ہم آپ کو اپنے مشاعرے میں سننے سے محروم رہیں گے۔) دلچسپ بات یہ ہے کہ فراق صاحب مشاعرے کے دن تشریف فرما ہو گئے اور کئی سال 'نقوش' سے ناراض رہنے کے بعد اپنے آپ مان گئے۔

پاکستان کے مشہور ترین اردو کے ایک روزنامے میں ۱۹۸۳ء میں یہ واقعہ چھپا تھا کہ سکھر کے انڈو پاک مشاعرے میں بشیر بدر اور منیر نیازی پیٹھ سے پیٹھ ملائے

دو مختلف سمتوں میں اپنا منہ کیے ہوئے بڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ اچانک منیر نیازی نے بشیر بدر سے دریافت کیا کہ "تم کون ہو" جواب ملا "بشیر بدر" دوسرا سوال تھا: "کہاں سے آئے ہو" جواب ملا "جہاں غزل کہی جاتی ہے"۔ آدھے گھنٹے کی خاموشی.... اب کے بشیر بدر کا نمبر تھا انہوں نے دریافت کیا کہ "تم کون ہو" جواب ملا: "منیر نیازی" دوسرا سوال کیا تم سکھر میونسپلٹی میں کام کرتے ہو اگر کرتے ہو تو ایک گلاس پانی منگوا دو۔

الٰہ آباد میں لائنس کلب کا ایک مشاعرہ ہوا جس کا اہتمام بی۔ این۔ آریہ نے کیا تھا۔ یہ شعری شام کیفی اعظمی کے نام سے منسوب تھی۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب نے انہیں افتتاحی تقریر میں کیفی صاحب کی شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی اس کے بعد مشاعرے کی نظامت کے لیے انور جلال پوری کو آواز دی گئی۔ انور جلال پوری اردو ادب میں اور انگریزی ادب میں پوسٹ گریجویٹ۔ انہوں نے مشاعرہ شروع کرنے سے پہلے جب کیفی اعظمی پر تقریر کی۔ تمہید باندھی تو بشیر بدر نے سختی کے ساتھ انور صاحب کو ٹوکا کہ مشاعرہ شروع کرو۔ ایک بڑے شاعر پر ایک سے زیادہ تقریر نہیں برداشت کی جا سکتی ہے۔"

ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنی محنت اور ریاضت سے دبستانِ ادب میں اپنی جگہ بنائی۔ نو عمری میں ہی انہیں اپنے خاندان کی کفالت کا بار اُٹھانا پڑا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ ایم۔ اے کیا اور پھر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ ان تمام مرحلوں میں وہ خود اپنے پیروں پر کھڑے رہے اور جہدِ مسلسل سے اپنی زندگی کا ایک کامیاب نقشہ مرتب کیا۔ مشاعروں میں جب آئے تو آندھی طوفان بن کر مشاعروں پر چھا گئے۔ یہ بات بڑی ذمہ داری سے کہی جا سکتی ہے کہ ان چند شعراء میں جن کی شرکت مشاعروں میں ناگزیر سمجھی جاتی ہے ڈاکٹر بشیر بدر بھی شامل ہیں۔ اس کی وجہ نہ صرف ان کا ترنم یا تحت میں پڑھنے کا ان کا مخصوص انداز ہے بلکہ ان کا معیاری کلام بھی لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مشاعروں میں انہیں مدعو کریں۔ ہمارے عہد کے مشاعروں میں وہی شعراء مقبول ہو سکتے ہیں جو اپنا کلام سامعین کے دلوں میں اتار دیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں ہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر اس گُر سے خاطر خواہ واقف ہیں۔ میں نے کوئی مشاعرہ ایسا نہیں

دیکھا جس میں سامعین نے ایک ہی غزل سننے کے بعد ڈاکٹر بشیر بدر کو چھٹی دے دی ہو جب تک وہ ایک دو تین غزلیں سُنا نہ لیں۔ مائکروفون سے جانے کی اجازت انہیں نہیں ملتی۔ مشاعروں کی ہنگامہ پرور دنیا میں یہ ایسی سعادت ہے جو کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے ایک شعر کہا ہے کہ ؎

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے　　یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

یہ شعر محض شعر کہنے کے لیے نہیں کہا گیا ہے بلکہ ڈاکٹر صاحب نے اس میں اپنی شاعرانہ زندگی کا ایک سچا اصول بتایا ہے۔ مشاعروں کے شعرا عموماً وقتی مسائل پر جذباتی شعر کہہ کر سامعین سے دادِ تحسین کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ اچھائی ہو یا بُرائی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر کبھی ہنگامی سیاسی حالات پر نہ کوئی شعر کہتے ہیں اور نہ پڑھتے ہیں بلکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے موضوعاتی مشاعرہ میں ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنی رومانی غزلیں سُنا دی ہیں۔ کئی برسوں پہلے قومی یکجہتی کے موضوع پر ٹیلی ویژن کے نیشنل پروگرام میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس میں سبھی شعرا نے موضوع سے متعلق اپنا کلام پیش کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی عادت کے مطابق ایک غزل پیش کی تھی جس کا براہ راست کوئی تعلق موضوع سے نہیں تھا۔ میرٹھ کے حالیہ فسادات میں ان کا مکان جلا دیا گیا تو لوگوں کو یہ توقع تھی کہ وہ سانحہ سے متاثر ہو کر کچھ ایسے اشعار بھی پڑھیں گے جن میں فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر ہوگا مگر کانپور کے ایک مشاعرہ میں جب وہ اس سانحہ کے بعد تشریف لائے تو حسبِ معمول اپنی ایک ایسی غزل پڑھی جس کا دور و نزدیک فسادات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کچھ شعرا نے ان پر طنز بھی کیا مگر وہ اپنے مزاج پر قائم رہے اور اپنی انداز غزل گوئی سے ذرا بھی انحراف نہیں کیا بلکہ اپنی گفتگو میں یہ کہا کہ یہ فسادات تو عارضی چیز ہیں مجھے انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر اعتماد ہے اور میں حالات ٹھیک ہونے پر انہیں لوگوں کے درمیان جا کر رہوں گا جہاں میرا مکان جلایا گیا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کی فطرت میں بے حد تضادات ہیں۔ ابھی کسی شاعر سے ان کا جھگڑا ہو رہا ہے لیکن چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ وہ پھر اس کے دوست بھی ہو گئے ہیں۔ انہیں تضادات کی بنا پر عموماً لوگوں کو غلط فہمیاں بھی ہوتی ہیں کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر

لوگوں سے دوستی اور جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بات ذاتی مفادات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ وہ ایسے لوگوں سے بھی اپنے تعلقات خراب اور اچھے کر لیتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب کو نقصان یا فائدہ پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ان تضادات سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں مختلف پہلو اور گوشے پیدا ہوتے ہیں کہ ان کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے کسی انگریز مصنف نے کہا ہے کہ "ہاں میں اپنی کہی ہوئی باتوں کی تردید اس لیے کرتا ہوں کہ میں عظیم ہوں" یہ مقولہ ڈاکٹر صاحب پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کو اپنے بزرگوں اور معاصرین سے کوئی دلچسپی ہو یا نہ ہو مگر وہ اردو کی نئی نسل کے ساتھ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ نوجوانوں میں جو لوگ ان کے قریب رہے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انہوں نے نئے فنکاروں کی ہمیشہ ہمت افزائی کی ہے اور انہیں اپنے مشوروں سے نوازا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ ان کے دکھ سکھ میں شریک رہے۔ انہوں نے نئے رجحانات اور نئے خیالات کا ہمیشہ استقبال کیا ہے اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تازہ ہوائیں آتی ہیں تبھی چمنستانِ ادب سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔ خود ان کے کلام کا مطالعہ بھی اسی بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ احساس کی تازگی اور نئے لب و لہجہ کے ساتھ اپنے شعر کہتے ہیں ان کے وہ اشعار بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں جس میں وہ آج کے دور کے تناظر میں انسانی نفسیات کو بے نقاب کرتے ہیں ؎

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو
رک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

اسی شہر میں کئی سال سے میرے کچھ قریبی عزیز ہیں
انہیں میری کوئی خبر نہیں مجھے ان کا کوئی پتہ نہیں

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں
کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

یہ اور اسی طرح کے بہت سے اشعار جو ان کے مجموعۂ کلام میں بکھرے ہوتے ہیں۔ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ موجودہ دور میں انسان کی نفسیات میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان پر ڈاکٹر صاحب کی کڑی گرفت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے کلام کا وہ حصّہ جس میں انہوں نے مناظر فطرت کے پس منظر میں کسی واقعہ کو پیش کیا ہے بہت ہی خوبصورت ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مصور نے کئی رنگوں سے ایک خوبصورت تصویر بنا کر ہماری نگاہوں کے سامنے رکھ دیا ہو ۔

اک شام کی دہلیز پر بیٹھے رہے ہم دیر تک
آنکھوں سے کیں باتیں بہت منہ سے کہا کچھ بھی نہیں
یہ اک پیڑ ہے آ اس سے مل کے رو لیں ہم
یہاں سے تیرے مرے راستے بدلتے ہیں
وہی شہر ہے وہی راستے وہی گھر ہے اور وہی لان ہے
مگر اس دریچے سے پوچھنا وہ درخت انار کا کیا ہوا
یہ خزاں کی زرد سی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
وہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

ان اشعار میں شاعری صرف ہمارے احساسات ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ مصوری بن کر ہماری نگاہوں کو بھی محاکاتی کیفیت سے متاثر کرتی ہے۔

ان سطور میں ڈاکٹر بشیر بدر کی شخصیت اور شاعری کا ایک اجمالی جائزہ لیا گیا ہے مگر ان کی شخصیت اور شاعری میں کتنے پہلو نکلتے ہیں کہ اس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ یہ بات بہت ذمہ داری سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری نے ہمارے ادب میں رنگ خوشبو اور تازگی کا اضافہ کیا ہے اور اسی بنا پر ان کا نام ہمارے ادب میں زندہ رہے گا۔ ●●

ہم دلّی بھی ہو آئے ہیں لاہور بھی گھومے
اے یار مگر تیری گلی، تیری گلی ہے
۱۹۵۵ء
بشیر بدر

منصور عثمانی

میں بشیر بدر ہوں

اسلوب کی "اکائی"، لہجے کی "انتج" اور غزل میں نئے رویوں، نئی لفظیات، نئے استعاروں کی آمد۔ تقسیم وطن کے آس پاس میرے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب فضا میں ہر طرف تہذیب و اخلاق کی گرتی ہوئی دیواروں کا گرد و غبار اور ماحول پر سلگتی ہوئی انسانیت کے دھوئیں کی گھٹن طاری تھی اور دوشیزۂ غزل یارانِ طریقت کے لادے ہوئے جھوٹے علامتی زیوروں کے بوجھ سے دبی سہمی حالات کے دوراہے پر حیران و پریشان کھڑی تھی۔ قید و قفس، برق و نشیمن، گلشن و صیاد، ساغر و سبو، طولِ شبِ ہجراں اور اختصارِ ساعتِ وصل ——— یہ وہ طوق و سلاسل تھے جو غزل کی کائنات سمجھ لئے گئے تھے اور غزل تھی کہ ———

خوبصورت اداس خوف زدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

خوبصورتی ماضی کی، اداسی حال کی اور خوف مستقبل کا ——— یہ تھی کیفیت معصوم و پاکیزہ غزل کی ——— جس کے تقدس سے بے خبر لوگ اسے شراب پینے پر مجبور کر رہے تھے اس کے ہوش و حواس لوٹ کر اپنی من مانی کرنا چاہتے تھے ——— وہ میں تھا جو اس وقت زمانہ بدلنے کی آہٹ لئے آگے بڑھا اور غزل کو نیم کا رس پیش کیا ———

غزلیں پہلے شراب پیتی تھیں
نیم کا رس پلا رہے ہیں ہم

اس نیم کے رس میں تلخی تو شراب سے زیادہ تھی مگر اس میں بیگانۂ عالم کرنے کے بجائے سارے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے کی صلاحیت کے ساتھ بیداریٔ شعور کا نشہ جاوداں تھا۔ میری خوش قسمتی کہ غزل نے مجھ ناچیز کی پیش کش قبول کی اور ایک معنیٰ خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی۔ برِّ صغیر کے بیشتر ادبی رسائل میں میرے کلام کی اشاعت شروع ہوئی اور تقریباً پندرہ سال کی رفاقت کے بعد میری غزل میری پہچان بن گئی اور میری ریاضت کے آنگن میں غزل نے ایک انگڑائی لے کر اپنی پچھلی مقدّس دوشیزگی کو پالیا ـــــ

بقولِ والی آسی "اس طرح انہوں نے صدیوں کے عظیم اور قدیم ایوانِ غزل میں اپنے لئے ایک مخصوص جگہ بنالی" ـــ یہ والی آسی لکھنؤ کے اس ادبی مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں جس نے یگانہ کے ساتھ "یادگارِ ادب" سلوک کیا تھا ـــــ غزل کا محترم دبستان، لکھنؤ جب والی آسی صاحب کی زبان سے میری محنت کا اعتراف کرتا ہے تو یہ یقیناً ایک بڑی بات ہے اور کیوں نہ ہو ـــــ

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

مجھے یاد ہے جب میں نے ـــــ

میرے بچپن کے مندر کی وہ مورتی دھوپ کے آسماں پہ کھڑی تھی مگر
ایک دن جب مرا قد مکمل ہوا اس کا سارا بدن برف میں دھنس گیا

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اشعار کہے تو غزل کو اپنی جاگیر سمجھنے والوں نے میری ذہنی تازگی کی داد دئے بغیر اپنے ہونٹوں پر طنز کی زہریلی مسکراہٹ سجالی تھی ــــ مگر آج "میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس عہد میں جو غزل رواں دواں ہے اس کا آغاز مجھ ناچیز کے چراغوں سے ہوا ہے... ...... یہ میرا فن ہے کہ غیر غزلیہ اردو کو میں نے نازک احساسات کا نغمہ اس طرح بنادیا کہ اب میرے عہد کے نئے اور ذہین لوگوں کے لئے یہ دل اور روح کا تغزّل ہے"

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سُنا ہوا

اور کیوں نہ ہو جبکہ میرا ایمان ہے ـــــ فن اگر روح و دل کی ریاضت نہ ہو
ایسی مسجد ہے جس میں عبادت نہ ہو

غزل کے اسی فن اور تازگی کے اسی ہنر کی خاطر میں نے زندگی کے بے شمار لمحات فکر کے سمندر کی گہرائیوں میں گزارے ہیں اور جب جب کوئی سیپی میرے ہاتھ آئی تو ساحل کے تماشائیوں نے بھی دیکھا ——— کانچ کے موتیوں کے آنسو کے

سب کھلونے غزل میں ڈھلتے ہیں

حالانکہ یہ بھی میں نے ہی کہا ہے ——— ہونٹوں پہ محبت کے فسانے نہیں آتے

ساحل پہ سمندر کے خزانے نہیں آتے

——— مگر آپ جانتے ہیں یہاں مفہوم دوسرا ہے ــ الفاظ کو سلیقے سے برتا جائے تو اُن کی معنوی وسعتیں ہی امکان نہیں پاتیں بلکہ کبھی کبھی ان کا عمل بھی بدل جاتا ہے۔

ہم نے الفاظ کو آئینہ کر دیا۔

چھپنے والے غزل میں چمک جائیں گے

اور اس مرصّع سازی و آئینہ گری میں دل پر کھلنے والے اسرار یوں زبان پاتے ہیں۔

اسے فن نہیں پردۂ فن کہو

غزل کو چراغوں کی چلمن کہو

چراغ بھی کیسے ــ پھولوں کے، آنکھوں کے، چہروں کے ــ۔

عمر کی کشتی میں زندگی کا سفر جاری ہے اور ہر موڑ، ہر پڑاؤ مجھے احساس کے نئے نئے رنگ دکھاتا رہا ہے ــ میرا یہ کہنا شاید لوگوں کو عجیب سا لگے مگر حقیقت یہی ہے کہ جہاں منظر بدلتا ہے وہیں احساس کا رنگ بدل جاتا ہے ــ جہاں احساس کا رنگ بدلتا ہے وہیں انسان کے جذباتی کردار کا امتحان ہونے لگتا ہے۔ میرے سامنے ایسے مرحلے کئی بار آئے مگر ــ اسے پاک نظروں سے چومنا بھی عبادتوں میں شمار ہے

کوئی پھول لاکھ قریب ہو کبھی میں نے اس کو چھوا نہیں

میں نے زندگی کو جن مختلف پہلوؤں سے دیکھا ممکن ہے اوروں کو بھی یہ موقع نصیب ہوا ہو، میں نے عُسرت بھی دیکھی ہے۔ ناکامی کے پہاڑوں کا بوجھ بھی اپنے دِل پر محسوس کیا ہے، تنہائیوں میں آنسوؤں کی فصل بھی بوئی ہے۔ قصباتی گرد و غبار میں بھی اَٹا ہوں، ہجرتیں بھی کی ہیں، دفتری فائلوں میں بھی اُلجھا ہوں، اپنوں کے پیار کو بھی ترسا ہوں ——— مگر غزل کے ساتھ ایک خوبصورت مستقبل کی آس نہیں چھوڑی،

زندگی سے مایوس نہیں ہوا۔ خدا کی اس عظیم کائنات میں خود کو تلاش کرتا ہی رہا اور دُعا مانگتا رہا کہ ——— میں غزل کی شبنمی آنکھ سے یہ دکھوں کے پھول چنا کروں؛

مری سلطنت مرا فن رہے مجھے تاج و تخت خدا نہ دے

اور پھر وہ وقت آ ہی گیا کہ بقول والی آسی "آج بشیر بدر، اردو کی نئی غزل کے ایک مقبول اور محبوب شاعر ہیں...... آج بشیر بدر کی غزل ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ اور کناڈا اور دیگر ممالک میں اردو اور ہندی داں طبقے کے عوام و خواص میں یکساں طور پر محبوب اور مقبول ہے۔" اور میں خدا کے حضور اپنی کائنات کا سر خم کئے سوچ رہا ہوں ——— یہ عنائتیں، یہ نوازشیں، ترا شکر کیسے ادا کروں

سرِ راہ پھول بچھا دئے مرے آنسوؤں کے جواب میں

آج میں شہر شہر اور ملک ملک گھوم کر بھی اپنے سیتاپور کو کیسے فراموش کروں مجھے تو نیو یارک اور واشنگٹن کی رنگینیوں میں بھی

وہ درودوں کے سلاموں کے نگر یاد آئے
نعتیں پڑھتے ہوئے قصبات کے گھر یاد آئے
شام کے بعد کچہری کا تھکا سناٹا،
بے گناہی کو عدالت کے ہنر یاد آئے

ریل اور ہوائی جہازوں کا مسلسل ہنگامہ پرور سفر، جگمگاتے ہوئے دلّی اور بمبئی کے صبح و شام، لکھنؤ اور بنارس کی دل کشی بھوپال اور اندور کا وقار، مدراس اور کلکتہ کے مسحور کن نظارے ——— یہ سب مل کر بھی میرے دل سے اس احساس کو نہیں چھین پائے کہ ——— قدیم قصبوں میں کیسا سکون ہوتا ہے

تھکے تھکائے ہمارے بزرگ سوتے ہیں

میں میرٹھ میں رہتا ہوں جہاں گذشتہ دنوں بھیانک فساد ہوا میرا زندگی بھر کا اثاثہ، تنکے تنکے جوڑ کر بنایا ہوا میرا گھر بھی لوٹا گیا جلایا گیا ——— مگر میں کیا کروں؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ———

[دلّی ہو کہ لاہور کوئی فرق نہیں ہے
سچ بول کے ہر شہر میں ایسے ہی رہو گے]

میں سچ کی عظمت کا منکر نہیں، اس کے سنہرے دور سے نا امید نہیں۔ بس جھوٹ و نفرت کے سوداگروں سے یہی کہتا ہوں ———

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

میں مانتا ہوں کہ شہرت کی اس منزل پر مجھے دیکھ کر کچھ لوگ میری اس سادہ گوئی کو مذاق سمجھتے ہوں گے ———

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے
یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

لیکن اس شعر کو سن کر اپنے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹوں کا چراغاں کرنے والوں کو میرا یہ شعر سنانے اور ان کا چہرہ غور سے دیکھئے ———

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشہ ہے
جس شاخ پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

میری شریکِ حیات قمر جہاں شہناز ——— جن کی رفاقت کا اُجالا زندگی کے بڑے بڑے اندھیروں سے معرکہ آرائی میں میرا حوصلہ ثابت ہوا۔ جن کی پلکوں پر اکثر میرے آنسو رقص کرتے تھے۔ جن کا دل میری محرومیوں کے داغ اپنے دامن میں سمیٹ لیتا تھا اور جن کی دوستی میری غزل کا نور تھی جن کو علامت بنا کر میں نے کہا تھا ———

کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا
مرے پاؤں شعلوں پہ چلتے رہے

مجھ سے اچانک بچھڑ گئیں ——— میں پاکستان میں تھا اور یہاں ایک ہنستی بولتی حقیقت کہانی میں بدل گئی ——— یادوں کا کبھی نہ کمہلانے والا ایک گلاب میرے دل کا مقدّر ہو گیا۔ میں شہناز سے یہ بھی نہ کہہ سکا ——— جاتے ہو تو لے جاؤ یادیں بھی مرے دل سے
ان شمعوں کا کیا رشتہ اُجڑی ہوئی محفل سے

میں انسانی زندگی کی بے ثباتی پر بس اتنا ہی کہہ سکا ———

کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا

دِل کو یوں سمجھانے کی کوشش کی ــــ وہ اپنے گھر چلا گیا افسوس مت کرو
اتنا ہی اس کا ساتھ تھا افسوس مت کرو
کاش میری یہ آواز ان تک پہونچ سکتی ــــ انہیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہمسفر کہاں ہے
مگر حقیقت یہ بھی ہے ــــــ سب لوگ یہ کہتے ہیں کہ تم لوٹ گئے ہو
تم ساتھ تھے تم ساتھ ہو تم ساتھ رہو گے

ایک بار میں نے شہناز سے کہا تھا" تمہارے علاوہ اب اس گھر میں کوئی چیز پرانی نہیں رہے گی" اور آج جب شہناز بھی نہیں ہے تو وہ گھر پھر اجڑ گیا ہے ــــ گھر تو کل پھر جڑ جائے گا مگر شہناز نہیں ملیں گی۔ ان کا گھر تو اب ان کی یادوں کا بسیرا، میرا ٹوٹا پھوٹا دِل ہی ہے۔ جس سے ہر دھڑکن، ہر کسک، ہر چبھن۔ غزل کا نغمہ بن کے پھوٹتی رہے گی۔ آپ دیکھئے، میرا ہر غم، اور میرا ہر آنسو غزل بن کے زندگی کے دامن پہ ٹپکا ہے اور موتی بن گیا ہے ــ غزل میرا ایمان اور اردو میری زندگی ہے ــ اس کے باوجود یہ دنیا کبھی کبھی میری مقبولیت اور محبوبیت کی سزا دیتی ہے۔ میرے مخصوص دوستوں کو ایک موضوعِ گفتگو مِل جاتا ہے اور میں کردہ و ناکردہ گناہوں کی پاداش میں معتوب کیا جاتا ہوں مگر ایسی آزمائش میں بھی حواس باختہ نہیں ہوتا، غصّہ نہیں کرتا، بلکہ چپکے سے اپنے ہمدردوں کو ایسے منصفوں کے لئے مشورہ دیتا ہوں ــــــ

انہیں کبھی نہ بتانا میں ان کی آنکھیں ہوں
وہ لوگ پھول سمجھ کر مجھے مَسلتے ہیں

اور بہت ہوا تو ہلکی سی صفائی پر اکتفا کر لیا ــ اصرار اس لئے نہیں کرتا کہ ــــــ

خطاوار سمجھے گی دنیا تجھے
اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے

خدا کا شکر ہے کہ غزل کے حوالے سے میرے چاہنے والے لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ہیں پھر میں چند لوگوں کی کیوں پرواہ کروں ــ آپ یقین کریں نہ کریں۔

فقیر آئینہ ہے پردۂ خیال نہیں
مرے بدن پہ کسی مصلحت کی شال نہیں

اور شاید ــ ان چند لوگوں کے درمیان ــــــ

اسی لئے تو یہاں اب بھی اجنبی ہوں میں
تمام لوگ فرشتے ہیں آدمی ہوں میں

مجھے اپنی وراثتوں پر ہمیشہ ناز رہے گا ــــــ

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

اور اسی مہکتی ہوئی زبان کا پرچم لے کر ــــــ

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

اور میرا، اسی سفر میں بہت قیمتی تجربہ ہے ــــــ

چمکتی ہے کہیں صدیوں میں آنسوؤں سے زمیں
غزل کے شعر کہاں روز روز ہوتے ہیں

اور اسی تجربہ کی روشنی میں جب بہ بانگِ دہل' میں نے کہا ــــــ

تتلی کے نازک پنکھوں پر آنسو کی تحریر غزل ہے
لفظوں کی مینا کاری کو الہامی اشعار نہ جانو

تو اہلِ نقد نے تسلیم کیا کہ ــــــ

★ نئی غزل میں ہندوستان اور پاکستان میں جو نام بہر حال آئیں گے ان میں بشیر بدر کا نام بھی ہوگا۔

ــــــ آل احمد سرور

★ غزل گو کی حیثیت سے بشیر بدر کی صلاحیتوں پر ایمان نہ لانا کفر ہے۔

ــــــ ڈاکٹر محمد حسن

★ جب الفاظ ان کے تجربے سے کلی طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں تو ان کا ہر شعر کھرے سونے کی طرح چمک جاتا ہے۔

ــــــ خلیل الرحمٰن اعظمی

اور صاحبانِ نظر بھی کہہ اٹھے ــــــ

★ نئی غزل پر کسی بھی عنوان سے گفتگو کی جائے بشیر بدر کا ذکر ضرور آئے گا۔

ــــــ شہریار

* بشیر بدر کی آواز دور سے پہچانی جاتی ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔

——— ندا فاضلی

* جدید غزل کا سب سے پیارا نام بشیر بدر ہے۔

——— عادل منصوری

نقد و نظر کے ان اہم اور معتبر ستونوں کے بیانات کی روشنی میں اگر میں یہ دعویٰ کرتا ہوں تو کیا یہ مبالغہ آرائی یا خود ستائی ہے؟

میں شاہراہ نہیں راستے کا پتھر ہوں
یہاں سوار بھی پیدل اُتر کے چلتے ہیں

اور اگر کوئی اسے نہیں مانتا تو سمجھ لیجئے وہ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے بے ایمانی کر رہا ہے۔ بہر حال میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے غزل کے ساتھ کوئی بے ایمانی تو کیا بڑے درجے کی بدسلوکی بھی نہیں کی ہے۔ مجھے ۱۹۵۵ء میں ہی یقین ہو گیا تھا کہ مجھے اپنی غزل کی اساس جذبوں کی انوکھی صداقت کے ساتھ زبان کی زندہ اور بولتی ہوئی لطافت پر رکھنی چاہئے۔ میں جس غیر غزلیہ لفظ کو چھوتا گیا ان میں سے اکثر و بیشتر غزل بنتے گئے اور آج میرا اسلوب آج کی غزل کا اسلوب بن چکا ہے۔

غزل کے نئے دوستوں کو میرا پیغام ہے کہ ———

کچھ تو پاس بچا کر رکھو سب کچھ کاروبار نہ جانو
دل کے دروازے مت کھولو اس گھر کو بازار نہ جانو
مانا رستہ بہت کٹھن ہے پھر بھی سایہ دار شجر ہیں
ٹہنی کو تلوار نہ سمجھو آنچل کو دیوار نہ جانو

اور غزل کے کروڑوں عاشقوں سے گذارش کہ ———

اُجالے اپنی "چاہت" کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے زندگی کی کس گلی میں شام ہو جائے

اب اجازت دیجئے ——— کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی ———

غیر عشقیہ غزل

عطیہ سلطان

بشیر بدر کا جن لوگوں نے مکمل تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا ہے وہ انھیں رومانی غزل گو سمجھتے ہیں وہ بلا شبہ نوعمروں میں بہت مقبول ہیں۔ غزل کی قدیم روایت میں بہت مقبول شاعر عام طور پر وہ شاعر رہے ہیں جو حسن و عشق کے معاملات، کیفیات اور محسوسات کی بطور خاص ترجمانی کرتے ہیں میرے خیال میں کلیہ سازی ہماری تنقید کی سہل پسندی ہے۔ میر اپنے زمانے میں بھی بہت مقبول تھے اور [illegible] کی تہذیب و تربیت میں تصوف کی پاکیزگی اور سنجیدگی ہے۔ مرزا داغ بھی بہت مقبول تھے اور ان کے یہاں شاہد بازار کے عشوہ و ناز کی بے التفاتی اور بے وفائی بے خود عاشق بھی مر مٹنے والا صوفی زادہ عاشق نہیں ہے بلکہ وہ مسائل دنیا سے بے خبر رند شاہد باز رہے۔ پھر حسرت کی غزل مقبول ہوئی۔ حسرت کے یہاں حسن و عشق کا معاملہ تصوف کے اسلوب میں ہجر کی لذتوں اور نکہتوں سے تابناک ہے اور بزم و بازار کی معشوق اور عشقیہ ہوئی لذت کوشی کا غزلیہ اظہار رہے۔ حسرت کے یہاں عاشق اور معشوق نئی زندگی اور نئی تعلیم کی پروردہ ہیں اپنے عہد کی حسیت کے پیکر ہیں۔ ان تین بڑی مثالوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کسی مخصوص دور کے رومانی یا عشقیہ اشعار اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی سیاق و سباق کا ایک روشن لمحہ ہوتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں مغربی تعلیم، سائنسی رویوں اور عقلیت پسندی اگرچہ ابھی ہمارا لاشعور نہیں بنی ہے لیکن ہمارے شعوری فکر و فن کا حصہ بن چکی ہیں۔ آج کے نوجوان اس مخلوط تعلیم، زندگی کی سفر میں صنف نازک کی ہم قدمی اور مجموعی طور پر پاسبانِ عقل سے زندگی کے ان حقائق سے آگاہ ہوتے جا رہے ہیں جو اپنے عہد کی بے شعور عشقیہ غزل سے تفریح تو لے سکتے ہیں مگر اس کو اپنی تنہائیوں کا ساتھی بنا کر اس سے محبت نہیں کر سکتے۔ بشیر بدر اردو اور ہندی پڑھنے والے قصباتی اور شہری نوجوانوں کے ہمراہ غالباً سب سے زیادہ ہیں۔ میرے نزدیک ان کی غزل میں وہ حقیقت پسندی اور زندگی آمیزی ہے جو نگہبانی عقل کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ میں بشیر بدر کے ان دس شعروں کو پہلے انتخاب کرتی ہوں جو میرے نزدیک اس عہد کا غزلیہ روزمرہ ہو گئے ہیں

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو   نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

دشمنی جم کے کرو لیکن یہ گنجائش رہے ۔۔۔ جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے ۔۔۔ یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو ۔۔۔ رک گئے راہ حادثہ دیکھ کر

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی ۔۔۔ یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے ۔۔۔ مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں ۔۔۔ مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے

جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیئے نہ رکھو ۔۔۔ کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

پہلی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ اشعار غزل کے اچھے شعر ہیں اور اگر نہیں ہیں تو میری غزل فہمی مشکوک ہوتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کسی عمیق مطالعے اور تادیر غور و فکر کے ساتھ یہ اشعار منتخب نہیں کئے ہیں اس لیے آپ جو دوسرے اشعار ان شعروں سے زیادہ بہتر قرار دیں تو نتائج بھی مختلف ہو سکتے۔ بہر حال پہلے اور ساتویں شعر کے علاوہ میرے نزدیک باقی آٹھ اشعار عصری آگہی عقل کی تجزیاتی لاشعوریت کا منظر نامہ ہیں ۔ دوسرا اور تیسرا شعر نفرت، تعصب اور جنگ کے موضوع پر ہے۔ چوتھا اور پانچواں شعر، بڑے شہروں کی لاتعلقی اور فرد کی کسمپرسی چھٹا اور دسواں شعر انسان کی اس بے بسی کا اظہار ہے جہاں انسان نہ تو بہت سچائی اور خلوص سے کسی کو چاہ سکتا ہے اور نہ ہی کسی کی خود سپردگی اور محویت میں گم ہو سکتا ہے ۔انسان اور دنیا کا رشتہ اتنا سفاک ہے کہ سوکھی ہوئی لکڑیاں، چراغوں کی روشنی میں موت کی تباہ کاری اور اس کے اندھیروں سے خوفزدہ ہوتی ہے ۔ نواں شعر بھی اس شہری خوبصورتی اور کھوکھلے پن پر شاعرانہ طنز ہے جس میں دیہات اور قصبات کی وضعدار رشتوں کا استحکام نہیں ہے ۔

بشیر بدر کے تخیل اور طرز احساس میں ایسی ندرت، نزاکت، نفاست اور خوبصورت ترین معنویت اور محسوسات کی تہہ داریاں ہیں کہ وہ دشمنی، رشک، حسد، انا، خود پسندی جیسے جذبوں کو تمام تر عقلیت پسندی سے چھونے کے بعد بھی غزل کے تغزل اور زندگی کے حسن کا پیکر بنا دیتے ہیں۔ بشیر بدر نے اپنی غزلیہ فکر کو ماضی و حال کے جس وسیع اور عمیق پس منظر میں سجایا اور سنوارا ہے وہ زندگی کا نغمہ ہیں ۔ میں بغیر کسی تجزیے کے ایک مختصر سا انتخاب اُن کے شعری مجموعوں اکائی، امیج اور آمد سے پیش کر کے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ بشیر بدر کی بے پناہ مقبولیت کا سبب اُن کا وہ خوبصورت متغزلانہ اسلوب ہے جو زندگی کی تمام نارسائیوں، محرومیوں، اندیشوں اور خوابوں کا

عقلی تجزیہ شاعرانہ اسلوب سے کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کا ایمان محبت ہے لیکن دنیا انسان کے لیے نئے راستے بناتی ہے اور خود ان راستوں کی دیوار بن کر اس کا اور اس کی محبت کا امتحان لیتی ہے انسان اور زندگی کے رشتوں کے نادر، انوکھے اور غیر رومانی غزلیہ پیکر یہ چند اشعار ہیں۔ میرا یہ مختصر سا نوٹ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہمارے بڑے نقاد اور اچھے شعرا اس طرف توجہ دیں کہ محبت، دنیا کے تمام سیاہ و سفید، عظمتوں اور پستیوں، کامیابیوں، اور ناکامیوں کے پس منظر ہی میں ایک خوبصورت سی ریکھا ہے۔ بشیر بدر زندگی کے تمام تضادات کی اکائی پیش کرتے ہیں کامیاب ترین شاعر ہیں۔ اپنی فکر، تخیل، وجدان کے شعری اظہار کے لیے بھی جو اسلوب انہوں نے منتخب کیا ہے اس میں بھی تعقل کا تجزیاتی رویہ ہے وہ شعری تاریخ کے مطالعے عصری تبدیلیوں اور آنے والے ماہ و سال کے مزاج کو سمجھتے ہوئے غزل کی جس زبان کا انتخاب کرتے ہیں وہ بھی ان کے مہذب شعوری اور تجزیاتی مزاج کا پتہ دیتا ہے۔ مثلاً

تحریر و گفتگو میں کسے ڈھونڈتے ہیں لوگ
تصویر میں بھی شکل ہماری نہ آئے گی

خوش رہے یا بہت اداس رہے
زندگی تیرے آس پاس رہے

میری اپنی بھی مجبوریاں ہیں بہت
میں سمندر ہوں پینے کا پانی نہیں

غرور اس کو بہت سجتا ہے مگر کہہ دو
اسی میں اس کا بھلا ہے غرور کم کر دے

مجھ سے کیا بات لکھانی ہے کہ اب میرے لیے
کبھی سونے کبھی چاندی کے قلم آتے ہیں

بڑے شوق سے مرے گھر جلا کوئی آنچ تجھ پہ نہ آئے گی
یہ زباں کسی نے خرید لی یہ قلم کسی کا غلام ہے

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

اب تیرے میرے بیچ ذرا فاصلہ بھی ہو
ہم لوگ جب ملیں تو کوئی دوسرا بھی ہو

اس کے لیے تو میں نے یہاں تک دعائیں کیں
میری طرح سے کوئی اسے چاہتا بھی ہو

کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا

شام کے بعد بچوں سے کیسے ملوں
اب مرے پاس کوئی کہانی نہیں

ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اٹھے اپنے ہی دل پر برسے

آنکھیں آنسو، دل بھی آنسو شاید ہم سر تا پا آنسو
تھوڑی مٹی اور ملا دے ابھی بہت گیلی ہے مٹی

محبت، عداوت، وفا، بے رخی
کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دھوپ ہوں کبھی دھول ہوں
میں تمام کپڑے بدل چکا ترے موسموں کی برات میں

میں اپنی راہ میں دیوار بن کے بیٹھا ہوں
اگر وہ آیا تو کس راستے سے آئے گا

میں نے دریا سے سیکھی ہے پانی کی پردہ داری — اوپر اوپر ہنستے رہنا گہرائی میں رو لینا

کتنی صدیوں کی قسمتوں کا امین — کوئی سمجھے بساط لمحہ کیا

تمام عمر مرادم اسی دھوئیں میں گھٹا — وہ اک چراغ تھا میں نے اسے بجھایا ہے

میں شاہراہ نہیں راستہ کا پتھر ہوں — یہاں سوار بھی پیدل اتر کے چلتے ہیں

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں

آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

انھیں کبھی نہ بتانا میں ان کی آنکھوں میں ہوں — جو لوگ پھول سمجھ کر مجھے مسلتے ہیں

غزل کے یہ اشعار جدید دور میں انسان کی بے چہرگی انسان اور حیات و کائنات کے تصادم، انسانی نارسائی، فن کار کو خریدنے والی سرمایہ دارانہ یا جابرانہ طاقتیں، عشق میں انسانی اور سماجی ذمہ داریوں کا احساس، افلاس اور ناکامی کی ایسی شدت کہ خوابوں کی کہانیاں بھی یاد نہ رہیں، انسان کی جلد جلد بدلتی ہوئی وفاداریاں دوستیاں اور محبتوں کا المیہ داخلی شکست و ریخت، صدیوں کے سیاق و سباق میں مثبت قدروں کے کسی ایک لمحہ کی جاودانی حیثیت، جابر یا قاتل کے ضمیر کی خود احتسابی، جدید عہد میں خلوص کی گہرائیوں سے محروم زندگی کی گاڑی چلانے والا سماجی سمجھوتہ، ظلم کے خلاف چپ اور ضبط کی آہ، غرض ایسے کتنے ہی شعری تجربات کا نقطۂ عروج اُن کے یہ اشعار ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محبت، حسن اور عشق کے جذبات و احساسات کے ایسے نادر نفسیاتی شعری پیکر اُن کے یہاں ملتے ہیں جو غالباً اس سے پہلے اتنی شدت اور انفرادیت سے عام نہیں تھے لیکن مجموعی طور پر بشیر بدر، پوری زندگی کے شاعر ہیں، اُس زندگی کے جو ماضی کی یاد میں ہے، حال کی جد و جہد اور مستقبل کا خواب ہے۔

بشیر بدر یقیناً اردو کے اس دور کے بہت مقبول شاعر ہیں

سید محمد عقیل

(الہ آباد)

پرنسپل محمد مشتاق شارق

آمد کے ابتدائی صفحات میں بشیر بدر نے ۱۹۸۵ء کے پڑھنے والوں کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :-

"بات یہ ہے کہ فارسی گزیدہ اردو جہاں اپنا غزل فہمی نہیں ہے نہ زبان اور اس کا شعر زوال دوال رہا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ مزاج بدلتا، بنتا، بگڑتا رہا۔ فارسی اور عرب کے آئینے میں سنورتی تھی۔ آج عربی اور فارسی گزیدہ اردو میرے خیال سے کمزور اور غیر جمالیاتی اردو ہے۔ علم کی غرض و غایت محض ماضی پرستی نہیں ہے۔ علم کی غرض و غایت زندگی کو جاننا اور اس کو خوبصورت، کارآمد اور معنی خیز بنانے کا عمل ہے۔"

اس میں بشیر بدر نے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ فارسی گزیدہ اردو کمزور اور غیر جمالیاتی ہے اور دوسری یہ کہ علم کی غرض و غایت ماضی پرستی کی بجائے زندگی کو جاننا اور خوبصورت بنانا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانہ تھا جب اہل الرائے کی نظر میں عربی اور فارسی گزیدہ اردو ہی قدر تھی۔ چنانچہ غالب کی زبان اور اس کے اسلوب کا بول بالا تھا۔ اس کی تقلید باعث فخر سمجھی جاتی تھی۔ قاری فارسی کی ترکیبوں پر سر دھنتا تھا۔ مضمون وہ اچھا سمجھا جاتا تھا جو روایتاً اس تک پہونچا تھا۔ کچھ فلسفہ کی باتیں، کچھ تصوف و اخلاق کے نکات اور کچھ عشق و عاشقی کے نغمے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اس دور کی شاعری میں داخلیت کم اور خارجیت زیادہ تھی۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس شاعری کا دائرہ اثر کتنا وسیع تھا؟ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ اثر صرف اس طبقے تک محدود تھا جو جاگیردارانہ نظام سے وابستہ تھا۔ عوام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ یہ شاعری عوام کی زندگی کی عکاس تھی۔ اب یہ کہ وہ نظام بدل گیا اور ہم ایک نئے دور میں داخل ہو گئے، ہماری شاعری کو آج کی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ یہ شاعری آج کے لاکھوں کروڑوں دھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز اور زبان کی جمالیاتی قدروں کی حامل ہو گی۔

بشیر بدر کی شاعری پر بصیرانہ نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ مذکورہ بالا معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کی زبان آسان، اس کا لب و لہجہ دلکش اور اس کے خیالات اس کے ذاتی تجربات اور اپنے محسوسات ہیں۔ یہ شاعری اس کے اپنے دل کی دھڑکن نہیں بلکہ ان کروڑوں آدمیوں کے دلوں کی آواز ہے جو ذرا سی بھی اردو سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بشیر بدر کی شاعری ان تمام تہذیبی اقدار کی حامل ہے جو میراث کے طور پر ہم تک پہونچی ہیں۔

ایک اور خاص بات بشیر بدر کی شاعری کی یہ ہے کہ اُس کی بنیاد کسی فارمولے پر قائم نہیں۔ نہ وہ یکسر روایتی ہے، نہ ترقی پسند تحریک کی نمائندہ اور نہ قطعی جدیدیت زدہ۔ وہ ایک عالمگیر مزاج اور آہنگ کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

ایلیٹ (ELIOT) اسٹیفن اسپنڈر (STEPHEN SPENDER)، اوڈن (AUDEN) اور لیوس (LEWIS) جدید انگریزی شاعری کی وہ اہم شخصیتیں ہیں جنھوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے مثال کے طور پر ایلیٹ کی ویسٹ اینڈ دیکھئے جس میں جدید تہذیب کی پیچیدگیوں، بدمزگیوں اور آج کی زندگی کی گھٹن، کھنچاؤ اور تناؤ کی پوری پوری عکاسی ملتی ہے۔ پھر اودن کی شاعری میں اس سماجی بیماری کے آثار نمایاں ہیں جو ہماری نئی تہذیب نے جنم دیئے ہیں اسپنڈر کے یہاں تو آپ کو شروع سے اخیر تک بیمار اور مجبور انسانیت کی چیخ پکار سنائی دے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم شاعر کو کسی مخصوص فارم یا مقصد کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جدید دور میں رہ کر اب سے چند سو سال پہلے کے ذہن سے سوچیں۔ بشیر بدر کی شاعری کا یہی وہ پہلو ہے جو انھیں اُن کے ہمعصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی سوچ اور ان کے ذہن کا رخ بڑی حد تک آج کی زندگی کے دکھ درد کی طرف ہے جس میں ان کا اپنا تجربہ اور اپنے محسوسات شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار دیکھئے:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے

خواب جس دل میں رہا کرتے تھے، کب کا مر چکا
کس کا دروازہ یہ بچے کھٹکھٹانے آئے ہیں

آج ہم سب ایک بہتر زندگی کی دوڑ میں
کیسے کیسے خواب قبروں میں سلانے آئے ہیں

بہت اچھا سا کوئی سوٹ پہنو تنگ دستی میں
اُجالوں میں چھپی ان بدلیوں کو کون دیکھے گا

اڑنے دو پرندوں کو ابھی شوخ ہوا میں
پھر لوٹ کے بچپن کے زمانے نہیں آتے

یہی نہیں کہ بشیر بدر نے صرف انفرادی دکھ درد کی عکاسی کی ہے، اُن کے یہاں قدم قدم پر محاکات، خارجی مظاہر کا حسن، صبح و شام کے مناظر کی سحر کاری اور زندگی کے پست و بلند پر حکیمانہ نظر کے جلوے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ پھر یہ نہیں کہ اُن کا فن محض ان کی گرمیٔ طبع کا کرشمہ ہو، اس میں حقیقت کی موجیں بھی لہراتی نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری بڑی متنوع ہے۔ یہ تنوع صرف مضامین اور موضوعات کے اظہار تک محدود نہیں بلکہ آگے بڑھ کر اس کا دامن ایک دلکش اسلوب تک پھیلا نظر آتا ہے۔ اُن کے چند اشعار دیکھئے جن میں اُن کے اسلوب کی رعنائی پوری طرح نمایاں ہے:

یہ پرندے بھی کھیتوں کے مزدور ہیں ‌ ‌ ‌ لوٹ کے اپنے گھر شام تک جائیں گے
سویرے ستاروں کی شبنم کہاں ‌ ‌ ‌ ذرا دیر میں تم کہاں ہم کہاں
کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا ‌ ‌ ‌ مرے پاؤں شعلوں پہ چلتے رہے
اس خواب کے ماحول میں بے خواب ہیں آنکھیں ‌ ‌ ‌ جب نیند بہت آئے گی بستر نہ ملے گا
یہ سوچ لو اب آخری سایہ ہے محبت ‌ ‌ ‌ اس در سے اٹھوگے تو کوئی در نہ ملے گا
شام کے بعد بچوں سے کیسے ملوں ؟ ‌ ‌ ‌ اب مرے پاس کوئی کہانی نہیں

اچھے شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ (QUOTABLE) ہو یعنی وہ مختلف مواقع پر بے ساختہ زبان پر آجائے اور اس سے حالات کی صحیح صحیح عکاسی ہو جائے۔ بشیر بدر کے یہاں ایسے بہت سے شعر ملیں گے جو مختلف حالات کی رعایت سے پڑھے جا سکتے ہیں انہی کے ساتھ اسلوب کی بے ساختگی نے ان میں سہل ممتنع کی خوبی پیدا کر دی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں ‌ ‌ ‌ تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا
میں نے دو چار کتابیں تو پڑھی ہیں لیکن ‌ ‌ ‌ شہر کے طور طریقے مجھے کم آتے ہیں
دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے ‌ ‌ ‌ جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں
وہ زعفرانی پلوور اسی کا حصہ ہے ‌ ‌ ‌ کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے
کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی ‌ ‌ ‌ یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا
جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں ‌ ‌ ‌ کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا
ہمارا بدن دھوپ کا باغ ہے ‌ ‌ ‌ یہاں چاندنی اور شبنم کہاں
خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے ‌ ‌ ‌ کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے
خطاوار سمجھے گی دنیا تجھے ‌ ‌ ‌ اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے
سنا ہے انھیں بھی ہوا لگ گئی ‌ ‌ ‌ ہواؤں کے رخ جو بدلتے رہے
تمہیں لوگ کہنے لگیں بے وفا ‌ ‌ ‌ زمانے سے اتنی وفا مت کرو
یہ سوچ لو اب آخری سایہ ہے محبت ‌ ‌ ‌ اس در سے اٹھوگے تو کوئی در نہ ملے گا

اگر کلیوں سے گداز، پھولوں سے مہک، چاند سے چاندنی اور چڑیوں سے چہچہے چھین لیے جائیں تو ان کے پاس کیا رہ جائے گا۔ اسی طرح اگر بشیر بدر سے افسانوی رومانیت کو لے لیا جائے تو ان کے یہاں تفکر آمیز سنجیدگی کے سوا کچھ نہ رہ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ بشیر بدر کی شاعری کی روح ان کی رومانیت میں

ہمو فی ہوتی ہے۔ بالخصوص ان کی افسانوی رومانیت ان کی اپنی چیز ہے جو دیگر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا احساس خود بشیر بدر کو بھی ہے۔ چنانچہ جب وہ کہتے ہیں کہ

"غزل دس سالہ شعور اور ہزار سالہ تہذیبی لاشعور کی یادوں کا نغمہ ہے یا غزل چاندنی کی انگلیوں سے پھول کی پتیوں پر شبنم کی کہانیاں لکھنے کا فن ہے"۔

تو ان کا اشارہ اپنی شاعری کے اسی وصف کی طرف ہے چنانچہ ان کی ذیل کی غزلیں دیکھئے جو سرتاسر افسانوی رومانیت کی آئینہ دار ہیں۔ یہ غزلیں نہ صرف دلوں کو موہنے والی ہیں بلکہ قاری کو بھی اپنے ساتھ یادوں میں کھو دیتی ہیں یہ غزلیں حسرت موہانی کی اس غزل سے قطعی الگ ہیں جس کا ایک مصرعہ ہے — 'وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے'۔ اور جو خارجیت کی یکسر غیر دلکش تصویر ہے اس کے برعکس بشیر بدر کی افسانوی رومانیت میں ایک نوع کی دھیمی دھیمی کسک پائی جاتی ہے جو دبتی ہے نہ ابھرتی ہے۔ ذیل کی غزلیں پوری کی پوری ان کے ہزار سالہ تہذیبی لاشعور کی یادوں کا نغمہ ہیں۔ ملاحظہ ہو:

چمک رہی ہے پروں میں اڑان کی خوشبو
بلا رہی ہے بہت آسمان کی خوشبو

بھٹک رہی ہے پرانی رضائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی
دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو

گلوں پہ لکھتی ہوئی لا الٰہ الا اللہ
پہاڑیوں سے اترتی اذان کی خوشبو

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

وہ دردوں کے سلاموں کے نگر یاد آئے
نعتیں پڑھتے ہوئے قصبات کے گھر یاد آئے

گھر کی مسجد میں وہ نورانی اذاں سے چہرے
ان مشینوں میں دعاؤں کے شجر یاد آئے

شاعر جب اپنے تجربات واحساسات میں ڈوب کر کچھ کہنا چاہتا ہے تو وہ شعری پیکروں کی زبان میں ادا کرتا ہے یا یوں کہیئے کہ وہ اپنے احساسات اور ذہنی ارتعاشات کو رنگ، آواز اور خوشبو کے پیکروں کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ اور بقول اسلوب احمد انصاری "شعری پیکر کا استعمال محض کمال فن کی دلیل نہیں بلکہ حقیقت کے عرفان کا ایک بہت ہی لطیف اور موثر وسیلہ بھی ہے"۔ بشیر بدر نے اکثر و بیشتر اپنے ارتعاشات ذہنی اور محسوسات قلبی کو شعری پیکروں کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ میں یہاں صرف بصری پیکروں کی چند مثالیں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ان کے مطالعہ سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے تجربات واحساسات کو کس حسن سے گرفت میں لاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

یہ خزاں کی زرد سی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

کئی میل ریت کو کاٹ کوئی موج پھول کھلا گئی ۔۔۔ کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا
مرے ساتھ جگنو ہے ہمسفر مگر اس شرر کی بساط کیا ۔۔۔ یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا
ریت سے دیا اٹھے ہیں خاک سے جھیلیں پٹیں ۔۔۔ یہ پرندے خون میں شاید نہانے آئے ہیں
چرواہے بھیڑوں کو لے کر گھر گھر آیا رات ہوئی ۔۔۔ تو پنچھی دل تیرا پنجرہ پنجرے میں جا رات ہوئی
سرخ سنہرا صافہ باندھے شہزادہ گھوڑے سے اترا ۔۔۔ کالے غار سے کمبل اوڑھے جوگی نکلا رات ہوئی

غزل پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ مسلسل نہیں ہوتی۔ متفرق جذبات کے موتیوں سے پروئی تسبیح ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے کلیم الدین احمد نے غزل کو وحشی صنف سخن کہا ہے۔ یہ بڑی حد تک صحیح ہے مگر غزل کی یہی وہ خوبی ہے جو اسے دوسری اصناف سخن سے ممتاز کرتی ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک مکمل داستان نہاں رکھتا ہے۔ اس میں ایک نوع کی آفاقیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ مختلف حالات پر بے ساختہ منطبق ہو جاتا ہے اور وہ بات جو ہم گھنٹوں میں نہ کہہ سکتے چند لمحوں میں کہہ دیتے ہیں۔ غزل کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس کے اشعار میں بات وضاحت سے نہیں کہی جاتی بلکہ اشاروں میں ادا کی جاتی ہے۔ اس میں ایک ہلکا سا ابہام اور خلا ہوتا ہے جو ذہن سامع کے پُر کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بشیر بدر کے یہاں یہ اوصاف ہر جگہ نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شہروں میں اونچے اونچے مکانوں میں رہنے والے ہوا اور روشنی سے کس طرح محروم ہیں۔ بشیر بدر کو بھی اس کا احساس ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی ۔۔۔ یہ کھڑکی کھولو ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

آدمی سوچتا بہت کچھ ہے۔ لیکن اس کا سوچنا بیکار جاتا ہے۔ اس کے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں — بشیر بدر کہتے ہیں۔

آج ہم سب ایک بہتر زندگی دوڑ میں ۔۔۔ کیسے کیسے خواب قبروں میں سلانے آئے ہیں

کہیں کہیں بشیر بدر نے حالات کی عکاسی بھی کی ہے مگر منفی انداز کی بجائے مثبت انداز میں۔ وہ بھی اس طرح کہ شعر تغزل سے عاری نہ ہونے پائے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

لہو اتنا سستا ہے انسان کا ۔۔۔ لکھا ہے کہاں وید و قرآن میں
یارو نئے موسم نے یہ احسان کیا ہے ۔۔۔ اب یاد مجھے درد پرانے نہیں آتے
اس شہر کے بادل تری زلفوں کی طرح ہیں ۔۔۔ یہ آگ لگاتے ہیں، بجھانے نہیں آتے
کوئی آسیب ہے اس حسیں شہر پر ۔۔۔ شام روشن ہے لیکن سہانی نہیں
چھپروں پر دیئے رکھ گئی ہے ہوا ۔۔۔ تاکہ پھر روشنی کی شکایت نہ ہو

ملک تقسیم ہوئے دل تو سلامت ہے ابھی — کھڑکیاں ہم نے کھلی رکھی ہیں دیواروں میں

اگر آپ تعلّی نہ سمجھیں تو بشیر بدر نے اپنی شاعری کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ لکھتے ہیں

"میں نے نئی لفظیات، نئے پیکروں، نئے استعاروں سے نئی غزل کو اس قدر عام کر دیا کہ حافظ اور سعدی کی عجیب الطرفین غزل ماضی کا وقار ہو کر رہ گئی میں نے اُسے اپنا ہندوستانی شجرہ حسب و نسب دیا میرا یہ جرم ہے کہ غیر غزلیہ اردو کو نازک غزلیہ احساسات کا نغمہ اس طرح بنا دیا کہ اب میرے عہد کے نئے اور ذہین لوگوں کے یہ دل اور روح کا تغزل ہے۔"

میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ غزل کے مزاج اور اس کی روح سے پوری طرح آشنا ہے۔ اس کے سمجھے بغیر شاید وہ اتنی اچھی غزلیں نہ کہہ پاتے۔ چنانچہ ذیل میں چند اشعار دیکھئے جس میں انھوں نے نئی غزل کی تعریف کی ہے ملاحظہ ہو

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا — وہ غزل کا لہجہ نیا نیا، نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

چمکتی ہے کہیں صدیوں میں آنسوؤں کی زمیں — غزل کے شعر کہاں روز روز ہوتے ہیں

یہ شبنمی لہجہ ہے آہستہ غزل پڑھنا — تتلی کی کہانی ہے، پھولوں کی زبانی ہے

ہم نے الفاظ کو آئینہ کر دیا — چھپنے والے غزل میں چمک جائیں گے

فن اگر روح و دل کی ریاضت نہ ہو — ایسی مسجد ہے جس میں عبادت نہ ہو

اسے فن نہیں پردۂ فن کہو — غزل کو چراغوں کی چلمن کہو

نصاب دل کا کہاں رکھ دیا کتابوں میں — غزل کی آگ ہے یہ کاغذوں کے بس کی نہیں

یہ آنسو ہیں انھیں پھولوں میں شبنم کی طرح رکھنا — غزل احساس ہے احساس کا ماتم نہیں ہوتا

اک زباں جس کو غزل کہئے وہ مجرم ٹھہری — شاہزادی کو چنا جائے گا دیواروں میں

میں غزل کی شبنمی آنکھ سے یہ دکھوں کے پھول چنا کروں — مری سلطنت مرا فن رہے مجھے تاج و تخت خدا نہ دے

تتلی کے نازک پنکھوں پر آنسو کی تحریر غزل ہے — لفظوں کی مینا کاری کو الہامی اشعار نہ جانو

چنانچہ بشیر بدر کے جس شعر کو دیکھئے کا وہ آنسوؤں کی زمین کا پھول، تتلی کی کہانی اور چراغوں کی چلمن معلوم ہوگا۔ ان کے اسلوب کا لہجہ شبنمی ہے مگر روح و دل کی ریاضت کا امین۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بشیر بدر نہ صرف آج کا شاعر ہے بلکہ مستقبل کا بھی فنکار ہے۔

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

بشیر بدر

اقتباسات

جمیدہ فکرو آگہی دہلی کے زیر اہتمام ۱۰ر فروری ۱۹۹۶ء کو بشیر بدر کے ساتھ ایک شام کا انعقاد غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین دہلی میں کیا گیا جس میں محترمہ محسنہ قدوائی وزیر شہری ترقیات وسیر و سیاحت ہند نے فکرو آگہی کے بشیر بدر نمبر کی رونمائی کی اس تقریب کے پہلے دور کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اور دوسرے دور کی صدارت محترم حیات اللہ انصاری نے فرمائی۔ اس بزم میں شریک کچھ مقتدر ہستیوں کے خیالات کا انتخاب پیش ہے۔ (رضیہ حامد)

محترمہ محسنہ قدوائی وزیر شہری ترقیات وسیر سیاحت حکومت ھند:۔ بشیر بدر ہندوستان ہی میں نہیں بیرونی ممالک میں بھی بہت مشہور ہیں۔ وہ ایک بہت اچھے شاعر اور بہت اچھے انسان ہیں۔ میں انھیں بہت قریب سے جانتی ہوں وہ ہمیشہ سے اعلیٰ انسانی قدروں کی حفاظت کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندوستان اور یہاں کے رہنے والوں کے لیے جو سچی محبت ہے وہ ہمیشہ دلوں کو جوڑنے اور آپس میں بھائی چارہ قائم کرنے کی آرزو کرتی ہے۔ ان کی زندگی میں بڑی بڑی ذاتی پریشانیاں آئیں لیکن وہ اپنی پریشانیوں کو بھول کر دنیا کے دکھ درد کی بات کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اتنی طاقت اور کشش ہے۔

ابھی مجھے ٹورنٹو (کناڈا) جانے کا اتفاق ہوا وہاں لوگوں نے مجھے ایک عالمی مشاعرہ کا ویڈیو کیسٹ دکھایا جس میں دنیا کے ان ملکوں کے اردو کے شاعر تھے جہاں جہاں اردو بولی و سمجھی جاتی ہے۔ لیکن سننے والوں نے بشیر بدر کو جس محبت اور عزت سے سنا اس سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ صرف ان کی کامیابی نہیں اردو غزل کی کامیابی نہیں بلکہ ہمارے ہندوستان کی کامیابی ہے۔

کنھیا لال نندن، مدیر نو بھارت ٹائمیز ھندی:۔ ڈاکٹر بشیر بدر کا دوست ہونا فخر کی بات ہے۔ مجھے یہ مسرت حاصل ہے اور میں اسے زندگی کا بڑا تحفہ سمجھتا ہوں کہ میں بشیر بدر کا دوست ہوں بشیر بدر کی غزل کا 'میں'، 'ہم' ہے وہ اپنے دکھوں پر مسکراتے ہیں لیکن دوسروں کے دکھوں پر ان کی غزل میں شبنم برستی ہے۔ میرٹھ میں جب ان کا گھر جلایا گیا اور گھر کے ساتھ ساتھ ان کی لائبریری بھی جلی تو میں نے لکھا تھا کہ یہ بشیر بدر کی لائبریری نہیں جلی بلکہ ہمارے ساہتیہ اور ہندوستان کی لائبریری جلی ہے۔ جو ملک اپنے ادب کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ کبھی شاداب نہیں ہو سکتا ان دنوں جو یہ سوکھا پڑا ہے یہ ایک اشارہ ہے بشیر بدر کی غزل نے ہندی والوں کو صحیح

ہندی بولنے میں مدد کی ہے کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ جب سے لوگوں نے اردو پڑھنا چھوڑ دیا ہے ہندی کا تلفظ بگڑ گیا ہے میں ایک اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی ساری غزلوں کی کتابیں جو اردو میں چھپ گئی ہیں انہیں ہندی میں چھاپنے کے لیے دیں کیونکہ بشیر بدر ہندی اور اردو کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی :۔ بشیر بدر کی حیثیت ایک نثر نگار ایک شاعر اور ایک استاد کی ہے بلاشبہ وہ بہت مشہور شخصیت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہرت اور علم میں اکثر بیشتر رہتا ہے مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس تضاد کو اکائی بنا دیں گے۔

ابوالفیض سحر :۔ آمد کے مطالعہ میں میں نے بشیر بدر کی غزل کو زندگی کی دھوپ اور احساس کے پھولوں کی غزل کہا ہے۔ یہی ان کی شاعری کا بنیادی مزاج ہے بشیر بدر نے غزل کو جو محبوبیت، وقار، اعتبار اور وجاہت بخشی ہے وہ بے مثال ہے عالمی سطح پر بشیر بدر سے پہلے کسی کی غزل کو یہ محبوبیت نہیں ملی میر و غالب کے شعر بھی مشہور ہیں لیکن میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ عالمی پیمانہ پر بشیر بدر کی غزلوں کے اشعار سے زیادہ کسی کے شعر مشہور نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے آج کے انسان کی نفسیاتی مزاج کی ترجمانی جس عالمی اردو کے غزلیہ اسلوب میں کی ہے وہ اس سے پہلے ممکن بھی نہیں تھی اس اعتراف میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے کہ وہ اس وقت دنیا میں غزل کے سب سے محبوب شاعر ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ :۔ بشیر بدر نے جو مقبولیت کا معیار قائم کیا ہے وہ شعر کے حوالہ سے بہت سے سوال اٹھاتا ہے میر نے کہا تھا۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا ۔۔۔ کرتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

بشیر بدر غزل میں ایسی ہی باتیں کرتے ہیں ہر بڑے شاعر کو کڑی آزمائشوں سے گزرنا ہوتا ہے میر کو اپنی عظمت کے اظہار کے لیے 'اجگر نامہ' لکھنے کی ضرورت پڑی غالب نے کیا کیا معرکہ آرائیاں کیں۔ فیض جنہیں ان کی زندگی میں مقبولیت اور عزت مل گئی انھیں بھی آسانی سے یہ رتبہ نہیں ملا تھا خود ترقی پسند نقادوں کی پرانی تنقیدیں اٹھا کر دیکھیے تو پندرہ بیس سال پہلے فیض کا ترقی پسند شاعروں میں بیسواں بائیسواں نمبر تھا پھر ان کا نام آٹھ دس شاعروں میں آنے لگا اور اپنی زندگی ہی میں وہ سرفہرست ہو گئے گذشتہ تیس برس میں بشیر بدر نے بھی یہ سختیاں جھیلی ہیں 'اکائی' سے لے کر 'آمد' تک ان کا سفر پھولوں کا راستہ نہیں ہے بڑی بڑی آزمائشوں سے وہ گزرے ہیں۔ ان کی غزلوں کی پہلی کتاب 'اکائی' نے ہمارے ادب میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ایک عجیب شان اور دھوم سے بشیر بدر غزل کی دنیا میں آئے لیکن پھر ان پر بھی بڑے سرد گرم موسم گذرے تب وہ یہاں تک پہونچے ہیں۔

بشیر بدر بہت اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ اتنی مدلل اتنی لاجیکل نثر بہت کم تخلیقی ذہن لکھ سکتے ہیں ہیں

ہمیشہ ان کی نثر سے محفوظ ہوتا ہوں میں ان کا ایسا عاشق ہوں ایک زمانہ میں میں نے بہت کوشش کی کہ وہ جامعہ ملیہ کے اسٹاف میں آجائیں۔

آج سے ۱۵ بیس سال پہلے جب ہم مغربی ممالک میں جاتے تھے تو صرف ترقی پسندوں کا نام اردو حلقوں میں جانا جاتا تھا تو ذہنوں میں ایک بار یہ سوال اٹھایا گیا کہ فیض سردار جعفری مجروح اور کیفی اعظمی یعنی کمیونسٹ شاعروں کے علاوہ کیا کوئی دوسرا مسلمان شاعر اردو کی نمائندگی نہیں کرسکتا پھر ایک ایسے شاعر اسی مطالبہ پر بلائے گئے جو شکل وصورت لباس اور حلیہ اور ریش مبارک سے اس کمی کو پورا کررہے تھے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مغربی ممالک میں اردو شاعروں کی رسائی کسی ازم یا کسی مذہب کے وسیلہ سے آسان تھی اسی لیے مجھے شک ہوتا ہے کہ اکثر شاعروں کی شہرت کا سبب ان کی سیاسی پارٹی یا ان کا مذہب ہے۔ آج بشیر بدر مغربی ممالک میں محبوب نام ہیں لیکن وہ کسی لیبل پر نہیں بلائے گئے۔ اپنے شعر کی قیمت پر اپنے شعر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کرنا بشیر بدر کا امتیاز ہے۔

بشیر بدر نے غزل کو نئی زبان دی زبان کا معاملہ ایک طوائف کا معاملہ ہے جو اس کی انگلی پکڑتا ہے اس کے ساتھ چل پڑتی ہے۔ لیکن اچھا شاعر اسے دوبارہ دوشیزگی عطا کرتا ہے اس کے حسن کو نکھارتا ہے تازگی بخشتا ہے بشیر بدر نے شعوری اور تخلیقی سطح پر غزل کے سفر میں اردو کو نئے لفظ دیے ان کی کوئی غزل کہیں سے پڑھ لیجیے آپ کوئی نہ کوئی نیا لفظ نئے رویے کے ساتھ غزل میں اضافہ کرتا نظر آئے گا۔ بشیر بدر کی غزل پر میر کا یہ شعر دونوں طرح سے صادق آتا ہے۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

شعر میرے ہیں گو عوام پسند
پر مجھے گفتگو خواص سے ہے

میرا عقیدہ ہے کہ آج ہندوستان اور پاکستان میں اردو کا مستقبل اردو کے غیر زباں دانوں سے وابستہ ہے میں اہل زبان کی بڑی عزت کرتا ہوں میں نے سب کچھ ان ہی لوگوں سے سیکھا ہے لیکن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں مختلف زبانوں کے لین دین میں اور اردو سے بے پناہ محبت کرنے والوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اپنے آپ کو اہل زبان نہیں کہہ سکتے بشیر بدر نے غزل کی وہ زبان دریافت کرلی ہے۔ جو صرف اردو اور ہندی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ان تمام بولیوں کی خوشبو ہے جن کا رشتہ ہماری ان روایتوں سے ہے جو ہماری دھرتی سے اگی ہیں غزل اس لیے اس عہد میں مقبول ترین صنف ہے کہ یہ آریائی اور ہندوستانی مزاج ہے کہ وہ دو مصرعوں میں حیات اور کائنات کو اپنے اندر سمولیتا ہے۔ جو کام پہلے دوہے کرتے تھے وہ کام اب غزل کررہی ہے۔ بشیر بدر نے دو پوئیٹری میں نئی بستیاں آباد کی ہیں یہ بات سچ ہے اور یہی ان کا پاپولر امیج ہے۔ لیکن یہ امیج پورے بشیر بدر کی نمائندگی نہیں کرتا میں ان کے دو شعر سناتا ہوں یہ رومانی شعر نہیں ہیں

سنسان راستوں کی سواری نہ آئے گی
اب دھول سے اٹی ہوئی لاری نہ آئے گی

پیدل چلو کہ کوئی سواری نہ آئے گی　　پیچھے کے چائے خانے بھی اب اونگھنے لگے

اس میں کئی گہری باتیں ہیں لیکن ان سے قطع نظر میں صرف اس قصباتی فضا کا ذکر کروں گا جو ہماری شاعری میں اب نایاب ہے دراصل اردو زبان کو شہروں نے کھالیا ہے میں میراجی، راشد اور اقبال کی روایتوں کے شاعروں کی اہمیت سے انکار نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ قصبات کی فضا میں جو تازگی اور معصومیت ہے اس کو گرفت میں لانا بشیر بدر کا ایسا شعری ہنر ہے جو ان کے زندہ رہنے کے لیے کافی ہے ان کی انفرادیت کی مہر لگانے والے دو تین شعر اور سن لیجئے۔

حویلیوں میں میرے خاندان کی خوشبو　　بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے

دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو　　سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی

رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو　　وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا

یہ وہی خوشبو ہے جو ہمارا رشتہ ہندآریائی ہماری دھرتی سے گنگ وجمن کی وادی سے ہندی برج، اودھی بلکہ تمام تمامی بولیوں سے جوڑتی ہے

ڈاکٹر خلیق انجم :- میں بشیر بدر کا معترف ان کی شاعری اور ان کی نثر سے ہوں۔ آج سے دس برس پہلے جب میں نے ان کے مضامین پڑھے تھے تو میں نے خود دیکھا وہ اپنی نثری کتاب انجمن ترقی اردو سے چھپوائیں ہمارے وسائل زیادہ نہیں ہیں اس وجہ سے ہمارے ہاں بہت سے اہم تخلیقات برسوں چھپنے کا انتظار کرتی رہتی ہیں لیکن میں نے خود درخواست کر کے ان سے ان کا تحقیقی مقالہ لیا اور انجمن نے اپنے تمام تر تحسینی کلمات کے ساتھ اسے چھاپا اس طرح سے میں نے اور انجمن نے یہ عملی ثبوت دیا کہ ہم لوگ ان کی تنقیدی نثر کے معترف اور مداح ہیں میں ان کی شاعری کا بھی بڑا معترف ہوں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں غزل کے لیے جو محبت اور عزت پیدا ہوئی ہے اس میں بشیر بدر کا نمایاں حصہ ہے۔ بشیر بدر کی شاعری معمولی شاعری نہیں ہے وہ زندگی کے تفکر کو تغزل بناتے ہیں اور ان کا کمال یہ ہے کہ اچھی شاعری کر کے مقبول ہیں میرے نزدیک اس وقت ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر اردو کی آبرو بشیر بدر ہیں۔

حیات اللہ انصاری :- بشیر بدر کی غزل ہمارے ذہن اور روح میں رچ بس گئی ہے اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب میرٹھ کے فسادات میں ان کے لیے ایک بہت بری افواہ ہم تک پہونچی اس وقت میری طرح ہزاروں آدمیوں کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ مجھے ان کی خوبصورت شاعری، شعر پڑھنے کا انداز اور تہذیبی سعادت مندی اس درجہ بے قرار کر گئی تھی کہ میں وہ درد کا تاثر آج نہیں بھول سکا ہوں آج میرا دل مسرت سے بھر آیا ہے کہ ہم اپنے شاعر کی شام منا رہے ہیں۔